باسمه تعالیٰ

عن ابی عمرو بن العلاء ان کعب بن زهیر رضی الله عنه لما انشد النبی ﷺ قصیدته بانت سعاد رمی الیه ببردة کانت علیه فلما کان زمن معاویة رضی الله تعالیٰ عنه کتب الی کعب بعنا بردة رسول الله ﷺ بعشرة آلاف درهم، فابی علیه فلما مات کعب بعث معاویة الی اولاده بعشرین الف درهم و اخذ منهم البردة التی هی عند الخلفاء آل العباس وهکذا قال خلائق آخرون (تاریخ الخلفاء ص: ۱۲)

الفرده فی شرح البردة

تالیف: تاج الشریعہ حضرت علامہ اختر رضا قادری ازہری دامت برکاتہم العالیہ

الوردة فی شرح الفردة

مترجم وشارح: خلیفۂ تاج الشریعہ، شہزدۂ خانوادۂ رضویہ مولانا ارسلان رضا قادری حفظہٗ اللہ عن الشرور

قصیدہ بردہ شریف: حضرت شیخ امام محمد شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ

عربی شرح: الفردۃ فی شرح البردۃ

مصنف: تاج الشریعہ حضرت علامہ اختر رضا قادری ازہری دام ظلہ العالی

اردو ترجمہ وشرح: الوردۃ فی شرح الفردۃ

مترجم وشارح: شہزادۂ خانوادۂ رضویہ، خلیفۂ تاج الشریعہ حضرت مولانا محمد ارسلان رضا قادری حفظہ اللہ

باہتمام: حضرت مولانا محمد جمیل احمد رضوی صاحب قبلہ

کمپوزنگ: محمد محمود عالم رضوی، رضا کمپوٹر مسجد بی بی جی بریلی شریف 9557580281

ناشر: مکتبہ رحمانیہ رضویہ مرکز اہلسنت بریلی شریف

باراول: ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰۱۷ء

بموقع: ۹۹ر عرس رضوی بریلی شریف

صفحات: ۶۰۴

قیمت:

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ رضویہ ______________ درگاہ اعلیٰ حضرت کے سامنے بریلی شریف

رضوی کتاب گھر ______________ مٹیا محل دہلی

مکتبہ فقیہ ملت ______________ مٹیا محل دہلی

قادری بک ڈپو ______________ نومحلّہ مسجد اسلامیہ مارکٹ بریلی شریف

دار العلوم اہل سنت فیض الرسول ______________ براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو اپنے جد مکرم حضور سرکار اعلیٰ حضرت کے بحر علم وفیض سے جاری ہونے والے ان دو سلسلوں کے بزرگوں کے نام سے معنون کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں جن میں سے ایک سے میرا قوی تر رشتہ، رشتۂ نسبی وفرزندی ہے اور دوسرے سے قوی تر رشتہ، رشتۂ علمی وروحانی ہے یعنی سلسلۂ حجۃ الاسلام اور سلسلۂ مفتیٔ اعظم جو جد اعلیٰ سرکار اعلیٰ حضرت سے کچھ اس طرح ہے:

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت

الشاہ امام احمد رضا خاں

فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شہزادہ وجانشین اعلیٰ حضرت حضور حجۃ الاسلام مولانا

محمد حامد رضا خاں علیہ الرحمۃ

حضور مفسر اعظم ہند الشاہ مولانا

محمد ابراهیم رضا خاں علیہ الرحمۃ

تاجدار مسند رضویت حضور ریحان ملت مولانا

محمد ریحان رضا خاں علیہ الرحمۃ والرضوان

جن سے میرا نسبی وحسبی تعلق اور رشتۂ فرزندی ہے

تاجدار اہلسنت شہزادۂ اعلیٰ حضرت

حضور مفتیٔ اعظم ہند علیہ الرحمہ

تاجدار مسند برکاتیت ساقیٔ کوثر مسلک اعلیٰ حضرت

حضور سرکار احسن العلماء علیہ الرحمۃ والرضوان

قاضیٔ القضاۃ فی الہند وارث علوم اعلیٰ حضرت

حضور تاج الشریعہ دامت برکاتہم العالیہ

جن سے میرا علمی وروحانی تعلق اور رشتۂ ارادت وغلامی بھی ہے

خاکپائے اجداد کرام ومشائخ عظام احقر محمد ارسلان رضا خاں قادری غفرلہٗ ربہ القوی

عرض

انتہائی مسرت وشادمانی کی بات ہے کہ یہ کتاب "الوردة فی شرح الفردة" زیورطباعت سے آراستہ ومزین ہوکر منظرعام پرآرہی ہے تاہم قارئین کرام کی بارگاہ میں عرض ہے کہ ۲۲؍محرم الحرام ۱۴۳۹ھ کو نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا محمد ارسلان رضا صاحب قبلہ حفظه الله کی دستار بندی کے موقع پر اس کتاب کو لانے کی وجہ سے اس میں انتہائی عجلت وجلد بازی سے کام لیا گیا ہے اور کاتب نے بھی دن رات محنت کرکے اس کی جلد از جلد کمپوزنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔لہذا اقوی امکان ہے کہ کتاب میں کتابت کی کثیر غلطیاں رہ گئیں ہوں، اسی لئے قارئین کرام سے پیشگی معذرت ہے اور گزارش ہے کہ اگر خامیاں نظر آئیں تو صاحب کتاب کو مطلع فرمادیں۔تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے عین نوازش ہوگی۔

مولانا محمد جمیل احمد رضوی
مکتبہ رحمانیہ رضویہ درگاہ اعلیٰ حضرت
مرکز اهلسنت بریلی شریف

نمبر شمار	فهرست ورده	صفحہ

'الوردہ' کو جن حضرات علمائے کرام نے مضامین وتقاریظ اور تأثرات سے جلا بخشی ان کے اسمائے گرامی:

تذکار گل گلستان رضا

(حالات مصنف)

از: مفتئ کاشی پور حضرت علامہ مفتی محمد ذوالفقار صاحب قبلہ نعیمی

اہل سنت کا مرکز عقیدت، شہر بریلی شریف اپنی مثال آپ ہے۔اس شہر کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی نہریں ہر طرف جاری ہوں اور وہ ہر پیاسے کو سیراب کرتی ہوں جس سے بنجر زمین کو سرسبز وشادابی حاصل ہوتی ہو۔اس چمن کی طرح ہے جس چمن کے گلہائے رنگارنگ اپنی مختلف خوشبوؤں سے اپنے اردگرد ماحول کو معطر کررہے ہوں، اس آفتاب کی طرح ہے جس کی شعائیں اندھیروں کو اجالا بخش رہی ہوں، اس چاند کی طرح ہے جس کی نرم چاندنی شب دیجور کا کلیجہ چاک کررہی ہو، یہی وہ بریلی شہر ہے جہاں عشق مصطفیٰ کے چھلکتے جام بانٹے جاتے ہیں، جہاں محبت رسول کی شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔

جہاں عظمت مصطفیٰ کا درس دیا جاتا ہے، جہاں ناموس رسالت پر مر مٹنے کا سبق پڑھایا جاتا ہے، جہاں الحب لله والبغض لله کا قانون حفظ کرایا جاتا ہے، جہاں ''زندگی ہے نبی کی نبی کے لئے'' کی عملی مشق کرائی جاتی ہے، یہی وہ بریلی شہر ہے جسے اعلیٰ حضرت کے حوالے سے شہرت ملی، حجۃ الاسلام کے نام سے پہچان ملی، مفتی اعظم ہند کے تصدق بلندی ملی، مفسر اعظم نے جسے عروج بخشا ریحان ملت سے جسے رعب و وقار نصیب ہوا اور تاج الشریعہ کے وجود سے جس کی شان دوبالا ہوئی۔

ولادت: الغرض اسی بریلی شریف کے محلّہ سوداگران میں خاندان اعلیٰ حضرت کے مقدس چشم و چراغ حضور ریحان ملت کے صاحبزادے حضور انجم میاں کے کاشانۂ اقدس میں ایک نورانی شکل وصورت والا بچہ تولد ہوا جسے دنیائے سنیت میں نبیرۂ اعلیٰ حضرت، خلیفۂ تاج الشریعہ، ارسلان ملت حضرت علامہ مولانا محمد ارسلان رضا خاں صاحب دامت برکاتہم کے نام سے جانا جاتا ہے۔۱۱ر صفر المظفر مطابق یکم اگست ۱۹۹۳ء کی مقدس تاریخ کو شہزادۂ بالا تبار نے اس خاکدان گیتی پہ قدم رکھا۔

حضور اعلیٰ حضرت سے رشتہ نسبی: موصوف کا نسب نامہ حضور اعلیٰ حضرت تک کچھ اس طرح ہے۔ارسلان میاں کے والد گرامی، مولانا عثمان رضا خاں عرف انجم میاں بن ریحان ملت ریحان رضا خاں عرف رحمانی میاں بن مفسر اعظم ہند ابراہیم رضا خاں عرف جیلانی میاں بن حجۃ الاسلام شاہ حامد رضا خاں بن امام

اہل سنت اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں (علیہم الرحمۃ والرضوان) اس طرح حضور اعلیٰ حضرت کی پانچویں پشت میں آپ کا نام آتا ہے۔

حضور مفتی اعظم سے نسبی تعلق: شہزادۂ حضور اعلیٰ حضرت، مفتی اعظم ہند محمد مصطفیٰ رضا خاں قدس سرہ سے آپ کا نسبی تعلق جد امجد حضور حجۃ الاسلام کی جانب سے یہ ہے کہ مفتی اعظم ہند حجۃ الاسلام کے سگے چھوٹے بھائی تھے۔اور ایک رشتہ دونوں میں سمدھی کا بھی تھا مطلب حضور حجۃ الاسلام نے اپنے شہزادے حضور مفسر اعظم ہند کا نکاح حضور مفتی اعظم ہند کی صاحبزادی محترمہ کے ساتھ کر دیا تھا جن سے حضور تاج الشریعہ اور حضور ریحان ملت تولد ہوئے۔یعنی محترم موصوف کے جد امجد حضور ریحان ملت کی والدہ محترمہ حضور مفتی اعظم ہند کی صاحبزادی تھیں۔اور وہ موصوف کی رشتہ میں پردادی بنتی ہیں۔

ابتدائی دور اور دینی ماحول: جد امجد کے مزار پر انوار کے ٹھیک سامنے مدرسہ منظر اسلام اور رضا مسجد سے متصل آپ کی پرورش ہوئی۔آنکھ کھولی تو ہر طرف اصحاب ریش،صوفی مزاج،لباس مصطفیٰ میں ملبوس مقدس ہستیاں نظر آئیں۔

کانوں نے ابتدا ہی سے رضا مسجد سے اذان،منظر اسلام سے قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی اور مزار اعلیٰ حضرت سے مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام کی پر نور صدائیں اور پیہم آوازیں ہی سنیں۔

اور جب گھر سے پہلا قدم باہر نکالا تو کسی میدان کے لئے نہیں بلکہ گھر سے نکلتے ہی سامنے جد امجد کی تربت انور آواز دے رہی تھی اور بزبان حال کہہ رہی تھی کہ اے شہزادے پہلے دادا کی آغوش محبت میں آجا اور یہاں سے عشق مصطفیٰ کے چھلکتے جام نوش کر لے۔وہیں مفتی اعظم کی تربت انور پکار کر کہہ رہی تھی کہ ادھر بھی آجا کہ میں تجھے تقوی وطہارت کا مقدس لبادہ زیب تن کر دوں۔دوسری طرف دادا حضور ریحان ملت کا مزار اقدس " **السیاسۃ باستصلاح الخلق بارشادھم**" کا سیاسی سبق اور فکر وتدبر کا درس پڑھانے کے لئے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

الغرض مقدس آستانہ سے تقوی وطہارت،عشق ومعرفت علم وحکمت،فکر وتدبر اور پاکیزہ سیاست کے ساتھ ساتھ مصطفیٰ پیارے کے عشق اور محبت کی لازوال دولت سے مالا مال ہو کر تقدس وپاکیزگی کے پانی سے وضو کر کے رضا مسجد تک کا سفر طے کیا۔خدا کی مقدس بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور سر نیاز خم کر کے اپنے مولی کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے نماز کے ذریعہ حق بندگی ادا کیا۔ان نمازوں کا کیا کہنا جو نمازیں کسی عام سے امام کے پیچھے نہیں بلکہ امام وقت نازش دوراں ولی کامل عارف باللہ قاضی القضاۃ مقدام الفقہاء والعلماء حضور تاج

الشریعہ مفتی اختر رضا خاں ازہری دامت معالیھم کی اقتدا میں ادا کی گئی ہوں۔اور خصوصی طور پر نماز فجر مکمل اہتمام کے ساتھ حضرت ہی کی اقتدا میں ادا کی گئی ہو۔یقیناً ان نمازوں کو شرف قبولیت عطا ہوا ہوگا۔
[یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت تاج الشریعہ باصحت وتوانا تھے اور نماز پنجگانہ کی امامت مسجد رضا میں فرماتے تھے۔

بنیادی تربیت: گھر سے متصل جدامجد کا تعمیر کردہ مدرسہ منظر اسلام تھا جہاں عشق مصطفیٰ کا درس دیا جاتا تھا ان کی اداؤں پر جینے کا طریقہ سکھایا جاتا تھا۔اتنے قریب مدرسہ ہو تو پھر بھلا کون گھر میں پڑھائے گا مگر قربان جائیں ایسی ماؤں پر جن کی آغوش کسی مدرسہ سے کم نہیں ہوتی ہے۔حضرت موصوف نے والدہ ماجدہ کی آغوش محبت میں بیٹھ کر قرآن پاک ناظرہ اور اردو کی مذہبی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی تربیت بھی ۔چوں کہ ہر طرف دینی ماحول تھا مذہبی تربیت سے آراستہ تھے اس لئے دنیاوی چکاچوند سے متاثر نہیں ہوئے۔اور اسی روش پر گامزن ہوئے جس پر ان کے اسلاف کرام تھے۔

تعلیمی سفر: دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر والدگرامی دام ظلہ نے دنیاوی علوم کی تحصیل کے لئے کالج میں داخل کرادیا۔البتہ موصوف کا قلبی رجحان جدامجد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مذہبی علوم حاصل کرکے دین ومذہب کی ترویج واشاعت کی طرف تھا اس لئے چندسال کی تعلیم حاصل کرکے آپ نے مدرسہ منظر اسلام میں داخلہ لے لیا۔اور خصوصی طور پر مولانا نعیم اللہ خان صاحب سابق صدرالمدرسین منظر اسلام کی آغوش عاطفت میں رہ کر ابتدائی بنیادی کتابوں کا علم حاصل کیا۔

گھر میں اور خانقاہ میں عقیدت مندوں کی بھیڑ اور ان سے ملنے ملانے کی مصروفیات سے وقت نکال پانا ایک مشکل امر تھا،اس لئے موصوف نے مدرسہ منظر اسلام جیسے عظیم الشان ادارہ کو خداحافظ کہا اور براؤں شریف کے مشہور مدرسہ فیض الرسول میں حصول تعلیم کے لئے پہنچ گئے۔اور وہاں پہنچ کر باضابطہ تعلیم شروع کردی۔

اساتذہ کرام: درس نظامی کی کتابیں جیسے تسہیل المصادر،گلزار دبستاں، فارسی کی پہلی نحومیر، ہدایۃ النحو سے لے کر مسلم وبخاری شریف تک،نحو وصرف، عربی ادب، منطق وفلسفہ، بلاغت ومعانی،حدیث اوصول حدیث،فقہ واصول فقہ،تفسیر اصول تفسیر کی مکمل تعلیم درج ذیل اساتذہ سے حاصل کی:

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم اللہ خان صاحب، سابق صدرالمدرسین منظر اسلام بریلی شریف
حضرت مفتی محمد مستقیم صاحب قبلہ مصطفوی، مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف

مفتی شہاب الدین صاحب، مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف
حضرت مفتی نظام الدین صاحب قبلہ، مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف
حضرت مولانا محمد اسمعیل صاحب قبلہ، شیخ الحدیث مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف
شہزادۂ حضور بدر ملت حضرت مولانا رابع نورانی صاحب قبلہ بدری، مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف
حضرت مولانا قاری خلق اللہ صاحب قبلہ خلیق فیضی مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف

چھٹیوں کے دوران بریلی شریف میں حضورتاج الشریعہ کی درسگاہ علم میں پہنچ کر علمی استفادہ کرتے رہے۔جلوت وخلوت جب جب موقع ملتا حضرت کی علمی موشگافیوں سے مستفید ہوتے اور گاہے بگاہے مشکل عبارات، دقیق مفاہیم، پیچیدہ سوالات عقدہائے لاینحل حضرت کے نذرسماع کرتے اور حضرت کے اچھوتے انداز میں ان کا اطمینان بخش حل پاکر اطمینان قلبی حاصل کرتے۔اس طرح اساتذہ میں خصوصی استاد کی حیثیت سے حضور تاج الشریعہ کا نام نامی اسم گرامی سرفہرست ہے۔یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ موصوف نے اسی بیچ کچھ دنوں جامعہ ازہر مصر میں بھی تعلیم حاصل کی لیکن وہاں ملک کے حالات خراب ہونے کے سبب ملک واپسی کر لی اور پھر حضور تاج الشریعہ کی اجازت سے دوبارہ براؤں شریف پہنچ گئے۔[اوراب انشااللہ بعد دستار بندی پھر از ہر شریف اعلی تعلیم کے حصول کے لیے روانہ ہونے والے ہیں۔]

علوم مروجہ کی تکمیل: موصوف کی یہ کدوکاوش، یہ جدوجہد آخر رنگ لائی اور وہ موقع آیا جسے پانے کے لئے ہر نیک دل تمنا رکھتا ہے۔یعنی اپنے سر پہ تاج فضیلت رکھنے کو ہر شخص خواہش مند رہتا ہے مگر یہ تاج مقدر سے ہی زیب سر ہوا کرتا ہے۔موصوف بھی ان ہی مقدر والوں میں سے ایک ہیں۔کہ ان کے سر پر بھی امسال ۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۳ را کتوبر بروز جمعہ ۲۰۱۷ء کو فضیلت کا تاج زریں رکھا جائے گا اور علمائے کرام کے مقدس ہاتھوں سند فضیلت سے نوازا جائے گا۔ہم پہلے ہی موصوف کو مبارکباد کا ہدیہ پیش کئے دیتے ہیں۔

شادی خانہ آبادی: نکاح نبی کریم ﷺ کی ایک پاکیزہ سنت کا نام ہے۔اس سنت سے بندہ دین کی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ایک طرف جہاں موصوف نے علوم مروجہ کی تکمیل کی ہے وہیں حدیث پاک کے مطابق نکاح کی سنت پر عمل کر کے دین کی تکمیل بھی فرمالی۔اسی سال خاندان ہی میں شادی کرنے کی اپنی خاندانی روش کے مطابق اپنے ہی خاندان میں اپنے عم محترم شہزادۂ حضور ریحان ملت حضرت مولانا تسلیم رضا خاں صاحب کی دختر نیک اختر کو اپنے حبالۂ عقد میں قبول کرلیا۔نکاح کی یہ مقدس رسم ۶ ررمضان المبارک ۱۴۳۸ھ مطابق ۲ رجون ۲۰۱۷ء

ربروز جمعہ کومسجد نبوی شریف میں گنبد خضری کے سایہ میں ادا کی گئی۔اس مقدس رسم نے حضرت مولی علی اور حضرت فاطمۃ الزہرا کے نکاح کی یاد تازہ کردی جو مسجد نبوی شریف میں پڑھایا گیا تھا۔

درس وتدریس: ماہ شعبان المعظم میں درس نظامی کی تکمیل کر کے محرم کے جلسہ دستار تک کا وقت یوں ہی گزارا جاسکتا تھا مگر موصوف نے اپنے علمی ذوق وشوق کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے گھر ہی میں منظر اسلام کے باذوق طلبہ کو فقہ واصول فقہ وغیرہ کی تعلیم دینا شروع کردی اور اس طرح باضابطہ نہ سہی مگر سلسلۂ تدریس شروع کردیا۔

تصنیف وتالیف: پیش نظر کتاب الوردہ فی شرح الفردہ ،موصوف کی پہلی مستقل تصنیف ہے،اس سے قبل موصوف نے تعلیمی مصروفیات کے سبب کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی البتہ مضمون نگاری،مقالہ نویسی کی شروع ہی سے عادت رہی مختلف عناوین پر اہم اور علمی مضامین مشہور رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے۔ابتدائی دور میں منظر اسلام کے ایک تحریری مقابلہ میں موصوف نے حضور ریحان ملت کی علمی وادبی خدمات کے عنوان پر ایک تاریخی مقالہ تحریر فرمایا جسے علماے منظر اسلام نے بنظر تحسین ملاحظہ کیا۔بعد میں وہ مقالہ ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی شریف سے شائع بھی کیا گیا۔علاوہ ازیں کئی اہم مضامین ابھی غیر مطبوعہ ہیں جو ان شاء اللہ جلد ہی زیب اشاعت ہوں گے۔

خطابت: مافی الضمیر کو لفظی جامہ پہنانا بہت آسان ہے مگر اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا از حد مشکل امر ہے بولنا کوئی کٹھن کام نہیں لیکن مجمع کے درمیان بولنا،بہت مشکل کام ہے،تقریر کرنا بہت آسان ہے مگر خطابت بہت مشکل ہے ،تقریر میں فقط لفظوں کا جادو ہی کافی ہوتا ہے البتہ خطابت میں علمی توانائیاں صرف کرنی پڑتی ہیں،تب کہیں جا کے ایک مقرر خطیب بنتا ہے۔محترم موصوف کو اللہ پاک نے خطابت کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔جب بولنے پر آتے ہیں تو حضور اعلیٰ حضرت کی تقاریر کا احیا ہوتا نظر آتا ہے۔یہ فن محنت سے نہیں اللہ کے فضل وکرم سے ملتا ہے۔موصوف نے مدرسہ کی مروجہ محافل سے یہ ملکہ حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے خاندانی طور طریقہ کو اپناتے ہوئے عرس وغیرہ کی چھوٹی بڑی محفلوں میں شریک ہو کر اپنے جوہر کا مظاہرہ کیا اور آخر کار ایک وقت آیا کہ قریب گیارہ سال کی عمر میں عرس مفتی اعظم ہند کے موقع پر اسلامیہ انٹر کالج کے وسیع میدان میں لاکھوں کے مجمع میں خطابت کے جوہر دکھانے کا موقع ملا تو خوب خوب جلوے بکھیرتے نظر آئے جس نے سنا عش عش کر اٹھا۔والد گرامی نے خوش ہو کر سو روپے کا انعام دیا جس نے حوصلوں کو مزید بلندی عطا کردی۔اور جب عمر ۱۳ سال کی ہوئی تو عرس

رضوی میں اپنے خطاب سے عوام وخواص کوخوب خوب محظوظ کیا۔اس خطاب کی کیسیٹ جب حضورتاج الشریعہ کوملاحظہ کے لئے پیش کی گئی اورآپ نے جب موصوف کوسناتو اظہارمسرت فرماکرموصوف کوطلب فرمالیااوراپنی جیب خاص سے سوروپہ کاانعام عطافرماتے ہوئے فرمایا''یہ تمہاراانعام ہے''حضرت کی اس کرم نوازی نے موصوف کے خطاب کو قبولیت کادرجہ عطاکردیا۔اورمقبولیت کاپھریہ حال ہواکہ جب دوبارہ عرس رضوی میں خطاب کیاتوعوامی دادوتحسین کے علاوہ برسرمنبررونق افروزعلماء ومشائخ نے بڑھ کرگلے سے لگالیا۔اوردادوتحسین کے ہزاروں گلدستے دعاؤں کی شکل میں عطافرمائے۔اسی تقریرسے متاثرہوکرمنظراسلام کے سابق صدرمفتی حضرت مولانامفتی محمدفاروق رضوی صاحب علیہ الرحمہ نے تہنیتی منظوم کلام تحریرفرمایایہاں ان اشعارکانقل کرنادلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریرپرتہنیت دل

برائے نبیرۂ ریحان ملت ابن انجم خانوادۂ اعلیٰ حضرت الحاج مولانامحمدعثمان رضاخاں انجم میاں صاحب قبلہ نوری یعنی مخدوم ذی وقارمولوی محمدارسلان رضاسلمہ درعرس رضوی قبل قل شریف بتاریخ ۲۵رصفرالمظفر ۱۴۳۱ھ

ارسلان اے گلشن نوری رضاکے تازہ گل ۔۔۔ وہ تیری تقریرپرتنویرپیارے قبل قل
تیرااک اک حرف تھاتقریرکاوہ دلنواز ۔۔۔ تیرے اوپرہورہاتھاخوب فضل کارساز
جملہ جملہ تھاتری تقریرکارحمت مآب ۔۔۔ واقعی تھامصطفیٰ کے فیض سے توفیضیاب
اے مرے مخدوم زادے وہ ترازوربیاں ۔۔۔ تھاکرامت غوث وخواجہ ورضاکی بے گماں
مجمع عرس رضوی یک زباں یہ بول اٹھا ۔۔۔ درحقیقت اس کوکہتے ہیں عنایات رضا
عرس کی محفل میں تھی تعریف تیرے نام کی ۔۔۔ سب نے دیکھی تجھ پہ شفقت حجۃ الاسلام کی
یوں ہی رکھے خالق کل ہرجگہ تیرابھرم ۔۔۔ تجھ پہ دائم مفتیٔ اعظم کاہوپیارے کرم
پر اثر تیری زباں ہو روز افزوں ہو بیاں ۔۔۔ ہوہمیشہ تجھ پہ فضل شاہ جیلانی میاں
واہ وہ اصلاح وہ اندازتھاردکاترے ۔۔۔ سب نے دیکھارنگ تھایہ جدامجدکاترے
تجھ کوحاصل اے گل ریحاں ہمہ دانی رہے ۔۔۔ انجم قسمت ہمیشہ تیراتابانی رہے
عزوشان وعلم آباء کاتجھے صدقہ ملے ۔۔۔ سایۂ رحمت میں ان کے توسداپھولے پھلے

تجھ سے مسلک اعلیٰ حضرت کا رہے تابندہ باد اوربفیض اعلیٰ حضرت تو رہے پائندہ باد
تو بنے مفتی مدرس اورمقررشاندار تجھ کو رکھے دور چشم بد سے وہ پروردگار
اپنے فیضان کرم سے تجھ کو رکھیں نیک نام میرے آقایان نعمت تیرے اجدادکرام
اے رضاکے ارسلان اے شیر دشت سنیت نام سے تیرے سدا خائف ہوگرگ نجدیت
دین کے ہر باب میں حاصل ہوتجھ کووہ کمال توترقی پرہوشرمندہ رہے تجھ سے زوال
تیرےحق میں فارق رضوی کی ہے پیارے دعا مظہرریحان ملت بن کے تومہکے سدا

(بتاریخ ۲۵ رصفر المظفر ۱۴۳۱ھ بروز جمعرات فقیر قادری محمد فاروق نوری دارالافتاء منظر اسلام سوداگران بریلی شریف)

۱۶۶ویں جشن ولادت اعلیٰ حضرت کے موقع پر ۱۰رشوال المکرّم ۱۴۳۸ھ مطابق ۶رجولائی ۲۰۱۷ء کومفتی فاروق صاحب کے ہم نام بریلی شریف کے مشہور شاعر مولانا محمد فاروق رضوی صاحب نے بھی منظوم تہنیتی کلام پیش فرمایا تھا یہاں اسے بھی پیش کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین محظوظ ہونے کے ساتھ موصوف محترم کی قبولیت کا اندازہ لگاسکیں۔

یاخدا ازطفیل شہِ انبیاء
یہ سلامت رہیں ارسلان رضا
ان کوصدقہ ملے آل واصحاب کا
ہوعطامنصب نائب مصطفیٰ
ان کے ذریعہ بڑاکام ہودین کا
یہ سلامت رہیں ارسلان رضا
سیدآل رسول احمدی کی عطا
اورنوری دعاکااثراب بھی ہے
پھربڑ ی رونق گلستان رضا
یہ سلامت رہیں ارسلان رضا
اعلیٰ حضرت کی روشن کرامت ہیں یہ
قلب انجم رضاخاں کی راحت ہیں یہ

سنیوں کے لئے مژدۂ جاں فزا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

اعلیٰ حضرت کی علمی مہک ان میں ہے
حسن حامد رضا کی چمک ان میں ہے
مفتیِ اعظم ہند کا آئینہ

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

مظہر سیدی ابراہیم رضا
شان ریحان رضا عکس اختر رضا
عالم باعمل متقی پارسا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

حسن سیرت بھی ہے حسن صورت بھی
ہے
حسن اخلا ق بھی حسن کردار بھی
ہو بہو اپنے اسلاف کا آئینہ

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

سچی حاصل رضا کی وراثت بھی ہے
علم و فضل و عمل استقامت بھی ہے
حق پسند حق نما اور حق آشنا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

یہ بھی تو خاص برکاتی فیضان ہے
کوئی شیران ہے کوئی ایقان ہے
چھوٹے یارب کسی سے نہ راہ رضا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

ان کی شہرت کا ہر سمت ڈنکا بجے
ایک آواز ہوکر یہ دنیا کہے
دیکھو دیکھو یہ ہے جانشین رضا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

میرا مقصد کوئی چاپلوسی نہیں
کوئی ہرزوطمع کوئی لالچ نہیں
دل میں تھی جو لبوں پر وہ آئی دعا

یہ سلامت رہیں ارسلان رضا

بیعت وارادت : خاندان اعلیٰ حضرت کی ایک رسم ہے جو اب تک جاری ہے وہ یہ کہ عموماً اہل خاندان مشائخ مارہرہ شریف سے شرف بیعت وارادت حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ڈھائی سال کی عمر شریف میں آپ کے اہل خانہ نے آپ کو حضور احسن العلماء کی بارگاہ میں پیش کردیا حضور احسن العلماء نے اسی طرح جس طرح ان کے جدامجد حضور نوری میاں نے حضور مفتی اعظم ہند کو انگلی چسا کر داخل سلسلہ فرمایا تھا محترم موصوف کو انگلی چسا کر شرف ارادت سے مشرف فرمایا۔چند ماہ بعد پیرومرشد کا وصال ہوگیا۔جب محترم موصوف سن شعور کو پہنچے تو پیرومرشد کے آستانے پر پہنچ کر حضرت کے دست حق پرست سے دستخط کردہ شجرہ جو حضرت نے وصال سے قبل رکھ چھوڑا تھا،حاصل کیا اوراس طرح شجرہ مبارکہ کے ذریعہ پیرومرشد کے فیوض وبرکات اخذ کرتے رہے۔چند سالوں بعد ارادہ کیا کہ کسی ایسے پیر سے طلب بیعت کرلی جائے جو پابند شرع ہونے کے ساتھ برکاتی رضوی نہروں کا مجمع البحرین ہو۔تو نگاہ انتخاب جدامجد حضور تاج الشریعہ کی طرف مرکوز ہوگئی۔[جو بیک وقت حضور مفتی اعظم کے بھی خلیفہ ہیں اور حضور احسن العلما کے بھی۔] ایک محفل میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ کس سے مرید ہو؟ عرض کی حضور احسن العلماء قدس سرہ سے تو حضرت نے برجستہ فرمایا:

''تو کیا ضرورت ہے؟ ہم سب تو وہیں کے غلام ہیں۔''

خلافت واجازت: متعدد بار ایسا ہوا کہ حضور تاج الشریعہ کی بارگاہ میں موجود خواص نے موصوف کے لئے خلافت واجازت کے لئے عریضہ پیش کیا۔لیکن چوں کہ اس وقت موصوف کا تعلیمی ابتدائی دور تھا اس لئے

ہر بار حضرت نے یہ کہہ کر اقرار فرمایا کہ ابھی جلدی کیا ہے، بچے کو ابھی پڑھنے دو، ہو جائیگی اور پھر بعد میں خود اپنے کاشانہ اقدس پر بلا کر ۹۶اویں عرس رضوی کے موقع پر علمائے کرام، ومشائخ عظام، عمائدین شہر اور خصوصی حاضر باشوں کی موجودگی میں حضرت نے مسلک اعلیٰ حضرت پر کاربند رہتے ہوئے مسلک کی ترویج واشاعت اور مسلک مخالف افراد سے بالکلیہ اجتناب کرنے کی شرط کے ساتھ تمغۂ خلافت اور شرف اجازت سے موصوف کو نوازا۔

حضورتاج الشریعه سے وابستگی: حضور تاج الشریعہ سے موصوف کا نسبی رشتہ کچھ اس طرح ہے کہ موصوف کے سگے دادا حضور ریحان ملت ان کے سگے بھائی ہیں۔تو اس طرح آپ بھی سگے دادا ہوئے۔ حضرت کی ذات موصوف کے لئے محور عقیدت ومحبت ہے۔حضرت سے موصوف کے قلبی لگاؤ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف نے اپنے قلمی سفر کا باضابطہ آغاز حضرت کی کتاب مستطاب 'الفرده فی شرح البرده' کی زیر نظر اردو شرح کے ذریعہ کیا ہے۔حضرت سے قرب کا عالم یہ ہے کہ جب کبھی خود بارگاہ میں حاضری نہیں ہو پاتی تو حضرت کبھی خود یاد فرمالیا کرتے ہیں اور بارہا فرمایا کہ آتے رہا کرو۔اس جملہ سے حضرت کی شفقت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

الغرض محترم موصوف کی شخصیت مختلف زاویوں سے قابل تعریف اور لائق تقلید ہے۔اس وقت محترم موصوف عروج کی اس منزل پر فائز ہیں کہ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ چانداس وقت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ضوفشانی کو تیار ہے۔زیر نظر کتاب 'الورده فی شرح الفرده' جو حضور تاج الشریعہ کی کتاب مستطاب کی اردو شرح ہے ۔وقت کی قلت دامن گیر ہونے کے سبب کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ تو نہ کر سکا البتہ جہاں جہاں نظر گئی پڑھ کر محظوظ ہوا۔اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یقیناً یہ سب حضور تاج الشریعہ کا ہی فیضان ہے۔اللہ پاک موصوف کو عروج وارتقا کی اعلیٰ منزلوں پر فائز فرمائے اور زوال کی نظر بد سے محفوظ فرمائے۔

آمین بجاه النبی الامین الکریم علیه الصلاة والتسلیم۔

نیازمند:محمدذوالفقارخان نعیمی ککرالوی

نوری دارالافتاء مدینه مسجدمحله علی خاں‌کاشی پور

مورخه ۲۳/ذی الحجه ۱۴۳۸ ھ

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثر گرامی

جانشین شعیب الاولیاء مفکر اسلام پیر طریقت حضرت علامہ **غلام عبد القادر علوی** صاحب قبلہ مدظلہ

سجادہ نشین خانقاہ فیض الرسول وناظم اعلیٰ دار العلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر

عالمِ اسلام کی عبقری شخصیت عاشقِ رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کا دنیائے سنّیت پہ جو احسانِ عظیم ہے اسے فراموش کیا ہی نہیں جا سکتا بلکہ عاشقانِ رسول کی گردنیں ہمیشہ ان کی بارگاہِ عظمت میں خم رہیں گی، اپنے علمی کارناموں اور کم وبیش ایک ہزار سے زائد تصنیفات اور کتب ورسائل سے عشقِ رسالت کی شمع اہل ایمان کے قلوب میں فروزاں کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ پوری حیاتِ مبارکہ گلشنِ رسالت کی آبیاری میں صَرف کر دی جسے اپنے اپنے دور میں آپ کے فرزندانِ گرامی حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا خان قبلہ علیہ الرحمہ اور میرے مرشدِ اجازت ورہنما مفتیٔ اعظم ہند حضرت علامہ مصطفیٰ رضا خان قبلہ علیہ الرحمہ اور مفسرِ اعظم حضرت محمد ابراہیم رضا خان علیہ الرحمہ اور خانوادۂ رضا کے دیگر حضرات اپنی دعوتی، تبلیغی و تصنیفی خدمات کے ذریعے بخوبی نبھاتے رہے اور موجودہ دور میں خدماتِ رضا، پیغامِ رضا، تحریکِ رضا کی باوقار علامت بن کر آبروئے مرکز اہلسنت تاج الشریعہ علامہ مفتی اختر رضا خان ازہری مدظلہ قاضی القضاۃ فی الہند بریلی شریف پوری دنیا میں عشق رسالت کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ شہرۂ آفاق مقبولِ بارگاہِ رسول قصیدۂ بردہ کی عربی شرح "الفردہ فی شرح قصیدة البردة" موصوفِ گرامی کی باوقار تحقیقی تصنیف ہے جس کی برکتوں کو اردوداں طبقے میں عام کرنے کیلئے اسی خانوادہ کے چشم وچراغ فاضلِ گرامی نبیرۂ ریحان ملت وخلیفہ تاج الشریعہ مولانا محمد ارسلان رضا خان قادری رضوی فیضی نے بیڑا اٹھایا جو فرزند ہیں میرے صدیق محترم صاحبزادۂ گرامی ریحانِ ملت حضرت مولانا عثمان رضا خان انجم میاں کے جنہوں نے تقریباً آٹھ سال تک براؤں شریف میں برصغیر اہلسنت وجماعت کی

قابلِ قدر درسگاہ یادگارِ شعیب الاولیاء عاشقِ اعلیٰ حضرت، حضور شعیب الاولیاء حضرت سیدنا شاہ محمد یار علی علیہ الرحمہ'' دارالعلوم فیض الرسول''میں پورے انہاک کے ساتھ تعلیم کی تکمیل کی اور زیرِ نظر تصنیف " الوردۃ فی شرح الفردۃ" براؤں شریف کی زمانۂ طالب علمی کے دورانیہ کی ان کی کامیاب کاوش ہے۔جس کی رسمِ اجراء امسال براؤں شریف میں عرس یار علوی کے موقع پہ ہونے والے جشنِ دستارِ فضیلت میں موصوف کی دستار بندی کے موقع پہ پورے اعزاز کے ساتھ ادا کی جائے گی۔صاحبزادۂ گرامی قدر کی علمی و تصنیفی جدوجہد کو دیکھتے ہوئے یقین کی حد تک امید ہے کہ موصوف اسلاف کی روش پر چلتے ہوئے اپنے علمی گھرانے اور مادر علمی کا خوب خوب نام روشن کریں گے۔ دعا ہے کہ پروردگار ان کی اس سعیٔ جمیل کو قبولیتِ عامہ سے نوازے اور عوام اہلسنت کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

غلام عبدالقادر علوی

سجادہ نشین خانقاہ فیض الرسول، ناظم اعلیٰ دارالعلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر

۲۲/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ/۱۴/ستمبر ۲۰۱۷ء

تقریظ

از: مفتیِ فیض الرسول حضرت مفتی محمد مستقیم صاحب قبلہ مصطفوی مؤقر استاذ دارالعلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی حبیبه الکریم

قصیدہ بردہ شریف جوعربی زبان مین مدح نبوی ﷺ پر مشتمل، علوم وفنون کا جامع، عربی ادب کا شاہکار اور زبان و بیان کے لحاظ سے انتہائی فصیح و بلیغ قصیدہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ قصیدہ بارگاہِ رسالت میں مقبول اور اتنا مقبول ہے کہ اس کے اشعار دربارِ خداوندی میں مستجاب اور روحانی فوائد کا خزینہ ہیں۔ اس قصیدہ مبارکہ کی اتنی ساری خصوصیات کی وجہ سے اکابر علماء وائمہ نے اس کی عربی زبان میں شرح فرمائی ہے جن میں سرِ فہرست حضرت ملاعلی قاری، علامہ عمر بن آفندی خرپوتی، علامہ ابراہیم بیجوری، شیخ زادہ شیخ محی الدین محمد بن مصطفےٰ اور امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ علماء ہیں لیکن ان میں سے اکثر شروح میں یا تو محض معنوی تشریح ہے یا محض فنی یا پھر محض لفظی تشریح ہے اور پھر یہ کہ یہ شروح کئی کئی سو سال پہلے کی ہیں جو شارح کے اپنے زمانے کے حالات ومقتضیات کے مطابق ہیں لہذا اس زمانے میں ایک ایسی عربی شرح کی ضرورت تھی جو اس زمانے اور اس دور کے حالات کے مطابق ہو جس میں اشعار کی شرح کے ساتھ ساتھ عقائد ومعمولات اہلسنت کا کامل بیان اور فرقہائے باطلہ کی تردید بھی ہو نیز علوم متداولہ کی جامع ہونے کے ساتھ سابقہ تمام شروح کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے بھی ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے شمار فضل وانعام ہو سرخیل خانوادۂ اعلیٰ حضرت وارثِ علوم امام احمد رضا جانشین حضور مفتیٔ اعظم حضور تاج الشریعہ پر کہ آپ نے اس ضرورت کو محسوس فرماتے ہوئے قصیدہ بردہ شریف کی ایک ایسی شرح فرمائی جو یقیناً علماء و طلبہ کے لئے یکساں مفید ہے جس میں علمی وفنی گفتگو بھی ہے اور علوم متداولہ مثلاً نحو وصرف، معانی وبیان ادب و منطق، علم کلام وعلم حدیث اور علم فقہ واصول فقہ وغیرہ کی اصطلاحات اور انکی تعریفات بھی ہیں اور اکابر علماء اہلسنت کی کتابوں سے عقائد اہل سنت کا اثبات بھی۔ خصوصاً جابجا اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی تصنیفات سے معمولات

اہلسنت کی وضاحت بھی ہے نیز دیگر شارحین کے تسامحات پر تنبیہ بھی۔ گویا حضور تاج الشریعہ کی یہ شرح یعنی" الفرده فی شرح البرده" سابقہ تمام شروح کی جامع اور قاری کی تشنگی کو دور کرنے والی ہے۔

قصیدہ بردہ شریف میں کل دس فصلیں ہیں۔ پہلی فصل غزلیات میں ہے۔ اس فصل میں حضرت تاج الشریعہ نے علم نحو وصرف اور علم معانی و بیان کے اعتبار سے شرح فرمائی ہے۔ دوسری فصل نفس امارہ کے بیان میں ہے۔ اس میں حضرت نے مذکورہ علوم وفنون کے ساتھ ساتھ علم تصوف و روحانیت سے بھی کلام کیا ہے۔ تیسری فصل مدح نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مشتمل ہے اس میں حضور والا نے اپنے جد کریم سیدی اعلیٰ حضرت اور دیگر اکابر علمائے اہل سنت کی کتب سے عشقِ رسالت کا درس دینے کے ساتھ عقائد و معمولات اہلسنت کا واضح بیان فرمایا ہے اور احادیث مبارکہ سے حضور علیہ السلام کے فضائل وشمائل بیان فرمائے ہیں۔ چوتھی فصل میلا د النبی ﷺ کے بیان میں ہے۔ اس میں میلاد مصطفےٰ ﷺ منانے کے مشروعیت پہ بحث کی ہے اور دلائل و براہین سے ثابت فرمایا ہے کہ میلاد مصطفےٰ ﷺ منانا ایسا نیک عمل ہے جسے مسلمانوں نے اپنے آباء واجداد سے ورثے میں پایا ہے۔ پانچویں فصل حضور اکرم ﷺ کے معجزات کے بیان میں ہے۔ اس فصل کی شرح میں کثرت کے ساتھ آیات و احادیث نقل کی ہیں۔ چھٹی فصل شرفِ قرآن کے بیان میں ہے۔ اس کے اشعار کی شرح میں علم عقائد کی مشہور ومعرکۃ الآرا بحث کلام باری کے تعلق سے انتہائی فاضلانہ اور پر مغز بحث کی ہے اور کلام نفس وکلام لفظی کی بحث میں اعلیٰ حضرت کے رسالے" انوار المنان فی توحید القرآن" سے نقول پیش کئے ہیں اور شرفِ قرآن کے متعلق بحث امام اہلسنت کی تصنیف لطیف "انبیاء الحی بان کلامه المصون تبیان لکل شئی" سے پیش فرمائی ہے۔ قس علی هذا البواقی۔

الغرض الفردہ فی شرح البردہ قصیدہ بردہ شریف کی ایک لاجواب شرح ہے جو پڑھی پڑھائی جانے کے لائق ہے لیکن چونکہ یہ کتاب عربی زبان میں ہونے کے ساتھ جا بجا انتہائی دقیق اور علمی ابحاث پر بھی مشتمل ہے اس لئے ضروری تھا کہ کوئی شخص اردو زبان میں اس کا ترجمہ وتشریح کر دے تا کہ اردو داں طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے نیز جن مدارس

میں یہ داخل نصاب ہے اس کے طلبہ کے لئے بھی آسانی فراہم ہو۔ چنانچہ خانوادۂ رضویہ ہی کے چشم و چراغ نبیرۂ اعلیٰ حضرت گرامی قدر مولانا محمد ارسلان رضا خاں صاحب نے یہ کام بھی پورا کردیا۔ گویا عشقِ رسالت کی شرح و ترجمہ دونوں اسی خاندان کے حصے میں آیا اور کیوں نہ ہو کہ عشق رسالت کا جام پلایا کس نے ہے۔

"الوردہ فی شرح الفردہ" جو اس وقت قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے یہ موصوف کے زمانۂ طالب علمی ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا آغاز انہوں نے ہدایہ، حسامی اور مدارک وغیرہ کتابوں کا درس لینے کے وقت کردیا تھا اور اختتام، تنقیح توضیح، بخاری شریف وغیرہ جماعت ثامنہ (دورۂ حدیث) کی کتابوں کا درس لیتے وقت کیا۔ اس سے واضح ہوگیا کہ "الوردہ فی شرح الفردہ" صاحبزادہ موصوف کے زمانۂ طالب علمی کی ایک تاریخی یادگار ہے لیکن مسرت آمیز حیرت کی بات تو یہ ہے کہ زمانۂ طالب علمی کی کاوش ہونے کے باوجود ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک طالب علم کی سعی کا ثمرہ ہے۔ اللھم زد فزد

بحمدہٖ تعالیٰ میں نے کئی جگہ سے کتاب دیکھی، اصل کتاب سے ملایا اور عربی اشعار کے ترجمہ اور اسی کی تشریح پہ نظر غائر ڈالی اور کافی غور و فکر کرنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں کہ صاحبزادہ موصوف کو اپنے آباء واجداد اور اسلاف کی ذہانت و فطانت اور علمی بصیرت سے وافر حصہ ملا ہے۔ یہ ذہانت و فطانت اور اعلیٰ علمی صلاحیت کا بیّن ثبوت ہی تو ہے کہ ایک اہم کتاب جو علمی و فنی مضامین پر مشتمل ہے اردو زبان میں اس کا ایسا سلیس ترجمہ اور ایسی عمدہ تشریح کی ہے کہ "وردہ" ترجمہ و تشریح ہونے کے باوجود ایک مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و روانی بتاتی ہے کہ یہ کسی کہنہ مشق کی مستقل تصنیف ہے اور جب اس کو اصل کتاب سے ملایا جاتا ہے تو ناظم اور اس کے عربی شارح کا مافی الضمیر اچھی طرح ادا ہوتا نظر آتا ہے۔ مثالوں کا ذکر باعثِ طوالت ہوگا نیز علالت وقلت فرصت مانع ہے اس لئے اسے ترک کرتا ہوں۔

اخیر میں دعا گو ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے میں صاحبزادہ موصوف زید فضلہ کے علم، عمل اور عمر میں بے حساب برکتیں عطا فرمائے اور ان کے اجداد و اسلاف خصوصا سرکار اعلیٰ حضرت رضی المولیٰ تعالیٰ کے علوم و خدمات کا سچا وارث و جانشین بنائے۔ فقط

گدائے آستانۂ رضویہ محمد مستقیم مصطفوی
خادم دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۷/ ستمبر ۲۰۱۷ء

تقریظ

از: مفتی نظام الدین احمد نوری خلیفۂ حضور تاج الشریعہ واستاذ مؤقر دارالعلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف

الوردہ اوراس کے مصنف

اسلامیان عالم کے سینوں میں عشق رسالت کی جوت جگانے والے کچھ قابل قدر افراد ہر دور میں گزرے ہیں، جنہیں دولت محبت رسالت نے نہایت قابل قدر واحترام بنادیا ہے اور آج تک عشق رسالت کی درسگاہوں میں جنہیں باضابطہ شامل نصاب رکھا گیا ہے اور جن کی شخصیات کو باضابطہ پڑھے بغیر درس عشق رسالت کی تکمیل نہیں ہوسکتی انہیں مقدس شخصیات میں ایک نہایت مقدس نام حضرت امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمہ (صاحب قصیدۂ بردہ) کا آتا ہے۔جن کا مقدس قصیدۂ بردہ ان کے عشق رسالت کی علامت بن کے رہ گیا۔عربی زبان میں اس قصیدے کی مثال ملنی مشکل ہے۔اور چودہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں جس شخصیت کی حیات عشق رسالت سے تعبیر ہوکر رہ گئی تھی وہ شخصیت بھی آج اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان کے نام سے معروف ومشہور ہے۔اردوزبان میں ان کا مجموعۂ کلام نعت ومنقبت پر مشتمل بنام حدائق بخشش پوری دنیائے اردو میں سکۂ رائج الوقت بن کر جاری وساری ہے، جس طرح دنیائے عرب کی محافل مولد وقیام میں قصیدۂ بردہ کی تلاوت نہایت محبت سے کی جاتی ہے تقریباً اسی طرح یہاں برِصغیر ہندوپاک میں اہلسنت کی کوئی بھی محفل حدائق بخشش کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

قصیدۂ بردہ کی شرح عربی زبان میں لکھنے کی سعادت حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خان ازہری صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے حصہ میں آئی۔اس کارِخیر سے جہاں حضور تاج الشریعہ کی قدآور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور حضرت امام بوصیری علیہما الرحمہ کے مابین اس نکتۂ اشتراک کی بھی وضاحت ہوتی ہے جسے جذبۂ عشق رسالت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور دولتِ عشقِ رسالت پناہی نے ان دونوں شخصیتوں کو عظمت وشہرت کے اس آسمان پر پہونچادیا جن کو دیکھنے کے لئے صرف ٹوپی ہی نہیں بلکہ دل کو بھی سنبھالنے کی ضرورت ہے۔

الفردہ شرح قصیدۂ بردہ (مصنفہ حضور تاج الشریعہ) یہ قصیدۂ بردہ (مصنفہ امام بوصیری) کی نہایت وقیع شرح ہے اور یہ شرح اپنے محامد ومحاسن کی بنا پر قصیدۂ بردہ کی دیگر شروح میں نہ یہ کہ صرف ممتاز بلکہ اسے نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔عربی زبان میں ہونے کے ناطے ہندوپاک میں ہر کسی بالخصوص اردوداں طبقہ تک اس کا فیضان پہنچ پانا قدرے دشوار تھا اس لئے نہایت سخت ضرورت تھی کہ اردوزبان میں اس کا ترجمہ اور مناسب تشریح کردی جائے۔

یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ الفردہ کا شاندار اور سلیس اردو ترجمہ نبیرۂ ریحان ملت خلیفۂ حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ محمد ارسلان رضا خان (فاضل فیض الرسول) زید مجدہٗ نے فرمایا ہے۔اسے حسن اتفاق سے ہی تعبیر کرنا مناسب ہوگا کہ حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ کے قصیدۂ بردہ کی شرح عربی زبان میں الفردہ (تاج الشریعہ) اور پھر اس کا اردو ترجمہ اور تشریح الوردہ (علامہ ارسلان خان) ان دونوں کاموں کی سعادت خانوادۂ اعلیٰ حضرت کو میسر آئی ،عشقِ رسالت کی جس شاہراہ پر حضرت امام بوصیری چلے اسی پر خانوادۂ اعلیٰ حضرت کے مقدس افراد بھی رواں دواں ہیں۔

صاحب الوردہ

حضرت علامہ محمد ارسلان رضا خان (فاضل فیض الرسول) جو نبیرۂ ریحان ملت بھی ہیں اور نبیرۂ اعلیٰ حضرت بھی۔ان کی مکمل تعلیم ملک کی مشہور مرکزی درسگاہ دار العلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی میں ہوئی،ان کی علمی صلاحیت کا اندازہ ان کی اس ضخیم اردو ترجمہ وتشریح سے لگایا جاسکتا ہے،مزے کی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے اتنا بڑا کارنامہ فیض الرسول کے دوران قیام یعنی دور طالب علمی میں انجام دیا۔نبیرۂ اعلیٰ حضرت کا مستقبل ان شاء اللہ نہایت ہی تابناک ہوگا ، ارباب اہلسنت کو موصوف سے مسلک اعلیٰ حضرت کے اشاعت وخدمت کی بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہیں۔

بالائے سرش زہوش مندی ☆ می تافت ستارۂ بلندی

حضور تاج الشریعہ کی دوراندیش نگاہوں نے مستقبل میں شہزادۂ کو کامیاب دیکھتے ہوئے انہیں سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ نوریہ کی اجازت وخلافت سے نوازا۔

زیر نظر کتاب ''الوردہ'' کو آپ بغور پڑھیں اور پھر اندازہ لگائیں کہ خانوادۂ اعلیٰ حضرت میں آج بھی سکۂ عشق رسالت کس شان سے کھنک رہا ہے۔ براؤں شریف میں رہ کر انھوں نے جس انہماک سے حصول علم دین کیا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔

خانقاہی شہزادوں کی عام روش سے ہٹ کر آباء واجداد پر اترانے کے بجائے خود نہایت محنت اور لگن سے علم دین مصطفوی کا حصول کیا، دوران تعلیم ان کی تمامتر توجہ تعلیم ہی پر مرکوز رہی۔الغرض شہزادگی کا غرور ان کے تعلیم وتعلم کی راہ میں حارج نہ ہوسکا ، بسا اوقات تعلیمی انہماک کی بنا پر کھانا تو بھول گئے مگر اپنے مشن سے ہر لمحہ متعلق رہے حالانکہ آباءواجداد بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ان پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔آپ کا نسبی سلسلۃ الذہب یوں ہے۔

مولانا محمد ارسلان رضا خان بن مولانا عثمان رضا خان بن ریحان ملت علامہ ریحان رضا خان بن مفسر قرآن علامہ ابراہیم رضا خان بن حجۃ السلام علامہ حامد رضا خان بن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بن علامہ نقی علی خان بن علامہ رضا علی خان علیہم الرحمۃ والرضوان

اب آپ غور کریں کہ جن کے آباء واجداد میں حضور ریحان ملت جیسا مدبر اور ان کے بھائی حضور تاج الشریعہ جیسا قائد وفقیہ مفسر قرآن جیسا عبقری حجۃ الاسلام جیسا عالم ربانی، حضور مفتیٔ اعظم ہند جیسا مظہر غوث اعظم ، ومفتیٔ اعظم عالم ،اعلیٰ حضرت جیسا علم وفضل کا کوہ گراں جسے لوگوں نے معجزۃ من معجزات سید المرسلین کہا ہو اور حضرت علامہ نقی علی خان جیسا خاتم المحققین اور حضرت علامہ رضا علی خاں جیسا عالم ربانی وعارف باللہ ہوں۔تو آپ خود سوچیں کہ ان اساطین علم وفضل اور ولایت کے درخشندہ آفتابوں اور ماہتابوں پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔مگر اس راستے سے حاصل ہونے والی کوئی بھی خوبی محض اضافی کہی جاسکتی ہے اور محض اضافی خوبیوں سے کوئی ہر دل عزیز نہیں ہوتا جب تک خود اس کے اندر ذاتی محاسن اور اوصاف حمیدہ نہ ہوں ،اسی نکتہ ونزاکت کو صاحب الوردہ نے محسوس کیا اور اپنے اندر ذاتی خوبیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں اور دن رات اسی میں منہمک رہے۔آج اسی محنت ومشقت نے نبیرۂ اعلیٰ حضرت کے لئے شخص سے شخصیت بننے کی راہیں ہموار کردیں۔غالبًا ذاتی خوبیوں کے حصول کے لئے ان کی یہ سوچ رہی کہ

لیس الفتیٰ من یقول کان ابی ☆ ان الفتیٰ من یقول ہا انا ذا

چنانچہ اب حضرت مولانا ارسلان رضا خان اضافی اور ذاتی دونوں خوبیوں سے آراستہ ہوکر ایک نہایت کامیاب شخص ہی نہیں بلکہ شخصیت بن کر ابھر رہے ہیں۔مولا تعالیٰ اس نوجوان رضوی شہزادے کا اقبال بلند فرمائے اور انہیں نظر حاسدین سے محفوظ فرما کر ان کے ذریعہ اہلسنت والجماعت کو بیش از بیش فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی اس علمی وروحانی تصنیف کو قبولیت عامہ عطا فرمائے اور موصوف کو اپنے آباء اجداد کی روش پر قائم رہ کر صاحب تصانیف کثیرہ نافعہ بنائے۔آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ علیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ واکرم التسلیم

نظام الدین احمد نوری

خادم دار العلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف۔سدھارتھ نگر

۲۱؍ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

تقریظ جمیل

از: شہزادہ وجانشین بدرملت حضرت علامہ ومولانا محمد رابع نورانی صاحب قبلہ بدری
استاذ وشیخ الادب دارالعلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وہ لمحہ کس قدر نقطۂ تحول (Turning.Point) تھا، خانوادۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی ــ **رحمہ اللہ تعالی** ـ کے رکن رکین اور فرد فرید ریحان ملت حضرت ریحان رضا صاحب قبلہ ــ **رحمہ اللہ تعالی** ـ کے نبیرۂ گرامی وقار، شہزادۂ خانوادۂ اعلیٰ حضرت ووارث علوم اعلیٰ حضرت مولانا محمد ارسلان رضا خان صاحب کی زندگی میں جب انھوں نے دینی تعلیم کے حصول کے لئے بین الاقوامی شہرت کی حامل عظیم ترین دینی درسگاہ دارالعلوم اہل سنت فیض الرسول براؤں شریف کے لئے رخت سفر باندھا، چنانچہ براؤں شریف آئے اور شہزادۂ شعیب الاولیاء مفکر اسلام نازش لوح وقلم، فخر فیض الرسول حضرت علامہ الحاج غلام عبدالقادر علوی سجادہ نشین خانقاہ فیض الرسول وناظم اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کی سرپرستی میں پورے انہماک کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگے۔

مدارس کی بھیڑ میں دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ عوام کی تو بات ہی نہیں ،خواص کا بھی ذکر چھوڑیئے، اخص الخصصین کا وہ طبقہ جن پر سواد اعظم کو اعتبار واعتماد ہے وہ اپنے جگر گوشوں کی تعلیم وتربیت کیلئے اس کی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اس کا انتخاب کرتے ہیں یہ سب اس مرد حق آگاہ کے فیض بے کراں کا اثر ہے جنھیں شیخ المشائخ سرکار شعیب الاولیاء **رضی المولی تعالی عنہ** کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہر حال وہ دارالعلوم میں آئے اور تعلیم وتعلم میں مشغول ہوئے ،تقریبا آٹھ سال انھوں نے دارالعلوم میں حضور شیخ المشائخ سرکار شعیب الاولیاء **رضی المولی تعالی عنہ** کے زیر سایہ گزارا، ان کا ذہنی وعلمی نشونما

دارالعلوم کے پاکیزہ علمی وثقافی ماحول میں ہوا تھا، دارالعلوم کے درودیوار گواہ ہیں کہ انہوں نے تعلیم وتعلم کے سوا کوئی مشغلہ نہ رکھا، ایک ایک لمحہ کوآئندہ حیات کے لئے قیمتی سمجھا، ہمیشہ غیر علمی کاموں سے دور رہے، جو کتاب پڑھی، بڑی دلجمعی کے ساتھ پڑھی اورازاول تا آخر پڑھنے کی کوشش کی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ استاذ محترم نے قدر معتد بہ پڑھا کر کتب بند کردی تو انھوں نے اپنی استعداد سے اس کی تکمیل کی، جو پڑھا گہرائی، گیرائی اور تحقیق سے پڑھا، اس طرح پڑھا کہ مضمون درس کوہضم وجذب کیا حتی کہ سونے کی حالت میں بھی اس کے متعلق سوال کرنے پرفورا صحیح جواب دینے کی پوزیشن میں ہوگئے، جو پڑھا سرسری طور سے نہیں پڑھا لیکن گیرائی اور گہرائی سے پڑھا، **منطوق ومفہوم ،مفہوم الموافقة وفحوی الخطاب اورمفهوم المخالفة ودليل الخطاب** ہراعتبار سے پڑھا صرف سطح آب پرنہیں تیرے بلکہ سمندرعلم کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کرعلم وحکمت کی بیش بہا موتیوں سے بہرہ ورہوئے، اپنے اندرتدبر، ژرف نگاہی، بحث ومباحثہ تحقیق وتدقیق کا جوہر اساتذۂ کرام کی محنتوں سے پیدا کیا، اور جہاں تک علمی مصطلحات اورقواعدفن کی بات ہے ان کی انھوں نے نہ یہ کہ صرف مشق وممارست کی بلکہ ان کواس طرح جذب کیا کہ ان سے ان کی جگہوں میں فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرلی ۔

علمی مسائل میں گہری بصیرت وحفظ واستحضار اور گہرے مطالعہ کا ثبوت فراہم کیا، علم ایسا قوی، مضبوط اور مستحکم کہ ہمیشہ مستحضر تاکہ وقت ضرورت کام آئے ''علم درسینہ نہ درسفینہ'' کے مقولہ پرعمل کیا، کتابوں کو گہرائی سے سمجھنے کی قوت، بحث ومباحثہ، تحقیق وتدقیق، استخراج واستنباط کی صلاحیتوں کے ساتھ خوداعتمادی کی روح سے سرشار ہوکرآگے بڑھے۔ تمام مروجہ علوم کی اصطلاحات، قواعدومسائل بہت کچھ مستحضر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے اندرایسی قوت محسوس کرتے ہیں کہ کسی فن کی کوئی کتاب برجستہ پڑھادیں اوراس سے بڑھ کربعض فن کا تو حال یہ ہے کہ بغیرکسی کتاب کی مدد کے اسے پڑھا سکتے ہیں۔ علوم متداولہ پرگہری نظر رکھتے ہیں اپنے آباء واجداد کے سچے وارث وامین **خير خلف لخير سلف** سلف پرفخرنہیں سلف کا کام آگے بڑھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، برسوں کا سفرمہینوں میں طے کیا۔

ان کا ذہنی وادبی ارتقاء بھی عمر ومطالعہ کے ساتھ تیزی کے ساتھ جاری رہا، دوران تعلیم مقالات ومضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کردیا، ان کے قلم کی روانی اوراس سے بڑھ کران کے قلم کی طاقت اور جوش تحریر بڑھتا گیا، ان کی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی، عقل وعشق کی لطیف آمیزش، اورآمدوروانی ایسی پیدا ہوگئی جوآتش نوا اورشعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اوران کی تقریروں کا خلاصہ ہے، وہ بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھ لیتے ہیں، ان کے مضامین وتحریر میں آمد ہی آمد رہا کرتی ہے، طبیعت جوش سے بھری ہوئی اورقلم کی کمان چڑھی رہتی ہے، ان کا اشہب قلم ساز ویراق سے آراستہ رہا کرتا ہے۔ ان کا قلم تو لگتا ہے کہ ایک آبشار ہے جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلتے ہیں جن میں آبشار کا شوراورطوفان کا زورہوتا ہے، اورکیوں ایسانہ ہو جب کہ اس کے اندران کا سوز دروں اورخون جگر بھی شامل رہا کرتا ہے اورواقعہ بھی یہی ہے کہ۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہیں سودائے خام خون جگر کے بغیر
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
اوج فن کی ہوتی ہے خون جگر سے نمود

آخری مصرع اصلا یوں ہے:

معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

لیکن میں نے معجزہ کا لفظ استعمال کرنا خواہ کسی تاویل سے ہومناسب نہیں سمجھا۔

تقریر کا حال یہ ہے کہ شعلہ نوائی کے ساتھ مبرہن مدلل مربوط ومرتب طبی نسخوں کے اجزاء کی طرح ایک ایک لفظ ناپ تول کراستعمال کرتے ہیں، جس کا نتیجہ خوشگوارفکری انقلاب کی صورت میں مرتب ہوتا ہے اور بیک وقت قلب ونظر دونوں کواپیل کرتا ہے۔ یہ سب ان کے آباء واجداد کرام امام اہل سنت حضور سیدی سرکاراعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضور حجۃ الاسلام، حضور مفتی اعظم، حضور مفسراعظم اورحضور ریحان ملت **رضی اللہ تعالی عنہم** سے نسبی تعلق کی برکت واثر اوراس کا فیض وکرم ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے فیض وکرم کا بادل ان پرخوب ٹوٹ

ٹوٹ کر برس رہا ہے اور اس کا ظہور ان کے دور طالب علمی ہی سے ہو گیا تھا، اسی دور میں ان کے آباء واجداد امام اہل سنت حضور سیدی سرکار اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضور حجۃ الاسلام، حضور مفتی اعظم، حضور مفسر اعظم اور حضور ریحان ملت **رضی اللہ تعالی عنہم** کی عالمانہ وجاہت اور فاضلانہ تمکنت ان کے وجود پر منعکس ہو گئی تھی۔
ان کے آباء واجداد کرام اور ان کی خاندانی عظمت کا کیا کہنا بس یہ عربی شعر پڑھ لینے کو دل کہہ دیتا ہے کہ:

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم

اذا جمعتنا یاجریر المجامع

یہ خاندان ہر دور میں باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے، اسی خاندان میں امام اہل سنت حضور سیدی سرکار اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی جیسی تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت پیدا ہوئی، جو عشق رسالت ﷺ اور ناموس رسول ﷺ کی حفاظت کی رمز وعلامت (Symbol) کے طور پر پورے عالم میں متعارف ہیں، ترجمۂ قرآن کریم ہو یا تشریح حدیث شریف، فقہ کے غموض ہو یا نعتیہ شاعری ہر جگہ عشق رسول ﷺ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے، جنھیں عشق رسول میں وارفتگی کے صلہ میں نہ صرف یہ کہ برصغیر کی مسلم امت نے عشق ومحبت کی نظروں سے دیکھا بلکہ ان کی وجہ سے پورے عالم اسلام کی نگاہیں اس خاندان اور اس کے مرکز ومسکن کی طرف محبت وعقیدت کے ساتھ اٹھ گئیں۔ لکھنے اور پڑھنے کا تو بڑا ذوق رکھتے ہی ہیں ایک دن اپنی خواہش ظاہر کی کہ حضرت تاج الشریعہ جنھیں **رجل القرن** یعنی: صدی کی شخصیت (Man Of The Century) کہا جا سکتا ہے نے قصیدہ بردہ شریف کی انتہائی علمی وفنی شرح عربی زبان میں فرمائی ہے اور وہ بعض مدارس اسلامیہ میں زیر نصاب بھی ہیں خصوصاً جامعۃ الرضا میں لیکن حضرت کی یہ تصنیف لطیف اہم اور دقیق نکات پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی ہے جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ اور نیم خواں حضرات اس سے کما حقہ استفادہ نہیں کر پاتے ہیں لہٰذا اگر اس کتاب کا اردو میں ترجمہ اور تشریح کر دی جائے تو اردو طبقہ میں بھی یہ کتاب مقبول ہو جائے نیز جن طلبہ کے زیر درس یہ کتاب ہو ان کے لئے یہ شرح میسر آ جائے، جب میں نے ان کی اس نیک خواہش اور آرزو کو سنا تو مجھے انتہائی مسرت ہوئی اور میں نے کہا کہ آپ فوراً اس کا کام شروع کر دیں کہ

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

چنانچہ انہوں نے براؤں شریف میں اپنے ایام تعلیم ہی میں اس کام کا آغاز کر دیا اور درسی مشغولیت کے ساتھ اس کتاب کی ایک ضخیم شرح تقریباً ایک ، دیڑھ سال میں مکمل کردی اور ماہنامہ فیض الرسول میں دو دو تین تین اشعار کی شرح شائع بھی ہوتی رہی جسے براؤں شریف کے علماء، طلبہ اور باذوق قارئین نے بے حد پسند کیا اور اب ان کی دستار بندی کے حسین موقع پر اس کی ایک جلد شائع ہو رہی ہے۔

میں نے الحمدللہ حضرت ارسلان میاں کی اس کتاب (**الوردة فی شرح الفردة**) کا باریک بینی کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، عموماً تقریظات بغیر مطالعہ کئے یا ایک آدھ صفحہ دیکھ کر سپرد قلم کر دی جاتی ہیں لیکن اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں: کہ ان کی ترجمہ نگاری میں ان کے جد کریم حضور حجۃ الاسلام اور حضرت تاج الشریعہ کی ترجمہ نگاری کی جھلک نظر آ رہی ہے، ترجمہ اس طرح ہے کہ ترجمہ اور ترجمانی اور تشریح ان سب کا حق ایک ساتھ ادا ہو گیا، اشعار کا ترجمہ اتنے حسین وجمیل اور اتنے نفیس انداز میں کیا ہے کہ اشعار کے بنیادی مفاہیم شرح کے بغیر دیکھے ہی سمجھ میں آ جاتے ہیں، ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ روح و معنی سب ادا ہے۔ یہ ترجمہ کسی طرح اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ یہ ایک نوعمر مترجم کے قلم سے نکلا ہے، کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں ترجمہ کی بو بھی نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتاب حضرت تاج الشریعۃ **حفظه الله تعالی** کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو زبان میں نکلی ہوئی ہے۔ کتاب میں متانت تحریر، توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت وتاثیر بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ذہنی بلوغ اور قلم کی پختگی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ذیل میں کچھ مثالیں پیش ہیں: امام بوصیری رضی اللہ تعالی عنہ کے اشعار پڑھیں پھر ان کا ترجمہ دیکھیں:

(۱) آیات حق من الرحمٰن محدثة　　　قديمة صفة الموصوف بالقدم

(ترجمہ: قرآن کی آیتیں رحمان کی جانب سے (باعتبار نزول، کتابت، تلفظ) حادث ہیں (مگر باعتبار معنیٰ اور کلام نفسی) قدیم ہیں (اس لئے کہ) وہ صفت ہے موصوف بالقدم کی۔ (اور قدیم کی صفت بھی قدیم ہوتی ہے)

(۲) كلهم من رسول الله ملتمس ☆ غرفاً من البحر اورشفا من الديم

یا رسول اللہ ﷺ آپ کے عوارف ومعارف کے سمندر اور کرم وسخا کی مسلسل بارش سے تمام انبیاء کرام ایک چلو یا

ایک گھونٹ کے خواہاں ہیں۔

(۳)منزه عن شريك فى محاسنه ☆ فجوهرالحسن فيه غير منقسم

حضور علیہ السلام اپنے اوصاف وخوبیوں میں شرکت سے پاک وبالاتر ہیں (یعنی حضور کے محاسن میں حضور کا کوئی شریک نہیں) پس آپ ﷺ میں جو ہر حسن ایسا ہے کہ کبھی تقسیم ہونے والا نہیں۔

(۳)لو نا سبت قدره آياته عظماً☆احيى اسمه حين يدعى دارس الرمم

اگر حضور کے آیات ومعجزات،عظمت وبزرگی میں حضور کے قدر ومنزلت کے برابر ہوتے تو حضور کا اسم شریف بو سیدہ اور فانی ہڈیوں کو زندہ کر دیتا جس وقت حضور ﷺ کے اسم شریف کا ذکر کیا جاتا۔

اللہ کرے حسن رقم اور ہوزیادہ

اس عظیم کام کے بعد بھی ان سے عظیم سے عظیم تر کارو کارنامہ کی امید ہے کیوں کہ

ان الله يحب معالى الامورواشرافها و يكره سفسافها (رواه الطبرانى فى معجمه الكبير)

کہ عنقارا بلند است آشیانہ

بس انھیں چند کلمات پر اقتصار کرتا ہوں اور کتاب اور قاری کے درمیان زیادہ حائل نہیں ہونا چاہتا کہ

فى طلعة الصبح ما يغنيك عن زحل

پورا شعر یہ ہے کہ

خذ ما تراه ودع ما سمعت به ☆فى طلعة الصبح ما يغنيك عن زحل

امید ہے کہ یہ کتاب ہر طبقہ کے لئے دل چسپ ،دل کش اور دلآویز ہوگی ع

بہ رنگ ارباب صورت را بہ بوار باب معنی را

محمد رابع نورانی بدری

استاذ: دارالعلوم اہل سنت فیض الرسول براؤں شریف

وسجادہ نشین آستانۂ حضور بدر ملت علیہ الرحمہ بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی

تقریظ

از: مصنف کتب کثیرہ حضرت علامہ ومولانا محمد عیسیٰ رضوی صاحب قبلہ

شیخ الحدیث والافتاء الجامعۃ الرضویہ مظہر العلوم گرسہائے گنج ضلع قنوج، یوپی

حضرت امام محمد بوصیری رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور بزرگ اور رسول کونین ﷺ کے عاشق صادق ہیں پہلے پہل وہ بادشاہوں، حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی شانوں مین بڑے بڑے قصیدے لکھتے تھے اوران کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے تھے کیونکہ وہ عربی کے عظیم فنکار شاعر وادیب تھے۔ لیکن آخر عمر شریف میں ان کی زندگی میں ایسا خوشگوار انقلاب آیا کہ وہ عشق رسالت کی دولت لازوال سے مالا مال ہوئے، اپنی بقایا زندگی عاشق رسول کی حیثیت سے گزاری اور عوام وخواص میں وہ اس وصف خاص سے مشہور وممتاز ہوئے۔

حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ کی زندگی اوران کی فکر ونظر میں انقلاب وتبدیل کا سبب یہ ہوا کہ عمر کے آخری حصے میں ان پر فالج یا برص کا اثر ہو گیا جس سے وہ کافی متفکر وپریشان ہوئے کافی حد تک علاج ومعالجہ ہوا مگر افاقہ اور سود مند ہونے کی بجائے مرض بڑھتا گیا اسی تذبذب وپریشانی کے عالم میں ایک روز ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے اپنی زندگی میں دنیاوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی شانوں میں بڑے بڑے قصیدے لکھے اوران کی مدح سرائی کی، اب میں اپنے آقا ومولیٰ محبوب پروردگار جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عرش وقار میں کچھ نعت وثنا کی سوغات پیش کرونگا تاکہ میری گزری ہوئی زندگی کا کفارہ اور مافات کی تلافی ہو جائے۔ اسی فکر وخیال میں انہوں نے بارگاہ رسالت سے لو لگایا اور درود ونعت کی شکل میں ایک طویل وجلیل قصیدہ لکھا جسے حضور سرور کونین ﷺ نے پسند فرمایا اور شرف قبولیت سے سرفراز فرمایا پھر کرم فرمائی یہ ہوئی کہ حضور نے خواب میں اپنے جمال جہاں آراء کا دیدار عطا فرمایا اور حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ کے فالج زدہ جسم پر اپنا دست شفا پھر دیا جس کی برکت وفیض سے ان کا مرض فوراً ختم ہو گیا اور وہ شفایاب وصحت مند ہو گئے، حضور سرور عالم ﷺ نے ان کے تحریر کردہ قصیدہ سے اس درجہ مسرور وخوش ہوئے کہ خواب ہی میں انہیں اپنی چادر اقدس بھی عطا فرمائی۔ جب وہ بیدار ہوئے تو مرض کا نام و

نشان بھی موجود و باقی نہ تھا اور حضور کی عطا کردہ چادر اقدس و کمبل موجود تھی۔ حضور کے اس معجزے کی مناسبت سے انہوں نے اپنے اس قصیدے کا نام "قصیدہ بردہ شریف" رکھا۔ بردہ کے معنیٰ چونکہ چادر و کمبل کے ہیں لہذا اس کے نام میں جو مناسبت و موزونیت ہے وہ اہل علم پر ظاہر و عیاں ہے۔

جس شب کو حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ حضور اقدس ﷺ کی زیارت مبارکہ سے مشرف ہوئے اس کی صبح کو راستے میں انہیں ایک خدا رسیدہ اور عاشق رسول فقیر ملے، فقیر نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا اے بوصیری مجھے قصیدے کی ایک نقل دیدو، امام بوصیری نے فرمایا میں نے تو بہت سارے قصیدے لکھے ہیں آپ کونسے اور کس قصیدے کی نقل چاہتے ہیں، فقیر نے کہا مجھے اس قصیدے کی نقل دو جو تم نے آج کی رات رسول پاک ﷺ کو سنایا ہے اور حضور نے جسکے صلے میں تمہارے جسم پر دست اقدس پھیرا تو تم شفایاب ہوگئے اور تمہیں اپنی چادر اطہر عطا فرمائی۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ قصیدہ بردہ شریف بارگاہ رسالت میں مقبول و معتبر ہوا اور حضور نے اسے پسند فرمایا یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام میں بڑے بڑے علماء و فضلاء نے قصیدہ بردہ کی شرحیں لکھیں ان سے فیض و برکت کے طالب و خواستگار ہوئے اور اس بات کے آرزو و متمنی ہوئے کہ ان کی شروحات بھی بارگاہ رسول کونین ﷺ میں قابل السعادت و قبول اور نگاہ رحمت کے سرفراز و مستحق ہو جائیں مگر ان کے الطاف و عنایات ہر ایک کو کہاں میسر و حاصل، وہ جسے چاہیں نوازتے ہیں۔

قصیدہ بردہ شریف کی متعدد شرحیں ہیں جو عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں میں لکھی گئیں ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی یہ ہے کہ ابھی حال ہی میں اس کی ایک عربی شرح بہ نام " الفردہ فی شرح البردہ " وارث علوم اعلیٰ حضرت جانشین حضور مفتیٔ اعظم ہند فخر ازہر و فخر بریلی حضور تاج الشریعہ الشاہ مفتی محمد اختر رضا خاں صاحب قادری ازہری مدظلہ العالی نے تصنیف فرمائی جو اہل علم اور علماء محققین میں بے حد مقبول ہوئی اور اس کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ یقین جانئے ہجوم افکار، کثرت اسفار اور شغل بسیار کے باوجود حضور

تاج الشریعہ کے قلم سے متعدد تصانیف وتراجیم اور شرح بردہ کی صورت میں ضخیم وعظیم کتاب کا وجود میں آنا میری نظر میں کرامت سے کم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کے سایۂ عاطفت کو صحت وسلامتی کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر قائم و باقی رکھے۔آمین یارب العالمین

قابل مبارک باد اور صد تحسین و آفریں کے مستحق وحقدار ہیں شہزادۂ گرامی نبیرۂ اعلیٰ حضرت و ریحان ملت، صاحبزادۂ عثمان ملت حضرت علامہ ومولانا محمد ارسلان میاں صاحب قادری بریلوی کہ انہوں نے "الفردہ فی شرح البردہ" کی ایک اردو شرح بنام "الوردہ فی شرح الفردہ" مرتب فرمائی جو علمی نوعیت اور فنی نقطۂ نگاہ سے متعدد خوبیون کی حامل، ادبی محاسن سے مزین وآراستہ اور ضخیم وجامع ہونے کے ساتھ عوام وخواص ہر ایک کیلئے لائق استفادہ اور یکساں مفید وکارآمد ہے۔

مجھے امید ہے کہ اہل علم میں اس کی مقبولیت وپذیرائی ہوگی اور علماء ومحققین اسے سراہیں گے۔میری قلبی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مقبول عام اور اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے۔آمین

آخر مین یہ کہکر ہم اپنی بات سمیٹ لیں گے کہ خانوادۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ میں ابھی ایک سے بڑھ کر ایک روشن ودرخشاں مہ وانجم کے ایسے بلند وبالا مینار تعمیر ہوں گے جن کی بلندی مریخ وثریا تک پہنچے گی اوران کی علمی شعاعوں سے آفاق کا چپہ چپہ منور وتابناک ہوگا۔انشاء اللہ تعالیٰ العزیز

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری

گھر گھر لئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محمد عیسیٰ رضوی قادری

خادم الحدیث والافتاء الجامعۃ الرضویہ مظہر العلوم گرسہائے گنج ضلع قنوج، یوپی

۲۲؍ذیقعدہ ۱۴۳۸ھ ۱۵؍اگست ۲۰۱۷ء

تقریظ

از: خلیفۂ تاج الشریعہ محقق عصر حضرت علامہ مفتی اختر حسین صاحب قبلہ علیمی، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی حبیبه الکریم

امابعد!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی کائنات مصطفےٰ جان رحمت فخر رسل جان عالم ﷺ کی مدح وثنا اور تعریف وتوصیف ایمان کا حصہ اور سعادت دارین کا عظیم وسیلہ ہے اس نعمت سے بہرہ ور حضرات کا اعتقاد ہے۔

ما ان مدحت محمدا بمقالتی

لکن مدحت مقالتی بمحمد

یعنی نبی رحمت ﷺ کی شان اقدس میں قصیدہ لکھ کر آپ کی شان میں کچھ اضافہ نہ کر سکا البتہ آپ کی مدح سرائی میں نکلے کلمات اور اشعار کو شرف قبولیت مل گیا اور وہ اشعار مدح وستائش کے قابل ہو گئے۔

اور یہ بھی مثل آفتاب روشن ہے کہ بڑے سے بڑے شعرا وادبا کی بھی زبان وقلم نے مدح سرائی سرور کونین میں عاجز ودرماندہ ہو کر کہہ دیا

لایمکن الثنا کماکان حقه

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور حسان الہند عاشق رسول مجدد دین وملت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ یوں رقمطراز ہوئے:

تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری

حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے

نعت نبی کہنے والوں میں بے شمار قدسی صفات شخصیات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں اوران کی لکھی نعتیں ایمان و عقیدے کومشکبار کررہی ہیں مگران ذوات مبارکہ میں ساتویں صدی ہجری کے نہایت بلند پایہ عرب شاعر حضرت امام شرف الدین محمد بوصیری علیہ الرحمہ کا اسم گرامی بڑا نمایاں اور ممتاز ہے آپ کا نظم کردہ قصیدہ بردہ شریف جس بلندوبالا معیار پر ہےاس سے عرب وعجم واقف ہے۔

علماء نے اس کی شرحیں لکھیں اسے داخل درس کیااوراس کا وظیفہ دفع آفات وبلیات کاعظیم ذریعہ بتایا۔انہیں شروح میں سے وارث علوم اعلیٰ حضرت جانشین مفتی اعظم ہند تاج الشریعہ علامہ الشاہ مفتی محمد اختر رضا خاں قادری ازہری دامت برکاتہم العالیہ قاضی القضاۃ فی الہند بریلی شریف کی تصنیف کردہ عظیم الشان شرح " الفردہ فی شرح القصیدہ البردہ" ہے جومطبوع ہوکر علمائے عرب وعجم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔

عربی زبان میں لکھی گئی یہ شرح بے شمار علوم وفنون کی جامع اورایمان ویقین میں استحکام وجلا کے لئے چمکتے موتیوں کی حسین لڑی ہے پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ منفرد المثال شرح سیدی تاج الشریعہ دامت برکاتہم القدسیہ کے مواہب لدنیہ،علوم وہبیہ اور معارف عطائیہ پر شاہد عدل ہے۔مقام مسرت ہے کہ اس بیش قیمت علمی ذخیرہ کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال کر دنیائے اردوادب میں اضافے اورافادیت کو عام کرنے کا کارنامہ خانوادہ رضویہ کے گل خوشرنگ صاحب فضل وکمال نبیرۂ ریحان ملت خلیفۂ تاج الشریعہ مولانا محمد ارسلان رضا خاں صاحب زیدت معالینھم نے کیا ہے۔صاحبزادۂ والا تبار کورب تعالیٰ نے حسن ایمان وعمل اورحسن صورت وکردار کا ایک خوشنما گلدستہ،ذہانت وذکاوت کا بہترین نمونہ اور خانقاہی شہزادوں میں متعدد جہتوں سے ممتاز کیا ہے۔

خانوادہ رضویہ میں زیرکی ودانائی اورشعوروآگہی رب کائنات کاعظیم عطیہ ہےاورعشق رسالت مآب ان کی گھٹی میں پلایا گیا ہےمولانا موصوف اپنے آباواجداد کی ان خوبیوں کے امین نظر آتے ہیں۔

آپ نے زمانہ طالب علمی میں ہی علمی اورفنی اسرارورموز اور لطائف ودقائق پر مشتمل عربی کتاب کا سلیس اوررواں ترجمہ کرکے اپنی علمی گیرائی وگہرائی اوراپنے اسلاف کی عظمتوں کا محافظ ہونے کا ثبوت پیش کردیا ہے۔عنفوان

شباب میں ہی یہ علمی شباب مستقبل قریب میں امت مسلمہ کو بہت کچھ دینے کی غمازی کر رہا ہے۔

رب ذو الجلال اپنے محبوب سرور کائنات علیہ التحیۃ والثناء کے طفیل صاحبزادہ گرامی مرتبت کی اس علمی اور دینی خدمت کو قبول فرمائے اسے مقبول انام کرے اور ناظم و شارح اور مترجم سب کو بہتر صلہ بخشے۔

آمین بجاہ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلاۃ و اکمل التسلیم

گدائے آستانہ

محمد اختر حسین قادری

خادم درس و افتاء دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی۔ یوپی

قاضی شریعت ضلع سنت کبیر نگر یوپی

یکم محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

اللّٰہ رب محمد صلی علیہ وسلم　　نحن عباد محمد صلی علیہ و سلم

از:خلیفۂ مفتئ اعظم حضرت علامہ حسن علی رضوی صاحب قبلہ میلسی پاکستان

امابعد!

فقیر، مخدوم ومحترم پیر طریقت حضرت الحاج مولانا شوکت حسن خاں صاحب قادری رضوی نوری علیہ الرحمۃ الباری کے ختم چہلم شریف کی تقریب سعید میں حاضر ہوا۔ یہاں مشفق ومحسن حضرت مولانا قاری تسلیم رضا خاں صاحب سلمہ ربہ یکے از صاحبزادگان خانوادہ سیدنا سرکار اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا، دل باغ باغ ہوگیا۔ حضرت صاحبزادہ والا جاہ فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد ارسلان رضا خاں صاحب قادری رضوی اطال اللہ عمرہ کی تالیف ''الفردۃ'' قصیدہ بردہ شریف کے ترجمہ وشرح پر مشتمل کتاب " الوردۃ فی شرح الفردۃ" کے چنداوراق دیکھنے کا موقعہ ملا دل مسرور وشادکام ہوا۔ روحانی کیف وسرور حاصل ہوا۔ یہ سرکار اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی زندہ تابندہ درخشندہ کرامت ہے کہ آج پانچ چھ نسلوں کے بعد بھی ماشاء اللہ آپ کی اولاد میں عالم وفاضل ہیں اور اسلام وسنیت وعلم دین کی درخشاں ونمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں، مولیٰ عزوجل اس کتاب کو مقبول خاص وعام فرمائے اور مزید خدمت دین کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے آمین۔

الفقیر القادری محمد حسن علی الرضوی غفرلہٗ میلسی

ادنیٰ خادم اہلسنت وخادم مسلک اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ

مقام رضا مدینہ ٹاؤن شہر میلسی ملتان پاکستان

۷/ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ بمطابق ۳۰/جولائی ۲۰۱۷ء

تقریظ جلیل

از: شہباز دکن، خلیفۂ مفتیٔ اعظم حضرت علامہ ومولانا محمد مجیب علی قادری رضوی صاحب قبلہ مرکز اہلسنت حیدرآباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o

الحمد لله رب العٰلمين وَ الصَّلوٰة و السلام علىٰ سيد الانبياء والمرسلين واٰله وصحبهٖ اجمعين

امابعد!

جانشین حضور مفتی اعظم وارث علوم اعلیٰ حضرت سیدی مولائی تاج الشریعۃ وبدر الطریقۃ حضور علامہ مفتی دوران حضرت اختر رضا خاں فخر ازہر مدظلہ کی کتاب الفردہ فی شرح البردہ کی شرح بزبان اردو خانوادۂ اعلیٰ حضرت کے فردِ فرید حضرت العلامہ مولانا ارسلان رضا قادری رضوی مدظلہٗ کی تصنیف "الوردہ فی شرح الفردہ" دیکھ کر بے پناہ مسرت قلبی حاصل ہوئی۔

فی زمانہ حضوری تاج الشریعہ کی عربی تصنیف کا بزبان اردو ترجمہ حضور ارسلان میاں مدظلہ نے لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ حضور اعلیٰ حضرت کے علمی کارخانے کا تسلسل تا قیام قیامت جاری وساری رہے گا انشاء اللہ تعالیٰ حضرت ارسلان میاں صاحب اس سعی جمیلہ کو اللہ تعالیٰ مقبولیت عطا کرے۔آمین بجاہ سید المرسلین۔

فقیر درِ رضا

محمد مجیب علی قادری عفی عنہ

المرقوم: ۵؍ستمبر ۲۰۱۷ء مطابق ذی الحجہ شریف ۱۴۳۸ھ

تقریظ

از: شہزادہ شاہ تراب الحق حضرت علامہ سید عبد الحق قادری نوری امیر جماعت اہل سنت پاکستان

الحمد لله الذی خلق الانسان و الصلوٰۃ والسلام علی سید الانس و الجان اما بعد فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم

عہدِ رسالت مآب ﷺ سے عصر حاضر تک، رحمتِ کونین ﷺ کی شان اقدس میں، ہزار ہا قصائد تحریر ہوکر عوام و خواص سے دادِ تحسین حاصل کرتے رہے ہیں، مگر امام ابوعبداللہ محمد بن سعید المعروف امام شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے میمیہ قصیدہ ’’الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریۃ‘‘ المعروف ’’قصیدہ بردہ شریف‘‘ کو کثیر صفات سے متصف ہونے کی بناء پر جو عظمت و مقبولیت حاصل ہوئی، وہ کسی اور قصیدہ کو حاصل نہ ہوسکی، بنظر غائر دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قصیدہ فنی نقصائص سے مبرا، صنائع بدائع سے مرصع، فصاحت و بلاغت کا دلآویز و دلکش مرقع، برمحل تلمیحات، خوبصورت استعارات، حسین تشبیہات، چست تراکیب، ضرب الامثال، سلاست و روانی، زبان کی شیرنی، بندش کی ہم آہنگی، جیسی عظیم صفات سے متصف ہونے کی بناء پر گویا گلدستہ، صدرنگ ہے۔۔ مقبولیت قصیدہ کا عظیم سبب، نبی کریم ﷺ کی جانب سے اسے پسند فرما کر سند قبولیت عطا فرمانا ہے، اسی مقبولیت کی بناء پر قصیدہ بردہ شریف کی مختلف زبانوں میں، ہر دور میں بیسویوں شروحات لکھی گئیں۔

فی زمانہ زبان عربی میں شروح قصیدہ بردہ میں ’’قاضی القضاۃ فی الہند، جانشین مفتی اعظم ہند، نبیرۂ اعلیٰ حضرت، حضور تاج الشریعہ، حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم العالیہ کی تحریر کردہ شرح ’’الفردۃ فی قصیدۃ البردۃ‘‘، علمی و ادبی محاسن کی بناء پر عصر حاضر کی تمام شروحات پر فوقیت رکھتی ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ اسے سلیس اردو زبان میں ترجمہ کر کے منظر عام پر لایا جائے تا کہ علماء کے ساتھ ساتھ طلباء و عوام بھی اس عربی شرح سے اکتسابِ فیض کرسکیں، الحمد للہ علی احسانہ اس ضرورت کو ’’دار العلوم فیض الرسول‘‘ براؤں شریف میں زیر تعلیم محترم المقام حضرت مولانا ارسلان رضا قادری صاحب زید مجدہ نے پورا کیا، دورِ طالب علمی میں عربی شرح کا

سلیس اردو زبان میں اردو محاورات کا خیال رکھتے ہوئے اتنے خوبصورت انداز میں ترجمہ کرنا یقیناً قابل صد تحسین ہے، فقیر نے حضرت مولانا ارسلان رضا قادری صاحب اطال اللہ عمرہ کی کاوش ''الوردۃ فی شرح الفردۃ'' کو چیدہ چیدہ مقامات سے پڑھنے کا شرف حاصل کیا، ترجمہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا کو ترجمہ وتحقیق کا بہترین ملکہ عطا فرمایا ہے، فقیر، موصوف کو اس سعی جمیلہ پر مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ دعا گو ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے وطفیل مولانا موصوف کے علم وعمل میں برکتیں عطا فرمائے، اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تبلیغ واشاعت کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

سید شاہ عبدالحق قادری نوری

امیر جماعت اہلسنت پاکستان، کراچی

۱۸/ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ بمطابق ۱۱/اگست ۲۰۱۷ء

تقریظ

از: شیخ الحدیث حضرت علامہ ومولانا محمد اسماعیل ضیائی پاکستانی۔دارالعلوم جامعہ امجدیہ کراچی

یہ قصیدہ عربی زبان میں ہے اور اس میں بہت مشکل عربی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ایک ماہر عربی داں کے لئے بھی اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔علامہ بوصیری علیہ الرحمہ نے انتہائی شوق وجذبہ کے ساتھ لکھا ہے۔استعارے اور کنایوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اس کی شرح وہی کرسکتا ہے جس کو عربی میں مکمل مہارت ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بھی ہو اور شاعروں کی زبان سے واقف ہو۔

حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی جیسے بحر العلوم ہی کماحقہٗ اس کی شرح لکھنے کا حق رکھتے ہیں اور آپ نے کثیر مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر ہمارے لئے یہ تحفہ عنایت فرمایا۔حضرت علامہ مولانا ارسلان رضا خاں صاحب دامت برکاتہ العالی کو اللہ تعالیٰ نے تمام علوم میں مہارت تامہ عنایت فرمائی اور صحیح معنیٰ میں فقیہ اعظم شاہ امام احمد رضا خاں کے جانشین ہیں۔آپ خود شاعر بھی ہیں۔ آپ نے ''الفردۃ فی شرح البردۃ'' تحریر کر کے قصیدہ بردہ میں اور چاہت بڑھادی اور ''الفردۃ'' یہ بھی عربی میں ہے اور قصیدہ بُردہ بھی عربی ہے اور یہ عربی دانوں کے لئے تو بہت اچھا سرمایہ ہوگیا۔لیکن اردو داں کے لئے یہ قصیدہ بردہ مع شرح کے مشکل کا مشکل ہی رہا۔اب اس شرح کو سمجھنا بھی ہر عربی داں کے بس کی بات نہیں۔اس کے لئے بھی ایک ماہر درس نظامی اور ماہر نحو وصرف درکار ہے وہی اس کا ترجمہ کرسکتا ہے۔

حضرت علامہ مولانا محمد ارسلان خاں صاحب جو اعلیٰ حضرت کے خاندان کے چشم وچراغ ہیں دوران طالب علمی میں ہی آپ نے ''الوردۃ فی شرح الفردۃ'' لکھ کر متن وشرح کو آسان فرمادیا۔عام اردو داں اس کتاب سے مستفیض ہوسکے گا۔''الوردۃ فی شرح الفردۃ'' نہایت سلیس اور آسان زبان میں لکھی گئی۔عربی سے مکمل ربط رہا ہے۔یہ شرح اردو داں کے لئے ایک بہت اچھی تصوف کی کتاب بھی ہے۔احادیث مبارکہ بھی کثیر جگہوں پر درج ہے اس کا ''تالی'' (پڑھنے والا) احادیث سے بھی مستفیض ہوگا۔

میں دل کی گہرائیوں سے محمد ارسلان رضا کے لئے دعا گو ہوں۔اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں اور اضافہ فرمائے اور صحیح معنیٰ میں مفتی تاج الشریعہ کا جانشین بنائے۔اس طرح اللہ تعالیٰ شاہ احمد رضا علیہ الرحمہ کی نسلوں سے باذوق راسخ العقیدہ سنی علم دوست ذی علم فقیہ پیدا فرماتا رہے اور تفقہ فی الدین کی سیادت ان کے خاندان میں باقی رہے۔آمین بجاہ النبی الامین سید الارض ولجان علیہ التحیۃ اوالتسلیم۔

فقط یک از سگ درگاہ غوثیت

محمد اسماعیل ضیائی غفرلہٗ

دارالعلوم جامعہ امجدیہ کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰ له و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

بعض مخلص احباب نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں اس قصیدۂ مبارکہ کی شرح کردوں جس قصیدے کوامام شرف الدین بوصیری نے تحریر فرمایا ہے، تو اپنے احباب کی فرمائش پوری کرنے کے لئے میں نے اس کی شرح کرنے کا عزم مصمم کرلیا اور شرح کرنے کا مقصد صرف اور صرف اس مبارک ومسعود قصیدے سے حصول برکت و فیروز بختی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل اور اس سے مدد مانگتے ہوئے اور وہ مجھے کافی ہے کیا ہی اچھا وکیل ہے۔

شرح کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ امام شرف الدین بوصیری (صاحب بردہ) قدس سرہٗ کے متعلق کچھ باتیں عرض کردوں اور وجہ وسبب انشاد قصیدہ بردہ کے متعلق بھی کچھ کلام پیش کردوں نیز ان شرائط کو بھی بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں جن کی رعایت اس قصیدے کے قاری اور سامع پر وقت قرأت لازم ہے تاکہ قاری اور سامع ہر ایک کے لئے اس کا نفع عام وتام ہو جائے اور اس کی برکت حاصل ہو انشاء اللہ تعالیٰ۔

صاحب قصیدہ بردہ

قصیدہ بردہ شریف کے مصنف امام شرف الدین بوصیری مصر کے رہنے والے تھے اور او ربوصیری سے مشہور و معروف ہیں، نسبت کرتے ہوئے ''ابوصیر'' کی جانب جوشہر اسکندریہ کے قریب ایک اسٹیشن کا نام ہے۔ امام رحمۃ اللہ علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ایک عمدہ اور انتہائی فصیح و بلیغ شاعر تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ ابتداً بادشاہوں کے مقربین میں سے تھے، ان کی مدح وثنا اور ان کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے، جیسا کہ خود انہوں نے اس قصیدے کے آخرم یں اس طرف اشارہ کیا ہے:

خدمته بمديح استقيل به ذنوب عمر مضى في الشعر و الخدم

اذ قلدانی ما تخشی عواقبه کانني بهما هدی من النعم

(یعنی میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصیدہ کہا ہے تا کہ اس کے وسیلے سے میں اپنی تمام عمر کے گناہوں سے معافی مانگوں جو عمر کہ شعر گوئی اور ارباب سلطنت کی خدمت میں ضائع ہوئی۔)

یہ دونوں چیزیں (یعنی شعر گوئی اور ارباب دنیا کی خدمت گزاری) میری ایسے گلے پڑ گئی ہیں جن کے انجام کا خوف ہے، ایسا لگتا ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کی وجہ سے بلی کا بکرا ہوں)

وجہ انشاد قصیدہ بردہ

وہ اسی حالت پر تھے کہ یک بیک ان کی قسمت کا ستارہ چمکا، اللہ نے انہیں ایک مرشد کامل کی رہنمائی نصیب فرمائی جس وقت کہ وہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، شیخ نے ان سے معلوم کیا کہ کیا تم نے کبھی نبی کریم علیہ السلام کی خواب میں زیارت کی ہے؟ امام نے جواب دیا: میں آج تک حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا؟ آگے کا واقعہ خود امام کی زبانی ملاحظہ فرمائیں امام فرماتے ہیں: ''شیخ کی زبان حق ترجمان سے وہ الفاظ سننے کے بعد میرا دل شوق و محبت اور عشق نبی سے مامور ہو گیا اور میں حضور کی مدح سرائی میں مصروف ہو گیا، میں نے آپ ﷺ کی ثنا و نعت میں بہت اشعار کہے'' ایک بار ایسا ہوا کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا جس کے نتیجے میں آپ کا آدھا بدن مفلوج ہو گیا اور اس مرض نے آپ کو منجمد کر دیا، اسی وجہ سے آپ نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں التجا کی اور اس قصیدے کو طلب شفا کی نیت سے تحریر فرمایا، تب آپ کو خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، اآپ نے دیکھا کہ آپ نبی کریم ﷺ کے سامنے باادب کھڑے ہیں اور انہیں اشعار سے حضور کی قصیدہ خوانی کر رہے ہیں جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے مشہور و معروف ہے، پھر جونہی آپ نے قصیدہ ختم کیا آقائے دو عالم ﷺ نے اپنا دست مبارک آپ کے جسم پر پھیرا تو بفضلہٖ تعالیٰ آپ شفایاب ہو گئے، پھر صبح آپ کی ملاقات آپ کے ایک عزیز دوست ابورجاء سے ہوئی، آپ کے دوست نے آپ سے فرمایا کہ مجھے وہ قصیدہ سناؤ جس کا مطلع یہ ہے:

امن تذکر جیران بذی سلم　　　مزجت دمعا جریٰ من مقلة بدم

امام شرف الدین بوصیری بہت متعجب ہوئے اور ان سے کہنے لگے کہ تم اس قصیدے کے بارے میں کیسے جانتے

ہو؟ جبکہ میں نے اس قصیدے کو ابھی تک کسی کے سامنے نہیں پڑھا؟ آپ کے دوست نے جواباً کہا: میں نے اس قصیدے کو گزشتہ رات حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں سنا ہے اور تم اس قصیدے کو پڑھ رہے تھے اور حضور اکرم ﷺ جھوم کر فرط مسرت سے سماعت فرما رہے تھے جیسے پھلدار ٹہنیاں جھوما کرتی ہیں۔ یہی وجہ وسبب انشا قصیدہ ہے اور اس قصیدے کی برکت سے انہیں شفا اور زیارت رسول نصیب ہوئی۔

آداب قرأت قصیدہ:

اور وہ امور جن کی رعایت ضروری ہے وہ یہ کہ پڑھنے اور سننے والے کیلئے باوضو ہو کر باادب قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھنا لازم ہے نیز اسے چاہئے کہ وہ ہر شعر کے بعد حضور اکرم ﷺ پر درود وسلام کی ڈالیاں نچھاور کرتا رہے اور اسی درود پاک کے صیغے کا التزام رکھے جو امام شرف الدین بوصیری قدس سرہٗ پڑھا کرتے تھے، وہ درود شریف یہ ہے:

مولای صل وسلم دائما ابدا　　　علی حبیبك خیر الخلق کلهم

اس لئے کہ یہ وہی درود پاک کا کلمہ ہے جس کو امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمہ نے اسی صیغے سے حضور اکرم ﷺ کے سامنے پڑھا تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے س درود پاک کے صیغے کو دوسرے درود پاک کے کلمات پر ترجیح دی ہے۔ اور اسی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ قارئ قصیدہ بردہ کو اسی صیغے پر مواظبت کرنا چاہئے کہ جو امام شرف الدین بوصیری قدس سرہٗ سے منقول ہے۔

برکات قصیدہ بردہ:

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عاشق زار حضور اکرم ﷺ کے رخ زیبا کی زیارت کی تمنا دل میں لیئے ہوئے اس قصیدے کو پڑھنے میں مشغول تھا لیکن اس پر مداومت کرنے کے باوجود اسے حضور کی زیارت نصیب نہیں ہو رہی تھی جبکہ اس قصیدے کا یہ خاصہ ہے کہ اس پر مداومت اور مواظبت کرنے سے حضور علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوتی ہے، لہذا اس عاشق زار نے اپنے مرشد سے اپنے حال کی شکایت کی، مرشد نے فرمایا کہ تم شرائط کی پابندی نہیں کرتے

ہو گے اس نے کہا نہیں بلکہ میں ان شرائط کی خوب پابندی کرتا ہون، تو اس کے شیخ نے مراقبہ کیا اور تھوڑی دیر تک نگاہ جھکا کر زمین کی طرف دیکھتے رہے، پھر فرماتے ہیں کہ میں اس راز پر مطلع ہو گیا ہوں جس کی وجہ سے تمہیں حضور علیہ السلام کی زیارت نصیب نہیں ہوتی، انہوں نے فرمایا کہ وہ راز یہ ہے کہ تم درود پاک کے اس صیغے سے حضور اکرم ﷺ پر درود نہیں پڑھتے جس صیغے سے امام شرف الدین بوصیری پڑھا کرتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ اس مصرع پر پہنچے " فمبلغ العلم فيه انه بشر "تو آپ رک گئے اور اگلا مصرع نہیں کہہ پا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ مصرعۂ ثانی کہنے کا دروازہ بند ہو گیا ہے، تو حضور اکرم ﷺ نے آپ سے فرمایا کہ امام دوسرا مصرع پور کرو، امام رحمۃ اللہ علیہ نے عرج کیا حضور! میں مصرعۂ ثانی کہنے کی توفیق نہیں پا رہا ہوں تو حضور نے خود شعر پورا فرماتے ہوئے اور دوسرے مصرعے کی رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا: وانه خير خلق الله كلهم۔

حضور اکرم ﷺ کا ان کو یہ مصرع لکھوانے کے بعد ان کا یہ شعر یوں پورا ہوا:

فمبلغ العلم فيه انه بشر   وانه خير خلق الله كلهم

(ترجمہ: آپ ﷺ کے بارے میں ہمارا مبلغ علم یہی ہے کہ آپ بشر ہیں اور حال یہ ہے کہ آپ تمام خلق اللہ سے افضل واعلیٰ ہیں۔)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

فصل اول

غزلیات اور شکوۂ عشق میں

(۱)أمن تذکر جیران بذی سلم مزجت دمعا جریٰ من مقلة بدم

ترجمہ: کیا تمہارا رونا ذی سلم کے پڑوسیوں کو یاد کرنے کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے تم نے گوشۂ چشم سے بہنے والے آنسوؤں کو خون سے ملادیا۔)

معنوی تشریح:۔ شاعر ذی فہم یہاں اپنے خیال میں ایک شخص کا تصور کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہیں گویا وہ شخص اپنی محبت کو چھپا رہا ہے اور محبت سے انکار کر رہا ہے تو ناظم اس سے مخاطب ہوکر اس بات کو ثابت کر رہے ہیں جس کا وہ انکار رہا ہے کہ اے مخاطب تو ضرور بالضرور عاشق زار ہے اور گرفتار محبت ہے تو کیسے اس عشق سے انکار کرسکتا ہے اور انکار کی بات اپنی زبان پہ تو کیسے لاسکتا ہے جب کہ تیرے دل کی کیفیت خود تیری حالت بیان کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ تیرا دل معشوق کی محبت میں گرفتار ہے اسی کو ناظم فاہم نے یوں کہا:

أمن تذکر جیران بذی سلم ۔ مزجت دمعا جریٰ من مقلة بدم

لفظی تشریح: یہاں پر ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور وہ صدارت کلام چاہتا ہے (من) حرف جار فعل "مزجت" کے متعلق ہے اور اس کو حصر کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے یعنی تمہاری یاد کرنے کی وجہ سے تم نے آنسوؤں کو خون سے ملادیا نا کہ کسی اور وجہ سے اور اسے نفع حصر رعایت نظم اور افادہ تعلیل کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے یعنی تیرے رونے کا سبب تیرا یاد کرنا ہے ان پڑوسیوں کو جو ذی سلم کے رہنے والے ہیں جو مدینہ شریف میں ایک جگہ کا نام ہے (مزجت) المزج، مصدر سے ہے اور المزج کا معنیٰ خلط ہے۔ لیکن مزج اور خلط کے درمیان اہل

لغت نے فرق بیان کیا ہے وہ یہ کہ:

" المزج" دو چیزوں کو اس طریقے سے ملانا کہ ان دو چیزوں کے ملانے سے کوئی ایک نئی حقیقت کا وجود ہو جائے جیسے اگر تم پانی کو دودھ سے ملاؤ اور پنیر کو گھی یا شہد سے ملاؤ تو ان تمام چیزوں سے حقیقت واحدہ پیدا ہو جائے گی۔

اور " الخلط" وہ اس سے عام ہے کہا جاتا ہے (میں نے درہموں کو دینار سے ملادیا) تو دراھم اور دنانیر مل جاتے ہیں مخلوط ہو جاتے ہیں لیکن باوجود اس کے ان دونوں کے ملا دینے سے وہ حقیقت واحدہ نہیں بنتا ہے۔ درہم اپنی حالت پر رہتا ہے اور دینار اپنی حالت پر رہتا ہے لیکن پہلی والی صورت میں معاملہ اس کے برعکس ہے اس لئے کہ جب تم کسی چیز کو کسی چیز سے مزج کرو گے اس کو اس سے ملاؤ گے تو جو چیز ملائی جائے گی وہ معدوم ہو جائے گی اور وہ ایک دوسری شئی بن جائے گی پس ان دونوں میں یہی فرق ہے۔

اور" الدمع "یعنی آنسو وہ آنکھ سے بہنے والا پانی ہے اور آنسو کبھی غم واندوہ کے ہوتے ہیں اور کبھی خوشی (فرحت و انبساط کے) تو وہ آنسو جو رنج وغم کی وجہ سے بہتا ہے اس میں حرارت ہوتی ہے اور خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

(جریٰ) الجری مصدر سے فعل ماضی کا صیغہ ہے اور بہنے کے معنیٰ میں ہے یعنی کیا پڑوسیوں کو یاد کرنے کی وجہ سے تم نے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کو خون سے ملا دیا اور (التذکر) یا تو الذِکر مصدر سے ہے یا الذُکر سے الذکر ذال کے کسرہ کے ساتھ زبان سے ہوتا ہے الذُکر (بضم ذال) دل سے ہوتا ہے۔

اور (جیران) (دمعا) (مقلة) اور (دم) میں تنوین مضاف الیہ کے عوض کے طور پر ہیں اور وہ مضاف الیہ کافِ خطاب ہے۔یعنی تقدیری عبارت یوں ہے" أمن تذكرك جيرانك بذی سلم ۔مزجت دمعك الذی سال من مقلتك بدمك ۔"یعنی کیا تمہارا رونا تمہارے یاد کرنے کی وجہ سے ہے ذی سلم کے اپنے پڑوسیوں کو جس کی وجہ سے تم نے اپنے گوشۂ چشم سے بہنے والے اپنے آنسوؤں کو اپنے خون سے ملا دیا۔

اور ذی سلم ؛مدینہ شریف میں ایک جگہ کا نام ہے یہ مضاف اور مضاف الیہ سے مرکب ہے ذو مضاف ہے اور

کلمۂ ذو ' صاحب' کے معنی میں ہے لیکن علماء نے ذو اور صاحب کے درمیان فرق بیان فرمایا ہے کہ اگر تم ذی سلم کہتے ہو تو یہ طریقہ اور یہ اسلوب مضاف میں شرف و بزرگی کو بیان کرتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر تم صاحب کہو گے تو عظمت و بزرگی مضاف الیہ میں ہوگی جیسا کہ صاحب النبی کہا جاتا ہے علیہ وسلم لیکن میرا گمان یہ ہے کہ ایسا اغلب و اکثر ہے کہ یہ قاعدہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان سے منقوض ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے ﴿ وما صاحبکم بمجنون﴾ کیوں کہ اس کلمے میں صاحب مضاف ہے لیکن اس کے باجود شرف و بزرگی مضاف میں ہے نا کہ مضاف الیہ میں جیسا کہ معلوم ہے کہ ''صاحب'' سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے جو اشرف الاشرفین ہیں۔

اور اسی طریقے سے جو دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگر کہا جائے ذو فلان تو شرف و بزرگی ذو مضاف میں ہوگی تو یہ بھی منقوض ہے (ذو الخویصرۃ) سے اس لئے کہ اس میں شرف نا تو مضاف میں ہے اور نا ہی مضاف الیہ میں۔

جو بات ابھی گزری اس کا تعلق ذی سلم کے مجموعے سے تھا اور اب صرف ''سلم'' کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ سَلَم (بفتح لام) ایک درخت کا نام ہے اور سَلِم (بکسر لام) اسم جمع ہے اس کا واحد سلمۃ ہے اور وہ بھی درخت کا نام ہے۔ بظاہر ذی سلم سے مراد وہ جگہ ہے جو مکہ شریف اور مدینہ شریف کے درمیان ہے جہاں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر مکہ کے موقع پر نزول فرمایا کرتے تھے۔ اس کلمے کے اور بھی کئی معانی ہو سکتے ہیں: سَلم سے مراد سلامتی ہو اور ذو سلم سے مراد وہ جگہ ہے جو آفات و بلیات سے محفوظ و مامون ہو اور وہ جنت اور اعلیٰ علیین ہے یا اس سے مراد عالم ارواح ہے۔

اور جیران (پڑوسیوں) سے مراد یا تو محبوب کی ذات ہے اور جیران کو تعظیم کی وجہ سے جمع لائے ہیں اور محبوب یہاں پر سید المحبوبین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا جیران سے مراد انبیائے کرام، صالحین اور ارواح عالیہ ہیں۔ گویا شاعر ذی فہم اپنے نفس کو اپنے وطن اصلی کا شوق دلا رہے ہیں جو ہر انسان کا وطن ہے یعنی عالم ارواح، اسی وجہ سے حدیث پاک میں وارد ہوا (حب الوطن من الایمان) یعنی مومن جب تک دنیا میں رہے گا اس کا نفس اپنے منزل

اول اور اپنے وطن اصلی کا مشتاق رہے گا جو اس کا آخری ٹھکانہ جیسا کہ وہ اس کا آغاز میں ٹھکانہ تھا یعنی عالم ارواح جہاں سے وہ آیا ہے اور وفات کے بعد جہاں اسے منتقل ہونا ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰ له و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

ما سبق میں ہم نے امام شرف الدین بوصیری کے قصیدہ بردہ شریف کے پہلے شعر پر سیر حاصل گفتگو کی وہ شعر یہ ہے:

أمن تذكر جيران بذى سلم　　مزجت دمعا جرىٰ من مقلة بدم

اور اب یہاں ہم اسی قصیدۂ مبارکہ کی شرح میں اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھیں گے اور اب دوسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲) أم هبت الريح من تلقاء كاظمة　　واو مض البرق فى الظلماء من اضم

ترجمہ: یا سمت کاظمہ سے باد صبا چلی ہے یا جبل اضم سے تاریک رات میں بجلی چمکی (آخر کیا وجہ ہے تیرے رونے کی)

تشریح: شارحین فرماتے ہیں کہ "ام هبت الريح" میں (أم) متصلہ ہے۔ اور یہی اکثر شارحین کا موقف ہے اس کے متصلہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں شعر ایک کلام کے حکم میں ہیں یعنی دونوں شعر ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہیں اور بعض شارحین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ 'ام' یہاں منقطعہ ہے یعنی وہ 'بل' کے معنی میں ہے گویا کہ عبارت یوں ہے: آنسوؤں کو خون سے ملانے کا سبب کیا ہے؟ کیا ذی سلم کے پڑوسیوں کو یاد کرنا سبب ہے؟ جس کی وجہ سے تم نے گوشۂ چشم سے بہنے والے آنسوؤں کو خون سے ملا دیا؟ اور اس کے بعد سائل اپنے اس سوال سے اعراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نہیں بلکہ کاظمہ کی جانب سے ہوا چلی ہے اور تاریک رات میں 'اضم' پہاڑ سے بجلی

چمکی ہے۔ ہوا کے چلنے کا مطلب اس کا آنا یا پھیلنا یا حرکت کرنا ہے۔

ریح مؤنث سماعی ہے، 'ریح' کا نام 'ریح' رواح سے رکھا گیا ہے اس لئے کہ ہوا ہمیشہ صبح وشام آتی جاتی رہتی ہے۔ اور 'ام' کے متصلہ ہونے کی بنیاد پر شاعر ذی فہم کا قول ''ھبت الریح واومض البرق'' مصدر کی تاویل میں ہو جائے گا۔ یعنی کیا تم نے پڑوسیوں کو یاد کرنے کی وجہ سے، گوشۂ چشم سے بہنے والے آنسوؤں کو خون سے ملا دیا یا سمت کاظمہ سے ہوا کے چلنے کی وجہ سے یا پھر رات میں 'اضم' پہاڑ سے بجلی چمکنے کی وجہ سے (ایسا کیا ہے)

سائل یہاں پر دعویٰ کر رہا ہے کہ تو عاشق ہے اور عاشق زار سے اس کے عشق اور اس کی محبت کو منوا رہا ہے جبکہ عاشق کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی محبت کو چھپا رہا ہے اور ادھر سائل مسلسل اپنے دعوے پر اصرار پہ اصرار کئے جا رہا ہے کہ تو گرفتارِ محبت ہے اور اپنے اس دعوے پر محبت کی علامتوں اور نشانیون کو بطور دلیل پیش کر رہا ہے گویا کہ آثار محبت اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ تو عاشق زار ہے اور سائل اپنے اس دعوے کے لئے قیاس کی ترتیب کو دلیل بنا رہا ہے اور یوں کہہ رہا ہے کہ تمہارا خون کے آنسو رو پڑنا، آثار محبت میں سے ہے اور ہوا کا سمت کاظمہ سے چلنا اور پھر تمہیں رونے پر اکسانا اور برانگیختہ کرنا یہ بھی محبت کی ایک علامت ہے (اور اسی پر بس نہیں بلکہ) تاریک رات میں جبل اضم سے بجلی کی چمک نے تمہارے دل میں پوشیدہ شوق محبوب کے راز کو فاش کر دیا ہے۔ یہ بھی محبت کی ایک (قوی) نشانی ہے۔ تو یقیناً تو عاشق زار ہے اور جبکہ اس کی علامتوں اور نشانیوں سے ظاہر و ثابت ہو چکا تو اس سے انکار کا تمہارے لئے کوئی راستہ ہی نہیں بچتا۔

قضیہ مانعة الخلو ہے نا کہ مانعة الجمع یعنی یہ اس بات سے خالی نہیں ہے کہ یا تو پڑوسیوں کو یاد کرنے کی وجہ سے تم رو پڑے ہو اور آنسو کو خون سے ملا دیا ہے یا پھر تمہارے خون رونے کی وجہ سمت کاظمہ سے ہوا کا چلنا ہے یا جبل اضم کی جانب سے بجلی کا چمکنا ہے۔ تو ان تمام امور کے جمع ہونے میں کوئی شئی مانع نہیں ہے (یعنی یہ تمام امور ایک ساتھ جمع تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک ساتھ برطرف نہیں ہو سکتے لہذا یہ مانعة الخلو ہے۔) بـــرق (بجلی) اہل سنت کے نزدیک 'برق' سے مراد فرشتے کا کوڑا یعنی اس کا چابک ہے، اور 'رعد' فرشتے کا نام ہے اور اکثر اہل

سنت و جماعت کے نزدیک قلب، محل عقل ہے اور قلب سے اس کی تعبیر کرنے میں ایک نفیس نقطہ ہے اور وہ یہ کہ قلب، تقلب سے مشتق ہے اسی وجہ سے قلب کو قلب کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ ہمیشہ متغیر ہوتا رہتا ہے اور کسی ایک حال پر ثابت نہیں رہتا ہے باوجود اس کے کہ ناظم فا ہم پر دعویٰ کرر ہے ہیں کہ تو مستقل غم واندوہ اور دائمی رنج والم میں مبتلا ہے تیرا حال اس کیفیت سے متغیر نہیں ہورہا ہے۔

تلقاء 'تا' کے کسرے کے ساتھ 'تبیان' کی طرح مصدر ہے اور اس وزن پر 'تا' کے کسرہ کے ساتھ مصدر نہیں آتا ہے اور وہ جو کہ ان دونوں کے علاوہ 'تا' کے کسرے کے ساتھ آیا ہے وہ یا تو صفت یا اسم جیسے تلعاب بمعنی کثیر اللعب اور تلعاب مصدر بمعنیٰ لعب ہے اسی طریقے سے تمثال، مثال اور صورت کا اسم ہے اس کا اطلاق ذی روح صورت اور جاندار کی تصویر پر ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے کپڑے پر تصویر ہے یعنی اس کے کپڑے پر جاندار کی تصویر ہے۔

کاظمه ایک قول یہ ہے کہ مدینۃ الاسلام کے قریب ایک جگہ کا نام ہے، علامہ خر پوتی نے فرمایا کہ کاظمه مدینۃ الاسلام کا ایک نام ہے، کاظمه، کظم سے مشتق ہے اور اس کا معنیٰ غصے کو ٹھنڈا کرنا ہے قرآن کریم میں آیا ہے ﴿والکٰظمین الغیظ و العافین عن الناس والله یحب المحسنین﴾ (آل عمران: ١٣٤)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کی مدح فرما رہا ہے جو کہ غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو پا لیتے ہیں اور اپنے غصے کو ٹھنڈا کر لیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنا اپنی عادت بنا لیتے ہیں اور اس کے بعد ان کو بشارت دی گئی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے۔

مجھے اس موقع پر ایک حکایت یاد آرہی ہے جس کو امام صاوی نے تفسیر جلالین پر اپنے حاشیہ میں اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام سیدنا زین العابدین کی باندی ان کو وضو کرا رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا اور سیدنا زین العابدین کے چہرۂ مبارک پر گر پڑا جس کی وجہ سے آپ کے سر پر زخم آ گیا آپ نے کچھ غضب ناک انداز میں اس کی طرف دیکھا تو باندی نے فوراً اس آیت پاک کی تلاوت کردی:

﴿والکٰظمین الغیظ﴾ اور جب وہ﴿ والله یحب المحسنین ﴾ تک پہنچی حضرت سیدنا زین العابدین نے فرمایا میں نے تجھے لوجہ اللہ آزاد کیا۔

مدینہ کا نام کــاظـمـہ کیوں رکھا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ کو مجازاً کاظمہ کہا گیا اس لئے کہ مدینہ وہ خود کاظمہ (غصے کو ٹھنڈا کرنے والا) نہیں ہوتا ہے بلکہ کاظم غصہ کو ضبط کرنے والا) تو وہ ہوتا ہے جو اس میں رہتا ہے تو اس کو کــاظـمـہ سے مجازاً موسوم کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کہ ندی بہہ رہی ہے جب کہ حقیقت میں ندی نہیں بہتی وہ تو اس میں پانی ہوتا ہے جو بہتا ہے۔ یہ اطلاق محل اور ارادت حال کی قبیل سے ہے۔اس میں ایک دوسرا معنیٰ بھی ہوسکتا ہے کــاظـمـہ سے نبی اکرم ﷺ کی قبر انور اور مرقد منیف مراد ہو۔اطلاق عام اور ارادت خاص کی وجہ سے۔

اور ہوا کا چلنا یا تو حقیقتاً ہے یا مجازاً اور هبـوب الریح سے مراد وہ چیزیں اور وہ امور ہیں جو ہوا کے چلنے سے لازم آتی ہیں، اس لئے کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ شئی کو وہاں تک پہنچا دیتی ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتی ہے جیسے کہ سوکھی گھاس وغیرہ اور یہاں اس سے ہواؤں کے دوش پر کوئے محبوب سے محبوب کی خوشبو آنا مراد ہے اور شہر محبوب عاشق کو رلا دیتا ہے اور عشق ومحبت کی خوابیدہ شراروں کو بیدار کر کے شعلۂ جوالا بنا دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ ریـح (ہوا) سے مراد خوشبودار ہوا ہو تو اس تقدیر پر معنی ہوگا کہ رونے والے کیا تو نے اس پاکیزہ خوشبو کو سونگھا ہے جو ہوا کی صورت میں تجھ تک پہنچی ہے اس (شہر محبوب کی) طرف سے پھر تجھ کو اس نے رونے پر اکسا دیا۔

(ریـح) سے مراد بادِ صبا بھی ہوسکتی ہے اور یہاں استعارہ ممکن ہے اس طرح کہ گویا ناظم فاہم نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ میرے آقا علیہ السلام کی سیرت طیبہ اور شمائل وخصائل اور اعلیٰ اخلاق کی بادصبا عاشق زار ہے پھر انہوں نے ان شمائل اور سیرت طیبہ کو بادصبا کے مشابہ قرار دیا، پھر مشبہ کی طرف محض اشارہ کیا جبکہ مشبہ بہ کی تصریح فرمائی، یہی تو استعارہ تصریحہ کہلاتا ہے اور" هبوب " بھی یہاں مجازی معنیٰ میں مستعمل ہے اور" هبوب "میں استعارہ تصریحہ کے لئے ترشیح ہے اس لئے کہ استعارہ مرشحہ اس کو کہتے ہیں جس میں مشبہ بہ کے مناسب کوئی شئی ذکر کی جائے لہذا

یہاں "ھبوب" "ریح" کے مناسب ہے مطلب یہ ہے کہ کیا تم تک حضور علیہ السلام کے شمائل وخصائل اور آپ کی سیرت طیبہ ہے پہنچ گئی ہے؟ جس کی وجہ سے تمہیں حضور اکرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق یاد آ گئے جو بادصبا کے مانند ہیں اور جو آفاق میں پھیلے ہوئے اور مشرق ومغرب میں چھائے ہوئے ہیں، تو اس کی وجہ سے تمہیں رونے آ گیا؟

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

گزشتہ اوراق میں ہم نے قصیدہ بردہ شریف کے دوسرے شعر پر سیر حاصل گفتگو کی اور وہ ناظم شعر کا یہ قول ہے:

أم ھبت الریح من تلقاء کاظمة   واو مض الرق فی الظلماء من اضم

اور ہم نے اس شعر پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر دی اور اب ہم تیسرے شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں: ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳) فما لعینیك ان قلت اکففا ھمتا   فما لقلبك ان قلت استفق بھم

ربط: اس شعر کا تعلق ماسبق سے ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ ناظم شعر اپنے خیال میں ایک شخص کو تصور کر کے اس سے مخاطب ہیں جیسا کہ انہوں نے گزشتہ دونوں شعروں میں کیا۔ گویا وہ شخص ایک طرح سے انکار کر رہا ہے اور اس قیاس کو رد کر رہا ہے جس کو ناظم شعر نے یوں مرتب کیا تھا کہ تمہارے آنسو کو خون سے ملانے اور ہوا کے چلنے اور بجلی کے چمکنے سے تمہارے ہیجان اور اشتیاق سے تمہارا دیوانۂ محبت اور بیمار عشق ہونا سمجھ میں آتا ہے (یعنی یہ ساری باتیں اس نتیجہ پر دلالت کر رہی ہیں)

اس لئے کہ جس کسی کی بھی یہ کیفیت اور یہ حالت ہوتی ہے وہ ضرور بالضرور عاشق زار ہی ہوتا ہے لیکن وہ شخص عاشق ہونے سے انکار کر رہا ہے جس کا ناظم شعر نے دعویٰ کیا تھا اور بایں الفاظ گویا ہے کہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں خون

کے آنسو رویا ہوں اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ وہ سارے آثار وعلامات جن کا تم نے ذکر کیا وہ مجھ پر اچانک رونما ہو گئے لیکن میں اپنا عاشق زار ہونا یا مشتاق محبوب ہونا یا پھر گرفتار محبت ہونا قطعاً قبول نہیں کرتا!!!

کیا میرا رونا کسی مرض یا کسی آفت کے لاحق ہونے کی وجہ سے نہیں ہوسکتا۔

تو اب ناظم شعر نے استدلال کے اسلوب میں تغیر وتبدیلی کی اور دوسری دلیل کی طرف منتقل ہو کر کہتے ہیں: کہ اگر تم عشق ومحبت سے انکار کر رہے ہو(تو یہ بتاؤ کہ پھر تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اگر تم ان کو روکنے کے لئے کہتے ہو یعنی اگر تم اس کو کہتے ہو ٹھہر جا یا رک جا یا اپنے آنسو کو روک لے تو وہ رکنا نہیں ہے بلکہ مزید آنسو بہانا ہے۔)

لفظی تشریح: اکففا یعنی احتبسا اور امتنعا یاکفا دمعکما ہے اس لئے کہ کف لازم ومتعدی دونوں طرح استعمال ہوتا، تو اس کے لازم ہونے کی تقدیر پر وہ ' امتنعا ' کے معنیٰ میں ہوگا اور اس کے متعدی ہونے کی صورت میں اس کا معنیٰ کفا (روکو) یعنی امنعا دمعکما (اپنے آنسوؤں کو روکو) اور فما لعینیك کا مطلب ماحصل لعینیك، ہے (تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے)

ان کا قول(ان قلت اکففا همتا) 'ما' کی تفسیر ہے، اور همتا کا مطلب 'سالتا دمعا، (آنسو بہانا) ہے تو تمیز یہاں پر محذوف ہے اور اسی طریقے سے 'مالقلبك ان قلت استفق یهم (اور تیرے دل کو کیا ہوا کہ جب تو اسکو افاقہ کرنے کو کہتا ہے تو وہ اور پریشان ہو جاتا ہے یعنی تیرے دل کو کیا حادثہ پیش آ گیا ہے کہ جب تو اس کو کہتا افاقہ کر تو وہ مزید متحیر ہو جاتا ہے۔ یعنی تو جب تم اس سے یہ کہتے ہو تو وہ تمہارے حکم کی فرمانبرداری نہیں کرتا ہے اور تمہاری بات نہیں مانتا ہے بلکہ عشق میں مصر رہتا ہے اور جب تم اس سے کہتے ہو استفق (ہوش میں آ) یهم (تو وہ مزید حیران و پریشان ہو جاتا ہے)"تهم" محل جزم میں ہے یعنی دراصل یهیم بمعنیٰ یتحیر تھا ان کا قول 'همتا' یہ فعل ماضی تثنیہ مؤنث غائب ہے، وہ سالتا (بہانے) کے معنیٰ میں ہے اور تثنیہ کی ضمیر عینین کی طرف راجع ہے۔

همیان (سیلان، بہنا) کی نسبت عینین کی طرف بر سبیل مجاز ہے اس لئے کہ آنکھیں نہیں بہتی ہیں بلکہ وہ تو آنسو

ہوتے ہیں جو آنکھوں سے بہتے ہیں اور آنکھوں کی طرف بہنے کی نسبت اسی طرح ہے جس طرح عمومی طور سے کہا جاتا ہے پرنالہ بہہ رہا ہے اور کہا جاتا ہے وادی بہہ رہی ہے لیکن حقیقۃ پرنالہ نہیں بہتا وہ تو اس میں پانی ہوتا ہے جو بہتا ہے اسی طرح وادی نہیں بہتی ہے بلکہ پانی بہتا ہے اور امام سکا کی نے اس شعر کو استعارہ مکنیہ کی جانب پھیر دیا ہے اور آنکھ کو عظمت و بزرگی میں بارش سے تشبیہ دی ہے اس لئے کہ بارش کا پانی تمام پانیوں میں سب سے زیادہ بلند رتبہ اور اشرف المیاہ ہے اسی طریقے سے آنکھ اشرف الاعضاء ہے تو شرافت و بزرگی وجہ شبہ ہے جو مشبہ اور مشبہ بہ میں جامع ہے پھر دعویٰ کیا گیا کہ مشبہ بہ کے دو فرد ہیں ایک فرد متعارف اور ایک فرد غیر متعارف، فرد متعارف بارش ہے اور فرد غیر متعارف آنکھ ہے پھر ذہن میں مشبہ بہ کا استعارہ کیا گیا اور وہ فرد متعارف ہے یعنی آنکھ کے لئے بارش فرد متعارف ہے اور پھر خارج میں آنکھ کو ذکر کیا گیا جو مشبہ اور فرد غیر متعارف ہے اور اس سے بارش مراد لی گئی پھر اس کو بطور شاہد و مثال مشبہ کی جانب سے پیش کیا گیا اور آنکھ کا بہنا (سیلان العین) امر وہمی ہے اور وہمی امر کی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے سرعت جریان میں (تیزی کے ساتھ بہنے میں) اور پھر اس لفظ کا ذکر کیا گیا جو مشبہ بہ پر دلالت کرتا ہے اور وہ ''سالتا'' ہے (بہا) جس سے مشبہ مراد ہے۔

اور مذہب جمہور بھی اس امر میں یہ ہی ہے کہ سرعت جریان میں آنکھ کو بارش سے تشبیہ دی جاتی ہے پھر آنکھ کے لئے بارش کا استعارہ کیا گیا ذہن میں اور پھر خارج میں مشبہ یعنی آنکھ کو ذکر کر کے مشبہ بہ مراد لے لیا گیا اور وہ استعارہ جو ذہن میں تھا اسکی جانب اشارے کے لئے '' ھمتا '' کو لایا گیا (تو) یہ اثبات تخییل ہے اور یہ استعارہ تخییلیہ اور 'همیان' (بہنا) مشبہ بہ (بارش) کے لوازم میں سے ہے۔

(ھمتا) جملہ ان کے قول (اکففا) کی جزا ہے اور یہ ہی بات (یهم) کے متعلق کہی جاتی ہے کہ یہ ان کے قول (ان قلت استفق) کی جزا ہے۔

''دل'' یہ صنوبر کے پھل کی شکل کا ہوتا ہے جو بائیں پسلی کے نیچے واقع ہوتا ہے اور ایمان وحیات کا سرچشمہ ہے۔

بعض عرفاء نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے پہلے روح پیدا کی پھر جسم کی تخلیق فرمائی پھر روح کو جسم کے ساتھ

شادی کرنے کا حکم فرمایا تو روح نے جسم کے ساتھ شادی کرلی جس سے اس کی دو اولاد ہوئیں نر اور مادہ تو دل نر ہے جو محل ایمان ہے دل روح کا تابع ہوتا ہے اور نفس مادہ ہے جو جسم اور شیطان کی تابع ہوتی ہے (اور اسی وجہ سے) نفس جائے فساد ہے جیسے کہ (قیاس میں) نتیجہ کمزور مقدمے کا تابع ہوتا ہے عرفاء کے اس قول کو اس حدیث نبوی ﷺ کی تائید حاصل ہے کہ (الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله، و اذا فسدت فسد الجسد كله، الا وهی القلب) یعنی: خبردار ہوجاؤ بے شک جسم میں ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے کہ جب وہ درست وصحیح رہتا ہے تو پورا جسم صحیح وسالم رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے ہوشیار ہوجاؤ وہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے۔

اور ان کا قول (استفق) استفاق مصدر سے امر کا صیغہ ہے جو " افق " کے معنی میں ہے یعنی استفاق، افاق کے معنیٰ میں ہے استفاق (از باب استفعال) افاق (از باب افعال) ہے اور 'استفاق' میں سین وجدان کے لئے ہے (یعنی بے دار ہوجاؤ) اور " یھم " " الھیمان " مصدر سے مشتق ہے وہ اصل میں " یھیم " تھا، ناظم کے قول (ان قلت استفق) کی جزا ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے، 'یھم' (ھام یھیم) سے حیران و پریشان ہونے کے معنیٰ میں ہے یعنی تحیر اور دہش کے معنیٰ میں ہے اور اس کی 'یا' کو جزم کی وجہ سے حذف کردیا گیا ہے۔

اس شعر میں ناظم ذی فہم کے قول (ھمتا) اور (یھم) کے درمیان جناس شبیہ بالمشتق ہے (ھمتا) فعل ماضی الھمیان مصدر سے اور (یھم) الھیمان مصدر سے ہے اس کو علم بدیع کی اصطلاح میں " جناس شبیه بالمشتق '' کہا جاتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول میں ہے ﴿ قال انی لعملكم من القالين ﴾ تو " قال " قول سے ہے اور (قالين) القلی سے ہے اور (قال) اور (القالين) کے درمیان جناس شبیہ بالمشتق ہے تو قول یہاں پر خطاب کے معنیٰ میں ہے اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ قول مصدر جب 'لام' حرف جار کے ذریعہ متعدی کیا جاتا ہے تو خطاب کے معنیٰ میں ہوتا ہے، جب 'فی' حرف جار کے ذریعہ متعدی کیا جاتا ہے تو اجتہاد کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور " علی " حرف جار کے ذریعہ کذب اور جھوٹ گڑھنے کے معنیٰ ہوجاتا ہے

اور جب 'با' کے ذریعہ متعدی ہوتا ہے تو بمعنیٰ حکم ہوتا ہے یعنی قال به اخذبه حکم به اور اسی طریقے سے کہا جاتا ہے کہ ''ابوحنیفۃ قال بکذا'' یعنی افتی بکذا یعنی امام اعظم نے اس کا حکم فرمایا اور قول مصدر کو 'با' کے ذریعہ متعدی ہونے میں کئی اور صورتیں ہوتی ہیں کہا جاتا ہے (قال برجله) یعنی اپنے پیروں سے چلا (قال براسه) یعنی اپنے سر سے اشارہ کیا (قال بثوبه) یعنی اپنا کپڑا اٹھایا (قال بالماء علی یده) اس نے پانی بہایا اور اپنے ہاتھ پر مل لیا۔

روحانی فوائد

ان تین اشعار کی خاصیت کا ذکر ابھی باقی رہ گیا ہے قصیدہ بردہ شریف کے شارح شیخ خرپوتی اپنے استاذ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ان تینوں اشعار کی خاصیت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی ناتجربہ کار جانور رہے (جس کو تم سدھانا چاہتے ہو اور وہ سدھ نہ رہا ہے تو تم ان تین شعروں کو ایک شیشے کے برتن میں لکھ دو اور اس شیشے کے برتن میں بارش کا پانی چلو بھر ملا دو اور پھر وہ پانی کو اس جانور کو پلا دو تو ضرور وہ جانور تمہارا فرمانبردار ہو جائے گا اور تمہارے قابو میں آجائے گا امام خرپوتی بیان کرتے ہیں کہ استاذی گرامی طول الله بقاه نے فرمایا کہ میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھا تو میں نے اس بات کو سچ پایا۔

ان اشعار کی دوسری خاصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ (اگر کوئی شخص ھکلا ہو اور اس کی ہکلاہٹ نہ جا رہی ہو) تو وہ ان اشعار کو کسی ہرن کے گردن پر لکھ دے اور اس شخص کے بازو پر باندھ دے جس کی زبان میں لکنت ہے تو ضرور انشاءاللہ اس کی زبان کی لکنت جاتی رہے گی اور وہ انشاءاللہ فصیح اللسان ہو جائے گا۔

میں چاہتا ہوں کہ شاعر کے قول (اکففا) کے متعلق گفتگو کو پورا کر دوں لیکن باقی ماندہ کلام پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ گزشتہ اسباق کو آپ پر راز بر کر دوں جس کو میں نے ماسبق میں ذکر کیا کہ (الکف) لازم اور متعدی دونون استعمال ہوتا تو لازم ہونے کی صورت میں الامتناع (رکنے) کے معنی میں ہوگا اور متعدی استعمال ہونے کی صورت میں (المنع) کے معنی ہوگا۔ تو ناظم کا قول (اکففا) بر تقدیر لازم کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اے آنکھوں

تم رونے سے باز آجاؤ رک جاؤ'' اور بر تقدیر متعدی معنی ہوگا'' اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک لو'
اس پر یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ حق کلام تو یہ ہے کہ " کـفـا " بالا دغام کہا جائے نا کہ " اکـفـفـا' فک ادغام کے ساتھ؟

اس اعتراض کا جواب ہم یوں دیتے ہیں کہ یہ صورت حال پیچیدہ اور دشوار کن ہے اس لئے کہ یہاں (اکــفـفــا) میں فک ادغام ضرورت شعری کی بنیاد پر ہے اور ضرورت شعری کی بنیاد پر فک ادغام کرنا جائز ہے جیسا کہ کسی شاعر نے اپنے اس شعر میں ان امور کو جمع کر دیا ہے جو کہ ضرورت شعری کی وجہ سے قابل معاف ہیں:

اشباع تحريك وفك لمد غم   وتذكير تانيث و عكسه بندرة

(اور وہ امور یہ ہیں: (۱) حرکت کو زیادہ کرنا، (۲) فک ادغام کرنا (۳) مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر کرلے آنا۔ یہ صورتیں ایسی ہیں جو ضرورت شعری کی بنیاد پر معاف ہوجاتی ہیں اور ایسا کمی کے ساتھ ہوتا ہے۔)

مجھے یہاں اس موقع پر " کف " کے متعلق ایک عربی مثل یاد آرہی ہے مثل بیان کی جاتی ہے (خيـر النـاس من كف فكـه وفك كفه، و شر الناس من كف كفه و فك فكه) بہترین انسان وہ ہے جو منہ بند رکھے اور ہاتھ کھول دے اور بدترین انسان وہ ہے جو ہاتھ بند کرلے اور زبان کھول دے۔) یعنی لوگوں میں سب بہتر وہ شخص ہے جو اپنی زبان کی حفاظت کرے اور خاموش رہے یعنی کثرت کلام سے باز رہے اسی طریقے کی بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمائی " قل خيرا والا فاسكت " اوكما قال ﷺ)

" فك كـــفـــه " کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو بھلائی کے لئے دراز کرے یعنی نیک کاموں میں خرچ کرنے میں سبقت کرے۔ اور لوگوں میں سب سے بد انسان وہ ہے کہ جو اس کا برعکس ہو کہ اپنے ہاتھ کو روکے اور مال سے بخل کرے اور نیک راہ میں خرچ نہ کرے۔

ناظم شعر کے قول (اكـففا) اور (همتا) میں علم بدیع کی ایک صنعت ہے جس کو 'طباق " کہتے ہیں دو معنی متقابلہ کے درمیان جمع کرنے کو طباق کہتے ہیں اس لئے کہ " اكـففا " " امتنعا " (رک جا) اور " امنعا " (روک لے)

کے معنیٰ میں ہےاور" ھمتا" سالتا (بہایا) کے معنیٰ میں ہےتو'' آنکھوں کا رکنا یا آنکھوں کو آنسو بہانے سے روکنا'' اور'' آنسو بہنا'' یہ دونون مفہوم متقابل (یعنی معنی متقابلہ) ہیں تو اس میں بایں معنیٰ صنعت طباق موجود ہے۔

توجب مسئول نے سائل کے سوال کا جواب نہیں دیا تو عاشق سے اس کی آنکھوں اوراس کے دل کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ تیری آنکھوں اور تیرے دل کو کیا ہوگیا ہے کہ تیری آنکھیں اتنا کیوں رورہی ہیں اور تیرا دل متحیر و پریشان کیوں ہے؟ اور جب تو ان کو اس سے باز رہنے کے لئے کہتا ہے تو وہ تیرے حکم کو بجا نہیں لاتیں بلکہ آنکھیں بے انتہا آنسو بہارہی ہیں اور دل عشق و وارفتگی میں بے انتہا مصر ہے۔ تو جب مسؤول خاموش رہا اور جواب نہ دے سکا تو سائل نے اس کی بات کو منظور نہ کرتے ہوئے اوراس کے انکار کارد کرتے ہوئے رجوع کیا۔ اور کہا:۔

(٤) ایحسب الصب ان الحب منکتم ما بین منسجم منه و مضطرم

ترجمہ: کیا عاشق کا یہ گمان ہے کہ عشق ومحبت چھپنے والی چیز ہے؟ جوش عشق کی وجہ سے بہنے والے آنسوؤں اور دل بے قرار کی موجودگی میں۔

تشریح: " ایحسب" سین کے کسرہ اور فتح دونوں طرح مستعمل ہے یعنی" ایحسب" بمعنیٰ" ایظن" ہے (کیا وہ گمان کرتا ہے) اور " الصب" عاشق ومحبّ اور دیوانہ وفریفتہ کے معنیٰ میں ہےاور 'الصب' یہاں ایسی صفت ہے جس پر اسمیت کا غلبہ ہےاس لئے کہ الصب کا معنیٰ انڈیلنا، بہانا ہےتو عاشق کی تعبیرُ الصب " سے اس لئے کردی گئی کیوں کہ عاشق بہت آنسو بہاتا ہے، ایحسب الصب (ان الحب) میں" ان الحب" محل نصب میں" ایحسب" کا مفعول ہے اور الحب (عشق و وارفتگی) یہ طبعی اوردلی رجحان ورغبت ہے کسی چیز کی طرف جیسا کہ پیاسا پانی کی جانب راغب ہوتا ہے منکتم باب انفعال سے صیغہ اسم فاعل ہے جو مستتر اور مختف (چھپنے والا) کے معنیٰ میں ہے یعنی کیا عاشق یہ سمجھتا ہے کہ محبت چھپنے والی شئ ہے (ڈھکنے والی، پوشیدہ

ہو جانے والی چیز ہے) بہنے والے آنسوؤں کی موجودگی میں اس کی لفظی صورت یوں ہوگی" ایحسب الصب ان الحب منکتم ای مستتر ومختف مابین دمع منسجم" (منسجم) بمعنیٰ سائل ہے (بہنے والی) یہ موضع صفت میں ہے جس کا موصوف محذوف ہے جو" دمع" (آنسو) ہے تو 'منہ' میں ضمیر یا تو راجع بسوئے" الصب" ہے یا راجع بسوئے" الحب" ہے تو اگر اس کو راجع بسوئے 'صب' مانا جائے تو 'من' ابتدائیہ ہوگی اور اگر ضمیر کو راجع بسوئے 'حب' فرض کرلیا جائے تو" من" سببیہ ہوگی سبب کا فائدہ دینے کی وجہ سے گویا کہ عبارت یوں ہے" ایحسب الصب ان الحب منکتم مختف مابین دمع منسجم و حر قلب مضطرم" (کیا عاشق یہ خیال کرتا ہے کہ محبت ڈھکنے چھپنے والی شئ ہے، بہنے والے آنسو اور جلنے والے دل کی گرمی کے درمیان)

مضطرم، الضرام مصدر سے (الاحتراق) جلنے کے معنیٰ میں ہے، اور مفتعل کے وزن پر اسم فاعل کا صیغہ ہے، 'تا' ضاد' کے بعد واقع ہوئی اس کو" طا" سے بدل دیا گیا مضطرم ہوگیا۔ مضطرم، قلب کی صفت ہے اور یہاں پر مضاف محذوف ہے۔ مقام اس کے حذف کو تصحیح کلام کی وجہ سے چاہتا ہے اس لئے کہ ناظم شعر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ عشق، بہنے والے آنسوؤں اور دل بے قرار کے درمیان پوشیدہ ہے پھر اس سے استفادہ کیا کہ محبت دو چیزوں کے درمیان ہے اور یہ توسط چاہتا ہے کہ عشق خارج از قلب ہو باجود اس کے کہ عشق دل سے خارج نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ عشق کا مسکن و محل دل ہے تو اگر ہم کلام کو اس کے ظاہری معنیٰ پر جاری کردیں تو معنیٰ فاسد ہوجائے گا اسی وجہ شارح نے یہاں پہ مضاف کو محذوف مانا ہے اور افادہ کیا کہ کلام میں مضاف کو مقدر مانا گیا ہے اس کی تقدیر یہ ہے" مابین دمع عین منسجم و حر قلب مضطرم" اضطرام قلب کی دلالت عشق و محبت پر اس کے لوازم کے سبب سے ہے یعنی عاشق کے ساتھ جو چیزیں لزومی طور سے ملحق ہوجاتی ہیں مثلا چہرے کی زردی، اس کے حال کا تغیر بدن کی کمزوری ناتوانی جسم وغیرہ کہ یہ ساری چیزیں عاشق کے لوازمات میں سے ہیں تو یہ" الاستدلال بالمسبب علی السبب" کی قبیل سے ہے۔

اس شعر میں خطاب سے غائب کی جانب التفات ہوتا ہے اسی اعتبار سے ناظم شعر نے کہا (ایحسب الصب) تو تمام کی تمام صورت حال دوسری قبیل سے ہے یعنی التفات من الخطاب الی الغیبة، کی قبیل سے۔
ظہیر اردبیلی شاعر کا یہ شعران دونوں شعروں کے مناسب ہے (یعنی اس شعراوراس سے پہلے والے شعر کے) ظہیر اردبیلی کہتے ہیں:

طـرفـی و قلبی ذایسیل دمـا و ذا　　دون الـوری انـت الـعـلیم بفرحـه

وهـمـا بـحبك شـاهـد ان و انـمـا　　تـعـدیـل كـل مـنهـمـا فی جـرحـه

ترجمہ: میری آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور میرا دل آگ کے شعلوں کے نیچے ہے یعنی میرا دل بھی یادِ محبوب میں جل رہا ہے، تم اس کی خوشی سے باخبر ہو اور وہ دونوں (دل اور آنکھ) تیری محبت پر گواہ ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی حالت کی تبدیلی فراق محبوب کے زخم میں ہے (یعنی میرے آنکھ اور میرے دل کی یہ حالت فراق محبوب کے زخم میں بدلی ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے)

میں چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ امور کا ذکر کر کے کلام کو پورا کردوں۔ (منسجم) میں تنوین تکثیر کی ہے، شاید میں گزشتہ اوراق میں بیان کر چکا ہوں کہ 'منسجم' بمعنیٰ سائل ہے۔ اور 'مضطرم' میں تنوین تعظیم کی ہے مضطرم۔ ملتهب (آگ بھڑکنا) کے معنیٰ میں ہے اور گزر چکا کہ مضطرم میں 'طا' تائے افتعال کی مبدلہ ہے۔

ناظم شعر کا قول (مابین منسجم منه و مضطرم) میں 'ما' یا تو زائدہ یا نکرہ ہے اور منکتم کی صفت ہے یا پھر یہ 'ما' موصولہ ہے۔ 'ما' کے موصولہ ہونے کی صورت میں 'ما' صفت ہوگا یا حب کا بدل ہوگا اور (ما بین منسجم و مضطرم) کو ظرفیت کی بنیاد پر محل نصب میں بھی کہا جا سکتا ہے یعنی ایسی جگہ پوشیدہ ہے جو بہنے والے آنسو اور جلنے والے دل کے درمیان ہے اور یہ بھی گزر چکا ہے 'منه' میں ضمیر یا تو عاشق (الصب) کی جانب راجع ہے یا عشق (الحب) کی طرف لوٹ رہی ہے پہلی صورت میں 'من' ابتدائیہ ہوگا حب راجع بسوئے

'صب' ہواور دوسری تقدیر پر 'من' سبیہ ہوگا جب راجع بسوئے 'حب' ہواور 'منه' یا تومنسجم کی صفت ہے یا تو منسجم سے حال واقع ہے۔

ایضاح مرام کے لئے میں چاہتا ہوں کہ کچھ باتوں کا سوال وجواب کے طور پر اعادہ کردوں:

سوال: شارح نے مضاف کومقدر کیوں مانا؟ اور یہ کیوں کہا کہ ان کے قول (مابین عین منسجم) میں ''دمع' مضاف ہے اور " عین منسجم " ترکیب توصیفی ہوکر مضاف الیہ ہے؟

جواب: شارح نے یہاں پر اس جانب اشارہ کرنے کے لئے تقدیر ظاہر فرمائی ہے کہ منسجم' "عین' کی صفت ہے اور 'دمع' کو عین کی جانب مضاف مانا اس لئے کہ مقام اس تقدیر کو چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ باب خوب روشن ہے کہ آنکھ نہیں بہتی بلکہ آنسو بہتا ہے اسی وجہ سے شارح نے مضاف کو مقدر مان کر کہا کہ تقدیری عبارتی یوں ہے:" ما بین دمع عین منسجم اور یہی بات دوسری والی صورت یعنی حر قلب مضطرم" میں جاری ہے، شارح نے یہاں پر بھی مضاف کو مقدر مانا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ مضطرم، قلب کی صفت ہے اور تقدیری عبارت یوں ذکر کی" ما بین دمع عین منسجم و حر قلب مضطرم" اس لئے کہ شارح نے دعویٰ کیا تھا کہ عشق بہنے والی آنکھ کے آنسو اور جلنے والے دل کی گرمی کے درمیان پوشیدہ ہے تو یہ توسط اس تقدیر کا متقاضی ہے کما لا یخفیٰ۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ٥

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل اول کے پانچویں شعر کی شرح کی جارہی ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵) لولا الهوی لم ترق دمعا علی طلل　　ولا ارقت لذکر البان و العلم

ترجمہ:۔اگرتمہارے دل میں محبت نہ ہوتی تو تم ویرانوں اور کھنڈروں پر آنسو نہ بہاتے اور نہ ہی شجر بان اور کوہ سار کو یاد کرکے رات بیخوابی میں گزارتے۔

ربط : گویا عاشق اس گمان میں ہے کہ اس کا عشق اور اس کی محبت سائل سے کوئی حیلہ بہانہ بنا کر چھپ سکتی ہے تو عاشق یہ گمان کرکے گویا سائل سے کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے انکار کو تسلیم کرر ہا ہوں لیکن میں عاشق یا کوئی فریفتہ نہیں ہوں، تمہارے پاس اس پر کیا دلیل ہے؟ تو سائل دوسری دلیل کی طرف منتقل ہوکر اور استدلال کو مکمل کرتے ہوئے کہتا ہے:

لولا الهوى لم ترق دمعا على طلل ولا ارقت لذكر البان و العلم

تشریح: یعنی اگر نہیں ہے "هوىٰ" (عشق) تجھ میں موجود تو تو آنسو کیوں بہا رہا ہے (تو آنسو نہ بہاتا) 'لم ترق' نفی حجد بلم مضارع الاراقۃ مصدر باب افعال سے ہے۔اور یہ 'الصب' (پانی بہانا) کے معنیٰ میں ہے۔ لم تصب دمعا على طلل يعنى فى طلل۔

(ولا ارقت) اور نا ہی تو رات بھر شجر بان کو یاد کرکے جاگتا رہتا یعنی 'بان' کے درخت کی یاد کی وجہ سے اس لئے کہ 'لام' یہاں پہ تعلیل کا ہے ان کے قول (لذكر البان و العلم) میں 'البان' ایک عربی پیڑ کا نام جس کا ذکر عاشقوں کے اشعار میں بہت ملتا ہے اس کا ذکر وہ ایسے جملے میں کرتے ہیں جو انہیں محبوب کے معاہدے کی یاد دلاتا ہے، تو 'بان' عاشقوں کا پیڑ ہے (العلم) پہاڑ یا اونچے پہاڑ کے معنی میں ہے۔اور اس کا ذکر بھی ایسے جملے میں ملتا ہے جس میں شعراء محبوب کے وعدوں کا ذکر کرتے ہیں (لولا) ایسا حرف ہے جو امتناع شئی لوجود غیرہ کے معنیٰ میں ہے یعنی اگر تیرے دل میں محبت موجود نہ ہوتی تو ضرور تو آنسو بہانے سے باز رہتا اور ضرور تو رک جاتا لیکن تو نے ایسا نہیں کیا اور تو آنسو بہانے سے باز نہ آیا بلکہ تو آنسو بہاتا رہا اور تیرے یہ آنسو آثارات وعلامات اور ہوا کے چلنے اور لمعۂ برق کو یاد کرنے کی وجہ سے بہہ نکلے۔اور یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ (تیرے دل میں) بے انتہا محبت ثابت وموجود ہے۔اور وہی عشق تیرے صبر اور تیرے بے غم ہونے میں مانع ہے۔

(لو لا) جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ ایسا حرف ہے جو امتناع شئی لوجود غیرہ کے معنی میں ہے۔تو (لو لا) 'لو' اور 'لا' سے مرکب ہے اور یہ ایسا کلمہ ہے جس کا دخول مبتدا اور خبر محذوف پر لازمی ہے اور اس 'لو لا' شرطیہ کا جواب (لم ترق دمعا علی طلل) ہے جیسا کہ میں نے ابھی گزشتہ سطور میں کہا کہ " لو لا " کا دخول مبتدا پر لازم ہے تو مبتدا یہاں پر " الھویٰ " ہے اور اس کی خبر محذوف '' موجود " ہے اور پھر اس کا مجزوم اس کے قائم مقام ہو گیا اور وہ مجزوم (لم ترق دمعا علی طلل) ہے۔

ناظم ذی فہم نے دلیل مذکور کے معاً بعد دوسری دلیل کا ذکر کی یعنی گزشتہ دلیل کے پیچھے اسی کے متصل دوسری دلیل لائے اور وہ دوسری دلیل یہ ہے (ولا ارقت لذکر البان و العلم) گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ 'بان' اور 'علم' عاشقوں (کے ملنے) کی جگہیں ہیں۔"بان" ایک شجر ہے "علم" پہاڑ یا اونچا یا اور بلند پہاڑ کے معنیٰ میں ہے۔اس شعر میں یہ بھی ممکن ہے کہ ناظم شعر نے 'شجر بان' اور 'جبل علم' کو مخصوص بالذکر محبوب کی مشابہت کی وجہ سے کیا ہو جس کے دل میں ان کی یاد ہیجان بپا کی ہوئی ہے اور جس کے قلب میں اس کی محبت جوش مار رہی ہے ناظم شعر نے ان دونوں کو طول قامت میں اپنے محبوب کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے شجر بان اور جبل علم سے تشبیہ دی تو 'بان' اور 'علم' کا ذکر 'طول قامت حسن ھئیت اور لطیف الرائحہ میں بطور تشبیہ محبوب کے لئے کیا ہے۔

ناظم شعر نے شجر بان' اور کوہ علم' کا ذکر' سھر' یعنی بے خوابی کے پیچھے صرف اس لئے کیا کیوں کہ عاشق کے دماغ میں رطوبت عشق و وارفتگی سے پیدا ہونے والی حرارت کی کثرت کی وجہ سے ختم وفنا ہو گئی ہے۔اسی وجہ سے ناظم شعر نے 'سھر' یعنی بے خوابی کے بعد ان دونوں کی یاد کا ذکر یوں کیا (ولا ارقت لذکر البان و العلم) اور نا ہی تو شجر بان اور کوہ علم کو یاد کر کے پوری رات بے خوابی میں گزارتا) تو رات بھر جاگنے کی وجہ رطوبت کا دماغ سے ختم ہو جانا ہے اور وہ رطوبت حرارت کی وجہ سے دماغ میں پیدا ہونا بند ہوئی ہے اور حرارت عشق کے سبب پیدا ہو رہی ہے اس لئے کہ عادۃ ایسا ہوتا ہے کہ نیند رطوبت کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے آتی ہے تو جب رطوبت دماغ

میں زیادہ ہوجاتی ہے تو وہ وہاں جم جاتی ہے جس کی وجہ سے نینداوراونگھ پیدا ہوتی ہے اسی وجہ سے حرات سوتے وقت جسم کے اندرونی حصہ کی جانب پلٹ جاتی ہے اوراس کی بڑی وجہ زیادہ کھانا پینا ہے کیونکہ اس کے ہضم میں حرارت مشغول ہوتی ہے اوراسی وجہ سے وہ جم جاتی ہے اور نیندآ جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح وہ عاشق جس کواس کے عشق نے کھانے پینے سے غافل کردیا ہے جس کی وجہ سے اس کے دماغ کی رطوبت معدوم اورسوزش عشق کی وجہ سے طبعی اورفطری حرارت زیادہ ہوگئی ہے تو رطوبت کا دماغ میں پیدا ہونا بند ہوگیا اوراسی وجہ سے عاشق کو نیند نہیں آرہی اور ساری رات بے خوابی میں گزاررہا ہے بالخصوص اس وقت نیند سے بے خواب ہوجاتا ہے جب اسے محبوب سے ملاقات کی جگہ کی یاد ستانے لگتی ہے یا وہ جگہ جوان کے مشابہ ہے۔ میں بیان کرچکا کہ (لـذكـر البان) میں 'لام 'تعلیلیہ ہے اور (الهوىٰ) میں 'الف لام' یا تو جنسی ہے یا پھر عہدی (الف لام جنسی ماننے کی صورت میں اس کا معنی ہوگا لـو لا جـنـس الحب ، حقيقة الحب، ماهية الحب" اورالف لام عہدی ماننے کی تقدیر پر معنیٰ ہوگا "لو لا هواك" ۔ یہاں پر ابھی ایک بات باقی رہ گئی ہے جس سے میں قارئین کرام کوآ گاہ کرادینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ سید محمد علی علان صدیقی مکی صاحب" الـذخـر و العدة" اس شعر کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں"لو لا الهوىٰ موجود لديك لم ترق ، اى لم تصب دمعا على طلل اى فى طلل منسوب للاحبة ان قدر انه راه يبكى فيها! وفيه تكلف، والا فهى للتعليل (ص۱۰۵)

ترجمہ:۔ اگر تیرے دل میں محبت نام کی کوئی چیز موجود نہ ہوتی تو تو ویرانوں اور کھنڈروں پر آنسو نہ بہاتا یعنی ان کھنڈرات میں آنسو نہ بہاتا جو محبوب سے منسوب ہیں اگر یہاں پہ مصرعہ میں " انـه راہٗ يبـكى فيها" کو مقدر مانا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ " تو کھنڈرون اور ویرانون میں آنسو نہ بہاتا لیکن ایسا کرنے میں تکلف ہے ورنہ تو وہ لام تعلیل کا ہے۔ (ص۱۰۵)

اقـــول: شارح نے جس تکلف کا دعویٰ کیا ہے نفس الامر میں وہ مناسب نہیں اور ظاہر یہی ہے کہ شیخ سے یہاں تسامح واقع ہوا ہے اوراسی وجہ سے انہوں یہ اعتراض وارد کیا اور " انـه راہٗ يبكى فيها" پر اعتراض کی بنیاد رکھی

جبکہ یہ بات بالکل معلوم شدہ ہے کہ ان تمام اشعار میں ناظم شعر نے اپنے دل میں ایک شخص کو تصور کر رکھا ہے اور ان اشعار کے مضمون سے وہ اس سے مخاطب ہیں اور یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان میں سب تخیلات اور تصورات کی باتیں ہو رہی ہیں بالکل اسی طرح ناظم شعر نے یہاں پہ ایک شخص کا تصور کر رکھا ہے کہ اگر تو عاشق نہ ہوتا اور تیرے دل میں محبت نام کی کوئی چیز موجود نہ ہوتی تو تیری ہرگز یہ حالت زار نہ ہوتی ایسا لگتا ہے کہ جیسا تو ویرانوں اور کھنڈرون میں روتا پھرتا ہے یہ سب مبالغہ کہلاتا ہے جو محسنات شعر میں سے ہے۔

شاعر ذی فہم مزید دو شعر تیسری دلیل کے طور پر لائے، فرماتے ہیں:

(٥) ولا اعارتك لو نی عبرة وضنی   ذکریٰ الخیام و ذکریٰ ساکن الخیم

(ترجمہ: خیموں اور خیموں والوں کی یاد نے تجھے غمی اور لاغری کے دو کپڑے بطور عاریت نہیں پہنائے (بلکہ وہ تیرے دائمی لباس ہو گئے ہیں۔)

یہ شعر صرف سید محمد علی بن علان صدیقی مکی کی شرح کردہ نسخے میں پایا جاتا ہے ورنہ تو قصیدہ بردہ شریف کے تقریبا سبھی نسخے اس شعر سے خالی ہیں۔

(ولا اعــارتك) یعنی اس نے تجھے بطور عاریت غمی اور لاغری کے دو کپڑے نہیں دیئے، اس شعر میں 'لونین' سے بطور تشبیہ دو کپڑے مراد ہیں تو یہاں پہ مشبہ بہ، مشبہ کی جانب مضاف ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے (احجــار نـاس) یعنی لوگ پتھروں کی طرح ہیں (مثل سنگ ہیں) اس میں 'احجار' مشبہ بہ کی اضافت 'ناس' مشبہ کی طرف کی گئی ہے بالکل اسی طرح یہاں 'لونی' مشبہ بہ مضاف ہے اور عبرة وضنی مشبہ مضاف الیہ ہیں۔ اور وہ حالت جو اشک و غم سے پیدا ہوئی اس کو دو لباسوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور ناظم شعر کے قول 'ذکری الـخیام و ذکری ساکن الخیم" میں " الذکریٰ "بمعنیٰ تذکر (یعنی یاد کرنے کے معنی میں ہے) اور ان کے اس مصرع میں 'استـعـاره' ہے 'ذکـر' کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو تقدیری عبارت یوں ہوگی و لا اعارتك ذکریٰ یعنی خیموں اور خیموں میں رہنے والوں کی یاد

نے تجھے نہیں دیا اوران کی یاد نے تجھے کمزوری اورغمی کے دو کپڑے نہیں پہنائے ناظم شعر کے قول 'لونی عبرة وضنی' کی شرح میں شارح نے 'استعارہ مکنیہ کا ذکر بایں معنی کیا ہے کہ عاشق وفریفتہ کی حالت کولباس سے تشبیہ دی ہے۔اورمشبہ بہ کی جانب (اعارتك) سے اشارہ کیا ہے تو ناظم شعر کے قول " لونی عبرة وضنی " میں 'استعارہ بالکنایہ موجود ہے اس لئے کہ انہوں نے 'مشبه به' کا ذکر کر کے 'مشبه' مرادلیا ہے اوراس کی جانب اپنے قول " اعارتك " سے کنایہ کیا یہی استعارہ تخیلیہ ،کہلاتا ہے لیکن میراخیال یہ ہے کہ یہاں 'استعارہ' نہیں ہے اس لئے کہ (اس مصرع میں 'مشبه 'اور'مشبه به' دونوں ناظم شعر کے قول (لونی عبرة وضنی) میں موجود ہیں،لونی مشبہ بہ ہے اور " عبرة وضنی " مشبہ بلکہ 'استعاره مكنيه' ان کے قول (ذکریٰ) میں کہا جاسکتا ہے، 'ذکریٰ' کو اس شخص سے تشبیہ دی ہے جو دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اوراس کے لئے 'اعارت' کو ثابت کیا ہے مشبه به کی جانب کنایہ کرنے کی وجہ سے اور معنی یہ ہے کہ نہیں دیا تجھے خیمے اور خیمے والوں کی یاد نے تجھے نہیں دیا اور تجھ میں وہ حالت نہیں پیدا کی جو اشک وغم کے نتیجے میں ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ٥

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰ له و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

ربط: سائل نے جب عاشق کے شدت عشق وفریفتگی کے اثبات میں مضبوط دلائل قائم کردیئے اور عاشق کے لئے جب عذر وانکار کے سارے دروازے بند ہو گئے تو سائل حیرت واستعجاب کے کلمات سے عاشق سے مخاطب ہو کر یوں کہہ رہا ہے:

(٦) فکیف تنکر حباً بعد ما شهدت   به علیك عدول الدمع و السقم

ترجمہ: تو پھر تو محبت سے کیسے انکار کرسکتا ہے جب کہ تیرے خلاف اشک چشم اور بیماریٔ عشق جیسے دو معتبر گواہ گواہی

دے چکے ہیں۔

تشــریــح: یہاں پرخطاب تعجب پرمبنی ہےاورشارحین کی ایک جماعت اسی بات کی قائل ہےاور (اصـل) و (عـضد) نےبھی یہ ہی فرمایاہے" اصل" سےمرادامام قسطلانی ہیں اپنی تصنیف'' مشـارق الانوار" میں" عضد" سےعلامہ عضدالدین شیرازی شافعی مراد ہیں صاحب" اصل وعضد" نےفرمایا کہ خطاب انکاری ہے اوراستفہام یہاں پرانکار کے لئے ہےتوان دونوں حضرات کےاقوال کی بنیاد پرمعنیٰ یہ ہوگا کہ ناظم شعر نے اپنے دل میں ایک ایسے شخص کوتصور کررکھا ہے جومحبت کا انکار کررہاہےاور وہ اس کےمحبت وفریفتگی پرمتعدد دلائل قائم کررہے ہیں تو جب وہ اپنے دعویٰ محبت کواس متصور ومتخیل شخص پرثابت کرلے گئے تو پھر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئےاوراس کے بیانوں کوردکرتے ہوئے استفہام انکاری سےاس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

فكيف تنكر حباً بعد ما شهدت ‏ ‏ ‏ به عليك عدول الدمع و السقم

لفظی تشریح: شعرمیں " فا" افادۂ ترتیب کے لئے ہےیعنی یہ استفہام ماقبل پرمرتب ہے(کیف)محل نصب میں ہےاور (تنکر) سےحال واقع ہے (کیف تنکر) کا مطلب یہ ہے کہ کیسےتوانکارکررہااور کیسےتو جہل کا اظہار کررہاہےاورایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تو محبت سےانجان ہو؟(بـعـد ماشهدت) یعنی''بعداس کے کہ خبرمتأ کداورمتحقق طور پردی جاچکی ہےاس بارے میں اور " دمـع" و" سـقـم" (آنسواور بیماری)ان دو گواہوں کی شہادت کے بعداس کاانکارکرنا صحیح نہیں ہے۔(الـعـدول)عدل کی جمع ہے،اوروہ اصل میں مصدر ہےاورمشہورقاعدہ ہے" الـمـصـدر لايثـنـى ولا يـجمع" (مصدرکی ناتثنیہ آتی ہےناجمع)لیکن کبھی مصدرکو مصدریت سےنکال کر ذات کےلحاظ سےجمع لےآیاجاتا ہے۔توایسے ہی یہاں عدل مصدرمنقول ہوگیا ہےاور اب منقول ہونے کے بعدنحویوں کی اصطلاح میں اسے''فاعل'' کہاجاتا ہےیعنی وہ جس سےعدل قائم ہوا،عدل قائم کرنے والا۔یہ بطورمبالغہ ہےجیسا کہ کہاجاتا ہے (زيـد عــدل) یعنی زیدسراپاعدل ہےتواس کو 'دمـع' وسقم' کی مناسبت سےمصدریت سےنقل کرکےجمع کردیا گیاہے۔

اور یہاں عـدول جمع سے مراد مافوق الواحد ہے اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمع لائی جاتی ہے لیکن اس سے جمع حقیقی مراد نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سے مـافـوق الواحد مراد ہوتا ہے جیسا کہ یہاں پر بھی جمع سے مراد " مـافوق الواحد" ہے اس لئے کہ دمع و سقم تثنیہ ہیں۔(الدمع) یہ آنکھوں سے بہنے والا آنسو ہے اور (السقم) یہ مرض ہے جو بدن کو لاحق ہوتا ہے تو (الدمع) و (السقم) میں الف لام عہدی ہے۔

علامہ عضدالدین نے فرمایا کہ عدول میں " استـعـاره مكنيه " ہے بایں معنیٰ کہ ناظم شعر نے دمع و سقم کو عدول سے تشبیہ دی ہے اور دمع و سقم (مشبه) کا ذکر کرکے مشبه به مراد لیا ہے اور مشبه به کی جانب اشارہ ''شہادت'' سے کیا ہے جو اس کے لوازم میں سے ہے تو اثبات شہادت استعارہ تخیلیہ ہے اور استعارہ تخیلیہ کے بعد اسی کے متصل استعارہ مکنیہ کا ذکر کیا جو عـدول میں ہے جو کہ پہلے مصدر میں جاری ہوا اور پھر مصدر کی تبعیت میں فعل میں بھی جاری ہو گیا لہذا وہ استعارہ تبعیہ تخیلیہ ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔

صاحب " الذخر و العدة " نے اپنے قول (كذا قال) کے بعد تأمل کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا (فتأمل) شاید تامل کی وجہ یہ ہے کہ استعارہ میں مشبه اور مشبه به دونوں ایک ساتھ مجتمع نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا پوشیدہ رہنا ضروری ہے یا تو مشبه مضمر ہو اور مشبـه به ظاہر ہو یا پھر مشبـه به مضمر ہو اور مشبه ظاہر ہو لیکن یہاں پر ایسا نہیں ہے بلکہ مشبه اور مشبه به دونوں اس ترکیب میں موجود ہیں اس لئے کہ (عدول الدمع و السقم) یہ " اضـافة المشبه به الى المشبه " کے باب سے ہے اس لئے کہ (عدول یہ مشبه به اور مضاف ہے اور (الدمع و السقم) یہ مشبه اور مضاف الیہ ہیں) تو شاید یہی وجہ تامل ہو۔

اس شعر میں انکار، شہادت اور عدول کے درمیان جمع ہے اسی کو فن بدیع کی اصطلاح مین 'مـراعـات الـنظير ' کہا جاتا ہے۔ناظم شعر عدول جمع لائے اور اس کو مصرع میں یوں ذکر کیا (عدول الدمع و السقم) جب کہ 'دمع وسقم ' کے افراد کا لحاظ کر کے ' عدول ' کے بجائے ' عدل الدمع و السقم ' کہنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ جمع لائے اس کی وجہ یہ ہے کہ 'دمـع ' یعنی آنسو یہ متعدد اوقات میں حاصل ہوا ہے اور 'ســقـم ' یعنی

بیماری یہ بھی مستمر اور جاری ہے اوراس کی تحصیل بھی کئی وقتوں میں ہورہی ہے تو اوقات متعددہ کو ذوات متعددہ کی منزل میں اتاردیا گیا (گویا کہ یہ کئی ذات ہیں) اوراسی وجہ سے انہوں نے عدل کے بجائے عدول الدمع و السقم کہا۔

روحانی فوائد

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ ان چھ اشعار میں یہ وہ پہلا شعر ہے جس کو سماعت فرمانے کے بعد آقائے دو عالم ﷺ نے تمایل فرمایا تھا جس وقت امام شرف الدین بوصیری نے اسے عالم رویا میں حضور کے سامنے پڑھا تھا تو قاری کو چاہئے کہ کسی بھی ضرورت اور حاجت برآری کے لئے اس شعر کو تین مرتبہ پڑھ لیا کرے۔ (انشاء اللہ اس کی حاجت پوری ہوگی) جیسا کہ اس قصیدۂ مبارکہ کے شارح علامہ جعفر پاشا نے فرمایا ہے۔

یا اللہ ہمیں گمراہ وبدعقیدہ اور نفسانی خواہشات میں گرفتار لوگوں کے زمرے میں نہ کر بلکہ ہمیں ان خوش نصیب وفروز بخت حضرات کی جماعت میں کر جن کے سینے تیرے نبی کے عشق سے مملو ہیں اور جن کی آنکھیں ہر وقت عشق مصطفےٰ میں بہا کرتی ہیں۔ (آمین) (ص ۲۰۔۲۱)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدۂ مبارکہ کے فصل اول کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷) و اثبت الوجد خطی عبرۃ وضنی　　　مثل البھار علی خدیك والعنم

ترجمہ: غم عشق اور حزن قلبی نے تیرے دونوں رخساروں پر گریہ وزاری اور لاغری کے دو نشان (خط وعلامت) مثل گل بہار اور شاخ عنم کے ثابت کردیئے ہیں۔

تشریح:۔ (اس شعر کا تعلق ماقبل شعر سے ہے) یعنی " اثبت " کا " شهدت " پرعطف ہے۔معنیٰ یہ ہے کہ (دو عادل گواہوں کی گواہی کے بعد) اورغم وحزن کا تیرے رخساروں پرگریہ وزاری اور لاغری کے دونشان نقش کردینے کے بعد (جب تیرا عشق ثابت ہوگیا تب پھر تو کیسے منکر عشق ہوسکتا ہے؟) اس تقدیر سے خوب ظاہر وواضح ہوگیا کہ (اثبت الوجد") جملہ معطوفہ ہے (شهدت) پراور اسی طریقے سے یہاں اس شعر کے شروع میں 'ما' مصدریہ ہے جس پر ' بعد' داخل ہے یعنی " بعد ما" بھی مقدر ہے گویا عبارت یوں ہے" بعد ما شهدت به عليك العدول من الدمع و السقم وبعد ما اثبت الوجب خطى عبرة و ضنى" (فكيف تنكر حبا)

(الوجد) حزن قلبی اور سوزش دل کو کہتے ہیں (خطى عبرة) مضاف مضاف الیہ ہے اور یہاں اضافت اختصاص کے لئے ہے یہ اضافت لامیہ کہلاتی ہے یعنی " خطين لعبرة وضنى " (العبرة) آنکھ سے بہنے والا آنسو ہے اور اس میں تنوین تکثیر کی ہے یعنی عبرة كثيرة (زیادہ آنسو)

(وضنى) یہ وہ مرض ہے جو چہرے کی زردی اور ضعف جسم کے ساتھ لازم ہے۔

'ضنى' مکسور منون ہے اس پر تنوین تعظیم کی ہے یعنی مرض عظیم (بڑی بیماری)(مثل البهار) مضاف،مضاف الیہ ہے اور یہ " خطى عبرة وضنى " کی صفت ہونے کی وجہ سے منسوب ہے (مثل) یہ اسمائے متوغلہ میں سے ہے اسی وجہ " البهار " معرف بالام کی جانب مضاف ہونے کے باوجود وہ مستفاد تعریف نہیں ہے اس لئے کہ وہ ابہام میں متوغل ہے تو اگرچہ اس کی اضافت کسی اسم معرفہ کی جانب کردی جائے تب بھی وہ معرفہ نہیں ہوسکتا۔

(البهار) وہ گلاب کا پھول جو زرد ہوتا ہے (العنم) یہاں مثل مضاف محذوف ہے یعنی 'مثل العنم) ہے اس لئے کہ اس کا عطف (مثل البهار) پر ہے۔(العنم) یہ سرخ ٹہنیوں والا درخ ہے۔یہاں خط کو" عنم " سے سرخی میں تشبیہ دینا مراد ہے آنکھوں کے آنسوؤں کا خون سے مل جانے کی وجہ سے (یعنی خط ونشان کو سرخی میں شاخ عنم سے تشبیہ دینا چاہتے ہیں اس لئے کہ وہ عاشق خون کے آنسو رو رہا ہے اور خون، آنسو سے مل گئے ہیں اور اس

سےاس کے چہرے پرلال خط قائم ہو گئے ہیں جو شاخ عنم کے مشابہ ہے)
اوررخساروں کو'بھار' (زردگلاب) سےاس زردی میں تشبیہ دینا چاہتے ہیں جس کےاوپر سرخی ہےتو ناظم فاہم نے رخساروں کو 'بھار' سےتشبیہ دی جو 'عنم' کی سرخ پتیوں کے نیچے بچھا ہوا ہے(اور یہ تشبیہ اس زردی میں دی گئی ہے جس کےاوپر آنسو اور خون کے امتزاج سے دو سرخ نشان (موجود) ہیں!!
تواب جب عاشق کے پاس کوئی بہانہ باقی نہ رہا تو وہ اعترافِ عشق پر مجبور ہو گیا اور جب اسے کوئی سبیل انکار نظر نہ آئی تو اس نے بزبان قال اپنے عشق کا اظہار کیا اور یوں کہا:

نعم سری طیف من اھویٰ فارقنی و الحب یعترض اللذات بالالم

انشاءاللہ قارئین کرام سے اگلی ملاقات اس شعر کی شرح کے ساتھ ہوگی۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

(قارئین کرام) سےہم نے آئندہ ملاقات میں گزشتہ شعر کی شرح کا وعدہ کیا تھا اور وہ شعر یہ ہے:

(۸)نعم سریٰ طیف من اھویٰ فارقنی و الحب یعترض اللذات بالالم

(ترجمہ:ہاں ہاں (مین اقرار کرتا ہوں کہ) مجھے اپنے محبوب کی یاد اور اس کا خیال خواب میں آیا جس نے مجھے بے چین اور بےخواب کر دیا اور محبت ایسی چیز ہی ہوتی ہے جو خوشی میں رکاوٹ بن جاتی ہے (حائل ہو جاتی ہے) درد والم کے ساتھ۔)
ہم نے اپنے قارئین کرام سے آئندہ ملاقات میں اس شعر کی شرح کا وعدہ کیا تھا لیکن علامہ خرپوتی کی تصنیف لطیف "عصیدۃ الشھدۃ بشرح البردۃ" کے مطالعہ اور مراجعت کے دوران کچھ بہترین نکات میری نظر سے

گزرے جن میں سے بعض کو میں یہاں اتمام نفع کے لئے بیان کر دینا چاہتا ہوں، علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب ناظم ذی فہم نے مخاطب کے عشق اور اس کی محبت پر گواہی ثابت کردی۔ بعبارة اخریٰ جب مخاطب کے عشق ومحبت پر دو صادق اور عادل گواہوں نے ناظم فاہم کے دعویٰ کے اثبات میں گواہی دے دی اور قاضی نے دارالحکومت میں کاتب کو ثابت کرنے کا حکم دے دیا کہ اس کے نزدیک اس کے عشق اور اس کے ہیجان و فریفتگی میں سے کیا ثابت ہوا ہے؟! تو اس نے (قاضی نے) کاتب سے کہا کہ ہمارے نزدیک عاشق کا جو عشق اور اس کی جو فرط محبت ثابت ہوئی ہے اسے لکھ تب ناظم فاہم اس شخص مجرد سے خطاب کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ تم دو عادل وصادق گواہوں کی گواہی کے بعد اور قاضی کے یہاں عشق ثابت ہو جانے کے بعد کیسے محبت کا انکار کر سکتے ہو قاضی نے منشور عشق اور محبت کی دستاویز لکھنے کا کاتب کو حکم دے دیا ہے تو وہ عاشق سے خطاب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا:

و اثبت الوجد خطی عبرة وضنی　　　مثل البهار علی خديك والعنم

شرح بیت اول: 'الاثبات' کسی شئی کو لکھ کر یا کسی اور ذریعے سے ثابت کرنا اور یہاں پر سیاق وسباق کے قرینے سے کتابت مراد ہے جیسا کہ ناظم فاہم نے کہا (خطی عبرة وضنی) (الوجد) یہ حزن قلبی کا نام ہے اور " اثبت " کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ " اثبت " کی اسناد " الوجد " کی جانب بمعنیٰ سبب مجازی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے (اهلك المرض) (بیماری نے ہلاک کردیا) اور کہا جاتا ہے (انبت الربيع البقل) (موسم بہار نے سبزہ اگایا) مطلب یہ ہے کہ مرض ہلاکت کا سبب ہے اور اسی طرح موسم ربیع سبزی کے اگنے کا سبب ہے 'الوجد' میں بایں طور استعارہ مکنیہ موجود ہے کہ 'وجد' کو ذہن میں کاتب سے تشبیہ دی گئی ہے اور مشبه به کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور ایک طرف استعارے کو ترک کر دیا گیا ہے، 'وجد' کا ذکر کر کے اس کا معنیٰ مراد لیا گیا تو 'وجد' کا اطلاق اس کاتب پر کیا گیا ہے جو مشبه به ہے اور پھر ایسا لفظ ذکر کیا جو مشبه به کے مناسب اور اس کے لئے لازم ہے یعنی " اثبت " کو بمعنیٰ کتب " ذکر کیا تو یہاں 'وجد' میں تو استعارہ مکنیہ ہے

اوراس سے پہلے ناظم شعر کے قول" اثبت" میں استعارہ تخیلیہ ہے تو ناظم فاہم کا قول ' اثبت' تخییل ہے اوراس کا ایقاع خطین پر ترشیح ہے اس لئے کہ خطین مشبه به ہے" خطین" سے اس حالت کا استعارہ کیا گیا ہے جو ناظم فاہم کے چہرے پر عیاں ہے تو اس حالت کو 'خطین' سے تشبیہ دی گئی ہے تو اسی وجہ 'خطین' میں استعارہ تصریحیہ ہے۔اور خطین یعنی خطی عبرة وضنی، یہ اضافة المشبه به الی المشبه کی قبیل سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے (جریٰ ذهب الاصيل على لجين الماء)

اور ناظم شعر کا قول 'مثل' جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ " خطی عبرة " کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور علامہ خرپوتی نے 'مثل' میں اعراب کی دواور وجہ بھی بیان کی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ 'مثل' یا تو حال ہونے کی وجہ سے یا پھر " اثبت" کا مفعول ثانی ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے اور یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ " اثبت" " جعل" کے معنیٰ پر مشتمل ہو یعنی (جعل الوجد خطی عبرة وضنی ومثل) اس صورت میں (خطی عبرة وضنی" مفعول اول اور " مثل" مفعول ثانی ہوگا" جعل" کا۔(العنم) بفتحتین ایک نرم اور کمزور درخت کا نام ہے، انگلیوں کو اس سے تشبیہ دی جاتی ہے کہا گیا ہے کہ وہ مہندی کا پیڑ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ 'دھتورا' ہے دہتورا ایک ایسا درخت ہے جس کی لکڑی بڑی، پتے بادام کی طرح اوراس کا تنا لال ہوتا ہے۔لیکن پہلا قول راجح ہے کہ "عنم" مہندی کے درخت کے معنیٰ میں ہے۔اور کسی شاعر کا شعر اس قول کو ترجیح دے رہا ہے۔:

النشر مسك و الوجوه دنانير و اطراف الاكف عنم

(ترجمہ: خوشبو مشک ہے چہرے خوبصورت اور روشن ہیں اور کف دست مہندی سے رنگا ہوا ہے۔)

اس شعر میں لف ونشر معکوس یعنی لف ونشر مشوش ہے یعنی غیر مرتب ہے اس طرح کہ مصرعۂ اولیٰ میں سرخی اور زردی کا ذکر کیا (یعنی عبرة اور ضنی کا ذکر کیا) اور ابتدا سرخی (عبرة خون سے ملے ہوئے آنسو) سے کی اور

دوسرے مصرعے میں حالت معکوس ہے اس اعتبار سے کہ اس میں ابتدا زردی سے ہوئی ہے (یعنی بھـــار سے جو زرد ہوتا ہے) اور نشر غیر مرتب ذکر کرنے کا سبب وزن شعر اور رعایت نظم ہے۔

حاصل معنیٰ: ۔ ایسے دو عادل گواہوں کی گواہی کے بعد جن کی گواہی کو تم مسترد اور جھوٹا نہیں قرار دے سکتے اور قاضی کے فیصلے کے بعد جس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، (ان تمام چیزوں کے ہونے کے بعد) آخر تم عشق ومحبت سے ناواقفیت اور اجنبیت کا اظہار کیسے کر سکتے ہو اور کیسے تم منکر عشق ہو سکتے ہو۔ (اور نا صرف یہ بلکہ) قاضی نے تیرے دونوں رخساروں پر دو سرخ رنگ کے خطوط سے منشور محبت لکھا دیا ہے تو اب جو کوئی بھی تیرے چہرے کی طرف نظر کرتا ہے وہ دونوں رخساروں پر نمودار محبت کی نشانیوں کو پڑھ لیتا ہے۔

علامہ خرپوتی نے اس کو بیان کرنے کے بعد دو انتہائی عمدہ شعر ذکر کئے ہیں وہ فرماتے ہیں:

اغـفـر يـا مـن بسعة مغفرته شوقني　　　واعف عنى الفعل الذى من رضاك فرّقنى

ولا تـحـرقـنـى بـنـار الـجـحيم　　　ان عشـق نبيك احـرقـنـى

(ترجمہ: بخش دے اے وہ جس کی مغفرت کی کشادگی اور جس کی معافی کی وسعت نے مجھے (معافی مانگنے کے لئے) راغب کیا۔ تو اے میرے مولیٰ میرے اس عمل کو معاف فرمادے جس نے مجھے تیری رضا اور خوشنودی سے دور کر دیا۔ اور اے میرے رب مجھے جہنم کی آگ میں نہ جلانا اس لئے کہ تیرے نبی کے عشق میں میرا دل (پہلے سے ہی) جل رہا ہے)

جب ہم اس شعر کی مکمل شرح کر چکے تو اب ناظم فاہم کے مذکورہ ذیل شعر کی شرح کی جارہی ہے:

نـعـم سـرىٰ طيف مـن اهـوىٰ فـارقنى　　　و الـحـب يـعتـرض الـلذات بـالالم

(ترجمہ: ہاں ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ جس سے میں محبت کرتا ہوں اس کی یاد اور اس کے خیال نے مجھے بے چین کر دیا اور میری نیند کو اچاٹ کر دیا اور محبت (ایسی چیز ہی ہوتی ہے جو خوشیوں اور لذتوں کے درمیان رکاوٹ بن جاتی ہے۔)

تشریح: (نعم) تین طریقوں پر مستعمل ہے (۱) قائل کے قول" قام زید" کے بعد واقع ہو تو تصدیق ہے (۲) قائل کے قول" اقام زید؟" (استفہام) کے بعد واقع ہو تو حرف اعلام (مستخبر) ہے (۳) قائل کے قول" افعل" (امر) اور" لا تفعل" (نہی) کے بعد واقع ہو تو حرف وعد ہوگا۔ یہاں 'نعم' دوسرے معنیٰ میں ہے یعنی" اعلام"

''نعم و بلیٰ' کے درمیان فرق

"نعم" اور" بلیٰ" میں فرق یہ ہے کہ "نعم" حرف تصدیق ہے لیکن وہ ایجاب و نفی کی خبر و استفہام میں سبھی کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس کے برخلاف" بلیٰ" یہ نفی کے ساتھ خبراً یا استفہاماً مختص ہوتا ہے بایں معنیٰ کہ وہ صرف منفی کی تصدیق واقع ہوتا ہے بر سبیل ایجاب۔ اسی وجہ سے اگر کوئی (الست بربکم) کے جواب میں" بلیٰ" کہے تو وہ مومن ہے اس لئے کہ اس" بلیٰ" کہنے کا معنیٰ ہے (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور اس کے برعکس اگر کسی نے (الست بربکم) کے جواب میں "نعم" کہا تو وہ کافر ٹھہرے گا اس لئے کہ اس کا معنیٰ ہوگا (ہاں تو ہمارا رب نہیں ہے) کسی نے اس کو شعر میں جمع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:

بعد نفی قل نعم لا بعد ایجاب کذا   بعد ایجاب نعم لا بعد ایجاب بلی

" سریٰ طیف من اھویٰ" میں 'سریٰ' فعل ماضی ہے اور ' طیف' اس کا فاعل ہے اور جملہ مستانفہ ہے گویا کسی نے عاشق سے کہا کہ اے مقر عشق تیری حالت کیسی ہے؟ تو اس نے از سرے نو اپنی حالت بیان کرتے ہوئے کہا" سری طیف من اھویٰ" (یعنی میری حالت تو ایسی ہے کہ یادِ محبوب نے بے قرار کر رکھا ہے) (اسریٰ) اَلسُّرّیٰ مصدر سے رات میں چلنے کے معنیٰ میں ہے۔ قرآن پاک میں آیا﴿ سبحٰن الذی اسری بعبده لیلا﴾ یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کے قول میں اسریٰ رات میں چلنے کے معنیٰ میں کیسے ہو گیا کہ رات میں چلنے پر تو" لیلا" ہی دلالت کر رہا ہے صراحتاً یعنی رات میں چلنے کا معنیٰ" لیلا" سے ماخوذ ہے۔ مفسرین کرام نے اس آیت پاک کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے کہ 'اسریٰ' رات میں سیر کرنے کے معنیٰ میں اور" لیلا اس لئے لایا گیا تا کہ اس سے اس امر کی جانب اشارہ ہو کہ سیر وہ رات کے مختصر سے حصے میں

ہوئی اور سیر پوری رات کو مستغرق نہیں ہے یعنی ساری رات سیر نہیں ہوئی بلکہ رات کے ایک ٹکڑے میں ہوئی۔تو" لیلاً " میں تنوین تقلیل کی ہے۔ اگر میسر آیا تو اس آیت کریمہ کے متعلق مفسرین کے اقوال بیان کردیئے جائیں گے۔

شیخ علامہ اسماعیل حقی افندی' روح البیان ' میں فرماتے ہیں کہ اسراء رات میں چلنے کے معنیٰ میں خاص ہے 'سریٰ ' کی طرح کہا جاتا ہے:اسریٰ و سریٰ اوراسی سے سرایا ' کے واحد 'سریة' آتی ہے(فوج کی ایک ٹکڑی)اس لئے کہ وہ رات میں خفیہ طور پر چلتی ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:'اسریٰ 'کامعنیٰ رات میں چلنا ہے،کہا جاتا ہے سریت مسری و سری و اسریت اسراءً اور کہا گیا ہے اسرء یہ اول لیل سے ہوتا ہے اور سری آخر لیل سے لیکن پہلی بات اعرف ہے۔انتھیٰ ملتقطا۔

(الطیف) بمعنیٰ خیال ہے اوران کے قول" طیف من " میں 'من ' اسم موصول ہے اس سے مراد محبوب کی ذات ہے۔اوراس کو تعظیم کی وجہ سے بطور مبہم لائے ہیں۔(اھویٰ)" ھویٰ، یھویٰ " سے واحد متکلم کا صیغہ ہے بمعنیٰ " احب " اور موصول کی جانب لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے،اس کی تقدیری عبارت یوں ہوگی، " سریٰ طیف من اھواہ " ان کے قول(فارقنی) میں 'فا' شرط محذوف کا جواب ہے تو اس بنیاد پر 'فا' فصیحہ ہوگا یعنی جب مجھے محبوب اور معشوق کی محبت کا خیال آیا تو اس نے مجھے بے خواب کردیا۔اس میں خطاب سے متکلم کی جانب التفات ہے مطلع کے برعکس اس لئے کہ اس میں متکلم سے خطاب کی جانب التفات ہے۔ (ارق) التاریق ، مصدر سے ' نسھیر ' (رات بھر جگانا،نیند سے بیدار کرنا) کے معنیٰ میں ہے۔اور" فارقنی " میں نون وقایہ ہے۔ اورایقاظ من النوم یا تو معنیٰ حقیقی میں ہے،اس لئے کہ جب عاشق کا دل محبوب کی محبت اوراس کی یاد سے مملو ہے تو وہی اس کے چین میں مخل ہورہا ہے اوراس کو آرام کی نیند سونے نہیں دے رہا ہے اور محبوب کا خیال ہر دم اس کی آنکھوں کے سامنے ہے،ایک لمحہ بھی اس کی نگاہوں سے غائب نہیں ہورہا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ بے دار رہ

رہا ہے۔

یا پھر وہ اس غفلت کی نفی سے مجاز ہے جس سے دنیا کے احوال اور اس کی لذتیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ ہی معنی یہاں مناسب ہے جیسا کہ سیاق وسباق سے نظر آ رہا ہے اور (والحب یعترض اللذات۔۔) میں 'واو' یا تو حالیہ ہے تو اس صورت میں 'واو' کے بعد جملہ اسمیہ محل نصب میں ہوگا یا پھر وہ 'واو' استئنافیہ ہے، گویا عاشق سے پوچھا گیا کہ کیا تو اپنی محبت کی موجودگی میں لذتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے" والحب یعترض۔۔۔۔" کہ محبت تو درد والم دے کر لذتوں کو زائل کر دیتا ہے لہذا اس صورت میں میں لذتوں سے لطف اندوز کیسے ہو سکتا ہوں)

علامہ خرپوتی نے اس میں ایک اور وجہ بیان فرمائی ہے علامہ خرپوتی فرماتے ہیں؛

ممکن ہے کہ یہاں واو عاطفہ علت کا ہو (یعنی علت کا معلول پر عطف ہو) جب اپنے ماقبل کی علت مانا جائے گویا ناظم فاہم نے کہا:" اذ الحب یعترض اللذات بالالم"(یعترض) سامنے آ کر تیر پھینکنے کے معنیٰ میں ہے یعنی تیر مار کر قتل کرنے کے معنیٰ میں ہے تو اس بنیاد پر" یعترض" بمعنیٰ" یقتل" ہوگا اور محبت کی جانب اس کی اسناد کرنا مجازی اور استعارہ تبعیہ ہے اس لئے کہ قتل کو شدت تاثیر میں اعتراض سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس وجہ سے کہ قتل سے تبدیلیٔ شکل کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو یہی چیز 'اعتراض' میں بھی پائی جا رہی ہے پھر اعتراض کے مفہوم کا قتل کے لئے استعارہ کیا گیا ہے تو اعتراض کا ذکر کر کے' قتل' مراد لیا گیا ہے۔اور استعارہ پہلے 'اعتراض' میں تھا جو مصدر ہے پھر مصدر ہی کی تبعیت سے فعل میں ہوگیا جو 'یعترض' ہے اور ' یقتل' کا صیغہ ' القتل' مصدر سے مشتق ہے تو' یقتل' کی ہیئت حاصلہ کو ' یعترض' کی ہیئت حاصلہ سے اس علاقہ کی وساطت سے تشبیہ دی گئی ہے جو دونوں فعلوں کے مصدر میں ہے یعنی" القتل" اور " الاعتراض" پھر 'یعترض' کا ذکر کر کے اور ' یقتل' مراد لیا گیا ہے اور امام سکاکی کے موقف کے مطابق 'حب' میں استعارہ مکنیہ ہے (اللذات) لذۃ کی جمع ہے اور یعترض کا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے (بالالم) یہ" یعترض" کے متعلق

ہے'الــــم' لفظا اور معنیً ''کدرٌ''(رنج وملال) کی طرح ہے لیکن یہاں 'الــــم' کا ذکر کر کے اس کا معنی مجازی 'سھـم' (تیر) مراد لیا گیا ہے اس طور پر کہ 'الـم' کو 'تیر' سے بایں معنیٰ تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ مہلک ہے۔یعنی مہلک وجہ شبہ ہے جو مشبہ اور مشبہ بہ میں جامع ہے اس لئے کہ جیسے تیر مہلک ہوتا ہے اسی طریقے سے الم بھی مہلک ہوتا ہے۔اور اس مصرع میں استعارہ تمثیلیہ بھی ہوسکتا ہے اور استعارہ تمثیلیہ وہ کہلاتا ہے جس میں امور معقولہ کی ماخوذ ہیئت کو امور محسوسہ کی منتزعہ ہیئت سے تشبیہ دی جاتی ہے اور یہاں امور معقولہ 'حب' کا قاتل ہونا الم کا مہلک ہونا، لذتوں کا حب سے مہلکہ ہونا اور حب کا لذتوں کی جانب الم کے تیر پھینکنے والا ہونا ہے۔تو امور معقولہ کی اس ہیئت ماخوذہ کو امور محسوسہ کی ہیئت منتزعہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور امور محسوسہ شخص کا رامی ہونا، تیر کا مـرمیا بـه ہونا، دوسرے شخص یا جانور کا مـرمیا الیه ہونا اور تیر کا مهلك ہونا ہے پھر ان امور محسوسہ کی ہیئت منتزعہ کا اس ہیئت کے مفہوم کے لئے استعارہ کیا گیا جو امور معقولہ سے سلب ہوگیا پھر امور محسوسہ کی ہیئت منتزعہ کا ذکر کر کے وہ ہیئت مراد لی گئی جو امور معقولہ سے سلب ہوگئی۔

حاصل معنیٰ:۔ عشق لذتوں کو روکتی ہے اور درد والم کے ذریعہ سے لذتوں کو ہلاک کردیتی ہے۔جیسے کہ تیر پھینکنے والا (رامی) انسان یا جانور کو (میـرمیا الیه) تیر سے (مـرمیا به) ہلاک کردیتا ہے اسی طرح عشق حقیقی جب کسی انسان کے دل میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ دنیاوی خواہشات اور لذات کو ختم کردیتا ہے تو اس کے دل میں دنیا کی کوئی بھی تمنا اور آرزو باقی نہیں رہ جاتی اس لئے کہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

حکایات

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن ہارون رشید نے اپنے دل میں سوچا کہ کیوں نہ دین ودنیا کو ایک ساتھ جمع کردیا جائے! دفعۃً حضرت بہلول ولی کو بذریعہ کشف اس کے دل کی خبر ہوئی تو آپ نے اس کے محل کا قصد کیا، اس کے محل کے سامنے کئی سالوں سے کچھ ستون ٹوٹے پڑے تھے اور وہ اتنے بڑے تھے کہ اگر پورے شہر کے لوگ سب مل کر بھی

اسے اٹھانے کی کوشش کرتے تو نہیں اٹھا سکتے تھے، حضرت بہلول ایک ستون کی طرف بڑھے اور اس کا ایک کونا پکڑ کر اسے اٹھا دیا پھر دوسرے ستون کی طرف گئے اور اسے بھی پکڑ کر اٹھا دیا پھر بیچ والے ستون کو اٹھانا چاہا لیکن اسے نہیں اٹھا سکے۔ ہارون رشید اپنے محل میں کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا تو ہارون رشید نے حضرت بہلول کو اپنے دربار میں بلا کر پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ حضرت بہلول نے فرمایا کہ بادشاہ کی رہنمائی مقصود تھی کہ وہ خیال پورا نہیں ہوسکتا۔ آپ نے فرمایا کہ جس وقت میں نے آخرت کو جمع کرنے کے ارادے سے ستون اٹھانا چاہا تو میں نے اسے اٹھالیا پھر جب میں نے دنیا کو جمع کرنے کے ارادے سے دوسرا ستون اٹھایا تو میں نے اس کو بھی اٹھالیا لیکن پھر جب میں نے دنیا اور آخرت کو جمع کرنا چاہا تو میں اس کو نہیں اٹھا سکا تو میں اس طریقے سے تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہارا خیال خام ہے اس کا ہونا ممکن نہیں۔

روحانی فوائد

علامہ خرپوتی کے کہنے کے مطابق اس شعر کی خاصیت یہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی پر شک کرتے ہو تو تم اس شعر کو لیمو کے پتے پر لکھ دو اور اس کو زوجہ کے بائیں پستان پر رکھ دو جس وقت وہ سو رہی ہو تو تمہارے یہ کرنے سے وہ حالت نیند میں جو کچھ بھی اچھا برا اس نے کیا ہوگا سب بیان کردے گی۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں:

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں یہ عمل آزمودہ اور مجرب ہے۔ اسی طرح اگر تمہیں کسی آدمی پر شک ہو کہ اس نے تمہارے مال میں سے کچھ چرایا ہے یا نہیں؟ تو تم اس شعر کو مینڈھک کی صاف جلد پر لکھ دو اور اس کو اس شخص کی گردن میں لٹکا دو تو اگر وہ چور ہوگا تو تمہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے گا اور اپنے جرم کا اقرار کرلے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

تنبیہ بر تسامح شارح

تتمہ: ایضاح مرام اور ازالۂ ابہام کے لئے میں ' نعم ' اور ' بلیٰ ' کے درمیان علامہ خرپوتی کے بیان کردہ فرق کا اعادہ کرادینا چاہتا ہوں۔

علامہ خرپوتی نے اس کے متعلق یہ تصریح فرمائی کہ نعم اور بلٰی کے درمیان فرق یہ ہے کہ 'نعم' حرف تصدیق ہے لیکن وہ ایجاب ونفی کی تصدیق واقع ہوتا ہے خبر واستفہام دونوں میں لیکن " بلی" صرف نفی کے ساتھ مختص ہے ایجاب کی تصدیق واقع نہیں ہوتا اس لئے اگر کوئی " الست بربکم" کے جواب میں " بلی" کہے گا مومن ہوگا اور اگر وہ اس کے جواب میں " نعم" کہے تو کافر کہلائے گا اس لئے کہ وہ " نعم لست بربنا" کی قوت میں ہے کسی نے اس کو یوں نظم کیا:

بعد نفی قل نعم لا بعد ایجاب کذا بعد ایجاب نعم لا بعد ایجاب بلی

ادنی تأمل سے آپ پر واضح ہوجائے گا کہ علامہ خرپوتی کی مذکورہ بالا عبارت میں کچھ ابہام ہے اور جو شعر انہوں نے نقل کیا اس میں تو اور زیادہ ابہام ہے، اس شعر میں واضح تناقض موجود ہے اس اعتبار سے کہ انہوں نے پہلا مصرعہ یوں بیان کیا۔ بعد نفی قل نعم لا بعد ایجاب کذا اور دوسرا مصرعہ کہا بعد ایجاب نعم لا بعد ایجاب بلی

دونوں مصرعوں کو ملاحظہ کرنے کے بعد آپ پر صریح تعارض واضح ہوگیا ہوگا کہ انہوں نے مصرعۂ اولیٰ میں ایجاب کے بعد " نعم" لانے سے منع کیا ہے اور پھر اسی وقت میں مصرعۂ ثانی میں ایجاب کے بعد " نعم" لانے کی اجازت بھی دے دی۔ ہوسکتا ہے کہ کاتب کے ہاتھ سے کوئی تحریف واقع ہوئی ہو جس سے معنیٰ میں خبط پیدا ہوگیا شاید ان کی مراد یہ ہے کہ " نفی" کے بعد نعم کہو اور نفی کی نفی کے بعد یعنی منفی کے ایجاب کے بعد نعم نہ کہو اور اس کے بعد فرمایا (کذا) یعنی اسی طرح ایجاب کے بعد 'نعم' کہو

(بہرحال بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ) 'نعم' ایجاب ونفی میں سے ہر ایک کے بعد تصدیق واقع ہوتا ہے برخلاف 'بلیٰ' کے اس لئے کہ وہ نفی کے ساتھ مختص ہے اور منفی کی بر سبیل ایجاب تصدیق واقع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے شعر میں کہا گیا " لا بعد ایجاب بلی" (ایجاب کے بعد 'بلی' نہ کہو) یعنی شاعر کہنا چاہتا ہے کہ 'بلی' نفی کے ساتھ مختص ہوتا ہے تو وہ نفی کے بعد لایا جاتا ہے نا کہ ایجاب کے بعد۔

لفظ 'نعم' اور 'بلیٰ' کی تحقیق

اورمزید میں ایضاح مقام کے لئے علامہ جلال الدین سیوطی کاملخص پیش کردینا چاہتا ہون جس کوآپ نے " ھمع الھوامع " میں " المغنی " کےحوالے سے ذکر کیا ہے۔امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(بلی) جواب کے لئے حرف مرتجل اصلی الالف ہے اوراس کی اصل 'بل' عاطفہ نہیں ہے(جوفعل میں نفی کے بعدعطف کرنے کے لئے آتاہے)لیکن ایک جماعت اس بات کی بھی قائل ہے کہ اس کی اصل 'بل' عاطفہ ہے اوراس پرالف زائدہ ہے،اس الف کوایجاب یا اضراب یا تانیث کے لئے داخل کیا گیا ہے، بہرحال، قائل اول نے اس کے ماقبل کے ہمیشہ منفی ہونے کےلزوم سے استدلال کیا ہےاورثانی (یعنی الف زائدہ ہے،اس کی اصل بل عاطفہ ہے)کے قائل،اس کے امالہ اور'یا' کے ساتھ اس کی کتابت سے استدلال کرتے ہیں۔اورقیاس رُب، ثَم وغیرہما بالتاء کی تانیث پرہے۔ 'بلی' نفی کے ساتھ مختص ہوتاہےاوراس کوثابت کرتاہےاب وہ منفی چاہیں مجرد عن الاستفہام ہوجیسے (زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلی) یاپھراستفہام سےمقرون ہو،اوروہ استفہام بھی چاہیں حقیقی ہوجیسے و" الیس زید بقائم"؟ کےجواب میں کہاجائے 'بلی' یاتوبیخاً ہو(ایحسب الانسان ان لن یجمع عظامه بلی قٰدرین علیٰ ان نسوی بنانه) یاتقریراًمثلا(الست بربکم قالوا بلی) ،اس میں 'بلی' کےذریعہ نفی کواثبات وتقریرکےساتھ نفی مجردکی جگہ اس کےردمیں ذکرکیا ہے،اسی وجہ سےحضرت ابن عباس وغیرہ نےفرمایاکہ اگروہ اس کےجواب میں 'نعم' کہتےتوکفرکرتے،اس لئے کہ نعم نفی وایجاب میں خبرکی تصدیق کرتاہےاوررہایہ کہ اس حدیث پاک " اترضون ان تکونوا ربع اھل الجنة قالوا بلی " کہ اس حدیث پاک میں استفہام مثبت کےبعد 'بلی' کاواقع ہونا،تویہ یاتوبہت قلیل الاستعمال ہے یاپھرراویوں کےتغیرکانتیجہ ہے۔(۴۹۱/۲)

امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ 'نعم' کےبیان میں فرماتے ہیں کہ (نعم) نون اورعین کےفتحہ کےساتھ معروف لغت ہے۔(نعم) عین کےکسرہ اورنون کےفتح کےساتھ کنانہ کی لغت ہے۔امام کسائی نےاسی کی قرأت کی ہےاور

(نِعِم) نون اورعین دونوں کے کسرہ کے ساتھ بعض کی لغت ہے اس کو " مغنی " میں بیان کیا ہے عین کو حا سے بدل کر (نحم) بھی ایک لغت کہی گئی ہے نضر بن شمیل نے اس کو بیان کیا ہے " مغنی " میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے اسی کی قرأت کی ہے۔ ابوحیان فرماتے ہیں کہ 'حاء مخرج میں 'عین' کے قریب ہے اور یہ حروف فم سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے عین سے اخف ہے۔

(۱) نعم (خبر کی تصدیق ہے جب خبر کے بعد واقع ہو) جیسے ' قام زید' یا' ما قام زید' کے جواب میں نعم ہو

(۲) نعم (مستخبر) کے لئے حرف اعلام ہوگا جب استفہام کے بعد واقع ہو) جیسے " ھل جاء زید " کے جواب میں نعم اور قرآن میں ہے (فھل وحدتم ما وعد ربکم حقا قالوا نعم)

(۳) نعم (طالب کے لئے حرف وعد ہوگا جب امر ونہی کے بعد واقع ہو) جیسے " اضرب زیدا " کے جواب میں 'نعم' اور " لا نضرب زیدا " کے جواب میں نعم

اور نعم جب ایجاب اور نفی اور ان دونوں کے استفہام کے بعد ہوتا ہے تو مثبت اور اس کے سوال میں ثبوت کی تصدیق کرتا ہے اور منفی اور اس کے سوال میں نفی کی تصدیق کرتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ نعم مابعد کی تاکید کے لئے بھی لایا جاتا ہے جب وہ مصدر کلام میں واقع ہو جیسے ' نعم ، ھذہ اطلالھم' (ہاں یہ ان کے کھنڈرات ہیں)

ابن ہشام کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں بھی نعم حرف اعلام ہوتا ہے اور درحقیقت وہ کسی سوال مقدرہ کا جواب ہوتا ہے۔

ابوحیان فرماتے ہیں کہ 'نعم' اس صورت میں اپنے مابعد کی تاکید وتصدیق کرتا ہے اور مقدم ہوتا ہے۔

ہم نے مختصر الفاظ میں زیادہ معانی ومفاہیم کے ساتھ " ھمع الھوامع " میں سے کچھ مباحث آپ کے گوش گزار کئے اور جو کچھ مقاصد ومطالب کی توضیح اور ابہام کا انکشاف اس میں کیا گیا تھا ہم نے یہاں بیان کیا اور جو شعر علامہ خرپوتی نے نقل کیا ہے اس کی درست صورت یہ ہوسکتی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں:

بعد نفی قل نعم اور عند اعلام کذا　　بعد ایجاب نعم لا بعد ایجاب بلی

(نفی کے بعد نعم کہو یا وقت اعلام اسی طرح نعم کہو، ایجاب کے بعد نعم کہو لیکن ایجاب کے بعد بلی نہ کہو۔
(شعر کی اس صورت کو تسلیم کر لینے سے علامہ خرپوتی نے جو وجہیں "نعم" کے متعلق شروع میں بیان کیں وہ صحیح و درست ہو جائیں گی وہ یہ کہ نعم یا تو مخبر کی تصدیق ہوگا یا مستخبر کے لئے اعلام یا پھر موجب کے لئے ایجاب اور ان کا قول " لا بعد ایجاب بلی " کا معنیٰ ظاہر واضح ہے اس سے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں علامہ خرپوتی سے اور اس سے بھی واضح ہے جو ہم نے " همع الهوامع " میں سے مزید بیان کیا وہ یہ کہ " بلی " نفی کے ساتھ مختص ہے اور منفی کے بعد اس معنی میں واقع ہوتا ہے کہ وہ برسبیل ایجاب منفی کی تصدیق ہوتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

گزشتہ شعر پر تحقیقی گفتگو کر لینے کے بعد ہم اپنے سلسلۂ کلام کو گزشتہ سے پیوستہ شعر کی شرح میں جاری رکھیں گے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹) یا لائمی فی الھویٰ العذری معذرۃ　　منی الیک ولو انصفت لم تلم

(ترجمہ: بنی عذرہ کی طرح عشق کرنے میں اے مجھے ملامت کرنے والے، میری معذرت کو قبول کر، اگر تو انصاف کرتا تو ہرگز ملامت نہ کرتا۔)

تشریح: (یا) حرف ندا ہے، قریب وبعید دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ (یا لائمی) یعنی اے مجھے ملامت کرنے والے (معذرۃ) فعل مقدرہ کا مفعول بہ ہے اس کی تقدیر یہ ہے " اقبل و خذ معذرة " (الیك) ماقبل ضمیر مجرور سے محل حال میں ہے۔ اوران کے قول (معذرۃ) میں اعراب کی کئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہیں: (معذرۃ) کو مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے (اس صورت میں) تقدیری عبارت یوں ہوگی

" هذه معذرة" یا پھراس کا عامل ابتدا ہےجس کی وجہ سے وہ مرفوع ہے تو (اس صورت میں) ' معذرة" مبتدا ہے۔(منی) 'معذرة' کی صفت ہےاور (الیك) اس کی خبر ہے۔ (لو) حرف امتناع ہے وہ جس سے ملحق ہوتا ہے اسے ممتنع کر دیتا ہےاور اپنے مابعد کو مستلزم ہوتا ہے معنیٰ یہ ہے کہ اگر تو انصاف کرتا تو ملامت کرنے سے باز رہتا (ملامت روک لیتا) لیکن تو نے انصاف نہیں کیا (اس لئے کہ) اگر تو انصاف کرتا تو ملامت نہ کرتا (الهوىٰ العذری) یہ موصوف صفت ہے (العذری) یہ قبیلہ بنی عذرہ کی جانب منسوب ہے۔" بنی عذره" ایک ایسا قبیلہ ہے جس کے مرد اپنی رقیق القلبی اور خالص محبت کی وجہ سے مشہور ہیں اور اس قبیلے کی عورتیں پاکدامنی اور عفت کی وجہ سے مشہور ہیں اس لئے کہ وہ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو محبت میں اپنی جانیں تک نچھاور کر دیتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔اور (العذری) عذر کی جانب منسوب بھی ہو سکتا ہے (اس صورت میں " الهوىٰ العذری" کا معنیٰ ہوگا ایسا عشق جس میں گرفتار شخص عذر پیش کرنے کا مستحق ہے وہ ایسی محبت میں معذرت خواہی کر سکتا ہے جو محبت اس کے دل ودماغ پر غالب آ گئی ہے۔

اس شعر میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنی ساری عمر اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت میں صرف کر دے اور ساری زندگی مسلسل اطاعت میں مستغرق رہے کبھی اکتائے نہ۔اور ان کے قول (لم تلم) میں " تجنیس ناقص ہے۔

اس شعر کی شرح کچھ طویل ہو سکتی ہے،اس لئے کہ ہم (معذرة منی الیك) کے اور بھی کئی معانی ومفاہیم ذکر کریں گے اور بنی عذرہ کے ایک نوجوان مرد کی عجیب حکایت بیان کریں گے جو اپنی چچا کی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا،قارئین منتظر رہیں۔

علامہ خرپوتی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس شعر کا معنیٰ یہ ہے کہ '' حب مخاطب اس دعوے کا انکار کر رہا تھا کہ وہ مریض عشق ہے اور محبت میں مبتلا ہونے کا منکر تھا تو اس وقت مدعا علیہ اور مدعی کے مابین خطاب اور ضمیر سے مکالمہ ہوا لیکن پھر جب مدعا علیہ نے دعوے کو قبول کر لیا اور اپنے عشق کا اقرار کر لیا تو فریق مخالف نے اس کی لگام

ڈھیلی کردی اور تھوڑی دیر کے لئے اس سے جدا ہوگیا مگر تھوڑی دیر کے بعد مدعی نے خطاب اور ضمیر سے خطاب بالندا کی طرف عدول کرکے کہا: یا لائمی اھ

جب ندا کا صیغہ بعید پر بھی دلالت کرتا ہے تو ممکن ہے کہ ندا سے خطاب کرنا مقصود کو ادا کی جانب مائل کرنے کے لئے ہو جیسا کہ حضرت سعدی چلپی نے اس آیت پاک کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ﴿ یا یھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام ﴾ (البقرہ) اور یہاں ندا سے مقصود عشق و محبت سے عذر پیش کرنا ہے اور ملامت کرنے والے سے اپنے عذر کو قبول کرنے کی امید رکھنا ہے۔

لائمی) 'لوم' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور وہ ضمیر متکلم کی جانب مضاف ہے معنی یہ ہے کہ اے وہ جو اپنی ملامت سے مجھے ملامت کر رہا ہے اور اپنے عتاب سے مجھ پر اظہار ناراضگی کر رہا ہے۔(فی الھویٰ) یہ ملامت کا ظرف ہے اور 'فی' یہاں افادۂ سببیت کے لئے ہے یعنی عشق (ھوی) ملامت کا سبب ہے اس لئے کہ جو شخص عشق و محبت میں پڑ جاتا ہے تو اس کی ہمیشہ صبح و شام ملامت کی جاتی ہے جب کہ عاشق ہر وقت آہ و زاری کرتا رہتا ہے اور اپنے عشق کی وجہ سے وہ ہمیشہ شدت و ذلت کا سامنا کرتا رہتا ہے۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

نون الھوان من الھویٰ مسروقۃ فصریع کل ھوی صریع ھوان

(ترجمہ: ھوان (ذلت ورسوائی) کی نون 'ھویٰ (عشق) سے مسروقہ ہے تو ہر عشق میں مبتلا شخص رسوائی میں مبتلا ہوتا ہے۔)

(العذری) بالجر 'ھویٰ' کی صفت ہے اور عین کے ضمہ کے ساتھ قبیلہ بنی عذرہ کی جانب منسوب ہے اور یہ یمن کا وہ قبیلہ ہے جو وفور عشق اور کثرت اشتیاق کی وجہ سے مشہور و معروف ہے اس قبیلہ کے بہت سارے جوان اس مرض میں ہلاک ہوجاتے ہیں اپنے مرض کی دوا نہ ملنے کی وجہ سے اس لئے کہ اس قبیلے کے مرد بہت نرم دل ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں فریب اور دھوکہ دہی نہیں ہوتی ہے اور نا ہی ان میں خساست ہوتی اور ان کی عورتوں کے اندر عفت و پارسائی ہوتی ہے۔(یا لائمی فی الھوی العذری) کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اے مجھے ملامت

کرنے والے اس محبت میں جو قبیلہ بنی عذرہ کی محبت کے مشابہ ہے عشق شدید اور شوق مدید میں۔
یا پھر اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اے مجھے ایسی محبت میں گرفتار ہونے پر ملامت کرنے والے جو بے اختیاری طور پر دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے اور اس عشق کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں گرفتار شخص کا عذر سبھی قبول کرتے ہیں اس لئے کہ اس عشق میں وہ شخص مجبور و معذور ہوتا ہے تو اسی وجہ سے اس میں گرفتار شخص پر ملامت نہیں کی جاتی ہے۔

حکایت

ہم نے اپنے قارئین کرام سے جس حکایت کو ذکر کرنے کا وعدہ کیا تھا اسے بیان کرنے کا وقت آ گیا ہے شیخ زادہ اور علامہ خرپوتی نے اسے ذکر کیا ہے: بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت اصمعی عرب کے ایک ایسے قبیلہ کی طرف جانا چاہتے تھے جہاں کی فصاحت و بلاعت صاحبان علم و عقل کے ہاں مشہور و معروف ہوتا کہ ان سے فصاحت سیکھیں چنانچہ آپ اپنی کمزور زبان کی وجہ سے نکل پڑے اور عرب کے قبیلوں کے بارے میں خوب تلاش و جستجو کرتے رہے تو پتہ چلا کہ وہ قبیلہ عذرہ ہے جس کی فصاحت و بلاغت عرب کے مابین مانی ہوئی ہے تو آپ نے اپنا رخت سفر یمن میں اسی قبیلہ کی جانب باندھا (چنانچہ جب آپ وہاں پہنچے) تو ایک شخص نے آپ کو اپنے یہاں مہمان بنایا اس صاحب خانہ کی ایک لڑکی تھی جو خوش قامت، خوب رو فصیحۃ الکلام اور ملیحۃ الملام تھی تو اصمعی کے دل میں اس کی محبت پیدا ہوگئی اس وجہ سے کہ وہ اس کے مہمان تھے اور مشہور بات ہے کہ جر اضافت کے عمل سے ہے یعنی مہمان نوازی سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت اصمعی فرماتے ہیں: پھر میں میزبان کے گھر سے قبیلہ کے اردگرد چہل قدمی کرنے کے لئے نکلا تو میں نے ایک خوبصورت لطیف الحسن جوان کو دیکھا جس کا چہرہ مثل ہلال روشن تھا لیکن عشق کی وجہ سے مثل خلال لاغر ہو چکا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد مثل عنم ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر محبت کی علامت اظہر من الشّمس تھی اور اس کے دل میں عشق کی آگ بڑھک رہی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بس عنقریب ابھی سفر آخرت باندھنے والا ہے تو میں نے اس سے اس کا حال دریافت کیا اور اس کے ملال و اضطراب کے بارے میں پوچھا تو اس نے لرزتے کانپتے بتایا کہ جس لڑکی کے گھر میں، میں مہمان ہوں وہ اس عاشق کی چچا کی بیٹی ہے اور اس

لڑکی کی محبت کی وجہ سے اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑک رہی ہے اور اس نے اپنی محبوبہ کو کئی سال سے دیکھا بھی نہیں ہے اور اس کی فراق میں وہ آہ وزاری کرتا پھرتا ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ میں اس کی چچا کی بیٹی کے پاس گیا تا کہ اس کی امید پوری کروں اور اس کے لئے سفارش کروں اور وہاں پہنچ کر میں نے اس سے یوں کلام کیا کہ اے راحت دل غم خردہ اور اے قلب حزیں کے زخموں کی دوا میں ہر غریب کی عزت وحرمت تمہارا یہاں دیکھ رہا ہوں (تو اسی وجہ سے) میں تمہارے پاس اس جوان کا سفارشی بن کر آیا ہوں (تو خدا کے واسطے تم) تم اس کے حال پر رحم کرو اس کے دل کو اپنا کر، تو اس نے کہا ہمارے فراق میں ہی اس کی صلاح وفلاح ہے اور سوزش عشق میں جلنے میں ہی اس کی کامیابی ہے لیکن بہت کوششوں کے بعد اس نے میری سفارش کو قبول کرلیا تو میں بشارت دیدار محبوب لے کر اس جوان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ محبوب کے دیدار کے لئے تیار ہو جاؤ اور محبوب سے ملاقات کا انتظار کرو کہ اتنے میں کوئے محبوب سے ہوا کے ساتھ غبار اڑتی ہوئی آئی جس سے وہ غش کھا کر سامنے جل رہی آگ میں گر پڑا اور اپنے بعض عضاء کو جلالیا (یہ حال دیکھ کر) میں اس لڑکی کے پاس گیا اور سارا حال سنایا تو اس نے کہا اے اصمعی نرم دل جب وہ ہماری جوتیوں پہ لگی غبار کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا تو وہ ہمارے حسن و جمال کے دیدار کی تاب کیسے لا سکے گا۔!!

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قبیلے کی سیر کے دوران اصمعی کو ایک پتھر پر یہ شعر لکھا نظر آیا:

ایا معشر العشاق باللہ اخبروا　　　اذا اشتد عشق بالفتی کیف یصنع

(ترجمہ: اے عاشق! خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ جب کسی جوان کا عشق انتہائی شدید ہو جاتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے)

تو اصمعی نے پتھر پر اس شعر کے نیچے یہ شعر لکھ دیا:

یداری ھواہ ثم یکتم سرہ　　　و یصبر فی کل الامور و یخشع

(ترجمہ: اس کا عشق نرمی کرتا ہے پھر اپنے راز کو چھپاتا ہے اور وہ عاشق ہر حال میں صبر کرتا ہے اور محبوب کی بے پرواہی سے ڈرتا ہے۔)

پھر جب دوسرے دن اصمعی وہاں آئے تو انہوں نے اس پتھر پر اپنے شعر کے نیچے یہ شعر لکھا ہوا دیکھا:

فكيف يداري و الهوى قاتل الفتى　　　في كل يوم روحه تتقطع

ترجمہ: آخر وہ کیسے نرمی کا برتاؤ کرسکتا ہے جب کہ عشق جوان کو قتل کر دینے والا ہے اور ہر آن اس کی روح فنا ہو رہی ہے)

اصمعی نے اس کے نیچے پھر یہ شعر لکھ دیا:

اذا لم يطق صبرا وكتما لسره　　　فليس له شئى سوى الموت انفع

(ترجمہ: جب وہ صبر نہیں کرسکتا اور اپنے راز کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تو موت کے سوا اس کے لئے کوئی چیز نفع بخش نہیں ہے)

پھر جب اصمعی تیسرے دن وہاں آئے تو انہوں نے وہاں ایک جوان دیکھا جو اس پتھر پر سر رکھے مرا پڑا ہے اور پتھر پر یہ شعر لکھے ہوئے ہے۔

سمعنا اطعنا ثم متنا فبلغوا　　　سلامي الى من كان للوصل يمنع

ترجمہ:۔ہم نے آپ کی بات سنی اور آپ کے مشورے پر عمل کر کے ہم اپنی جان دے رہے ہیں، لہذا میرا سلام اسے پہنچا دیا جائے جو محبوب سے ملنے میں مانع تھا (ص ۳۵۔۳۶)

(معذرة) مصدر ہے (عذر) سے، اور فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یعنی " اقبل معذرة" (منى) اسی سے متعلق ہے۔(اليك) " معذرة" کا صلہ ہے شیخ زادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "معذرة" مفعول لہ بھی ہوسکتا ہے اور (اليك) اسم فعل۔(اس صورت میں معنی یہ ہوگا) کہ "اے معذرت میں ملامت کرنے والے، مجھ سے دور ہو جا اس لئے کہ تو ظالم ہے۔

(ولو انصفت) میں " واو" یا تو ابتدائیہ ہے یا حالیہ ہے۔اور (لو) یہ اول کے انتفاء سے ثانی کے انتفاء کے لئے مثلا لو جئتنى لاكرمتك۔ (الانصاف) بمعنیٰ عدل وانصاف ہے۔

(لـم تـلـم) ماضی حجد بلم۔ملامت سے یائے متکلم اس کا مفعول ہے یعنی ملامت کو مجھ سے دور کر دیتا۔علامہ خر پوتی نے یہاں پر (اھوی) کلمے کے متعلق فرمایا کہ وہ (ھوی) باب سمع سے ہے پھرافادہ کیا کہ وہ صرف (علم) کے باب سے ہے انہوں نے اس پہلے (لـولا الھـوی) کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ ھـوی کسرہ کے ساتھ باب علم سے ہے یا پھر وہ ھَوَی باب ضرب' سے ہے۔ بہرحال ہرغور وخوض کرنے والے پر ظاہر یہ ہوگا کہ اس میں واضح تضاد ہے اس لئے کہ پہلے انہوں نے کہا کہ (ھوی) باب علم اور باب ضرب دونوں سے آتا ہے اور یہاں یہ بیان کرر ہے ہیں کہ (ھــوی) بمعنیٰ عشق صرف باب عَلِمَ سے آتا ہے لیکن یہاں پرانہوں نے جو بیان کیا وہ لغات کے موافق ہے اس لئے کہ (الـمعجم الوسیط) میں اس کی تصریح یوں کی گئی ہے:" ھـوی الشئی " یھوی ھـویا وھویانا" یہ اوپر سے نیچے گرنے کے معنیٰ میں ہے اور " ھـوی فلان فلانا یھوی ھویً وھو ھوٍ وھی ھویة (یہ محبت کرنے کے معنی میں ہے باب علم سے۔)

اورامام مجدالدین فیروزابادی کی قاموس میں ہے کہ " الھـوی" بـالقصر: اس کا معنیٰ عشق ہے چاہے خیر ہو یا شر اور بمعنی خواہش نفس ھویة رضیة کی طرح ہے ھویً فھو ھوٍ: محبت کرنا۔

اقول: " ھوی" کے متعلق ابھی میں نے ' قـاموس" سے جو نقل کیا اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ھوی بمعنی عشق ہے جو خیر وشر دونوں میں ہوتی ہے لیکن عرف شرع میں غیر محمود کا غلبہ ہے اس لئے کہ عرف شرع میں 'ھوی' کا معنیٰ میل القلب الیٰ مایاباہ الشرع" ہے (یعنی شریعت کے منہی عنہ کی جانب میلان قلب)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ o

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰ له و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل اول کے دسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۰) عدتك حالی لا سری بمستتر　　عن الو شاۃ ولا دائمی بمنسحم

ترجمہ: میرے (عشق کی) کیفیت تجھ تک پہنچ گئی، میرا راز چغلخوروں اور نماموں سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی میری بیماری جڑ سے ختم ہونے والی ہے)

ربط: عاشق نے جب ملامت کرنے والے سے معذرت خواہی کی اور اس سے ترک ملامت کی امید کی، عشق عذری میں لیکن اس نے عاشق کا عذر قبول کرنے سے انکار کردیا تب عاشق نے کہا:

عدتك حالی لا سری بمستتر　　عن الوشاۃ ولا دائمی بمنسحم

تشریح: (عدتك حالی اھ) یعنی میرا حال تجھ تک پہنچ جائے تو، تو بھی اس میں مبتلا ہو جائے جس میں میں مبتلا ہوں۔ تو اس تقدیر پر وہ ملامت کرنے والے کے لئے دعا ہوگی اور اس میں" لائم " کے لئے بددعا ہوسکتی ہے یہ اس صورت میں ہوگی جب (عدتك) کو (تجاوز عنك) کے معنیٰ میں لیا جائے یعنی میرا حال تجھ سے آگے بڑھ جائے اور جس آزمائش میں میں ہوں وہ تجھ سے دور ہو جائے یعنی تو اس میں مبتلا نہ ہو جس میں میں مبتلا ہوں اور جو مجھے لاحق ہے وہ تجھے لاحق نہ ہو۔

جو ابھی ہم نے بیان کیا اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ (عدتك) اور بھی کئی معانی کا احتمال رکھتا ہے کہا جاتا ہے (عدا الیه) بمعنیٰ سری تو اس وقت وہ حذف وایصال کی قبیل سے ہوگا جیسا کہ کلام الٰہی میں ہے (و اختار موسیٰ قومه) اور اگر 'عدا' کو 'علیٰ' کے ذریعہ متعدی کیا جائے تو وہ ظلم کرنے کے معنیٰ ہوگا۔ تو اس بنیاد پر " عدت" یہ جملہ یا تو لائم کے لئے بددعا ہوگا یا اس کے حق میں دعا ہوگا جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے جملہ بددعا بایں معنیٰ

ہوگا جب اسے عاشق کے مرتبے تک وصول سے محروم رہنے کی بددعا دی جائے، تو جملہ لفظا خبریہ ہے اور معنیً انشائیہ اور اگر عدا بغیر کسی صلہ کے ہوتو دوڑنے کے معنیٰ میں ہوگا۔

(حالی) یعنی میرے عشق ومحبت مصائب وآلام کی وہ حالت وکیفیت جس میں میں مبتلا ہوں ناظم شعر نے پھر اس کے بعد اپنا تھوڑا سا حال یوں بیان کیا: (لاسری۔۔۔) یعنی میرا وہ راز جس کو چھپانا ہی مناسب ہے، اس راز سے مراد عشق ہے۔

(بمستتر) بمعنیٰ "مختف" (چھپنے والا) (عن الوشاۃ) (یعنی میرا راز چغلخوروں سے چھپنے والا نہیں ہے) (الوشاۃ) ''چغلخوری کرنے والے'' یہ "واش" کی جمع ہے جیسے "نحاۃ" ناح کی اور "غزاۃ" غاز کی جمع ہے۔ (الوشاۃ) وہ منافق چغلخور جو عاشق ومعشوق کے درمیان فساد پیدا کرنے کے لئے چغلی لگاتا ہے تاکہ ان دونوں کے درمیان تفریق ڈال دے۔ اور وہ بہت ساری علامات عشق پائے جانے کی وجہ سے ہے جو اس کی حالت پر دلالت کررہے ہیں مثلاً آنسو کا خون سے ملنا، چہرے کی زردی، جسم کی نقاہت، آہ وزاری کی کثرت بے خوابی وغیرہ ذالک یہ سارے امور عشق ومحبت کی علامتوں اور دلیلوں میں سے ہیں۔

پھر گویا کسی سائل نے اس سے کہا کہ تمہاری حالت کیسی ہے؟ تو عاشق نے اسے یوں جواب دیا "لاسری بمستتر۔۔۔ الخ تو اس سے معلوم ہوا کہ "لاسری بمستتر" یہ جملہ استئنافیہ ہے۔ اور "لاسری" میں 'لا' مشابہ بلیس ہے اور (سری) یہ 'یائے متکلم' کی جانب مضاف ہے اور 'لا' کا اسم ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے اور (بمستتر) اس میں 'با' زائدہ ہے اور یہ 'لا' کی خبر واقع ہے (عن) یہ "مستتر" کے متعلق ہے۔ (لادائی) اس کا "لاسری" پر عطف ہے اور حرف نفی کی تکرار تاکید کے لئے ہے "داء" بمعنیٰ مرض یہ 'یائے متکلم' کی جانب مضاف ہے (المنحسم) 'انحسام' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنیٰ انقطاع یعنی میرا مرض محبوب تک پہنچنے سے منقطع ہونے والا نہیں ہے۔

حاصل معنیٰ:۔ اے ملامت کرنے والے میں نے تجھ سے عذر قبول کرنے کی بہت امید کی لیکن تو نے میر

اعذر قبول نہیں کیا اور تو ملامت کرنے سے باز نہ آیا تو اب میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے بھی اس بلائے عشق میں مبتلا کردے جس میں میں مبتلا ہوں اور تجھ تک بھی یہ محبت کی بلا پہنچ جائے یا پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس ضیاء عشق کو تجھ سے دور کردے، خدا کرے کہ یہ عشق کی سختی تجھ سے دور ہو جائے اور تجھے نہ لگے۔ تو گویا سائل عاشق سے اس کے ابتلا کے بارے میں دریافت کررہا ہے اور اس سے پوچھ رہا ہے کہ مبتلائے عشق ہو کر تیری حالت کیسی ہے؟ تو عاشق کہتا ہے کہ میں اس حال میں مبتلا ہوں کہ اب میرا راز محبت نکتہ چینوں اور عیب جویوں سے مخفی نہیں رہا اس لئے کہ اس عشق نے مجھے بے اختیار کردیا ہے اور میرا راز مجبوراً عیاں ہو گیا ہے۔ مگر جہاں یہ راز پوشیدہ رہنے والا نہیں وہیں یہ میرا مرض یعنی مرض عشق نبی مختار کا منقطع ہونا بھی ممکن نہیں لیل ونہار کی گردش اور دور وفرار کی مجبوریاں بھی اس عشق کو ختم نہیں کرسکتیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ شریف کی فصل اول کے گیارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۱)محضتنی النصح لکن لست اسمعہ ان المحب عن العذال فی صمم

ترجمہ: تونے تو مجھے خلوص دل سے نصیحت کی لیکن میں تیری نصیحت کو سننے والا نہیں اسلئے کہ عاشق نکتہ چینوں کی ملامت سننے سے بہرا ہوتا ہے۔

ربط : توجب ناظم ذی فہم ملامت کرنے والے سے معذرت خواہی کرنے لگے (اور دوسری طرف ملامت کرنے والا عاشق کی معذرت قبول نہ کرکے) مسلسل ملامت کرنے اور نکتہ چینی میں مصروف ہے۔ ادھر عاشق ملامت طلب کررہا ہے اور نرم گو ہو کر اس سے یوں مخاطب ہے کہ اے ملامت کرنے والے تونے صفائی قلب اور خلوص دل

سے مجھے عشق سے باز رہنے کی نصیحت کی اس گمان میں کہ میں عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی میں مبتلا ہوں اور نبی اور رحمٰن کے بجائے فلان ابن فلان کے عشق میں جل رہا ہوں تو عاشق نے اس کی نصیحت نہ قبول کرنے کا عذر پیش کیا۔تو عاشق نے اس کی نصیحت نہ قبول کرنے سے معذرت کی، اس بات پر آگاہ کرتے ہوئے کہ وہ خود بینی اور خودستائش سے پاک ہے۔(یعنی تمہاری نصیحت قبول نہ کرنا خودستائش میں نہیں ہے بلکہ تم نے تو مخلصانہ ہی نصیحت کی تھی لیکن اس کے باوجود میں اسے قبول کرنے والا نہیں اور یہ نصیحت قبول نہ کرنا عجب وریا اور خود بینی کی وجہ سے نہیں ہے۔)

آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

"لو لم تذنبوا الخشيت عليكم ماهو اعظم من ذالك العجب العجب"

ترجمہ: اگر تم لوگ بالکل کوئی گناہ کا ارتکاب نہ بھی کرو تب بھی مجھے تم پر اندیشہ ہوگا اس گناہ کا جو اس سے بھی بڑا گناہ ہے وہ 'ریا' ہے ۔

تو ناظم شعر اس سے یوں مخاطب ہوئے:

محضتني النصح لكن لست اسمعه ان المحب عن العذال في صمم

(محضتني) یعنی اے ملامت کرنے والے تو نے خالص اور بے غرض نصیحت کی۔ (النصح) فعل کا مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔(النصيحة) دوسرے کے لئے بھلائی چاہنا۔ (لكن) یہ کلمہ استدراک کے لئے ہے (لست اسمعه) نہیں میں اس کو قبول کرنے والا (میں اس کی جانب ملتفت ہونے والا نہیں) سماع سے مراد قبول و اقرار کرنا ہے۔علامہ ابن حجر مکی "عمدہ" میں فرماتے ہیں کہ "میں اس کو سننے والا نہیں" کا مطلب قبول واذعان سے سننے والا نہیں۔

اور یہ جملہ مستانفہ ہے اور ثابت شدہ کلام سے محل تعلیل میں ہے۔

پھر مذکورہ نفی کی علت بیان کی اپنے قول "ان المحب" سے۔اس میں متکلم سے غیبت کی جانب التفات ہے۔(

عن العذال) یعنی ملامت کرنے والوں سے۔ یہ تو " اسمعه " کے متعلق ہے یا پھر" صمم " سے اور یہی من جهت المعنی اولیٰ ہے(یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ مصدر کا معمول اس پر مقدم ہے تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ) مصدر جب ظرف ہو، تو اس کے معمول کے مقدم ہونے میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ اس میں فعل کا اثر ہی کافی ہوتا ہے۔ جیسا کہ شیخ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں تصریح فرمائی ہے (فاما بلغ معه السعی) اولا 'لوم' سے تعبیر کیا اور پھر 'عذل' سے اس جانب تنبیہ کرتے ہوئے کہ دونوں مترادفین ہیں۔ (فی صھم) یہ''ان'' کی خبر ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی" کائن فی صمم عن سماع کلامهم" ان کی باتیں سننے سے بہرہ ہوتا ہے۔

اس میں آقا علیہ السلام کے قول کی جانب تلمیح ہے جس کو امام بخاری نے روایت کیا کہ (حبك الشئی یعمی ویصم) کسی شئی کی محبت انسان کو اندھا بہرہ کر دیتی ہے۔

اس شعر کی خاصیت یہ ہے کہ اگر تم کسی کے مکر و شر سے خائف ہو تو اس شعر کو ایک گول کاغذ میں لکھ کر اپنے سر کی پیشانی پر عمامہ کے نیچے رکھ لو انشاء اللہ تبارک و تعالیٰ تم اس کے شر سے محفوظ رہو گے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و اٰله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ شریف کی فصل اول کے بارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۲)انی اتهمت نصیح الشیب فی عذلی و الشیب ابعد فی نصح عن التهم

ترجمہ: میں بڑھاپے کی نصیحت پر اپنی ملامت کے سلسلے میں تہمت لگاتا ہوں حالانکہ بڑھاپا نصیحت کرنے میں تہمتوں سے بہت دور ہوتا ہے۔

تشـریـح: عاشق ماسبق کی تاکید پر مزید تاکید کررہا ہے کہ وہ لائم کی نصیحت قبول نہیں کرے گا اور اس کی نصیحت نہ قبول کرنے پر وجہ جواز بیان کرتا ہے اور یہ کہتے ہوئے متوجہ ہوتا ہے۔

انی اتهـمـت نـصيـح الشيـب فی عذلی و الشيب ابعد فی نصح عن التهم

تشریح: جملہ ماسبق کے لئے محل تعلیل میں ہے، علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ " انی " کی تقدیر " لانی " ہے۔ حرف جار کو قیاسی ہونے کی وجہ سے حذف کردیا گیا تو وہ حقیقتاً علت ہے ان کے قول کا قضیہ یہ ہے کہ یہاں دو وجہ جائز ہیں ایک یہ کہ ' انـی اتهمـت ' بفتح ہمزہ ہو حرف جار کے محذوف ہونے کی بنیاد پر۔اس کی بہت مثالیں ہیں یہاں پر قرآن پاک سے ایک مثال پر اکتفیٰ کیا جارہا ہے۔(و بشـر الـذيـن اٰمنوا وعملوا الصلحت ان لهم جنٰت۔۔) الاية

اور دوسری وجہ یہ کہ ' انی ' بالکسر ہو اور جملہ ہر حال میں محل تعلیل میں ہو۔

(اتهمت) صیغہ واحد متکلم از باب افتعال بمعنی تہمت لگانا اور کہا جاتا ہے اتهمت فلانا بكذا (میں نے فلاں پر اس چیز کی تہمت لگائی یعنی میں نے اس کی نسبت اس چیز کی طرف کی جو عار پیدا کرتی ہے۔

(التهمة) یہ اسم ہے اور اس کی 'تـا' واو سے مبدلہ ہے اس کی اصل 'وهمة' ہے جیسے 'تـخمة' کہ اس کی اصل 'وخمة' ہے

(نـصيـح الشيـب) یہ " اتهـمـت " کا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔(نـصيـح) بروزن فعیل بمعنی 'نـاصـح' ہے اور " الشيـب " کی جانب مضاف ہے تو یہاں پر یہ اضافت یا تو " اضـافة الـصـفة الی موصوفها " کی قبیل سے ہے یعنی میں نے نصیحت کرنے والی چیز پر تہمت لگادی۔

یا یہ اضافت ' اضـافة المشبه به الی المشبه " کی قبیل سے ہے یعنی وہ جو ناصح کی طرح ہے قرب موت کی خبر دینے کے سلسلے میں۔یا پھر تـنـصيـح کو مصدر مانا جائے تو اس کی اضافت " الشيـب " کی جانب " اضـافة المصدر الی فاعله " کی قبیل سے ہوگی۔

اور یہ اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ اضافت بیانیہ ہو۔(بہر حال) نـصيحة الشيـب (بڑھاپے کی نصیحت) سے مرد یہ ہے کہ بڑھاپا بزبان حال کہہ رہا ہے کہ سفر آخرت قریب ہو چکا ہے اور اس دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آچکا تو اب بدکاریوں سے منتقل ہو کر توبہ کرنے کا وقت ہے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضرت عمر فارق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے ایک اعرابی کو حکم دیا کہ وہ روزانہ صبح گھر کے پیچھے سے یہ آواز لگایا کرے کہ اے عمر اپنی موت کو نہ بھولنا اور دنیا میں اتنا ہی کام کرو جتنا تمہیں اس میں رہنا ہے: پھر بعد میں جب حضرت عمر فاروق اعظم نے اپنی ریش مبارک میں سفیدی دیکھی تو اس اعرابی سے فرمایا کہ اب تم ندا لگانا چھوڑ دو اس لئے کہ میرا نذکرا اور منادی اب ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لئے اب تمہاری ندا کی کوئی ضرورت نہیں۔(الخرپوتی ص ۳۱)

(فـي عـذلـي) "اتهمت" فعل کے متعلق ہے اور (الـعـذل) 'ذال' کے فتح اور سکون دونوں صورتوں میں ملامت کرنے ہی کے معنیٰ میں ہے لیکن مصدر" العذل" ذال کے سکون ہی کے ساتھ ہے۔اور وہ مفعول کی جانب مضاف ہے (فی عذلی) کی تقدیری عبارت یوں ہوگی (فـی عـذلـه ایای) اس کی مجھے ملامت کرنے کے سلسلے میں)

(والشيـب ابـعد) اس کو موضع اضمار میں ظاہر کیا یعنی اشـد بعدا۔ (و الشيب) میں 'واو' حالیہ ہے۔" الشیب" مبتدا ہے اور "ابعد" اس کی خبر (فـی نـصـح) 'ابعد' کے متعلق ہے اور اس کی تنوین مضاف الیہ (کے عوض) کے طور پر ہے اس کی تقدیری عبارت یہ ہوگی "فی نصحه عن التهم" اور بعض روایتوں میں "عن التهـم" کے بجائے "مـن التهـم" آیا ہے اور روایتوں کے اختلاف کی بنیاد پر ابعد کے متعلق ہے یہاں یہ 'من' تفضلیہ محذوف ہے یعنی "من كل ناصح"

شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ یہ شعر گزشتہ شعر کی معنیٰ کے اعتبار سے تاکید ہے یعنی اے ملامت کرنے والے میرا سرگشتہ اور شیفتہ دل جب بڑھاپے کی نصیحت کو قبول نہیں کرتا (جو تمام نصیحت کرنے والوں سے سچا اور ہر تہمت سے بری

ہے) تو اپنی تہمت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ (تیری نصیحت مجھ پر کیا اثر کرسکتی ہے جب بڑھاپے کی نصیحت مجھ پر کوئی اثرنہیں کررہی ہے)

اس لئے کہ بڑھاپا بلاشبہ تمام تہمتوں سے دور ہوتا ہے خالص خیر خواہی میں (اور میں ایسے ناصح کی نصیحت تک کو بھی قبول نہیں کررہاہوں تو تم اس پر اپنی نصیحت کے قبول کرانے کو قیاس کرسکتے ہو۔

اقول:۔ اس میں اور علامہ خرپوتی کے بیان کردہ معانی میں کوئی منافات نہیں ہے کہ شیخ زادہ نے فرمایا کہ یہ شعر گزشتہ شعر کی من حیث المعنیٰ تاکید ہے اور علامہ خرپوتی نے فرمایا کہ یہ شعر ماسبق کی علت ہے۔اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شئی کسی دوسری شئی کی علت بھی ہوتی ہے اور اس کی فی نفسہ تاکید بھی ہوتی ہے من حیث المعنیٰ کیوں کہ جس وقت علت میں معلول کی تائید اور تقویت کا معنی ہوگا وہ تاکید کے معنیٰ سے خالی نہیں ہوگا۔تو سب کا مرجع ایک معنیٰ ہے جو تقویت اور تاکید ہے۔

تفنن

اب اس شعر سے ناظم شعر عاشق اور لائم سے شکوہ وشکایت کی حالت بیان کرکے نفس اور اس سے شکوہ کی حالت کے بیان کی جانب منتقل ہورہے ہیں۔

ناظم ذی فہم اب یہاں سے اپنے اسلوب اور روش کو بدل رہے ہیں اور دوسری حالت کی طرف منتقل ہورہے ہیں یعنی عاشق کے حالات اور نکتہ چیں کا شکوہ بیان کرکے، نفس کی کیفیت اور اس کے شکوہ کے بیان کی جانب منتقل ہورہے ہیں،اس لئے کہ وطن اصلی کی جانب مکمل میلان سے جو چیز مانع ہے وہ یہی نفس امارہ ہے جو بدکاریوں کا حکم دیتی ہے اور افعال قبیحہ کی جانب راغب کرتی ہے اسی وجہ سے آقا علیہ السلام کے اس قول سے خطاب تمہاری جانب متوجہ ہوا۔" اعدی عدوك نفسك التی بين جنبيك "(ترجمہ:۔تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دو پہلو کے درمیان ہے)اور کلام میں ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی جانب منتقل ہونا یہ سامع کے ذوق وشوق میں تازگی اور جدت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اس کا ایقاع اکثر سامع کی اس کی جانب توجہ

مبذول کرانے کے لئے ہوتا ہے۔اوراللہ رب العزت کے کلام یعنی قرآن پاک کا اعجاز ان اسلوب اور طریقوں پر نازل ہونے کی وجہ سے بھی ہے۔شیخ زادہ نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن پاک کا اعجاز صرف انہی قوالیب میں اترنے اور صرف انہی اسالیب پر نازل ہونے کی وجہ سے ہے۔انہوں نے جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرمارہے ہیں دعوے کو منحصر اور محدود کر دیا حالانکہ قرآن پاک کے وجوہ اعجاز تو اتنے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔اسی وجہ سے میں نے ان کی عبارت میں کچھ تغیر کر کے تصرف کیا ہے۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ ان دونون شعر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص سے محبت کرتے ہو اور اس سے اور لوگوں سے شرم کرتے ہو کہ وہ اس سے بات کہیں تو ان دونوں شعر کو ساعت زہرہ میں تانبے کے ایک بڑے پیالے میں لکھ دو اور اس میں بارش کا پانی بھر کر اسے پی جاؤ تو (انشاءاللہ) ضرور تم مضبوط وقوی ہو جاؤ گے محبوب پر اور تم کسی سے کبھی خوف نہیں کھاؤ گے اور تمہارا راز بھی محبوب پر کھل جائے گا اور تمہارا مقصد پورا ہو جائیگا۔

الفصل الثانی فی التحذیر من ھو النفس

(دوسری فصل نفسانی خواہشات سے متنبہ کرنے کے بیان میں)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و اٰ لہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے پہلے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں

(۱۳)فان امارتی بالسوء ما اتعظت　　　من جھلھا بنذیر الشیب والھرم

(ترجمہ:۔تو بلاشہ میرے نفس امارہ نے اپنی جہالت کی وجہ سے ڈرانے والے بڑھاپے اور انتہائی ضعیفی کی نصیحت کو قبول نہ کیا۔)

ربط: جب شاعر ذی فہم کا یہ قول ” انی اتھمت نصیح الشیب فی عذلی ‘‘اس بات کی تنبیہ کر رہا ہے اور اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ عاشق نے بڑھاپے کی نصیحت تک کو قبول نہیں کیا اور وہ اس کے نیک مشورے کو بھی ماننے والا نہیں،تب ناظم شعر نے اس کی علت بیان کرنے کے لئے اپنے اس قول سے اس کی علت کی طرف یوں اشارہ کیا:۔

فان امارتی بالسوء ما اتعظت　　　من جھلھا بنذیر الشیب والھرم

تشریح:۔ (فاِنَّ) میں ’فا‘ تعلیلیہ ہے (الامّارۃ) اسم فاعل کا مبالغہ ہے یعنی بدی کا بہت حکم دینے والا۔اور یائے متکلم کی جانب اس کی اضافت عہدی ہے یعنی میرا حکم دینے والا تو وہ خود متعین ہے اور وہ میرا نفس ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ” حذف الموصوف و ذکر الصفۃ و ارادتہ منھا ‘ ‘ کی قبیل سے ہو (یعنی موصوف کو حذف کر کے صفت کا ذکر کر دیا جائے اور اس صفت سے موصوف ہی مراد ہو) اس لئے کہ ’امارۃ‘‘ کا صلہ ’سوء‘ بمعنی شر ہے۔ (الاتعاظ) نصیحت قبول کرنے کے معنی میں ہے (من) سببیہ ہے (نذیر) بمعنی انذار

ہے جیسے نکیر بمعنی انکار ہوتا ہے (ڈرانے کے معنی میں ہے) یا پھر وہ بمعنی منذر ہے جیسے بدیع بمعنی مبدع ہوا کرتا ہے (ڈرانے والے کے معنی میں ہوگا) اور "نذیر" کی "الشیب" کی طرف اضافت "اضافة الصفة الی موصوفھا" کی قبیل سے ہے (یعنی صفت کی اپنے موصوف کی جانب اضافت)۔

یا پھر یہ اضافت بیانیہ ہے جیسے (کتاب المفتاح) اور (شھر رمضان) میں اضافت بیانیہ ہے۔

اور اگر 'شیب' (بڑھاپے) اور 'نذیر' (ڈرانے والا) کے درمیان مشابہت کا اعتبار کر لیا جائے تو یہ اضافت "اضافة المشبه به الی المشبه" کی قبیل سے ہوگی یعنی "لجین الماء" کی قبیل سے ہوگی (جیسے پانی مشبہ ہے اور چاندی (لجین) مشبہ بہ ہے) اور یہ قبیل، تشبیہِ تاکید کے دو طریقوں میں سے ایک ہے۔ (الھرم) بمعنی انتہائے ضعیفی (بالنذیر) جائز ہے کہ وہ "اتعظت" کے متعلق ہو اور "جھلھا" کے متعلق ہو تو اس صورت میں "تنزیل العالم منزلة الجاھل" کی قبیل سے ہوگا (یعنی اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے عالم کو جاہل کی منزل میں اتار دینا) تو معنی یہ ہوگا کہ بدکاریوں اور برائیوں کا حکم دینے والے میرے نفس امارہ نے ضعیفی کی نصیحت کو قبول نہیں کیا تو (اسی وجہ سے) وہ انتہائی ضعیفی اور بڑھاپے کے بعد جہالت کی گمراہی میں ڈوب گیا اور اس نے شہوت کی سرکشی کی لگام کو دست ندامت سے نہیں کھینچا۔

جاننا چاہئے کہ ناظم شعر (نظمهٔ الله فی سلک اولیاء ہ) (اللہ تعالیٰ ان کو اپنے اولیاء کے زمرے میں شامل فرمائے) نے اوصاف ذمیمہ نفسانیہ کے اصول چند اشعار میں بیان فرمائے اور پھر ان صفات ذمیمہ کو اپنے نفس پر ثابت کر دیا ایک نبی (حضرت یوسف علیہ السلام) کی اقتدا کرنے کے لئے جنہوں نے کسر نفسی کے لئے کہا تھا (وما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء) اور اثر حبیب کی پیروی کرنے کے لئے جو منصف کے کلام کی اتباع میں چلا اپنے اس قول میں (ومالی لا اعبدالذی فطرنی والیه ترجعون)

اس طرح کا راستہ اختیار کرنا بلاغت میں عجیب شان رکھتا ہے اس لئے کہ یہ طریقہ سامعین کو اچھی طرح بیدار کر دیتا

ہے اور انہیں غور سے سننے کی بھرپور اپیل کرتا ہے کیونکہ وہ انہیں اس طریقے سے مخاطب اچھی طرح نہیں کرتا جس سے انہیں تنفر اور توہم ہو تو جب سامعین نے پہلی دفعہ ناظم کے کلام سے اعراض نہیں کیا اور نہ مقصود کلام سے روگردانی کی تب ناظم نے بتدریج سامعین پر حق ڈال کر ان کو اس طرح ترقی دی کہ وہ نہیں جانتے ہیں تو یہ صفات مذکورہ مخاطب کے صفات سے ہیں نہ کہ متکلم کے، لیکن متکلم نے ان صفات کو اپنے اوپر اس نکتے کی رعایت میں ثابت کر لیا جو ابھی ہم مذکورہ بالا عبارت میں بیان کر چکے ہیں (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور اثر حبیب کی اتباع میں جنہوں نے کسر نفسی اور تواضعا کہا تھا) اور اب جب گفتگو پھر اسی طرف لوٹ آئی ہے تو اب حقیقت نفس اور اس کے طریقۂ تزکیہ کی معرفت کے لئے ایک مقدمے کی تمہید ضروری ہے۔

حقیقت نفس

مقدمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿ان النفس لامارة باسوٓء الا مارحم ربی﴾ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اعدی عدوك نفسك التی بین جنبیك'' یعنی تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان ہے۔

جاننا چاہئے کہ نفس ایک جوہر لطیف ہے اور یہی معدن اخلاق ذمیمہ ہے جو انسان کے دونوں پہلوؤں کے درمیان میں ہوتا ہے یعنی تمام جسم میں اور یہی نفس برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے اور یہ ایک ایسی طبیعت وفطرت ہے جو ملکوت اعلیٰ سے پیدا شدہ روحانیت کی ضد ہے تو وہ روحانیت رحمانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی ہے۔

اور یہ نفس ملکوت سفلی سے پیدا شدہ ہے (اور ان ارواح کا تابع ہوتا ہے جو اسفل سافلین میں ہیں) شیاطین کے مثل جو صرف شر اور برائی کا حکم دیتا ہے، اور سرکشی کرنا، انکار کرنا، تکبر کرنا اس کی فطرت میں سے ہے، اسی وجہ سے نفس موعظت حسنہ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور سرکشی کرتا ہے جیسا کہ ناظم نے اس طرف اشارہ کیا ہے اپنے اس قول سے (فان امارتی بالسوء ما اتعظت)

بعض روایات میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب نفس کی تخلیق فرمائی تو اسے حکم دیا (اقبلی) کہ سامنے آ تو اس نے اعراض کیا اور جب اس سے فرمایا (ادبری) یعنی پیچھے ہٹ تو سامنے آئی عقل کے برخلاف۔

منشأ خلقت نفس: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب جسد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں روح پھونکی تو روح اور جسم کے ازدواج سے دو اولاد پیدا فرمائی۔

ایک مذکر اور وہ دل ہے جو اپنے والد روح کے مشابہ ہوتا ہے تو اسی وجہ سے وہ امر خیر کرتا ہے اور دل جو صنوبر پھل کی شکل کا ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اس کا مسکن محل سینے کے بائیں جانب میں بنایا۔

اور دوسری اولاد مؤنث پیدا فرمائی اور وہ نفس ہے جو اپنی والدہ جسم سفلی کے مشابہ ہوتی ہے وہ حکم شر کرتی ہے اور اس کا مسکن ومحل پورا جسم ہے اور نفس کو جہنم کی صورت پر پیدا فرمایا اور جہنم کے ہر درکے میں اس نفس کی ایک صفت پیدا فرمائی اور وہ درکہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اس میں وہی داخل ہوگا جو ساتوں درکوں میں کسی ایک درکے کی طرف گرے گا اور وہ سات درکات یہ سات صفتیں ہیں۔ کبر، حرص، شہوت، حسد، غضب، بخل اور کینہ تو جس نے اپنے نفس کو ان صفات قبیحہ سے پاک کرلیا تو وہ ان درکات سفلیہ کو پار کرلے گیا اور جنان علویہ کے درجوں پر پہنچ گیا جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا (قد افلح من زکّٰھا) اور جس نے اپنے نفس کو ان صفات قبیحہ سے پاک نہیں کیا تو وہ جہنم کے درجوں میں خائب وخاسر ہوکر پڑا رہا جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا (و قد خاب من دسّٰھا)

اھم نکتہ: پھر جاننا چاہئے کہ یہ تمام مذکورہ صفات مقدمات نفس میں سے ہیں اور ان تمام صفات سے کچھ اور صفات پیدا ہوتی ہیں (بہرحال) ان تمام صفات نفسانیہ کا منشا دو صفت ہیں جو ہر حیوان کی جبلت میں موجود ہوتی ہیں اور وہ دو صفتیں زندگی میں ضرور ہوتی ہیں، وہ دو صفت شہوت اور غضب ہیں۔ شہوت کے ذریعے اپنے نفس پر منافع اور فوائد لائے جاتے ہیں اور غضب کے ذریعے مضرت کو اپنے نفس سے دفع کیا جاتا ہے۔ تو پھر جب شہوت کا استعمال محتاج الیہ کے حصول میں کیا جائے تو اس سے حرص پیدا ہوگی اور اگر غضب کا استعمال دفع مضرت میں کیا

جائے تو اس سے ''کینہ'' پیدا ہوگا اور اگر کوئی انسان کسی ایسی چیز کو اپنے غیر کے پاس دیکھے جس کی اسے احتیاج ہو اور وہ اسے حاصل نہ کر پاتا ہو تو اس سے ''حسد'' پیدا ہوگا۔ اور اگر کسی انسان کے پاس کوئی ایسی شئی ہو جو ضرورت منداس سے طلب کرے اور وہ اس کو نہ دے تو اس سے ''بخل'' پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اس انسان کے پاس موجود شئی کی احتیاج وضرورت جم غفیر کو ہو اور وہ تمام لوگ اپنے مقصد کی طلب میں اس سے عجز وانکساری کر رہے ہوں اور وہ شخص ان کو بنظر حقارت اور اپنے آپ کو بنظر عزت واحترام دیکھتا ہو تو اس سے ''کبر وغرور'' پیدا ہوتا ہے، اور اگر اس کے غیر کے پاس وہ چیز ہو جسے اسکو ضرورت ہے اور وہ اس تک نہ پہونچ پائے لیکن وہ قادر ہے کہ قوت اور اپنی طاقت سے اسے حاصل کرلے اور حرص اس کو اسے لینے پر آمادہ کرے تو اس سے ''ظلم وتعدی'' پیدا ہوتا ہے۔

(بہر حال) اسی طرح تمام اخلاق ذمیمہ کا حال ہے کہ بعض بعض سے وجود میں آتے ہیں جب تک ان کا استئصال نہ کردیا جائے۔ اور اس کے مادے کو تزکیہ نفس سے شریعت وطریقت کے قانون پر ختم کیا جاسکتا ہے (شیخ زادہ ۳۳۔۳۴)

یہ شعر اور اس کے بعد والے دو شعر (یعنی تین اشعار) ان کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر اس کا نفس غالب آگیا ہو اور وہ اسے توبہ واستغفار سے روکتا ہو اور وہ (شخص) مخالفت نفس سے عاجز ہو تو وہ ان تینوں اشعار کو جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہوکر لکھ لے اور اس کو گلاب کے پانی سے دھو کر پی لے اور جب اسے پیئے تو مستقل قبلہ کی طرف رو کرکے نماز عصر ومغرب ادا کرنے تک بیٹھا رہے اور مسلسل اذکار میں مصروف رہے اور بعض اوقات ان اشعار کو پڑھتا بھی رہا کرے تو ضرور (انشاء اللہ) وہ اس مجلس سے اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا نفس اس کا مطیع وتابعدار ہو چکا ہوگا اور اس کے نفس کی حالت اچھی ہو چکی ہوگی اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو توفیق توبہ عطا فرمادے گا۔

☆☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے دوسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں

(۱۴)ولا اَعَدَّتُ من الفعل الجمیل قری ضیف ألم براسی غیر محتشم

(ترجمہ:۔(میرے) نفس نے اعمال حسنہ سے اس مہمان کی میزبانی کا اہتمام وانتظام نہ کیا جو میرے سر پر بے تکلف اتر آیا (یعنی بیاض مو، بڑھاپا)

ربط: شاعر ذی فہم جب حالت نفس امارہ اور اس کے گناہوں میں مستغرق ہونے کی بدحالی کو بیان کر چکے اور اس کا نصیحت نہ قبول کرنے کی کیفیت کو بیان کر دیا تو اب وہ یہ بیان کر رہے ہیں کہ نفس رذیل اوصاف سے نہ بری ہے اور نہ ہی اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہے اسی کو شاعر ذی فہم یوں کہتے ہیں۔

ولا اعدت من الفعل الجمیل قری ضیف ألم براسی غیر محتشم

لفظی تشریح: (ناظم فاہم کا یہ شعر) جملہ معطوفہ ہے (ما اتعظت) جملے پر اور (اتعاظ) (نصیحت قبول کرنا) سے مراد افعال قبیحہ سے اجتناب کرنا ہے اور (اعــــــــداد) تیار کرنا) سے مراد افعال حمیدہ کو ادا کرنا ہے۔(اعدت) بمعنی هیأت ہے (یعنی تیار کرنے) کے معنی میں ہے اور اس کا (ما اتعظت) پر عطف ہے (من الفعل الجمیل) یعنی بہترین عبادات اور اعلیٰ ذریعۂ تقربات کے ذریعے (قریٰ) قاف کے کسرے کے ساتھ مہمانوں کے لئے جو کھانا پینا پیش کیا جاتا ہے اور جس طعام وشراب سے ان کی ضیافت کی جاتی ہے، اصل میں اس کو ''قری'' کہتے ہیں۔

(لیکن) یہاں ''قری'' سے مراد خالص اور اعمال حسنہ سے سفارش کی گئی توبہ ہے۔(ضیف) (مہمان) سے مراد بڑھاپا اور پیرانہ سالی ہے۔(اَلَمَّ) بمعنی اتر پڑنا۔فعل ماضی از باب افعال (مصدر المام) یعنی وہ مہمان میرے سر پر

اتر آیا اس حال میں کہ وہ غیر محتشم ہے یعنی اترنے میں حیا کرنے والا نہیں ہے اس اعتبار سے کہ وہ میری اجازت اور ارادے کے بغیر اتر آیا ہے اور اس نے اپنی اقامت طویل کر دی ہے تو اب وہ موت سے ہی کوچ کرے گا۔

حدیث صحیح میں ہے:" من کان یومن باللہ و الیوم الآخر فلیکرم ضیفہ" (ترجمہ) جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو اسے اپنے مہمان کی تعظیم کرنا چاہئے۔

مقامات نفس اور مراتب توبہ کا بیان

پھر تزکیہ نفس میں اصل نفس کا اپنے مقامات سے ترقی کرنا ہے اور اس کے چار مقام ہیں:۔(۱) مقام امارہ یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے(ان النفس لامارۃ بالسوٓء)(۲) مقام لوامیہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے(ولآ اقسم بالنفس اللوامۃ)(۳) مقام ملھمیہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے(و نفس وما سوّٰھا فالھمھا)(۴) مقام مطمئنہ، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے(یآ یَّتُھا النفسُ الْمُطمئنۃ ارجعیٓ الی ربک)

نفس اپنے مقامات سے مراتب توبہ کے مطابق ترقی کرتا ہے اور توبہ منازل سالکین میں سے پہلی منزل اور مقامات طالبین سے پہلا مقام ہے۔ لغت میں توبہ کی حقیقت لوٹنا اور رجوع کرنا ہے لیکن شرع میں توبہ سے مراد ہر اس چیز سے رجوع کرنا ہے جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی نہیں۔

اور توبہ کے بھی مقاماتِ نفس کے موافق چار مراتب ہیں۔

مرتبہٗ اولیٰ یہ توبہ کے نام سے مختص ہے اور یہ نفس امارہ کے لئے ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے(وتوبوا الی اللہ جمیعا ایُّہ المؤمنون)اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا(التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ) (گناہ سے تائب ہونے والا بے گناہ کی طرح ہے) یہ مرتبہ عوام المومنین کا ہے اور اس کی حقیقت منہیات کو ترک کرنا، مامورات کو بجالانا، فوائت (فوت شدہ نمازوں عبادات وغیرہ) کی قضا کرنا، حقوق کو ادا کرنا، مظالم سے آزاد ہونا، ماضی کے گناہوں پر نادم ہونا، گناہوں کی طرف نہ لوٹنے کا عزم مصمم کرنا ہے یہ سب اقوال وافعال کی توبہ ہیں۔

مـرتبـۂ ثـانیـہ: انابہ اور یہ نفس لوامہ کے لئے ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشادفرماتا ہے (وانیبـوا الـی ربکم) یہ مرتبہ خواص المومنین کا ہے اور اللہ کی جانب متوجہ ہونا (الانـابة الی الله تعالیٰ) کی حقیقت یہ ہے کہ ترک دنیا اوراس کی لذتوں سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو عبادت کے لئے فارغ کر لینا، اخلاق کو مہذب کرنا، نفسانی خواہشات کی مخالفت کر کے نفس کو مزکی کرنا، اور نفس سے مسلسل جہاد کرنا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے، اوراس جانب اشارہ فرماتا ہے کہ توبہ واستغفار کرنا اور نفس کو اوصاف ذمیمہ کی کدورت سے پاک کرنا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت ازلیہ کے نتائج سے ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے (یـحِبُّھـم) یہ اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص نے حضرت رابعہ بصری سے عرض کیا کہ میں بہت بڑا گنہگار رہوں تو اگر میں توبہ کروں تو کیا اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے گا؟ فرمایا نہیں بلکہ اگر وہ تجھے بخشنے کا ارادہ فرمائے تو تو تائب ہو، اس لئے کہ گناہ بندوں کی صفات میں سے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وعـصـیٰ اٰدم ربه فغویٰ) اور توبہ قبول کرنا اور توبہ کی توفیق عطا کرنا رب تعالیٰ کی صفات میں سے ہے جیسا کہ خود وہ فرماتا ہے (فتـاب عـلیه و هدی) مزید خود کو ''تواب'' فرماتا ہے تو بندے کا توبہ کرنا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے توبہ قبول کرنے کا اثر ہے جیسا کہ بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ازلی محبت کا نتیجہ ہے، جیسا کہ میں ابھی باری تعالیٰ کا یہ فرمان نقل کر آیا ہوں (یـحبهـم ویـحبـونهم) بلکہ وہ تمام امور جو بندے کی مشیت اوراس کے ارادے سے متعلق ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اوراس کے ارادے ہی سے ہوتے ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے (مـا تشآء ون الآ ان یشاء الله) اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ الـمراد مریدو المرید مراد، تو نفس جب انـابـت (توبہ کے دوسرے مرتبے) سے آراستہ ہوجاتا ہے تو وہ مقام قلب میں داخل ہوجاتا ہے اوراس کی صفت سے متصف ہوجاتا ہے، اس وجہ سے کہ انابت قلب کی صفت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشادفرماتا ہے (وجآء بقلب منیب)

مـرتبۂ ثالثه:۔ (توبہ کا تیسرا درجہ) اور یہ نـفس ملهمه کے لئے ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشادفرماتا ہے (

نعم العبد انه اوّاب) اور یہ خواص الاولیاء کا مرتبہ ہے۔اور اوبہ الی اللہ ،اللہ تبارک وتعالیٰ سے لقا کے شوق کا اثر ہے تو جس نے خوف سزا کی وجہ سے توبہ کی تو وہ صاحب توبہ ہے اور جس نے حصول ثواب کی نیت سے توبہ کی تو وہ صاحب انابہ ہے اور جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملاقات کرنے کے شوق میں توبہ کی تو وہ صاحب اوبہ ہے۔

تو نفس جب 'اوبہ' (توبہ کے تیسرے مرتبے) سے آراستہ ہو جاتا ہے تو وہ مقام روح میں داخل ہو جاتا ہے اور وہی مقام عبودیہ ملکیہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کے بموجب (فادخلی فی عبادی)

'اواب' کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ وہ میل جول کو علیحدگی اور ہم نشینی کو گوشہ نشینی میں بدلنے کا مشتاق رہتا ہے، مخلوق سے وحشت محسوس کرتا ہے، حق سے مانوس ہوتا ہے اپنے نفس سے کما حقہ اللہ کے لئے جہاد کرتا ہے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔

مرتبۂ رابعه:۔ رجوع (توبہ کا چوتھا درجہ) یہ نفس مطمئنہ کے لئے ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿یٰٓا یّتُهَا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك﴾ اور یہ انبیاء اور اخص اولیاء کا مرتبہ ہوتا ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان (ارجعی الی ربك) یہ عنایت ربانی کی کشش کی صورت ہے جو انبیاء اور اولیاء کے نفوس کی طرف ہوتی ہے، وہ نفس کو اس کی انانیت سے کھینچ کر اپنے رب کی ملاقات کی طرف بطیبِ خاطر لیجاتا ہے۔یعنی وہ نفوس اپنے رب سے لقا کے شوق میں فرمانبردار ہو جاتے ہیں یعنی سیر میں طریق مرضیہ پر چلتے ہیں اور اپنے رب سے ملاقات کے شوق میں جاں نچھاور کرتے ہیں اثنینیت کے دفع اور ہمیشہ ملاقات کی طمع میں۔

حضرت حلاج کا واقعہ

حکایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حلاج کو جب ہاتھ کاٹنے کیلئے لایا گیا تو پہلے جب ان کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا تو وہ ہنسنے لگے پھر جب ان کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ اور زور سے ہنسے پھر ان کو اندیشہ ہوا کہ خون کے نکلنے سے کہیں

ان کا چہرہ زرد نہ پڑ جائے تو انہوں نے اپنے چہرے کو بہتے ہوئے خون پر اوندھا لیا اور چہرے کو خون سے لت پت کر کے یہ اشعار پڑھنے لگے۔

اللہ یعلم ان الروح قد تلفت   شوقا الیک ولکنی امنیھا

(اللہ جانتا ہے کہ روح تیری ملاقات کے شوق میں فنا ہو چکی ہے لیکن میں اسے آرزو دلاتا ہوں)

و نظرۃ منک یا سولی ویا املی   اشھی الیّ من الدنیا ومافیھا

(اے میری التجا اور اے میری امید! ایک نگاہ تجھے دیکھنا، مجھے دنیا و مافیھا سے زیادہ محبوب ہے)

یا قوم انی غریب فی دیارکم سلمت   روحی الیکم فاحکموا فیھا

(اے میری قوم یقیناً میں تمہارے دیار میں پردیسی تھا، میں تمہیں اپنی روح سونپ رہا ہوں تو تم ہی لوگ اس کے مسئلے میں فیصلہ کرو)

ما أسلم النفس للأسقام تتلفھا   الا لعلمی بان الوصل یحییھا

(میں جان کو ان بیماریوں کی وجہ سے نہیں سونپ رہا ہوں جو ہلاک کر دیں گی بلکہ اس یقین کی وجہ سے سپرد کر رہا ہوں کہ وصال محبوب اسے زندگی بخش دے گا)

نفس المحب علی الا لام صابرۃ   لعل مسقمھا یوما یداویھا

عاشق کا نفس مصائب و آلام میں اس امید پر صبر کرتا ہے کہ شاید اس کو بیماریوں میں مبتلا کرنے والا کبھی اس کی دوا کر دے۔

یہ اشعار پڑھنے کے بعد حضرت حلاج نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا کہ اے میرے مولیٰ میں تیرے بندوں میں اجنبی ہوں اور تیرا ذکر مجھ سے زیادہ اجنبی ہے اور ایک اجنبی دوسرے اجنبی سے الفت رکھتا ہے پھر کسی شخص نے انہیں آواز لگائی اور ان سے پوچھا کہ شیخ یہ بتائیں کہ عشق کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے کہا کہ اس کا ظاہر تو وہ ہے جو دیکھا جا سکتا ہے میری حالت کو ،لیکن اس کا باطن وہ مخلوق سے پوشیدہ ہوتا ہے الحمد للہ الکاشف

لـلكروب والصلوٰة على نبيه المحبوب (تمام خوبیاں اللہ تبارک وتعالیٰ کو جوغموں کو دور کرنے والا ہے اور درودوسلام نازل ہواس کے محبوب پر (الشیخ زادہ ۳۶۔۳۷)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين

فصل ثانی کے تیسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں

(۱۵)لـو كـنـت اعـلـم انی ما او قرهٗ　　　　كـتـمـت سـراً بـدا لـی مـنـه بـالـكـتـم

(ترجمہ:۔اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ میں اس معظم مہمان (یعنی بڑھاپے) کی تعظیم وتوقیر نہیں کروں گا تو میں اس سے نمودار راز (یعنی بالوں کی سفیدی) کو خضاب (مہندی) سے چھپالیتا۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ دونوں شعر میں اپنے نفس کے خلاف گواہی دی کہ میرے نفس نے اس بڑھاپے کے مہمان کا اکرام نہیں کیا جو میرے سر پر اتر آیا ہے بے تکلفانہ طور پر اور نہ ہی اس نے اعمال حسنہ کر کے اس مکرم مہمان کی میزبانی کا انتظام کیا تو ماسبق میں ان کے نفس سے جو صادر ہوا، اس پر پشیمانی اور ندامت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لـو كـنـت اعـلـم انـی مـا او قـرهٗ　　　　كـتـمـت سـراً بـدا لـی مـنـه بـالـكـتـم

تشریح: (لو) امتناع شئی لوجود غیرہ، (اول کے امتناع کے لئے ثانی کا امتناع) کے لئے آتا ہے اس کی تقدیر یہ ہوگی" لكن لم اعلم فلم اكتم سرا بدالی" اھ (یعنی چونکہ" لو" امتناع اول کے لئے امتناع ثانی کے معنی میں ہوتا ہے اس لئے ان کا یہ کہنا ''اگر میں جانتا تو راز چھپالیتا'' کا مطلب ہوگا لیکن میں نے نہیں جانا تو اسی وجہ سے راز کو چھپائے نہیں رکھا)

(کنت) اپنی خبر کے ساتھ یعنیٰ" اعلم" کے ساتھ جملہ شرطیہ ہے (اِنَّ) اپنے اسم وخبر کے ساتھ "اعلم" کے دونوں مفاعیل کے قائم مقام ہے۔ (ما او قره) میں "ما" نافیہ ہے۔ (اُوَقِّرُه) از باب تفعیل توقیر مصدر سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے بمعنی تعظیم، توقیر، احترام۔

اور ضمیر مفعول، ضیف' (مہمان) کی جانب ہے اس سے مراد بڑھاپا ہے۔

(کتمت) یہ شرط کی جزا ہے بمعنی' اخفیت' (چھپانا) (سراً) یہ" کتمت" کا مفعول ہے یعنی خفیہ اور پوشیدہ معاملہ بڑھاپے سے 'کتم' کو 'سر' پر اخفاء اور پوشیدگی میں مبالغہ کے لئے واقع کیا۔ (بدا) یہ سراً' کی صفت ہے بمعنی ظاہر ہونا۔ (لی) یعنی میں اپنے نفس کے احوال پر کسی دوسرے کے جاننے سے پہلے مطلع ہو گیا ہوں۔ (منه) یہ" بدا" کے متعلق ہے اور اس کی ضمیر راجع بسوئے" شیب" (بڑھاپا) ہے۔

(بالکتم) یہ "کتمت" کے متعلق ہے۔ "کتم" ایک ایسا پودا ہے جس سے رنگا جاتا ہے جیسے مہندی یعنی میں بڑھاپے کے اتر آنے کے بعد بالوں کو 'کتم' (مہندی) سے رنگ لیتا تا کہ اس معظم مہمان کی میزبانی اور تعظیم نہ کرنے کے جرم میں، میں گرفتار نہ ہوتا۔

اس شعر میں علم بدیع کی ایک صنعت" رد العجز علی الصدر" موجود ہے، اس صنعت کی تعریف یہ ہے کہ دو مکرر یا متجانس لفظوں میں سے کوئی ایک لفظ شعر کے آخر میں ہو اور دوسرا لفظ مصرعۂ اولیٰ کے شروع میں ہو یا پھر ایک لفظ آخر شعر میں ہو اور دوسرا لفظ مصرعۂ ثانی کے شروع میں۔ (جیسے یہاں اس شعر میں مصرعۂ ثانی کے شروع میں "کتمت" ذکر کیا اور آخر شعر میں "بالکتم" کہا)

حاصل معنی:۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس مکرم مہمان یعنی ضعیفی کی اعمال حسنہ کر کے مہمانی نہیں کر سکوں گا تو میں ضرور پہلی ہی ملاقات میں اس معاملے کو چھپا لیتا جو اس مہمان کی وجہ سے نمودار ہوا یعنی بڑھاپے کی سفیدی کو مہندی سے رنگ کر چھپا لیتا اس لئے کہ مہندی لگانا آقائے دو عالم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے تو اس وقت میری حقیقت کوئی نہیں جان پاتا اور مجھ سے ذلت ورسوائی دور ہو جاتی۔

تلخیص:۔اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد بھی گناہوں کو ترک کر کے زہد اختیار نہیں کروں گا تو میں ضرور اپنے اس بڑھاپے کو مہندی سے رنگ کر چھپا لیتا تاکہ کوئی بھی میری عیب گیری نہ کر سکے اور یہ نہ کہہ سکے کہ فلاں شخص نے ضعیفی اور پیرانہ سالی کی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی زہد وتقویٰ اختیار نہیں کیا اور ابھی تک تارک واجبات وسنن ہے۔

لیکن چوں کہ مجھے اس بارے میں قطعی کوئی علم نہ تھا اسی وجہ سے میں اپنا راز بھی پوشیدہ نہ رکھ سکا۔جس کے نتیجہ میں لوگوں نے میری برائی کی (علامہ خرپوتی:۲۸)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين

فصل ثانی کے تیسرے شعر کی شرح سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم اسی فصل کے چوتھے شعر کی شرح کر رہے ہیں۔

ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۶)من لی برد جماح من غوايتها　　　كما يرد جماح الخيل باللجم

(ترجمہ:۔کون ہے جو میرے نفس امارہ کی سرکشی کو (جو اس کی جہالت اور گمرہی سے پیدا ہوئی) روک دے، جیسے سرکش گھوڑوں کی سرکشی کو لگاموں سے روکا جاتا ہے۔)

ربط:۔شاعر ذی فہم نفس امارہ کی سرکشی سے جب عاجز آ گئے اور اس کے گمرہی میں مستغرق ہونے نے ان کو جب انتہائی درجہ مجبور کر دیا تو انہوں نے اس کی سرکشی کی لگام یہ سوال کرتے ہوئے کھینچی کہ ہے کوئی ضامن جو نفس امارہ کی طغیانی کو روک دے اور اس کو سرکشی کرنے سے باز رکھے،تب انہوں نے اپنے مسئلے کو حل کرنے والے سے پرسش

کرتے ہوئے کہا

مــن لــی بــرد جمــاح مــن غــوا یتهــا　　　کمــا یــرد جمــاح الــخیــل بــاللجم

تشریح:۔ (من لی) اس شعر میں استفہام استعطاف (استفہام برائے طلب رحم) اور استعانت بالغیر ہے یعنی کون ہے جو میرا ضامن ہو جائے؟

(جماح) یعنی خیر سے رکنا اور شر پر مصر رہنا " الجماح " جمح الفرس سے ہے (یعنی گھوڑے کا سرکشی کرنا کے معنی سے ہے) جب گھوڑا اپنے سوار کو سرکشی سے اور تابعداری نہ کرکے عاجز کردے (تب جماح' لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے)' جماح ' کا نکرہ لانا برائے تعظیم ہے۔

(من) ایک نسخے میں (عن) آیا ہے (غوا یتها) یعنی ضلالتها (بمعنی گمراہی) یعنی نفس کا سنت نبوی اور اس کے اسرار قدسیہ سے ہٹ جانا (گمراہ ہو جانا) " من غوایتها" ظرف " رد" کے متعلق ہے (کما یردُّ) یعنی مثل مایرد' (اس کی طرح جو رد کیا جاتا ہے) تو 'کما' میں 'ما' مصدر ہے اور 'کاف' بمعنی مثل ہے، یہ موصوف محذوف کی صفت ہے اور مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (جمــاح الخیل) گھوڑوں کا اپنے سوار سے سرکشی کرنا اور اس کی تابعداری نہ کرنا۔ اور یہاں اضافت " اضافة الصفة الی موصوفها" کی قبیل سے ہے۔ (الــخیــل) گھوڑوں کا گروہ یہ اسم جمع ہے اس کا اسی لفظ سے واحد نہیں آتا۔ گھوڑوں کو لفظ خیل سے اس لئے موسوم کیا گیا کیوں کہ وہ بھی ناز و نخرے سے چلتا ہے اور گھوڑا یہ اشرف البہائم ہے اس کی تعریف قرآن پاک میں بھی آئی ہے۔ (ومن رباط الخیل تذهبون به، عدو الله و عدو کم) (الانفال:۶۰ العمدة ص ۱۵۳)۔ (اللجم) یہ " یرد" کے متعلق ہے، لجم جمع ہے لجام کی (بمعنی لگام) الجام، لوہے کے ٹکڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے منہ کے دونوں طرف بندھا ہوتا ہے۔

تزکیۂ نفس کا بیان

اس شعر میں اس جانب اشارہ ہے کہ تمام کامیابوں اور فلاح کی اصل یہی ریاضت نفس ہے جس کو تزکیۂ نفس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (قد افلح من زکٰھا) اور یہ کیفیت صرف اسے حاصل ہوگی جو اس عالم کی رفاقت میں رہے گا جسے مجاہدے کے قوانین کا علم ہو اور جس کے اندراتنی صلاحیت ہو کہ وہ طالب حق پر حق کا فیضان کر سکے اور ہرگز یہ گمان نہ کیا جائے کہ تزکیۂ نفس کی کیفیت بطریق عقل میسر آسکتی ہے جیسا کہ فلسفیوں اور برہمنوں وغیرہ جاہلوں کا خیال ہے وہ ریاضت ومجاہدے سے اپنے نفوس کا تزکیہ کر کے شکوک وشبہات اور گمراہی کے دلدل میں جا گرتے ہیں۔

اس لئے کہ تزکیۂ نفس بدن کے علاج کے مثل ہے جیسے مریض کسی تجربہ کار طبیب حاذق کے مشورے کے بغیر دوائیاں استعمال نہیں کرسکتا ویسے ہی تزکیۂ نفس بغیر کسی نبی وولیٔ کامل کی توجہ کے میسر نہیں آسکتا۔اور بعثت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بے شمار اسرار میں سے ایک سر یہ بھی ہے اس لئے کہ وہ علم تزکیہ نفس میں بہت حاذق ہوتے ہیں اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ ہر مایوس اور ناامید نفس کو شریعت کے علاج سے مزکی کردیں۔(الشیخ زادہ ص ۳۸)

اس شعر میں علم بدیع کی ایک صنعت ہے من اور مَن کے درمیان، 'برد' اور 'یُرد' کے درمیان ' جماحِ' اور جماحُ کے درمیان صنعت تجنیس موجود ہے اور' خیل' اور' لجم' کے درمیان صنعت تناسب ہے۔(خرپوتی ص ۴۰)

(اس شعر اور اس کے بعد آنے والے دو شعر کا فائدہ یہ ہے کہ جو کوئی گناہوں کو زائل کرنے کی نیت سے ان اشعار کو دس مرتبہ پڑھے گا تو وہ اپنے دل کو خوف الٰہی میں لرزتا ہوا اور اپنی توبہ قبول ہوتے ہوئے پائے گا۔انشاءاللہ تعالیٰ

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے پانچویں شعر کی شرح کا وقت ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۷)فلاترم بالمعاصی کسرشهوتها ان الطعام یقوی شهوة النهم

(ترجمہ پس تو گناہوں کے ذریعے کسر شہوت کا قصد نہ کر، بے شک کھانا بسیار خوری کی خواہش کو اور تقویت پہنچاتا ہے۔)

ربط :۔شاعر ذی فہم مسلسل عبارت میں تنوع پیدا کر رہے ہیں اور بار بار ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب میں منتقل ہو رہے ہیں پہلے شعر میں وہ اپنے نفس سے مخاطب تھے اور دوسروں سے اپنے معاملے کی ضمانت کے لئے مہربانی کے طالب تھے اور اس شعر میں وہ تکلم سے خطاب کی جانب ملتفت ہو کر، اپنے مہربان اور مشفق دوست کی زبان سے مخاطب ہیں اور ان کے مشفق دوست نے جو اطلاع دی اسے بتاتے ہوئے یوں گویا ہیں:

فلاترم بالمعاصی کسرشهوتها ان الطعام یقوی شهوة النهم

تشریح: (مذکورہ شعر میں)'فا'اس شرط محذوف کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کا ادراک گزشتہ اشعار سے ہو رہا ہے۔تقدیری عبارت یوں ہوگی۔''ان کنت عرفت ان النفس الامارة حریصة علی الشرور والقبائح فلا ترم''(اگر تو یہ جانتا ہے کہ نفس امارہ گناہوں کا حریص ہے تو گناہوں کا ارتکاب کر کے شہوت کو توڑنے کا ارادہ نہ کر)

(لا ترم)بمعنیٰ لا تطلب' (بمعنی قصد و ارادہ نہ کر،طلب نہ کر)(بالمعاصی) نفس کو گناہوں پر قدرت دے کر، گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ اور اسی طرح وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو مروت کے خلاف ہیں مثلاً بازار میں نہ رہنے والے کا بازار میں کھانا۔

(کسر شھوتھا) بمعنی شہوت کومروت کے ساتھ ختم کرنا مصدر معروف ہونے کی بنیاد پر یہ معنی ہوگا اور مصدر مجہول ہونے کی بنیاد پر معنی ہوگا شہوت کا ختم کیا جانا۔

(شھوتھا) میں 'ھا' کی ضمیر نفس کی ہے۔ پھر شعر میں مذکورہ نہی کی علت ضرب المثل کے طریقے پر یوں بیان کی کہ "ان الطعام یقوی شھوۃ النھم" (ان) بکسر ہمزہ (الطعام) کھانا یعنی جنس طعام یعنی وہ جو کھایا پیا جاتا ہو۔ (یقوی) یعنی انسان کی شہوت وخواہش کو بڑھا دیتا ہے (بمعنی مضبوط کرنا) (النھم) کھانے کی انتہائی خواہش رکھنے والا (بمعنی کھانے کا بہت زیادہ حریص)

حاصل معنی: ۔اپنے نفس کو عورتوں اور بچوں کی محبت اور حب شہوت سے مزین کرنے والے! تو ہرگز کسر شہوت نفس اور قطع شہوت (خواہش) کے لئے گناہوں کو ذریعہ نہ بنا اور ہرگز تو جرم کا ارتکاب کر کے اس کا قصد نہ کر، اس لئے کہ ہر چھوٹے بڑے کے نزدیک اور عوام وخواص کے مابین یہ بات انتہائی مسلم اور مشہور ہے کہ معاصی شہوت نفس کو اور بڑھاتے ہیں! اور نفس گناہوں سے نہ کبھی ملول ہوتا ہے اور نہ ہی سیر ہوتا ہے (اس لئے تو اس ارادے کو ترک کردے) اے اللہ ہمیں تھوڑے وقت کے لئے بھی نفس کے سپرد نہ فرما اور بیت النار کو ہمارا ٹھکان نہ بنا، بلکہ ہمارے افعال کو اپنی رضا کے موافق کردے، بے شك تو ہر تنگی اور دشواری کو آسان فرمانے والا اور ہر قیدی کی نصرت فرمانے والا ہے، اپنے بندوں پر تیری بہت عنایت ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۸)والنفس کالطفل ان تهمله شب علی حب الرضاع و ان تفطمه ینفطم

ترجمہ: نفس امارہ شیرخوار بچے کے مثل ہے،اگر تو اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دے گا تو وہ دودھ پینے کی عادت پر جوان ہوگا اور اگر تو اس کا دودھ چھڑا دے تو وہ بآسانی دودھ چھوڑ دے گا)

تشریح: (شعر کے شروع میں) ’واو‘ یا تو عاطفہ ہے یا استینافیہ۔اور نفس،جیسا کہ علامہ باجوری نے فرمایا کہ لطیفۂ ربانیہ ہے اور اس کو اجساد سے اس کا تعلق ہونے سے پہلے روح کہا جاتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارواح کو اجساد سے دو ہزار سال پہلے پیدا فرمایا ارواح اتنی مدت تک حق تعالیٰ کے جوار میں رہ کر بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کے قرب خاص سے مستفیض ہوتی رہی پھر جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو اجسام سے مل جانے کا حکم دیا تو اس نے غیر کو بھی جانا تو وہ حق تعالیٰ سے بسبب بُعد کے محجوب ہوگئی تو اسی وجہ سے اب اس کو مذکّر اور ناصح کی احتیاج ہوئی۔اللہ فرماتا ہے (فان الذکریٰ تنفع المومنین)تو اس کو جسم سے متعلق ہونے سے پہلے روح کہا جاتا ہے اور جسم سے ملنے کے بعد نفس۔روح اور نفس کے درمیان فرق اعتباری ہے(الباجوری ص۱۳)

(النفس) میں الف لام عہدی ہے،اس سے مراد وہ معروف نفس امارہ ہے۔

(کالطفل) میں ’کاف‘ بمعنیٰ مثل ہے یہ محلا مرفوع ہے خبر ہونے کی بنیاد پر یعنی وہ نفس امارہ جو مثل طفل ہے۔

(الطفل) اس بچے کو کہتے ہیں جس پر اس کی ولادت کے بعد کچھ زمانہ گزر گیا ہو۔(جاننا چاہئے کہ)(۱)انسان جب تک رحم میں ہوتا ہے اسے ”جنین“ کہا جاتا ہے(۲)اس کی ولادت ہوجاتی ہے تو اسے ’ولید‘ کہا جاتا ہے (۳)پھر اس پر جب تھوڑا زمانہ گزر جاتا ہے تو اسی کو ’طفل‘ کہتے ہیں(۴)اس کے بعد اسے ’صبی‘ کہا جاتا

ہے(۵)بعدہٗ ' مـراهـق ' (٦) پھراس کوانیس سال کی عمرتک ' غـلام ' کہاجاتا ہے(۷) پھرانیس سے تینتیس سال کی عمرتک اسے 'شـاب ' کہاجاتا ہے(۸) پھرتینتیس سے اکیاون برس کی عمرتک اسے" کهـل " کہاجاتا ہے (۹) پھراکیاون برس سے آخرعمرتک اسے " شیخ " کہاجاتا ہے۔

ناظم شعر نے نفس کوطفل سے تشبیہ دی،محبوب و پسندیدہ اشیاء پر مداومت سے ملول نہ ہونے میں (یعنی جیسے طفل محبوب ، پیاری اورعزیز چیز کے ہمیشہ ہونے سے ملول نہیں ہوتا ویسے نفس بھی مرغوب اورمحبوب اشیاء کی ہمیشگی سے اکتاتانہیں ہے۔تو یہی ان کے درمیان وجہ شبہ ہے۔)

تو جیسے تم طفل کواس کے دودھ پینے کے پسندیدہ کام پر چھوڑ دوتو وہ اسے ہمیشہ محبوب رہے گااوراگرتم اسےاس سے روک دوتو وہ بازآجائے گا۔

(ان تهمله) یعنی اگرتم اسےاس کے دودھ پینے جیسے محبوب ترین اور پسندیدہ شغل پرچھوڑ دو(شب) بمعنیٰ ' کبر ' (جوان اوربڑاہوگا) عـلـى حـب الرضاع) اس میں ' عـلـى ' یاتو بمعنیٰ 'مع ' ہے یعنی دودھ کی پسندیدگی کے ساتھ تواس کوکبھی ترک نہیں کرے گااس لئے کہ پھروہ اس کی عادت اورفطرت بن جائے گا۔یا پھر ' عـلـى ' اپنے ہی معنی میں ہےاورمحذوف کے متعلق ہے جوحال ہے یعنی" حـريـصـا" و مـلازمـا عليه" (الحب)اس کا معنی معلوم ومعروف ہے۔(الرضاع) بچے کااپنی ماں کادودھ پینا۔اسلاف کےکلام میں آیاہےکہ (كثرة الرضاع تفسد الطباع) یعنی ماں کازیادہ دودھ پینا،طبیعت کوفاسدکردیتاہے۔

(وان تـفـطـمـه) اس جملےکا " ان تهـمـلـه " پرعطف ہے۔معنی یہ ہے کہ اگراس کودوسرے کسی کھانے پرآمادہ کرکے،دودھ پینے سے روکاجائے۔(ينفطم) تووہ بازآجائےاوررک جائےاوراس سے کراہت ہوجانے کی وجہ سے واپس نہ لوٹے،تواسی طرح نفس کواگرمعصیت کی وادیوں میں چرنے کیلئے چھوڑ دیاجائے جسے وہ پسندکرتا ہےتواس کےاس حالت سے لوٹناناممکن ہوجائے گااوراگراس کوشروع ہی میں روک دیاجائے طاعات اورعبادات میں مشغول کرکےتووہ اس سے بازرہےگااوراس سے کراہت کرے گااوراس طرف کبھی عودنہ کرے گا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ٥

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے ساتویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۱۹)فاصرف هواها و حاذر ان تولیه ان الهوی ما تولی یصم او یصم

(ترجمہ: پس تو خوہشات نفسانیہ کو دفع کر اور اس سے متنبہ (بچ) کہ کہیں وہ تجھ پر حاوی نہ ہو جائے، اس لئے کہ نفسانی خواہشات جب غالب ہو جاتی ہیں تو وہ ہلاک کر دیتی ہیں یا عیب دار کر دیتی ہیں)

ربط: جب تجھے یہ بات معلوم ہوگئی کہ گناہوں کا ارتکاب کر کے کسر شہوت کا قصد نہیں کیا جا سکتا بلکہ شہوت کو نفس کی لگام کھینچ کر اور گناہوں کی غذا سے روک کر ہی توڑا جا سکتا ہے پس تو نفسانی خواہشات کی ہرگز پیروی نہ کرنا (اسی کو ناظم شعر یوں کہتے ہیں

فاصرف هواها و حاذر ان تولیه ان الهوی ما تولی یصم او یصم

تشریح:(شعر کے شروع میں ('فا') فصیحہ ہے (اصرف) یعنی ادفعه (ہٹا دے، دفع کر دے اس کو)

(الھویٰ) بالقصر، اس کا لغوی معنی: کسی چیز کی جانب میلان قلب (خواہش) اور عرف کے اعتبار سے اس کا معنی نفس کا کسی ایسی چیز کی طرف میلان جس پر فی الحال برائی مرتب ہوئی ہو اور آخرت میں عقاب (العمدۃ ص۱۶۲)

(حاذر) یعنی ہر وقت ڈرو اور ہر حال میں چوکنا رہو۔ناظم شعر نے یہیں سے اسے" احذر" کے معنی میں لیا ہے۔(ان تولیه) وہ اس پر اسے والی مقرر کر دے گا کہ وہ اس میں ایک امیر جیسے تصرفات کرے گا۔

پھر اس کی علت بیان کی اپنے اس قول سے" ان الھویٰ" (انّ) استئناف کی بنیاد پر، ہمزہ کے کسرے کے ساتھ ہوگا اور تعلیل مراد لینے کی بنیاد پر ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہوگا۔

اس کا لام تعلیل کے اضمار کے ساتھ ہے (الھویٰ) یعنی تمام کی تمام خواہشات، اس کے افراد میں سے ہر ایک فرد۔

(الف لام استغراقی ہے)(ما) بمعنیٰ'' مهما '(تولی) فعل ماضی،اس کی ضمیر' الھوی 'کی جانب راجع ہے۔(یُصُم) پہلے حرف کی ضمہ کے ساتھ بمعنیٰ قتل کرنا ہلاک کرنا۔ " ا صمی الصید" (شکار کو تیر مار کر اسی جگہ قتل کر دینا) سے اس کا معنیٰ لیا گیا ہے" یُصُم " کی یا علامت جزم کی وجہ سے محذوف ہے،اس لئے کہ وہ" ما شرطیه" سے مجزوم ہے (اویَصم) میں'او 'برائے عطف ہے،وہ اور بھی کئی معانی کے لئے آتا ہے،جیسا کہ اصولی اس بات کے قائل ہیں کہ وہ اکثر'' شک'' یا شک میں ڈالنے کے لئے آتا ہے اور کبھی ''اباحت وتخییر'' کے لئے آتا ہے جیسے 'جالس الفقهاء او المحدثين'(فقہاء کے ساتھ بیٹھو یا محدثین کے ساتھ)،کبھی ' بل' کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان (فهی کالحجارة او اشد قسوة) ،کبھی ' حتی ' کے معنی میں آتا ہے مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے (ليس لك من الامر شئی او يتوب عليهم) ،کبھی ' الی کے معنی میں آتا ہے جیسے''لالزمنك او تعطينی حقی" (میں تمہارے ساتھ لازم رہوں گا یہاں تک کہ تم میرا حق ادا کر دو)،اور کبھی " الی ان" کے بھی معنی میں آتا ہے جب کہ اس کے بعد مضارع منصوب واقع ہو اور اس کے ماقبل مضارع نہ ہو۔جیسے امرءالقیس کا یہ شعر:

فقلت له لا تبک عینیک انما تحاول ملکا او تموت فتعذرا

(ترجمہ:۔میں نے اس سے کہا کہ اپنی آنکھوں کو نہ بہا بلکہ مرتے دم تک مثل بادشاہ ہو جا تو وہ آنکھیں آنسو بہانے سے خود باز آجائیں گی)

(بہر حال) یہاں پر جو' او' واقع ہوا ہے وہ بمعنیٰ شک ہے كما لا يخفی (خرپوتی ص۴۳)

ناظم شعر کا قول(یَصم) یہ' وصم ' سے مضارع کا صیغہ ہے،بمعنیٰ عیب دار بنانا۔ان دونوں افعال کے مفعول کو ضرورت شعری کی وجہ سے حذف کر دیا گیا(ان کا مفعول کاف خطاب ہے)یعنی " یصمك او يجعلك ذا عیب فی الناس" (وہ تجھے ہلاک کر دے گا یا لوگوں میں تجھے عیب دار بنا دے گا) پھر جاننا چاہئے کہ ان دونوں فعل میں یعنی" یُصُم " اور" یَصِم " کے درمیان تجنیس تام ہے۔

حاصل معنی:۔ ناظم شعر کہتے ہیں کہ اے سوزش عشق میں جلنے والے اور اے بُعد وفراق کی تکلیفوں اور سختیوں کو برداشت کرنے والے، تو متابعت ھوی سے اپنے نفس کو دور رکھ اور ہرگز خواہشات کی اتباع نہ کرنا اس لئے کہ نفسانی خواہشات کی اتباع گمراہی اور اللہ رب العزت سے دوری کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے (ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله) اور جیسے بعض صحابہؓ کرام سرکار ﷺ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں" ما عُبدالله ابغض على الله تعالىٰ من الهوى" (کوئی بھی معبود باطل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوائے نفس سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں) لہذا تو ہرگز نفس کو اس کی خواہشات پورا کرنے میں بے شرم نہ بنانا اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے نفسانی خواہشات کو اپنا خدا بنا رکھا ہے، اس لئے کہ جس کسی کے بھی اوپر اس کا نفس غالب آجاتا ہے اور مسلط ہو جاتا ہے تو وہ اسے ہلاک و برباد کر دیتا ہے یا اسے گمراہی کے دلدل میں ایسا گراتا ہے جس سے نکلنے کی امید ختم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثانی کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۰) وراعها وهى فى الاعمال سائمة و ان هى استحلت المرعى فلا تسم

(ترجمہ:۔تو نفس کی نگرانی کر اس حال میں کہ وہ چرنے میں مصروف ہو اور اگر وہ اس چراگاہ عمل کو لذیذ جانے تو اس کو تو چرنے نہ دے)

تشریح:۔ (واو) عاطفہ ہے، انشاء کا انشاء پر عطف سے ہے یعنی" حاذر" جملۂ انشائیہ پر اس کا عطف ہے (راع)، راعىٰ يراعى مراعاة سے امر کا صیغہ ہے بمعنی نگاہ رکھنا، حفاظت کرنا، یعنی تو نفس امارہ کی حفاظت

اورنگہ بانی کراوراس کے احوال ٹٹولتا رہ اوراس کے مکروفریب پرغور کر۔

(وھی) (واوحالیہ ہے) یعنی اورحال یہ ہے کہ وہ اعمال صالحہ میں (مصروف) ہے، یہ " سائمة " سے متعلق ہے(سائمة) یعنی کام میں لگنے والا مشغول، یعنی مویشی کا چراگاہ میں چرنے کے لئے جانے میں مصروف ہونا۔

(وان ھی استحلت) یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے(و ان احد من المشرکین استجارك فأجره) اور یہ انشائیہ کا اپنے مثل پرعطف ہے، اس لئے کہ شرطیہ کا جملہ خبریہ اور انشائیہ، جزا کے تابع ہوتا ہے اگر جزا خبر ہے تو یہ بھی خبریہ اور اگر انشائیہ ہے تو یہ بھی انشائیہ۔

(استحلت المرعی) یعنی نفس اس کو میٹھا اور لذیذ گمان کرے اور اچھا سمجھے " المرعیٰ " میم کے فتح کے ساتھ بمعنی چرنے کی جگہ، چراگاہ۔ یعنی وہ جو اعمال صالحہ کئے ہیں وہ جانوروں کی چراگاہ کے مشابہ ہیں، اس معنی میں کہ اس نے اسے پسند کیا اور اپنی عادت سے اس کی طرف مائل ہوا۔(یعنی جیسے جانور اپنے چرنے کی جگہ کو پسند کرتا ہے اور طبعا اپنی چراگاہ کی طرف مائل ہوتا ہے ویسے ہی نفس بھی جب اعمال کو پسند کرے اور عادةً اس کی طرف مائل ہو نہ کہ عبادةً تو وہ اس کے مشابہ ہے)اوران اعمال صالحہ سے مرادنوافل ہیں نہ کہ واجبات اور مستحبات، اس لئے کہ یہ دونوں " استحلا " سے موجب شرک نہیں ہوتے ہیں۔

(فلا تُسم) ، الاسامة " مصدر باب افعال سے نہی حاضر کا صیغہ ہے جانور کو چراگاہ چرنے بھیجنے کو اسامة کہتے ہیں۔ اوراس کی 'یا' جزم کی وجہ سے محذوف ہے معنی یہ ہے کہ پس تو اپنے نفس کو اس حالت پر باقی نہ رکھ بلکہ اس کو جھڑک اور روک۔

حاصل معنی:۔ نفس کی حفاظت کراوراس سے متمسک رہ اس لئے کہ نفس اس جانور مویشی کے مشابہ ہے جو اعمال صالحہ کی چراگاہ میں چرتا ہے، تو اگر تو چراگاہ میں اس کی نگہ بانی کرے گا اور چرنے میں ضرروفساد سے اس کی حفاظت کریگا تو نیک عمل کرنے والا ہے اوراگر تو اسے اپنی عادت کے مطابق عمل کرتا چھوڑ دے گا تو وہ تجھے ضرر پہنچائے گا، نفس جب کسی نفلی عبادت کو اچھا سمجھے اور اسے دوست رکھے اوراس عبادت کو ادا کرنا اپنی عادت بنالے تو

اس نفس کو تو اسے ادا نہ کرنے دے بلکہ اسے جھڑک کر اس سے روک دے، اس لئے کہ اگر نفس کو کسی عبادت میں انتہائی لذت آنے لگے تو ضرور اس میں غرور وریا کی معصیت ہوگی اور تکبر وگھمنڈ جیسے گناہوں کی آمیزش ہوگی تو نفس کو کسی ایسی دوسری عبادت پر آمادہ کرنا واجب ہوگا جس میں وہ حلاوت ولذت نہ پاتا ہو۔ اس لئے کہ اگر عبادت کو عادت بنالیا جائے تو وہ عبادت، عبادت نہیں رہتی بلکہ بے فائدہ ہوجاتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک صالح نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے ایسی ایسی دلیلیں دیں، تو مجھ پر ظاہر ہوا کہ یہ سب کچھ تو میرے حصۂ شر سے ملا ہوا ہے اور اس میں خلوص نہیں! وہ اس لئے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھ سے ایک گھونٹ پانی مانگا پینے کے لئے تو میرے نفس پر یہ گراں گزرا تو میں نے جان لیا کہ دلیلوں میں متابعت نفس میرے حصۂ شر کی وجہ سے ہے اس لئے کہ اگر میرے نفس میں خلوص ہوتا تو اس پر وہ چیز مشکل اور بھاری نہ ہوتی جو کہ حق شرع ہے۔ کذا فی ''البریقہ''

شعر کی صوفیانہ تشریح :۔ اے عارف باللہ، اپنے نفس کو معرفت الٰہی اور اللہ کی محبت میں فنا کردے اور اس کی رضا حاصل کر اور اعمال کی تعداد گننے میں نہ رہ اس لئے کہ اعمال میں باقی رہنا صلحاء اور زہاد کا مرتبہ ہوتا ہے بلکہ تو ملاحظۂ واجب الوجود میں مستغرق ہوجا اور اپنے قعود وسجود پر نظر کرنا چھوڑ دے اس لئے کہ اگر تو گنتیوں میں پھنسا رہا تو محجوب ہوجائے گا اور اگر تو اس کو چھوڑ کر اس سے بالاتر منزل کو پہنچ گیا تو تو مطلوب ہوجائے گا، کیوں کہ اعمال واستدلال سے ماوراء اصول کمال کی منزل ہوتی ہے اور یہی حقیقت وصال ہے، تو نفس اپنی خباثت کی وجہ سے ذکر وفکر میں پڑا رہنا چاہتا ہے فعليك بالتحول ولو بالتحمل (خرپوتی ص۴۶)

اقول: شاید کہ یہ وہی مرتبۂ احسان ہے جس کی تشریح حدیث پاک میں بایں الفاظ کی گئی ہے (ان تعبد الله كانك تراه) حدیث اسی معنی لطیف پر مشتمل ہے اور وہ بندے کا شہود نفس سے اپنے آپ کو فنا کرکے مرتبۂ دیدار الٰہی تک وصول ہے، گویا کہ وہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان (فان لم تكن) کے احتمال میں کسی بھی وجہ پر نہیں ہے۔ (فان لم تكن) یعنی اگر تو نے اپنے آپ کو اپنی عبادت میں فنا کرلیا تو گویا تو نے " تراه " کی منزل کو

نہیں پایا۔تو اس بنا پر یہ جملہ " فان لم تکن شرط ہے اور " تراہ "شرط کی جزا ہے۔
شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے " لمعات شرح مشکوٰۃ " میں تصریح فرمائی کہ صوفیہ میں سے کسی عارف باللہ کے باطن پر یہ ظاہر ہوا کہ وہ " تـــراہ " کے راز پر واقف ہو گئے ہیں اس معنی کے ارادے سے کہ جب تو اپنے نفس کو فنا کر دے اور کوئی چیز نہ رہ جائے اور تو اپنے نفس کو نہ دیکھے بلکہ مشاہدۂ رب کرے (تو تو "تراہ" کی منزل کو پالے گا) اس لئے کہ نفس تیرے اور مشاہدۂ رب تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ (لمعات التنقیح :۱/۶۹ مطبوعہ پاکستان)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

گزشتہ سے پیوستہ شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ناظم فاہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

(۲۱)کم حسنت لذۃ للمرء قاتلۃ　　　من حیث لم یدر ان السم فی الدسم

(ترجمہ: بارہا نفس پسندیدہ اور مرغوب (اعمال) کو آراستہ کرتا ہے حالاں کہ وہ انسان کے حق میں زہر قاتل ہے، اس وجہ سے کہ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اس کے چکنے اور لذیذ کھانے میں زہر ملا ہوا ہے)

ربط :۔ گزشتہ اشعار میں ناظم شعر متصور شخص سے شفقت وعنایت کے طالب تھے اور نفس کو اتباع ہویٰ سے باز رکھنے کے لئے اس شخص سے ہدایت کے خواستگار تھے، یہ شعر انہی اشعار کے لئے بمنزل استدلال ہے (اور ماسبق کی علت بیان کر رہا ہے اور اس کو دلیل سے مزین کر رہا ہے) تو جب سائل نے ان سے عنایت اور ہدایت کرنے کی فرمائش کی تو اس مجرد شخص نے سائل کی طلب کا جواب دیا اور اس کو یہ نصیحت کی کہ نفس کی نگہ بانی کرے چراگاہ عمل میں چرنے کے وقت اور اگر نفس اس عمل کو عادۃً لذیذ جانے تو اس کو چرنے سے روکے۔ یہ نصیحت اور رہنمائی کرنے کے بعد اب انہوں نے چاہا کہ اس کو مزید واضح اور مبرہن کر دیں تو وہ دعویٰ کی دلیل کا قصد کرتے ہوئے

کہتے ہیں:

کم حسنت لذة للمرء قاتلة   من حیث لم یدر ان السم فی الدسم

تشریح: (کم) یہاں خبریہ ہے جو 'ممیز' کا متقاضی ہے اور اس کا ممیّز اکثر مجرور آتا ہے قرآن پاک میں آیا (کم من فئة) "کم استفهامیه" کے بعد جملہ انشائیہ ہوتا ہے جیسے "کم خبریہ" کے بعد واقع ہونے والا جملہ خبریہ ہوتا ہے، اور 'کم استفہامیہ'' کا ممیّز اکثر منصوب آتا ہے (کم حسنت) یعنی 'کم مدة' (کتنی مرتبہ، بارہا، بہت دفعہ)، تو وہ کثیراما'' قول کی قوت میں ہے۔ یعنی" کثیرا ما حسنت لذة للمرء" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نفس نے اچھا سمجھا یعنی مزین کیا۔ مندوب ومحبوب اعمال کو عادۃ ادا کیا

ہم نے اعمال کو مندوبہ سے اس لئے مقید کیا کیوں کہ ماسبق میں بتایا جا چکا ہے کہ واجبات استحلاء سے ترک نہیں کئے جاسکتے اگر چہ نفس اس کو اچھا جانے، بلکہ ان اعمال سے نوافل اور مندوبات مراد ہیں تو "حسنت'' کا معنی یہ ہے کہ نفس نے آراستہ کیا اور مندوب اعمال کو انسان کی نگاہ میں محبوب ومرغوب بنایا۔ (لذة) یہ مصدر ہے بمعنی مزہ لینا، (حصول مرغوبات) اور مصدر کبھی اسم مفعول کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے یہاں لذۃ مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی بمعنٰی مستلذ ہے ہماری اس تقریر سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ " لذة" بالنصب "حسنت " کا مفعول ہے اور وہ اس کا مفعول ثانی ہے اس لئے کہ' حسنت بمعنی ''جعلت" ہے اور جعل مصدر یہ متعدی بدو مفعول ہوتا ہے تو اس کا مفعول اول وہ عمل ہے اس کی تقدیر ماسبق میں گزر چکی یعنی" جعلت عملا" اور مفعول ثانی" لذة" بمعنی ''مستلذ' ہے۔ (للمرء) یہ جار مجرور" قاتلة" سے متعلق ہے جس کو ضرورت شعری کی وجہ سے مقدم کیا گیا۔ اور " للمرء" کو لام کے ساتھ تقویت اور تاکید فعل کے لئے لایا گیا۔

"المراء" لفظ کی تحقیق

(المرء) تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے۔ علامہ عاصم کے کہنے کے مطابق جوانہوں نے" ترجمة القاموس" المسمی به (اوقیانوس) میں فرمایا' مرء' بمعنی انسان ہے مذکر ہو یا مؤنث اور ایک قول کی بنیاد پر، اس کا معنی

مرد کے ساتھ خاص ہے لیکن یہاں " مرء " عام ہے اور اس کی اسی لفظ سے جمع نہیں آتی ہے، اس کی جمع (من غیر لفظه) رجال، آتی ہے اور ایک قول پر اس کی جمع " مرؤن " آتی ہے اور اس کی مؤنث مراۃ ' بالتاء پڑھی جاتی ہے اور " مـرۃ " بھی سنا گیا ہے ترک ہمزہ اور فتح راء کے ساتھ۔ اور کبھی اس کے شروع میں ہمزہ وصل داخل کر دیا جاتا ہے اور ایسے ہی کبھی لام تعریف بھی اور جیسے ' مـرأۃ ' کے شروع میں ہمزہ وصل داخل کر دیا جاتا ہے اسی طرح ' مرء ' کے شروع میں بھی کبھی ہمزۂ وصل لگا دیا جاتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ نکرہ ہو تو اس میں تین لغات ہیں (۱) ہمیشہ 'راء' کے فتحہ کے ساتھ حالت رفع ونصب وجر سب میں (۲) 'راء' پر ہمیشہ ضمہ تینوں حالتوں میں (۳) 'راء' کی حرکت حرف اخیر کی تابع ہوگی اعراب میں، تو اگر اس کا حرف آخر مرفوع ہے تو 'راء' بھی مرفوع ہوگی اور اگر منصوب ہے تو 'راء' بھی منصوب ہوگی اور اگر مجرور تو 'راء' بھی مجرور۔ قرآن پاک میں آیا (و ان امـرءٌ هـلك) اور جیسے کہا جاتا ہے (امـراً و شـانه) تو اس کی 'راء' حالت نصب میں منصوب ہے اور جیسے کہا جاتا ہے (مـررت بامری ء) تو 'راء' کو حرف آخر کی تبعیت میں مجرور کیا گیا، اور اگر وہ حرف تعریف سے ملا ہوا ہوگا تو اس کی 'راء' ہمیشہ ساکن ہوگی۔

(قـاتلة) " لذة " سے حال واقع ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے یا پھر اس کی صفت ہے۔ یہاں پر 'قتل' سے مراد ہلاک کرنا ہے، " ذکـر الـمـلـزوم وارادة اللازم " کی قبیل سے (یعنی ملزوم ذکر کر کے لازم مراد لینا) (من حيث) یہ جار مجرور، " قاتلة " سے متعلق ہے حیثیت کا اعراب تین معانی کے لئے آتا ہے۔ (۱) اطلاق (۲) تقیید (۳) تعلیل مثلا کہا جاتا ہے ''الانسان من حیث الانسان'' (یہ افادۂ مطلق ہے)

اور جیسے افادۂ تقیید کے لئے علم طب کی تعریف میں کہا جاتا ہے " الطب علم يبحث فيه عن بدن الانسان، مـن حيـث انه مريض، و من حيث انه صحيح، (یعنی طب وہ علم ہے جس میں جسم انسان سے صحت و مرض کے اعتبار سے بحث کی جاتی نہ کہ مطلقا)

اور افادۂ تعلیل کے لئے کہا جاتا ہے " الـمـاء يبـرد وجـود الانسان من حيث انه بارد " (یعنی پانی وجود

انسان کوٹھنڈا کر دیتا ہےاس وجہ سے کہ وہ ٹھنڈا ہوتا ہے)

(بہرحال) یہاں یہ "من حیث" یا تو 'تقیید' کا ہے یا تعلیل کا (حیث) اصلا مکان کے لئے آتا ہے لیکن یہاں معنیٰ جہت کے لئے مستعار ہے، علامہ اخفش فرماتے ہیں کہ " حیـــث" ظرف زمان کے لئے بھی آتا ہے لیکن اس صورت میں اس کی کسی جملہ کی طرف اضافت لازم ہے، جملہ اسمیہ ہو یا فعلیہ، وہ اکثر فعل ہی کی جانب مضاف ہوتا، مفرد کی جانب اس کی اضافت نادر ہے، اسی وجہ یہاں پہ " حیث" کی اضافت فعل (لم یدر) کی طرف کی گئی ہے۔

(لم یدر) فاعل یا مفعول کی وجہ سے بالنصب ہے یعنی" لم یدر" بمعنیٰ 'لم یعلم' (اسے معلوم نہ ہوا)۔(السم) مثلثۃ السین معنی وہ دوا جو انسان کو جلدی سے قتل کر دے لیکن یہاں بر سبیل مجاز و استعارہ گناہ مراد ہے۔(انسان کو فوری طور پر ہلاک کر دینے والا زہر)

کبر وریا کو ہلاک کرنے میں زہر سے تشبیہ دی جو دونوں میں جامع ہے، جیسے زہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے ویسے ہی عجب وریا بھی انسان کو ہلاک و برباد کر دیتے ہیں اور ہر وہ براعمل جو ہلاک اعمال کی طرف موصل ہوتا ہے وہ نتیجۃ عامل کو ہلاک کر دیتا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا کہ آقائے دوعالم ﷺ نے فرمایا(ان اخـوف مـا اخاف علی امتی الاشراك بالله، اما انی لست اقول تعبدون شمسا ولا قمرا ولا وثنا ولکن اعمالا لغیر الله....) الحدیث

(ترجمہ: میں اپنی امت کے بارے میں جس چیز کا زیادہ اندیشہ کرتا ہوں وہ شرک باللہ ہے یاد رکھو میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم سورج، چاند اور بت کی پوجا کرنے لگو گے مگر غیر اللہ کے لئے عمل کرو گے۔)

تشریح: فی الدسم (ظرف مستقر 'ان' کی خبر ہے اور یہ جملہ " لم یدر" فعل کا نائب فاعل ہے یا اس فعل کا مفعول ہے۔ 'دسم" کا معنیٰ وہ کھانا جس میں بہت چکنائی ہو، اس سے مجازا اور استعارۃً اعمال وطاعات مراد ہیں اعمال وطاعات کو لذت ورغبت میں چکنے کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے اس اعتبار سے کہ نہیں جانا گیا کہ اس میں زہر

ہے۔ 'دسم' (چکنے کھانے) کا اعمال وطاعات کے مفہوم کے لئے استعارہ کیا گیا ہے تو لفظ 'دسم' کا ذکر کیا گیا جو طعام پر دلالت کرتا ہے اور اس سے اعمال وطاعات کا ارادہ کیا گیا۔

پھر جاننا چاہئے کہ ناظم شعر کے اس قول" ان السم فی الدسم " میں ایہام حسن ہے دو لفظوں کے باہم متجانس ہونے کی وجہ سے لفظ اور معنی میں تو 'دسم' اور 'سم' میں لفظاً بھی جناس ہے اور معنی بھی کما لا یخفی یہ اسی کے مثل جو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان میں کہا گیا ہے (ان السفر قطعة من السقر) ترجمہ: سفر جہنم کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے) اور شاعر کہتا ہے

النار آخر دينار نطقت به والهم آخر هذا الدرهم الجاری

(ترجمہ: جوانی آخری دینار تھا جس کو میں نے خرچ کر دیا اور اب اس جاری درہم یعنی بڑھاپے کا نتیجہ غم واندوہ ہے)

(اس شعر میں بھی" الهم " اور " الدرهم " میں ایہام حسن ہے۔ بڑھاپے کو سفیدی میں چاندی کے درہم سے تشبیہ دی گئی ہے اور جوانی کو اشتعال میں ''نار'' سے تشبیہ دی گئی ہے)

حاصل معنی:۔ نفس امارہ انتہائی مکار اور فریب دینے والا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ انسان کو یوں فریب دیتا ہے کہ ان اعمال کو ظاہرا انسان کے سامنے آراستہ و پیراستہ اور مزین کر کے پیش کرتا ہے جو اس کے باطن کو خراب اور فاسد کر دے اس لئے کہ نفس امارہ مثل اعداء ہے اور اعداء لذیذ کھانے میں ہی زہر ملا کر دیتے ہیں اور انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اسی طرح نفس بھی انسان کو اس کی عبادت میں عجب وریا کو داخل کر کے اس کو تباہ و برباد کر دتیا ہے اور انسان عجب وریا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی وجہ سے نفس کی خفیہ سازش کو جان ہی نہیں پاتا۔ (اور جاننا چاہئے کہ) عجب (کبر، خودنمائی) ہر حال میں مضر ہے چاہے عبادت میں ہو یا عبادت اور اعمال حسنہ کے غیر میں۔

روایت کیا جاتا ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر بعض صحابۂ کرام نے جب لشکر کی کثرت اور اس کے ساز وسامان کی

طرف نظر کی تو ان کو یہ کثرت اور تعداد اسباب اتنے پسند آئے کہ ان کی زبان سے یہ جملے نکل گئے کہ اتنا ساز و سامان اور یہ تعداد ہونے کے بعد ہماری لئے آج شکست ہے ہی نہیں، جب یہ بات نبی اکرم ﷺ تک پہنچی تو آپ نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار فرمایا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اول امر میں ان کے اوپر سے، اس بات پر متنبہ اور آگاہ کرنے کے لئے نصرت اٹھالی کہ فتح ونصرت سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی جانب سے ہے، یہ کثرت اور ساز وسامان کی بہتات کی وجہ سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (لقد نصرکم الله فی مواطن کثیرة و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم۔۔)(الآیۃ)

بیان کیا جاتا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک حکیم تھا جس نے تین سو ساٹھ کتابیں تصنیف کیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی اتاری کہ اس سے کہہ دو'' دنیا نفاق سے بھر چکی ہے اور تو نے اس عمل میں سے کسی سے بھی میرا ارادہ نہ کیا، میں ان میں سے کچھ بھی قبول نہیں کرتا ہوں!'' تو وہ شخص انتہائی نادم ہوا اور ترک دنیا کر کے عام لوگوں کے ساتھ رہنے لگا اور تواضع وانکساری اختیار کر لی، تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی نازل فرمائی کہ اس سے کہہ دو''اب تو نے میری رضا پائی''۔

نیز ہمارے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا'' مجھے تم لوگوں پر سب سے زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ شرک اصغر کیا ہے؟ سرکار نے فرمایا'' ریا'' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، میں بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے رہا ہوں، پھر فرمائے گا کہ ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم دنیا میں عمل کیا کرتے تھے اور دوسری حدیث میں آیا ہے'' اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرمائے گا میرے اس بندے نے اپنے اعمال میں میری نیت نہیں کی تھی، اس کو قید خانے میں ڈال دو''۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

ماسبق سے ملحق شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۲)واخش الدسائس من جوع و من شبع فرب مخمصة شر من التخم

(ترجمہ:شکم سیری اور فاقہ کشی کی خفیہ چالوں سے بچو،(اس لئے کہ) بسا اوقات سخت بھوکا اور خالی پیٹ ہونا، بدہضمی سے زیادہ مضر ہوتا ہے)

ربط: یہ اسی قصیدۂ مبارکہ کی فصل ثانی کا دسواں شعر ہے،اللہ تبارک وتعالیٰ کی عنایت سے ہم اس شعر کی شرح کا آغاز کررہے ہیں۔شاعر ذی فہم جب محافظت نفس بیان کر چکے کہ نفس جب نفلی عبادات میں مشغول ہوجائے اور مندوب اعمال سے لذت اٹھانے لگے،تو اس وقت نفس کی اصلاح اور نگہ بانی کرکے اس کی محافظت کی جائے اور اس کی تفصیل سے بھی فارغ ہوگئے تو اب وہ اس شعر میں اسی مفہوم کو مزید مؤکد کررہے ہیں افادۂ اصول کے ساتھ اور شخص مجرد کو نصیحت کررہے ہیں کہ اسے اس خفیہ سازش سے بچنا لازم وضروری ہے جس سے شیطان اور نفس اس پر مباحات میں فریب کرتے ہیں۔تو ناظم کہتے ہیں:۔

واخش الدسائس من جوع و من شبع فرب مخمصة شر من التخم

تشریح: (واخش) فعل امر ہے"خشیٰ یخشی خشیة " سے بمعنیٰ 'احذر' یعنی بچو، محتاط رہو۔(الدسائس) یہ 'دسیسة' کی جمع ہے اور"و اخش "کا مفعول بہ واقع ہے،اس کا معنیٰ 'الحیل الخفیة' یعنی خفیہ چال،فریب، (من جوع و من شبع) جار مجرور،محل نصب میں ہے اور الدسائس، کی یا تو صفت ہے یا حال،اور قاعدہ یہ ہے کہ صفت کے لئے تعریف وتنکیر میں موصوف کی متابعت لازم ہے اور 'الدسائس' موصوف معرفہ ہے اور 'من جوع' کا دسائس کی صفت ہونے کی تقدیر پر،اس کا معرفہ ہونا لازم ہے۔اور معرفہ یا

حقیقی ہوتا ہے یا تقدیری۔اور یہاں ' من جوع و من شبع ' اس صفت میں تعریف مقدر ہے، تقدیر معرفہ مراد ظاہر ہو جانے کے بعد ضرر نہیں پہنچاتی ہے جیسا کہ شیخ زادہ نے افادہ فرمایا ہے (من جوع ومن شبع) "صادرة" سے متعلق ہے یا' ناشية' سے یعنی اس حال میں کہ وہ دو تقدیروں پر ہے ایک اس تقدیر پر کہ جار مجرور ' الدسائس ' کی صفت ہے یا اس تقدیر پر کہ وہ 'الدسائس' سے حال واقع ہے۔

فعل امر کے سولہ معانی کا بیان

'فعل امر' یہاں ''تادیب'' کے لئے ہے یا ''ارشاد'' کے لئے۔حالانکہ امر سولہ معانی کیلئے آتا ہے جیسا کہ علامہ خرپوتی نے افادہ فرمایا ہے۔

(اول):۔'ایجاب' جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ ا قیموا الصلوٰة ﴾ ،(ثانی):۔'ندب' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ فکاتبوه ﴾)، (ثالث):۔'تادیب' جیسے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول میں ہے ﴿ كل مما يليك ﴾ (رابع):۔'ارشاد' جیسے اللہ کا یہ فرمان ﴿ و استشهدوا ﴾ (خامس):۔ 'اباحت' جیسے اللہ کا یہ فرمان ﴿و اذا حللتم فاصطادوا﴾ یعنی جب تم حج کی ادائیگی سے فارغ ہو جاؤ تو میں تمہیں شکار کرنے کی اجازت دیتا ہوں یا اب تمہارا شکار کرنا مباح کرتا ہوں تو امر یہاں اللہ کے فرمان ﴿فاصطادوا﴾ میں اباحت کے لئے۔(سادس):۔' تحديد' جیسے ﴿ اعملوا ماشئتم﴾ اور جیسے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا " اعمل ماشئت" (سابع):۔'امتنان' مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿كلوا مما رزقكم الله﴾ ،(ثامن):۔'اکرام' مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے ﴿ ادخلوها بسلٰم ﴾ ،(تاسع):۔'تعجیز' جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ فاتوا بسورة من مثله)﴾ ،(عاشر):۔" تسخير" ۔مثلا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔﴿ كونوا قردة خٰسئين﴾ (حادی عشر):۔' اھانت'۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿ذق انك انت العزيز الكريم﴾ ،(ثانی عشر)۔" تسويه"۔ مثلا ﴿فاصبروا اولا تصبروا﴾ (ثالث عشر)۔'دعا' مثلا ﴿ اللهم اغفرلی)﴾ ،(رابع عشر)۔" تمنی"۔ جیسے امرءالقیس کا یہ شعر:

الا ایھا اللیل الطویل الا انجلی　　بصبح و ماالا صباح منک با مثل

ترجمہ:۔اے لمبی رات تجھے صبح ہوکر روشن ہوجانا چاہئے اور میرے نزدیک صبح تجھ سے افضل نہیں (یعنی اے رات کاش تو ہی روشن ہوجاتی اور مجھے دن کا منہ دیکھنا نہ پڑتا اس لئے کہ میرا دن رات سے زیادہ تاریک ہے)

(یعنی شاعر کہتا ہے کہ میں نے اس سے کہا اے رات روشن ہوجا اور صبح کا قصد کرتا کہ تیری تاریکی صبح کی روشنی سے ختم ہوجائے اور پھر شاعر کہتا ہے:" وما الاصباح منك بامثل" کہ میرے نزدیک دن، رات سے افضل نہیں اس لئے کہ میرا دن، رات سے زیادہ تاریک ہے، غم اور حزن وملال کی تجھ پر کثرت کی وجہ سے اس لئے لمبی رات تو ہی روشن ہوجا میرا دن تو روشن ہونے والا نہیں۔) بہر حال امرء القیس کے اس شعر میں محل استشہاد "انجلی" فعل امر ہے جو یہاں "تمنا" کے لئے ہے۔

(خامس عشر)۔" احتقار " ۔اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے یہ کہنے کی حکایت بیان فرماتا ہے﴿ القوا ما انتم ملقون﴾

(سادس عشر)۔"تکوین "جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان﴿کن فیکون﴾

(دسائس) " دسیسة " کی جمع ہے جیسے کتائب، "کتیبة "کی جمع ہے، دسیسه بمعنی دھوکہ، مکر، فریب اور الدسائس 'میں الف لام مضاف الیہ کا عوض ہے یعنی دسائس النفس (من جوع) ظرف مستقر یا تو دسائس سے حال واقع ہے یا اس کی صفت ہے جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں معنی یہ ہے کہ نفس کے فریب سے محتاط رہو اس حال میں کہ وہ فریب بھوک اور سیری سے پیدا ہونے والے ہیں۔ یا صفت ہونے کی تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ ان خفیہ چالوں سے محتاط رہو جو بھوک اور شکم سیری سے پیدا ہونے والے ہیں۔

(جوع) بھوک انسان کی اس مشہور حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان کھانے کی طرف راغب ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ انسان کی بھوک کی ایک علامت یہ ہے کہ مکھی اس کے لعاب کو سونگھے اور اس پر بیٹھی نہ رہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے

فی حد جوع الفتی قولان، قیل بان　　یشتھی بہ الخبز فردا حالة الاکل

وقیل، ان وقعت فی الارض ریقته　　　شم الذباب وجد السیر من عجل

(ترجمہ:۔ایک جوان کی بھوک کی تعریف میں دوقول ہیں ایک یہ کہ وہ کھاتے وقت طاق روٹی کی خواہش کرے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اس کا لعاب دہن زمین پر گر جائے تو مکھی اسے سونگھ کر جلدی سے اڑ جائے اور اس پر بیٹھی نہ رہے۔)

(شبع) بمعنی شکم سیری یہ 'جوع کا عکس اور اس کی نقیض ہے،اور دسائس من الجوع و الشبع' سے مراد وہ آفات ہیں جو ان دونوں سے پیدا ہونے والے ہیں۔

بھوک سے پیدا ہونے والی آفتیں یہ ہیں۔غصہ،سختی، پژمردگی، کمزوری، نفس کا اکتانا،نفس کا تحصیلِ کمال سے رکنا، اور خیالات فاسدہ اور اوہام کاسدہ کا آنا۔

اور شکم سیری سے حاصل ہونے والی آفتیں یہ ہیں۔کثرت نوم جو سستی پیدا کرنے والی ہو، دل کی سختی،قلب کا غافل رہنا، دل کا مردہ ہوجانا یعنی دل کا لمبی امیدوں اور نور یقین کے بجھ جانے سے مردہ ہوجانا، کثرت شہوت وغیرہ مصیبتیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جوع سے برسبیل مجاز فقر مراد ہو،اس لئے کہ وہ ملزوم الجوع ہے تو اس بنیاد پر دسائس سے مراد مہالک ہوں گے،اس لئے کہ تنگدستی'' مؤدی الی المهالك'' ہوتی ہے اسی وجہ سے آقائے دوعالم ﷺ نے اس سے استعارہ کیا اور حدیث میں فرمایا ''کاد الفقر ان یکون کفرا'' (قریب ہے کہ فقر وجہ کفر ہوجائے) اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا'' الفقراء سود الوجوه یوم القيامة'' (بعض تنگدست قیامت کے دن سیاہ رو ہوں گے)

اور تنگدستی کی آفتیں، چوری کرنا، مذہب وملت کو بدل لینا وغیرہ ہیں جیسا کہ شاعر کہتا ہے

کم عالم عالم اعیت مذاهبه　　　وجاهل جاهل تلقاه مرزوقا

هذا الذی ترک الاحلام حائرة　　　وصیر العالم النحریر زندیقا

(ترجمہ:۔ کتنے عالم ہیں کہ جنکے رزق کے راستوں نے انہیں عاجز کر دیا ہے اور کتنے جاہل ایسے ہیں کہ تم انہیں رزق پایا ہوا دیکھو گے، یہی وہ چیز ہے جس نے عقلوں کو حیران کر رکھا ہے اور ماہر عالم کو زندیق بنا دیا ہے)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شبع (شکم سیری) سے غنا مراد ہو اور دسائس سے مہالک الغنی، اس کے آلات ہلاکت ہیں یہ ہیں حب دنیا جو تمام گناہوں اور معصیت کی جڑ ہے، امید کی زیادتی، عبادات سے کاہلی، آخرت کو بھول جانا، سختی قلب، کبر، عجب، حرص، بخل، وغیرہ۔

جوع سے جہل اور شبع سے علم بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ 'جوع' سے عدم عمل اور 'شبع' سے 'عمل' مراد ہو اور اس کا بھی احتمال ہے کہ جوع سے مراد سکوت ہو اور 'شبع' سے کلام اور اس کا بھی امکان ہے کہ جوع سے 'سهر الليل' اور 'شبع' سے 'نوم بالليل' مراد ہو۔ اور جوع سے کنوارا رہنا، شبع سے بہت زیادہ خلط ملط کرنا، نیز جوع سے مجرد رہنا اور 'شبع' سے شادی کرنا بھی مراد لینا درست ہوگا۔

تو ان تقادیر پر 'جوع' اور 'شبع' میں مجاز اور استعارہ ہے اور ان دونوں سے ہر ایک میں وجہ شبہ نفس کا خوراک سے علیحدہ ہونا اور اس کا حاصل کرنا ہے اور 'دسائس' یعنی مکروفریب، تمام مذکورہ کے مہالک کا نام ہے۔

(فرب مخمصة شر من التخم) اس میں 'فا' تعلیل کے لئے ہے اس لئے کہ وہ پوشیدہ دعوے کی دلیل ہے جس کو ماسبق سے سمجھا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بھوک کے مکروفریب سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ (رُبَّ) اکثر کے نزدیک تقلیل کے لئے آتا ہے اور بعض کے موقف کے مطابق وہ تکثیر کے لئے آتا ہے یہ حرف جار ہے جو صرف نکرہ ہی پر داخل ہوتا ہے، کلمہ 'رُبّ' میں اور بھی کئی لغات ہیں تشدید اور تخفیف کے اعتبار سے، اور اس کے آخر میں 'تا' اور کلمہ ما کو ملحق کر دیا جاتا ہے اور 'تا' 'ما' کے ساتھ مشددہ اور مخففہ ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ شیخ الاسلام زکریا انصاری 'رُبّ'' کلمے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس میں ستر لغت آتی ہیں، آپ نے ان سب لغات کو " القصيدة المنفرجة " پر اپنی شرح میں شمار فرما دیا ہے اگر کسی کو تفصیل درکار ہو تو اسے اس عظیم کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ تعلیل کو 'جوع' (بھوک) کے ساتھ ہی مخصوص کیوں کیا گیا؟ اور یوں علت بیان کی "فرب مخمصة..." اور شبع کی تعلیل کا ذکر نہیں کیا؟ کیوں؟

جواب: 'شبع' (شکم سیری) کا ضرر بدیہی اور مخلوق کے مابین انتہائی مشہور ہے اس لئے وہ اپنی شہرت کی وجہ سے 'شبع' کی تعلیل بیان کرنے سے مستغنی ہے۔ اور علامہ ابو سلیمان درانی نے 'شبع' کے بارے میں چھ نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں شکم سیر عبادت کی حلاوت نہیں پاتا ہے، اس پر حکمت کی محافظت متعذر ہو جاتی ہے، وہ مخلوق پر شفقت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اس پر عبادت بھاری اور بار گزرنے لگتی ہے، اس کی شہوت بڑھ جاتی ہے، تمام مومنین مساجد کی طرف جانے میں جلدی کرتے ہیں اور یہ شکم سیر گندے مقامات کی طرف دوڑتا ہے۔

اور رہے 'جوع' (بھوک) کے نقصانات تو وہ بہت پوشیدہ اور خفی ہوتے ہیں اور جوع پر منافع اور فوائد زیادہ مرتب ہوتے ہیں ان فوائد و منافع میں سے کچھ یہ ہیں: نیند کا غائب ہو جانا، نیند کا اڑ جانا، اور دوامی بیخوابی کا ساتھ ہو جانا، عبادت پر مواظبت اور مداومت میں سہولت اور آسانی ہونا، خوراک کا کم ہو جانا۔

اسی وجہ سے صرف 'جوع' ہی کی علت بیان کی۔

(المخمصة) بمعنی شدت کی بھوک۔ (شر) اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اس کی اصل ''اشرر'' تھی مخفف کرنے کے لئے اس کے ہمزہ کو حذف کر دیا گیا، شین کو فتحہ دے کر، 'را' کو 'را' میں ادغام کر دیا اور علامہ ابو قلابة سے اس آیت کی قرأت میں اعرابی غلطی ہوئی (سیعلمون غدا من الكذاب الاشر) ، انہوں نے اس آیت پاک میں " اشر " کی قرأت اسم تفضیل کے صیغہ پر " من الكذاب الاشَرُّ " کی ہے لیکن کسی نے بھی اس امر میں ان سے اتفاق نہیں کیا۔

علامہ حریری فرماتے ہیں: ''شر'' میں تفضیل کا معنی ہوتا ہے اور اس کی تثنیہ جمع اور مؤنث نہیں لائی جاتی اور " اشر " بھی کسی صحیح لغت میں نہیں پڑھا جاتا سوائے ردی زبان کے

(التـخم)، تخمة کی جمع ہےاور "تخمة" مصدر ہے جو بدہضمی کے معنی میں ہے یعنی کھانے کا انسان پر ثقیل اور اس کے معدہ میں خراب ہو جانے کی وجہ سے ہضم نہ ہونا۔

مـخـمصة یعنی شدت کی بھوک، بدہضمی سے زیادہ مضر ہےاور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ بہت زیادہ شکم سیر ہونا، زیادہ مضر ہےاور شدکی بھوک اس سے بہتر ہوتی ہے لیکن پھر بھی شدت کی بھوک مضر اور نقصان دہ ہی ہے اس لئے کہ شدت کی بھوک اور خالی پیٹ ہونا، انسان کے جسم میں اتنا ضعف اور کمزوری پیدا کرتا ہے کہ وہ عبادت کو ادا کرنے پر بھی قادر نہیں ہو پاتا، اسی وجہ سے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ سے فرمایا "ان نفسك مطيتك فارفق بها، و ليس من الرفق ان تجيعها و تذيبها"

بیشک تمہارا نفس تمہاری سواری ہے تو تم اس کے ساتھ نرمی کرو اور یہ نرمی کرنا نہیں کہ تم اس کو بھوکا رکھو اور کمزور کردو۔

اور کتب فقہیہ میں یہ بات بالکل ثابت ہے کہ کھانا:

یا تو فرض ہوگا، اور وہ اتنی مقدار ہے جو انسان سے ہلاکت کو دفع کردے حضور ﷺ نے فرمایا" ان الـلـه لَيُؤْجـرُ فـی لـقـمة يـرفعها العبد الى فمه" (اللہ تبارک وتعالیٰ ہر لقمے کے بدلے میں اجر عطا فرماتا ہے جو بندہ اپنے منہ میں ڈالتا ہے)

اور یا تو کھانا مندوب ہوگا، اور وہ قدر مفروض سے زائد ہے تاکہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے پر قادر ہو جائے اور اس پر روزہ رکھنے میں سہولت ہو، حضور ﷺ فرماتے ہیں "الـمـومـن الـقـوی احـب الـی الـلـه من المومن الضعيف" (اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے طاقتور مومن زیادہ محبوب ہے)

یا تو کھانا مباح ہوگا، اگر بندہ محض تقویت اور تقوم بدن کے لئے قدر مندوب سے زیادہ کھالے تو اس میں نہ تو کوئی ثواب ہےاور نہ ہی گناہ البتہ خفیف اور ہلکا محاسبہ کیا جائے گا۔ اور یا تو کھانا حـرام ہوگا، اور وہ شکم سیر ہو جانے کے بعد بھی اس پر زائد کرنا ہے، یہ اضاعت مال اور اسراف کی وجہ سے حرام ہے۔

خاتمہ:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم

یہ بائیسویں شعر کی شرح کا خاتمہ ہے اور وہ شعر یہ ہے" واخش الدسائس اه "

اس تتمہ میں ہم علامہ خرپوتی کی بیان کردہ عبارت پر تبصرہ اور کچھ روشنی ڈال دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے ابوقلابہ کی قرأت کے بارے میں بیان کی تھی کہ ابوقلابہ نے (سیعلمون غدا من الکذاب الاَشِرُ) آیت پاک کی قرأت (من الکذاب الاَشَرُّ) اسم تفضیل کے صیغہ پر" شر" سے کی، علامہ خرپوتی یہاں تصریح فرماتے ہیں" لحن ابو قلابة فی قراء ته (سیعلمون غدا من الکذاب الاشر) علی صیغة التفضیل، ولم یوافقه احد علیها"(ص۵۱، ۵۲)

لیکن میرے لئے یہ محل نظر ہے! اور آپ کا یہ فرمانا" وقد لحن ابو قلابة " تو بالکل ممنوع اور سراسر غلط ہے اس لئے کہ 'لحن' کا معنی اعرابی غلطی کرنا ہے جیسا کہ مصباح المنیر 'میں آیا ہے:

" لحن فی کلامه لحنا من باب نفع: اخطا فی العربیة ،ابوزید نے فرمایا' لحن فی کلامه لحنا بسکون الحاء و لحونا و حضرم فیه حضرمة' یعنی 'لحن' اس وقت بولا جاتا ہے جب اعرابی غلطی کی جاتی ہے اور وجہ صواب کی مخالفت کی جائے۔

" لحن ' الخطا فی العربیة، اعرابی غلطی اور مخالفت وجہ صواب کو کہتے ہیں جیسا کہ مصباح المنیر' سے ابھی بیان کیا گیا اور اسی 'لحن' کا دعویٰ علامہ خرپوتی نے ابوقلابہ پر کر دیا اور کیوں کہہ ڈالا کہ کوئی بھی ایسا معتبر مفسر جس نے علم تفسیر میں کتابیں تصنیف کی ہوں اور ان میں قرأت متواترہ مشہورہ اور قرأت شاذہ کا ذکر کیا ہو، ابوقلابہ کی قرأت کی تائید کرتا ہوا نظر نہیں آ رہا ہے حالانکہ ان میں سے کسی نے بھی' لحن ابو قلابة' نہیں فرمایا کہ ابوقلابہ نے اس کی قرأت میں اعرابی غلطی کی ہے، بلکہ ان مفسرین نے تو صرف ابوقلابہ کی قرأت کا شمار کرایا ہے اور اپنی تصانیف میں صرف قرأت کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے فقط۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ابوقلابہ نے 'اشــر' شین کے فتحہ اور 'را' کی تشدید کے ساتھ قرأت کی اور وہ اس کو اصل پر لائے ہیں علامہ قرطبی نے اس کلمے میں اور بھی قرات بیان کی ہیں فرماتے ہیں کہ ابوحیوۃ سے 'اشــر' بفتح و تخفیف را، آیا ہے اور مجاہد اور سعید بن جبیر 'اشــر' شین اور را، کے ضمہ اور تخفیف کے ساتھ، نحاس نے کہا کہ وہ بمعنی 'اشر' ہے اس کی نذیر" رجل حَذِرٌ و حَذُرٌ' ہے۔ مصباح المنير ' میں ہے۔' رجل شر' یعنی ذوشر" و قـوم اشرار" وهـذا شر من ذالك (یہ اس سے زیادہ برا ہے) اور اس کی اصل 'اشر' الف کے ساتھ، افعل تفضیل کے صیغہ پر ہے، اور اصل کا استعمال بنی عامر کی لغت ہے یعنی 'اشـر' اور شاذ میں اسی لغت پر" الكذاب الأُشَرُّ" کی قرأت کی گئی ہے۔

علامہ زمخشری ''کشاف'' میں فرماتے ہیں " اشر" بضم شین کی قرأت بھی کی جاتی ہے جیسے " حَدِثٌ و حَدُثٌ، حَذِرٌ، حَذُرٌ " وغیرہ کہا جاتا ہے اور 'اشـر' بھی بڑھا گیا ہے اور اس کا معنی ابلغ فی الشرارۃ ہے۔'اخیـر' اور 'اشــر' خیـر و شـر کی اصل ہیں اور یہ ایسی اصل ہے جو مرفوض یعنی نظر انداز کی ہوئی ہے۔ ابن انباوی نے قول عرب بیان کیا 'هو اخير و اشر! وما اخيره وما اشره!!انتھیٰ

ان نقول سے آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ان کا قول" هـذ اشـر من فلان "لغت محفوظہ ہے اور یہ بنی عامر کی لغت ہے اور علامہ ابن انباری کی بیان کردہ اصل کے ساتھ متناقض ہے۔ (بہر حال) جو نظائر یہاں ہم نے بیان کئے اس سے واضح ہو گیا کہ ابوقلابہ کی قرأت کا ذکر معتبر اور اکابر مفسرین کی ایک جماعت نے فقط قرأت کے اعتبار سے کیا ہے اور سب نے صرف یہ تصریح فرمائی کہ یہ قرأت شاذ ہے اور کسی نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے اعرابی غلطی کی ہے۔

تو علامہ خو یوتی کا وہ قول اور ابوقلابہ پر ان کا یہ دعویٰ کہ کسی بھی مفسر نے ان کی بات سے اتفاق نہیں کیا! دلیلوں کی بنیاد پر قائم نہیں ہے کہ اس قرأت میں 'لحن' اور اعرابی غلطی ہے اس لئے کہ کلام عرب میں اس کی قرأت کی اصل موجود ہے اور وہ یہ کہ بعض عرب کی وہ لغت مستعملہ ہے اور 'لحن' اسے کہتے ہیں جو من حیث العربیت غلط ہو، تو

ان کی اس قرأت پر لحن کی تعریف صادق نہیں آرہی ہے اور جب تعریف صادق نہیں آرہی تو معلوم ہوگیا کہ وہ من جہت العربیت خطاہے ہی نہیں۔تو ابوقلابہ پر قرأت میں لحن کا دعوی کرنا صحیح نہیں ٹھہرتا ہے۔

اور مزید یہ کہنا کہ اس قرأت سے کسی نے اتفاق نہیں کیا اس میں لحن ہونے کی بنیاد پر یہ بھی دلائل پر قائم نہیں ہے اس وجہ سے کہ یہ قرأت علی وجہ الشذ وذ میں جاری ہے اور ابھی اس کلمے کے متعلق اور دوسری قرأت شاذہ بیان کی جاچکی ہیں مثلا 'اَشَرُ' بتخفیف الراء کی قرأت اور جیسے 'اَشُرُ' بضم شین وُراء' کی قرأت اور ایک ایسے مقری جن کی قرأت کی روایت کی جاتی ہو اور تفاسیر کی کتابیں جن کے مباحث سے پُر ہوں، ان کی جانب 'لحن' کو منسوب کرنا بے ادبی سے خالی نہیں ہے۔

علم حدیث کی اصطلاح میں 'شاذ' اسے کہتے ہیں جس کو ثقہ راوی نے روایت کیا ہو اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کے موقف کے خلاف، تو اگر قاری کی قرأت کے اعتبار میں تمام مفسرین کا متفق ہونا شرط ہوتا ہو تمام قرأت شاذہ قرأت ہونے سے ضرور خارج ہوجاتیں لیکن مفسرین کا قرأت شاذہ کو اپنی تصانیف میں ذکر کرنا، اس کو دلائل سے مزین کرنا، اس پر احکام کی بنا کرنا، یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قرأت شاذہ کلام میں ثابت اور مقبول ہوتی ہیں اگرچہ وہ قرأت متواترہ، مشہورہ اور قرأت عامہ کے درجہ تک نہ پہنچی ہوں۔

امام جلال الدین سیوطی نے ''اتقان'' میں ان قرأت کے بحث میں انتہائی نفیس کلام ذکر کیا ہے، اس مختصر سی مجلس میں اتنی گنجائش تو نہیں کہ میں سب کا سب یہاں بیان کرسکوں اس لئے کہ وہ بہت طویل کلام ہے لیکن کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں، امام جلال الدین سیوطی نے کسی معتبر اور سربرآوردہ قاری سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

(۱) پہلی قسم وہ جسکی قرأت کی جاتی ہے اور اس کے منکر کی تکفیر بھی کی جاتی ہے یہ وہ قرأت ہے جو ثقات سے منقول ہو اور وہ عربیت اور خط مصحف کے موافق ہو۔

(۲) دوسری قسم وہ جو آحاد سے منقول ہو۔آحاد سے اس کی نقل ثابت ہو اور عربی میں صحیح ہو لیکن اس کا لفظ خط مصحف

کے موافق نہ ہوتو ایسی قرأت مقبول تو ہے لیکن دووجھوں سے اس کی قرأت نہیں کی جاتی ہے (۱) ایک وجہ مخالفت اجماع ہے (۲) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اسے اجماع سے نہیں بلکہ خبر احاد سے لیا گیا ہے۔ تو اس سے اس کا قرآن ہونا ثابت نہیں ہوا اسی وجہ سے اس کے منکر کی تکفیر نہیں کی جائے گی لیکن جس نے بھی اس کا انکار کیا بہت برا کیا۔

(۳) تیسری قسم وہ جو منقول ہو اور عربی میں اس کی کوئی دلیل نہ ہو، اس کو غیر ثقہ رواۃ نے نقل کیا ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ خط کے موافق ہو۔

اقـــول:۔ ظاہر ہے کہ جو قرأت علامہ ابوقلابہ سے منقول ہے وہ دوسری قسم میں سے ہے، اس لئے کہ اسے ثقہ نے روایت کیا ہے اور وہ عربی کے موافق ہے، تو وہ اگرچہ قسم اول کے درجے تک ثبوت کے ذریعہ نہیں پہنچی ہے پھر بھی وہ فی الجملۃ ثابت اور مقبول ہے اور اس کا قرآن سے ہونا، مظنون ہے، اسی وجہ سے امام سیوطی نے فرمایا ''جس نے بھی اس کا انکار کیا بہت ہی برا کیا''۔ بہر حال علامہ ابوقلابہ پر یہ حکم کہ انہوں نے 'لحن' کیا محض ان پر طعن ہی نہیں بلکہ اس سے، ان کے پاس سے قرأت ثابتہ کے انکار کی بو بھی آرہی ہے۔

میں نے یہ چند سطور صرف تنبیہ عوام، تائید امام اور دفع اوہام کے لئے ذکر کردیئے ہیں والحمدللہ الملک المنعام۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ٥

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

ربـــط: شاعر ذی فہم گزشتہ اشعار میں جب مختلف اسلوب اور طریقوں سے مراعات نفس کے بیان سے فارغ ہوگئے اور شخص مجرد کو نفس کی محافظت اور نگہ بانی کی ہدایت کر چکے، تو انہوں نے ملاحظہ کیا کہ شخص مجرد کو ماضی میں سرزد ہوجانے والے کثیر گناہوں سے، اللہ کی جناب میں توبہ کرنے کی ضرورت ہے تو اب شاعر ذی فہم اس شعر میں شخص مجرد کو توبہ اور رجوع پر آمادہ کرنے کے لئے، سبب مغفرت اور گناہوں کے کفارے کی جانب رہنمائی کرتے

ہیں۔تو فرماتے ہیں۔

(۲۳) و استفرغ الدمع من عين قد امتلأت   من المحارم و الزم حمية الندم

ترجمہ:اور آنسوؤں کو اس آنکھ سے جاری رکھ جو گناہوں سے بھر چکی ہے اور ندامت کی پرہیز کو لازم پکڑ)

تشریح: (واو) یہاں برائے عطف ہے اور واو استئنافیہ بھی ہوسکتا ہے،اور جملہ سوال مقدرہ کا جواب واقع ہے، گویا شخص مجرد نے اس سے سوال کیا اور اس سے پوچھا کہ آپ نے مجھے نفس کی حفاظت کی ہدایت فرمائی اور مستقبل میں نفس کی نگہ بانی کرنے کی طرف رہنمائی کی،لیکن میں ان گناہوں کا کیا کروں جو ماضی میں مجھ سے سرزد ہوچکے ہیں،کیا توبہ اور رجوع کا کوئی راستہ ہے؟ تو ناظم شعر نے اسے اس راستے کی جانب رہنمائی کی یہ کہتے ہوئے:" و استفرغ الدمع۔اھ۔"

(استفرغ) صیغہ امر،باب استفعال سے،اس باب کی خاصیت،طلب فعل ہے،تو معنی ہوگا،" اُطلب الفراغ" بمعنی" فرّغ الدمع" (آنسو جاری کر،بہا)(الدمع) نمکین پانی جو آنکھ سے بہتا ہے۔

(من عين) جارمجرور" استفرغ" سے متعلق ہے۔(قد امتلأت)،'عین' کی صفت ہونے کی وجہ سے یہ جملہ محل جر میں ہے،اور فعل ضمیر مستتر (يعنى هى) 'عين' کی جانب راجع ہے۔

" امتلأت" سے مراد کثرت ذنوب ہیں،ممکن ہے کہ بطریق استخدام ایسا کہا جاتا ہو،طریق استخدام یہ ہے کہ لفظ کو پہلے بامعنی ذکر کیا جائے اور اس کی جانب بعد میں ضمیر کو کسی دوسرے معنی میں لوٹایا جائے،جیسا کہ یہاں واقع ہوا ہے،تو آنکھ وعضو انسانی کے معنی میں ہے جس سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے قول (امتلأت) میں ضمیر آنکھ کی جانب لوٹ رہی ہے لیکن یہاں آنکھ سے دل مراد ہے،اسی کو بلاغت میں استخدام کہتے ہیں۔

(من المحارم)" امتلأت' سے متعلق ہے،'محارم' یہ 'محرم' کی جمع ہے کہا جاتا ہے: ذات رحم محرم منك' جب کسی سے ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو،تو محرم،بمعنی حرام ہے اور 'محارم' سے مراد محرمات اور معاصی ہیں۔

(والـزم حمية الندم) میں 'الزم' بمعنیٰ 'التزم' (لازم پکڑ)، 'حمية' مصدر بمعنیٰ 'احتماء' اور 'تحرز' (پرہیز، احتیاط) اور 'الندم' بمعنی ندامت ہے، اور 'حمية الندم' میں اضافت بیانیہ ہے یعنی اس احتیاط کو لازم پکڑ جو ندامت اور پشیمانی ہے، یا پھر یہ اضافت بمعنیٰ 'من' ہے یعنی 'الحمية الحاصلة من الندم' (وہ احتیاط جو ندامت سے حاصل ہونے والی ہے) یا پھر یہ اضافت 'اضافة المشبه الى المشبه به' کی قبیل سے ہے، جیسے اس قول میں ہے

(.......قد جرىٰ ☆ ذهب الأصيل على لجين الماء)

وجہ اخیر کی تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ 'لازم' پکڑ اس ندامت کو جو پرہیز کے مشابہ ہے۔ اور شعر کا معنی ہوگا کہ اے وہ جس کی آنکھیں میں حرام چیزوں کے مشاہدے سے پر ہیں، اور جس کا دل مرض غفلات میں مبتلا ہے، تجھ پر گریہ وزاری اور آنسو بہانا لازم ہے، اس لئے کہ یہی اس مرض سے بری ہونے کا علاج ہے اور یہی دل کو اللہ کے سوا سب سے پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ خلیل اللہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) بیت اللہ کی تطہیر کے لئے مامور تھے اور تم اس بات سے باخبر ہو کہ ارواح اور قلوب کا علاج صرف معجون نجاح سے ممکن ہے، کہا جاتا ہے: نجاست ظاہرہ کی تطہیر پانی سے ہوتی ہے اور نجاست باطنہ کی تطہیر آنکھ کے پانی سے ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آنسو خشیت اور ندامت کے ہوں، اس لئے کہ نماز میں درد اور تکلیف اور کسی مرض کی وجہ سے رونا، نماز کو فاسد کر دیتا ہے، لیکن خشیت الٰہی میں آنسو بہانا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں رونا، مُکمّل نماز شمار کیا جاتا ہے۔

شاعر ذی فہم نے اس علاج یعنی آنکھوں کو بہانے کی جانب اس لئے رہنمائی کی کیونکہ خشیت الٰہی میں رونا اور آنسو بہانا، جہنم میں دخول سے مانع ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا، آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا" لا يـدخـل النار من دمع من خشية الله تعالىٰ حتى يلج اللبن الضرع" (ترجمہ) جو خشیت الٰہی میں رویا اور اللہ کے خوف سے آنسو بہائے وہ جہنم میں نہیں داخل ہوگا یہاں تک کہ دودھ تھن میں واپس چلا جائے۔

مزید آثار میں وارد ہوا کہ ''قیامت کے دن جہنم سے ایک آگ مثل پہاڑ نکلے گی اور امت محمدی ﷺ کی طرف

بڑھے گی، رسول اللہ ﷺ اس کو بجھانے کی کوشش فرمائیں گے اور آپ ﷺ، حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آواز دیں گے اور حاضر ہونے کا حکم فرمائیں گے کہ یہ آگ میری امت کو جلانا چاہتی ہے! تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک پیالہ لے کر حاضر ہوں گے جس میں پانی ہوگا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ سے عرض کریں گے کہ حضور اس کو لیں اور آگ پر چھڑک دیں، حضور اس پانی کو آگ پر چھڑکیں گے جس سے آگ فوراً بجھ جائے گی، پھر حضور فرمائیں گے جبرئیل! یہ کیسا پانی ہے میں نے آگ بجھانے میں ایسا پانی کبھی نہیں دیکھا؟ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام عرض کریں گے کہ حضور یہ آپ کی امت کے وہ آنسو ہیں جو وہ خلوت میں، خشیت الٰہی میں بہایا کرتے تھے۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے اس ضرورت کے دن کے لئے محفوظ رکھوں تا کہ اس سے وہ آگ بجھائی جائے جو آپ کی امت کی طرف بڑھے۔

اور ناظم شعر کا یہ قول (الـــزم) ایک سوال مقدرہ کا جواب ہے، گویا اس سے پوچھا گیا کہ کیا آہ و بکا اور گریہ وزاری ہمیشہ نفع پہنچائے گی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، بلکہ آنسو بہانا اور رونا یہ اسی وقت سودمند ہوگا جب ندامت کے طور پر ہو، اسی وجہ سے ناظم فاہم نے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے کہا" والزم حمية الندم" اور آنسو بہانے کے بارے میں یہ کتنی اچھی بات کہی گئی ہے" صب العبرات يحط السيئات و يرفع الدرجات" (یعنی آنسو گناہوں کو مٹاتے ہیں اور درجات کو بلند کرتے ہیں)، اور بعض آثار میں مروی ہے کہ قیامت کے دن ایک بندہ پیش کیا جائے گا، جس کے خلاف اس کے اعضاء گناہوں کی گواہی دے رہے ہوں گے اور وہ جہنم کا مستحق ٹھہرے گا کہ اتنے میں اس کی آنکھوں سے ایک بال اڑے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے اذن شہادت طلب کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اسے اجازت دے گا اور فرمائے گا کہ اے بال! میرے بندے کے بارے میں ثبوت پیش کر، اور اس کا دفاع کر تو وہ بال گواہی دے گا کہ اے اللہ تیرا یہ بندہ تیرے خوف اور خشیت سے دنیا میں رویا تھا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا اور منادی ندا دے گا کہ یہ بندہ ایک بال کی گواہی کے سبب عتیق اللہ ہے۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق دریافت کیا گیا (فيهـمـــا عيـنـــان

تجریان) کہ ان دو چشموں کی بشارت کس کے لئے ہے؟ فرمایا ان دو بہنے والے چشموں کی بشارت اس شخص کے لئے ہے جس کی آج اس دنیا میں دو آنسو بہانے والی آنکھیں ہیں۔

پھر جاننا چاہئے کہ اس شعر کی خاصیت یہ ہے کہ اگر تم پر دوران مطالعہ کوئی درس مشکل ہو جائے اور تم اسے حل نہ کرسکو، تو اس شعر کو ایک سوانیس مرتبہ پڑھ لو، انشاء اللہ تم پر اس کے بند دروازے کھل جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ کے فصل ثانی کے بارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔

ربط: شاعر ذی فہم نے، گزشتہ شعر میں جب، نفس کا نفسانی خواہشات کے دلدل میں مستغرق ہونے کی کیفیت اور خواہشات و آرزو کی وجہ سے نفس کا انتہائی نقصان اور پریشانی میں مبتلا ہونے کی حالت کو بیان کر دیا، تو اب وہ شخص مجرد کو نفس اور شیطان کی کلیۃ مخالفت کرنے کا حکم دے رہے ہیں وہ کہتے ہیں:

وخالف النفس و الشیطان واعصھما و ان ھما محضاك النصح فاتھم

ترجمہ:۔ نفس و شیطان کی مخالفت کر اور ان دونوں کی نافرمانی کر اور اگر یہ دونوں تجھے مخلصانہ نصیحت کریں تب بھی تو انہیں متہم کر اور مشکوک جان۔

تشریح:۔ مخالفت، عصیان سے مطلقا عام ہے، اس لئے کہ عصیان (نافرمانی) یہ امر و نہی میں فرماں برداری نہ کرنا اور تعمیل حکم کو ترک کرنا ہے، اور مخالفت یہ موافقت نہ کرنے سے ہوتی ہے تو ہر عصیان مخالفت ہے لیکن اس کا عکس نہیں (یعنی ہر مخالفت عصیان نہیں) (الشیطان) یا تو " شاط " سے ہے بمعنی ہلاک ہونا اور فعلان کے وزن پر ہے، یا پھر یہ " شطن " مادے سے بمعنی دور ہونا ہے، اور 'فیعال' کے وزن پر ہے۔ ناظم شعر کا یہ

مصرع ''و ان هما محضاك النصح "اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے (وان احد من المشركين استجارك فاجره) اس پر ماسبق میں ہم گفتگو کر چکے ہیں یہاں اعادہ بے سود ہوگا۔

(ان)۔'اذا' میں اصل یہ ہے کہ اسے مقطوع الوقوع میں استعمال کیا جائے اور ' ان' میں اصل یہ ہے کہ اسے مشکوک میں استعمال کیا جائے اور یہاں ' ان 'اس کے لئے لائے کہ نفس و شیطان سے مخلصانہ نصیحت انتہائی مشکوک اور نادر ہے، تو اگر شیطان نصیحت کرے تو یہ قابل غور مسئلہ ہے، اس لئے کہ شیطان ہمارا اور ہمارے باپ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دشمن ہے، اور ہمیں حکم ہے کہ ہم اسے اپنا دشمن ہی سمجھیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ﴿ ان الشیطٰن لكم عدو فاتخذوه عدوا﴾ اور اس نے ہمیں بہکانے اور گمراہ کرنے اور آرزوئیں دلانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے مہلت مانگ رکھی ہے اور وہ ہمارا پیچھا موت تک نہیں چھوڑے گا۔ اور اس نے ہمارے ساتھ اپنے اس برے ارادے کی ان الفاظ سے قسم کھائی ہے (لاضلنهم و لا منينهم و لامر نهم)مزید کہا (فبعزتك لاغوينهم اجمعين) اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے واسطے سے مردود بارگاہ الٰہی ہوا، تو ایسے دشمن کی نصیحت مخلصانہ نصیحت نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ایسا دشمن مخلص دوست ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کی نصیحت فساد سے خالی ہوسکتی ہے حضرت آدم علیہ السلام اپنی کمال صفوت، علو درجت اور استحقاق خلافت ونبوت کے باوجود اس لعین کے مکر سے محفوظ نہ رہے تو ضرور ممکن ہے کہ وہ کبھی تجھے طاعات کی طرف بلائے گا اور تجھے عبادات پر آمادہ کرے اور تیری عبادت کو تیری نگاہوں میں معبود بنا کر پیش کرے، اور پھر تجھے حق تعالیٰ سے اس عبادت کے سبب دور کردے جو مردود ہے تو اس وقت تو ان لوگوں میں سے ہوجائے گا جن کے بارے میں کہا گیا (افرأيت من اتخذ الهه هواه و اعرض عن الله وعبد سواه) کہ بھلا دیکھو تو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنا خدا اپنے نفس کو بنا رکھا ہے اور اللہ سے اعراض کرکے اس کے سوا کی پرستش کی) تو یہ ہے تیرا حال اس دشمن کے ساتھ جو اپنی عداوت میں مشہور ہے اور جو تجھے بہکانے اور گمراہ کرنے کا عزم مصمم کئے ہوئے ہے اور یہ دشمن ہر وقت تیری تاک میں ہے اور ہر وقت حاضر ہے اور کبھی کبھی ہی تجھ سے غائب ہوتا ہے، تو جب تیری ایسے دشمن کے ساتھ یہ حالت

ہے، تو تو خود اندازہ لگالے کہ اس دشمن کے ساتھ تیری کیا حالت ہوگی جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہوا کہ تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے، یہ تو تجھ سے اس سے بھی زیادہ قریب ہے، تو ہرگز تو ان کی نصیحتوں کو نہ سننا کہیں وہ تجھے رسوائی کے گڑھے میں نہ گرادے، اس لئے کہ کامیابی اور سلامتی، نفس کی مخالفت اور اس کی خواہشات سے پہلوتہی میں ہی ہے، آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی معنی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں" شــــاوروهــــن خــالـفـوهن" (نفس سے مشورہ کرکے اس کی مخالفت کرو) اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اگر تو اس کی نافرمانی کرتا ہے تو ذرا سی نرمی بھی کر دیا کر۔

اور ناظم شعر کا قول (فاتهم) یعنی نفس وشیطان پر تہمت لگاؤ اور انہیں کذب اور مکر کی تہمت لگاؤ۔

حسبنا الله وهو المستعان و عليه التكلان

بیان وجوہ اعراب وشرح مفردات

(وخالف) 'واؤ' عاطفہ ہے اور یہ عطف، "عـطف الانشـاء على الانشاء" کی قبیل سے ہے، 'خالف' "صیغۂ امر ہے، مخالفت مصدر باب مفاعلت سے اور وہ جیسا کہ کئی مرتبہ گزرا کہ مبالغہ کے لئے ہے۔

(الـنفس) میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ نفس امارہ ہے۔ 'الـنـفـس'، 'خالف' کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (الشيطان) اس کے بارے میں ابھی گزشتہ سطور میں دو وجہیں بیان کی جاچکی ہیں یہاں پہ ہم اس کے معنی میں اور بھی کئی وجوہ کا اضافہ کریں گے اور گزشتہ دونوں وجہوں کا بھی اعادہ کرادینے میں کوئی حرج نہیں جو شیخ زادہ سے مروی ہے اس لئے کہ تکرار دروس کو یاد کرنے میں معاون ہوتی ہے اور اس کو محفوظ کرنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ تو شیطان یا تو فیعال کے وزن پر ہے، تو اس صورت میں اس کا نون اصلی ہوگا 'شـطـن' سے بمعنی دور ہونا، اور شیطان کو اس لئے شیطان سے موسوم کر دیا گیا کیوں کہ وہ ہر خیر سے دور ہو گیا ہے۔

یا پھر وہ شیطان 'فـعـلان' کے وزن پر ہے، 'شـاط'، هلك کے معنی میں ہے یا بمعنی 'اسـرع' ہے اس لئے کہ شیطان بھی انسان کے باطن میں تیزی کے ساتھ دوڑتا ہے، یا آدمی کو گمراہ کرنے میں بہت جلدی کرتا ہے، حدیث

پاک میں وارد ہوا،" ان الشیطان یجری فی ابن آدم مجری الدم" (شیطان بنی آدم کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے) یا بمعنی 'احترق' (جلنا) ہے، اس لئے کہ اس کی اصل آگ یا اس وجہ سے کہ اس کی اول آگ ہے تو ان دونوں وجھوں پر، اس کو (۱) منصرف بھی پڑھ سکتے ہیں (۲) اور غیر منصرف بھی جب اسے عَلَم بنا دیا جائے علامہ جعبری فرماتے: شیطان، ابلیس اور اس کا لشکر ہے، اس سے مراد جنس شیطان ہے، تفسیر خازن میں ہے کہ وہ سرکش اور نافرمان شیاطین کی جنس ہے، پھر شیطان اور جن کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ دونوں موجود ہیں یا معدوم؟ اور اصح یہی ہے کہ یہ دونوں موجود ہیں اور مزید اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ دونوں مجرد ہیں یا نہیں؟ اور اکثر متکلمین وجہ ثانی پر ہیں۔

اور کہا گیا ہے کہ شیطان، آگ کا ایک جسم لطیف ہے جو مختلف صورتیں بدل سکتا ہے اور جن جسم ہوائی ہے وہ بھی اسی طرح شکلیں بدل سکتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ شیطان اور جن یہ دونوں جنس کے اعتبار سے ایک ہی ہیں لیکن ان میں سے جو نیک خوش بخت اور خوش نصیب ہوتا ہے اسے جن کہتے ہیں اور جو شریر بد بخت ہوتا ہے وہ شیطان کہلاتا ہے، اور اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شیطان کی نسل ہوتی ہے؟ تو علامہ نسفی " بحر الکلام " میں فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ ہے کہ شیطان انڈے دیتا ہے اور ان انڈوں سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے" ان فی احد فخذیه فرجا، و فی الآخر ذکرا فیجامع نفسه فیخرج منه الولد'' (اس کی ایک ران میں فرج ہوتی ہے اور دوسرے میں ذکر، تو وہ خود سے ہی جماع کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے) لیکن یہ روایت شاذہ ہے۔

پھر جاننا چاہئے کہ یہاں شعر میں شیطان عام ہے، اس سے مراد ہر شیطان ہے انسان میں سے ہو یا جنات سے، اس لئے کہ انسانی شیاطین بھی برائیوں کا حکم دیتے ہیں تو جیسے جناتی شیاطین کی مخالفت لازم ہے ویسے ہی انسانی شیاطین کے حکم کی بھی مخالفت لازم ہے اور نا صرف مخالفت بلکہ اس کے ساتھ ہم نشینی بھی جائز نہیں ہے۔ (شعر

میں)" الشیطان " کا" النفس ' پرعطف ہے گزر چکا کہ اس سے مراد جنس شیطان ہے،تو اس پر الف لام جنسی ہےاور مفید جمع واو عاطفہ کے ذریعے عطف کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نفس وشیطان بدکاریوں اور برائیوں کا حکم کرنے میں مشترک ہیں،اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے(ان النفس لامارہ بالسوء)اور فرماتا ہے (الشیطان یعدکم الفقرو یامرکم بالفحشآء)

"ان ھما "میں ان شرطیہ ہے اور تثنیہ کی ضمیر نفس وشیطان کی جانب راجع ہے۔(محضاك) فعل ماضی تثنیہ مذکر غائب از "تمحیض "مصدر باب تفعیل سے ہے۔(النصح) کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرنا کے معنی میں ہے ۔(فاتھم)میں 'فا' جزائیہ ہے،تو(فاتھم) شرط کی جزاء ہے،" اتھم ' صیغۂ امر ہے' تھمة' مصدر سے تہمت کا معنی شیخ زادہ سے نقل کیا جاچکا ہے۔

اعتراض:۔ کیا نفس وشیطان کی طرف سے نصیحت ہوتی بھی ہے کہ اسے جھوٹا کہا جاسکے؟

قلت: جی ہاں ان کی جانب سے نصیحت ہوتی ہے،نفس کی نصیحت تو یہ ہے جیسا کہ خادمی نے 'المنھاج' سے نقل کیا ہے کہ احمد بن ارحم بلخی فرماتے ہیں:ایک دن میرے نفس نے مجھ سے جہاد میں جانے کی حجت کی میں نے کہا سبحان اللہ،اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ نفس برائیوں کا بڑا حکم دینے والا ہے اور میرا یہ نفس مجھے خیر کا حکم دے رہا ہے! تو میں نے کہا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ جہاد میں جانے سے تنہائی کی قید سے رہائی ملے گی،لوگوں سے اختلاط ہوگا،الفت سے آرام ملے گا اور مخلوق سے عزت واحترام ملے گا،تو میں نے اس سے کہا کہ اگر تیری یہی منشا ہے تو میں تجھے آبادی میں کبھی نہیں لے جاؤں گا اور کسی سے تیری پہچان نہیں کراؤں گا۔۔الخ جو علامہ خرپوتی نے قصیدہ بردہ پر اپنی شرح میں تحریر کیا(ص۵٦)

اور رہی شیطان کی نصیحت تو مولانا روم نے اپنی کتاب 'مثنوی' میں بیان کیا ہے کہ ایک دن حضرت سیدنا امیر معاویہ صبح کے وقت سو رہے تھے،تو شیطان نے آکر کہا حی علی الفلاح ،امیر معاویہ نے اس کے حکم میں اس کے مکرو غدر کو بھانپ لیا،آپ نے اس سے فرمایا اے شیطان ،تو ،تو صرف گناہوں کا حکم دیتا ہے،آج کیسے طاعت کا حکم

دے رہا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے اس عجیب بات کی؟ اس لئے کہ تجھ جیسے سے یہ بات بہت تعجب خیز ہے، بولا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دن آپ کی نماز فجر کی جماعت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اقتداء میں چھوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے آپ سارا وقت اتنا نادم رہے کہ آپ کے نامۂ اعمال میں اس تحسر کی وجہ سے دوگنی نیکیاں لکھ دی گئیں، تو مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ ایک مرتبہ اور نماز سے کہیں سوتے نہ رہ جائیں اور ایک بار پھر آپ زیادہ ثواب نہ حاصل کر لیں۔ (تو ان دونوں حکایتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نفس وشیطان کے شر سے محفوظ اور محتاط رہو اور اس سے پرہیز لازم رکھو خاص طور پر اس وقت جب وہ جھگڑا اور حجت کریں۔)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين

گزشتہ اوراق میں ہم نے اس قصیدۂ مبارکہ کے فصل ثانی کی بارہویں شعر کی شرح کی اور اب ہم اس فصل کے تیرہویں شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں۔

ناظم فاہم کو شخص مجرد سے انکار کا احتمال ہوا کہ شاید شخص مجرد اس کا انکار کر دے جسے اس شعر میں مخاطب کیا گیا تھا۔

و خالف النفس و الشيطان و اعصهما　　　و ان هما محضاك النصح فاتهم

ربط: تو ناظم کو یہ گمان گزرا کہ مخاطب اس بات کا انکار کر دے گا، اسی وجہ سے انہوں نے چاہا کہ گزشتہ بات کی مزید تاکید کر دی جائے اور اس کو ایک طریقے کی دلیل سے مدلل کر دیا جائے، اس لئے کہ وہ ایک انتہائی اہم اور واجب العمل مسئلہ ہے تو ناظم شعر فرماتے ہیں:

(۲۶) ولا تطع منهما خصما ولا حكما　　　فانت تعرف كيدالخصم والحكم

ترجمہ: نفس اور شیطان کی اطاعت و پیروی کسی بھی حالت میں نہ کرنا، نہ انہیں فریق مخالف بنا کر اور نہ ہی حکم و ثالث

بنا کر، اس لئے کہ تو مخالف اور ثالث دونوں کے مکر کو خوب جانتا ہے۔

تشــــریح: (واو) یہاں عاطفہ ہے اور وہ فعل نہی کا فعل امر پر عطف ہے یعنی عطف الانشاء علی الانشاء ہے (ولا تطع) فعل نہی ہے، حرف نہی یعنی 'لا' سے مجزوم ہے، الاطاعة مصدر باب افعال سے۔" الاطاعة" کا معنی خوشی اور رضا مندی سے تعمیل حکم اور فرماں برداری کرنا ہے۔(منهما) جار مجرور، حال ہونے کی بنیاد پر محل نصب میں ہے، یہ "خصما ولا حکما" سے حال واقع ہے اور 'کائن' محذوف سے متعلق ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی" لا تطع خصما ولا حكما كائنا منهما" ضمیر تثنیہ، نفس وشیطان کی ہے اور یہ 'من' یہاں بیانیہ بھی ہوسکتا ہے اور اس کو ضرورت شعری کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے۔

'الخصم' سے یہاں مراد وہ ہے جو نفس وشیطان کی موافقت سے اختلاف کرے اور ان کے اتحاد میں مخاصمت کرے۔اور' الحکم' سے مراد وہ ہے جو تیرے خلاف نفس وشیطان کی چاہت کے مطابق فیصلہ کرے۔

شاعر ذی فہم کے قول (فانت تعرف كيد الخصم و الحكم) میں 'فا' تعلیلیہ ہے،'کید' بمعنی مکر ہے اور 'خصم' اور 'حکم' میں الف لام عہد خارجی کا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے (ارسلنا الى فرعون رسولا فعصى فرعون الرسول) یعنی "الرسول" میں بھی الف لام عہدی ہے، اس رسول سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

شاعر ذی فہم نے گزشتہ شعر میں نفس وشیطان کی مخالفت کا حکم دیا تو اب وہ ان اسلوب سے اس بات پر تنبیہ کرر ہے ہیں کہ نفس وشیطان میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون و مددگار ہے اور ہر اس چیز پر ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں جس سے بندے کو کفر و گمراہی کے دلدل میں گرا کر، عبرتناک سزا کا مستحق بنا دیں جائے۔جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں" ان ابليس يضع عرشه على الماء ثم يبعث سراياه فادناهم منه منزلة اعظمهم فتنة ، يجئ احدهم فيقول: فعلت كذا و كذا، فيقول ما صنعت شيئا! ثم يجئى احدهم ، فيقول، ماتركته حتى فرقت

بینه و بین امراته، فیدنیه"

(ابلیس پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے پھر اپنی فوج کو بھیجتا ہے تو اس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ پرور ہوتا ہے، ان میں سے ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے یہ یہ کام کیا، تو ابلیس کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا! پھر ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی، تو ابلیس اس کو اپنے سے قریب کر لیتا ہے)

مجھے یاد آ رہا ہے کہ شاید ایک روایت میں "یلتزمه و یقول نعم انت او انت انت" آیا ہے او کما قال النبی ﷺ اور یہ حدیث "مشکوٰۃ" وغیرہ کتب حدیث میں موجود ہے۔

اور کبھی شیطان کی جماعت اور اس کا لشکر ایسے انسانوں میں سے ہوتا ہے جو خود شیطانی عادات و اطوار اختیار کئے ہوتے ہیں انہیں جیسوں کے بارے میں قرآن پاک میں آیا ہے۔(أولٓئك حزب الشيطان) اور بعض مفسرین اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان ﴿و من یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطٰنا فهوله قرین﴾ [الزخرف: ٣٦] کے تحت فرماتے ہیں کہ اس آیت پاک میں اس جانب اشارہ ہے کہ وہ انسان جو اللہ کے ذکر سے اعراض کا سبب بنے تو وہ انسان کے حق میں شیطان کی طرح ہے، تو اسی پر نفس اور اس کے لشکر کے حال کو قیاس کر لینا چاہئے اور یہ گمان ہرگز نہیں کرنا چاہئے کہ امر صرف انہی دونوں کی مخالفت کرنے میں منحصر ہے بلکہ ہر وہ جو برائیوں کا حکم دے اس کی مخالفت کرنی چاہئے، یہ حکم سب کو عام ہے۔

اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ناظم شعر کا قول (منهما) ظرف مستقر "کائنا" سے متعلق ہے اور حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کو ضرورت شعری کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے، ہم نے قارئین کرام کے افادے کے لئے یہ بتا دیا کہ اس طرح کی تقدیم، شعر میں جائز ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

وقد جاء فی الترکیب بعض التصرف   کفصل و تقدیم و مثل زیادة

یعنی شعر میں کچھ تغیر جائز ہے جیسے فصل، تقدیم، اضافہ وغیرہ

'خصم' اور 'حکم' کی کچھ تشریح ہو جانے کے بعد بھی، ابھی بالکلیہ واضح نہیں ہوا کہ شعر میں خصم و حکم کا کیا معنی ہے

اوراس سے کیا مراد ہے؟ اسی وجہ سے اس قصیدۂ مبارکہ کے شارح علامہ زرکشی فرماتے ہیں کہ یہ شعر 'خَصم وَ حَکَم' کے معنی کی معرفت کے اعتبار سے اس قصیدۂ مبارکہ کے مشکل ترین اشعار میں سے ایک ہے، اس موقع پر بعض شارحین نے فرمایا ہیں کہ یہ وہ کلمات ہیں جو بے سود ہیں اور بے معنی ہیں اور انہوں نے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ یہ سب بے معنی کلمات ہیں۔ علامہ زرکشی مزید فرماتے ہیں کہ جہاں تک میرا سوال ہے تو کچھ زمانے تک تو میں بھی اس میں پریشان رہا پھر میں نے ایک دن مکاشفہ میں اس قصیدۂ مبارکہ کے ناظم، امام بوصیری کو دیکھا، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ حضور! اس شعر سے آپ کی کیا مراد ہے اور اس شعر کا معنی کیا ہے؟ امام نے فرمایا کہ اگر تم دواعیٔ انسان پر غور کرتے تو اس کی مراد تم پر ظاہر ہو جاتی، علامہ زرکشی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا حضرت! میں اس کی تفصیل کا طالب ہوں تو امام نے فرمایا کہ انسان کے اندر تین دواعی اور اسباب ہوتے ہیں۔ (۱) قلب (۲) نفس اور (۳) شیطان، تو دل جب عمل صالح کرنا چاہتا ہے تو نفس اس کو مانع ہو جاتا ہے اور اسے روکتا ہے، تو وہ دونوں آپس میں اختلاف کرنے لگتے ہیں اور اپنے مخاصمہ میں کسی کو حَکَم وثالث بنانا چاہتے ہیں جو ان میں فیصلہ کردے تو وہ شیطان کو حکم بنادیتے ہیں اور شیطان برائی کا حکم دیتا ہے تو اس طرح شیطان حکم بن جاتا ہے اور نفس خَصَم (فریق مخالف) اور اگر شیطان فعل بد اور گناہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو دل اس سے کہتا ہے کہ اس فعل کا ارتکاب نہ کر اس لئے کہ یہ شر اور گناہ ہے اور شیطان کہتا ہے کہ نہیں بلکہ یہ نیک عمل ہے، تو اب ان دونوں میں مخاصمت شروع ہو جاتی ہے تو یہ حاکم وفیصل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو ان کے جھگڑے کو سلجھادے تو یہ نفس کو حاکم بنادیتے ہیں اور معلوم ہے کہ نفس برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے تو یہ برائی کا ہی فیصلہ کرتا ہے تو اس طرح نفس 'حَکَم' اور شیطان 'خَصَم' ہو جاتا ہے۔ بہر حال تو نفس وشیطان میں سے ہر ایک کبھی ایک طریقے سے 'خصم' ہو جاتا ہے اور دوسرے طریقے سے 'حکم'۔

یہاں پر وسوسے کی کیفیت کے بارے میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیا چیز ہے جب ہم شیطان کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ ہی حواس خمسہ سے اسے محسوس کر سکتے ہیں تو آخر وہ مدعی، حَکَم اور مُوَسْوِسْ (وسوسے پیدا کرنے

والا) کیسے ہوسکتا ہے؟

قلنا: احیاء العلوم' میں وسوسوں کی بحث میں ذکر کیا گیا ہے کہ دل اس گنبد کے مثل ہوتا ہے جس کے کئی ابواب ہیں جس کے ہر دروازے سے اقوال آتے ہیں اور مزید دل کی مثال اس ہدف کی سی ہے جس کی طرف ہر جانب سے تیر برسائے جاتے ہیں۔

تو جب انسان کسی چیز کا حواس خمسہ سے ادراک کرتا ہے تو اس سے دل میں ایک اثر ہوگا اور اسی طریقے سے شہوت، غضب وغیرہ کے بھڑکنے اور مشتعل ہونے کے وقت دل میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے اور یہی خیالات سب سے اہم محرک ہیں ان ارادوں کے جو اعضا کو حرکت دیتے ہیں تو اگر یہ خیالات محمودہ ہیں تو الہام اور اگر یہ مذمومہ ہیں تو یہی وسوسے کہلاتے ہیں۔ حدیث انس میں ہے " ان الشیطان واضع خرطومه علی قلب ابن آدم، فان ذکر الله خنس وان نسی التقم قلبه"

(ترجمہ: شیطان بنی آدم کے دل پر اپنی سونڈ رکھے ہوئے ہے، تو اگر آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہوجاتا ہے اور اگر ذکر اللہ سے غافل ہوگیا تو شیطان اس کے دل کو اپنا لقمہ بنالے گا۔)

فان قلت: وسوسوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے؟ قلت: صوفیاء فرماتے ہیں کہ شیطان پر مومن کے چھ ہتھیار ہیں۔(۱) تعوذ پڑھنا (۲) کلمۂ شہادت کا ورد کرنا (۳) بسملہ ہر نیک کام کے شروع میں پڑھنا (۴) لالچ کو ترک کرنا (۵) ارمان، آرزو کو چھوڑنا (۶) دنیا سے الگ ہونا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک قوم حضرت حسن بصری کے اس شیطان کی شکایت لے کر آئی، آپ نے فرمایا شیطان بھی ابھی تم لوگوں کی شکایت کرکے میرے پاس سے گیا ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ میری دنیا چھوڑ دو تاکہ میں تمہارے لئے تمہارا دین چھوڑ دوں۔

اور دفع وساوس میں سب سے زیادہ نفع بخش اشتکاء الی اللہ ہے اور اللہ سے اس کو قید کرنے کی امید اور اس پر اس کو نہ نکالنے کی دعا کرنا ہے، اس لئے کہ شیطان کھلے کتے کے مثل ہے اور کتے کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اس کے

مالک ہی کی پناہ لی جاتی ہے۔

فــان قلــت: اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے، آخر نفس وشیطان کو پیدا کرنے اور انسان پر اس کو مسلط کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جــواب: اس میں انسان کو عامۂ ملائکہ پر فضیلت دینا حکمت ہے اسی وجہ سے انسان کو بغیر نفس کے ملائکہ کی طرح پیدا نہیں کیا گیا، اس لئے کہ نفس میں رکاوٹیں اور رخنے ہوتے ہیں جیسے شہوت، غضب وغیرہ چیزیں اور وہ ضرورتیں جو اکتساب کمال میں رکاوٹ بنتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ موانع اور شواغل کے ساتھ عبادت کرنا اور کمال حاصل کرنا زیادہ مشکل اور اخلاص سے پُر ہوتا ہے! اور جس کسی کی بھی یہ حالت ہو تو وہ افضل ہی ہوتا ہے اور رہی شیطان کی تخلیق میں حکمت! تو اولیاء اللہ کو تمام لوگوں میں سے منتخب کرنا حکمت ہے، اس لئے کہ جو اللہ کے دشمن یعنی شیطان کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا،

اور بعض نے کہا اس کی تخلیق میں حکمت یہ ہے کہ عبادت گزار اپنی عبادت میں دھوکا نہ کھائیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ شیطان کی تخلیق میں حکمت یہ ہے کہ عصیان وطغیان کے باعث جو اس کی حالت ہوئی اس سے نصیحت وعبرت حاصل کی جائے اور اہل ایمان کو زیادتی اور گھمنڈ کے ضرر پر متنبہ کیا جائے ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ کی فصل ثانی کے چودھویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۶) استغفر الله من قول بلا عمل　　لقد نسبت به نسلا لذی عقم

ترجمہ:۔ میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے بغیر عمل کے قول سے مغفرت طلب کرتا ہوں، بے شک اس طرح میں نے نسل

کی نسبت بانجھ آدمی کی طرف کردی۔
شاعر ذی فہم نے جب نفس کے دھوکوں سے متنبہ کردیا نیز وہ خواہشات نفسیانیہ سے دور رہنے اور نفس وشیطان کی مخالفت کرنے کا حکم کرچکے اور ان دونوں کے خَصَم وحَکَم کی اطاعت سے جب انھوں نے روک دیا تو اب انہیں اپنے نفس پر ریا کا اندیشہ ہوا اسی لئے وہ اب اس شعر میں نفس کو توڑتے اور اسے پست کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

استغفر اللہ من قول بلا عمل　　لقد نسبت بہ نسلا لذی عقم

تشریح: (استغفراللہ) بمعنیٰ اطلب مغفرتہ' یعنی میں بارگاہ الٰہی میں اس امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے معافی طلب کرتا ہوں جو بغیر عمل کے مجھ سے صادر ہوا، اس طور پر کہ میں نے جس کام کا امر کیا اسے خود نہیں کیا اور جس سے نہی کی اور روکا اس کا میں خود ارتکاب کر بیٹھا۔
(بلا عمل) یہ" قول" کی صفت ہے، (لقد) میں 'لام' قسم کی تمہید کے لئے ہے۔ (نسبت) صیغۂ ماضی متکلم النسبۃ مصدر سے بمعنی نسبت کرنا ہے۔ (بہ) میں 'با' سببیہ ہے اور اس کی ضمیر" قول بلا عمل" کی جانب راجع ہے (نسلا) یعنی وہ قول جو نسل کے مشابہ ہے اور یہ" نسبت" کا مفعول ہے (لذی عقم) یعنی میں نے اس قول کی نسبت ایسے شخص سے کردی جو بانجھ آدمی کے مثل ہے جو اولاد پیدا نہیں کرسکتا ہے، اس لئے کہ قول، قائل کے لئے نسل کی طرح ہے، اس لئے کہ قائل اگر اپنے قول پر خود عمل نہیں کرتا تو سامع بھی اکثر اس کی بات پر عمل نہیں کرتے تو گویا اس نے کوئی بات کہی ہی نہیں! تو قول کی نسبت ایسے قائل کی طرف، نسل کی نسبت بانجھ آدمی کی جانب کرنے کی طرح ہے جو جھوٹ ہے اور اس سے استغفار لازم ہے۔
'عقم' کا "قاف" ساکن ہوتا ہے اور اس پر ضمہ بطور مبالغہ آتا ہے جو علامہ جوہری کی تصنیف سے ماخوذ ہے اس میں ہے ہر وہ اسم جو تین حروف کا مجموعہ ہو اول حرف مضموم اور اوسط ساکن ہو تو بعض عرب اس میں ثقل پیدا کرتے ہیں یعنی اس کے ساکن کو ضمہ دے کر مثلاً عصر، رحم، حلم۔

حاصل معنی:۔ میں بارگاہ الٰہی میں اپنے اس قول سے استغفار کرتا ہوں جو عمل سے خالی ہو، اس لئے کہ ظاہر

ہے کہ جو شخص خیر کا حکم کرنے والا اور برائی سے روکنے والا ہو وہ خود بھی مامور بہ کو ادا کرنے والا اور منہی عنہ سے پرہیز کرنے والا ہوتا ہے لیکن نفس الامر میں جب ظاہر ہوا کہ وہ مامور بہ کو ادا کرنے والا اور منہی عنہ سے پرہیز کرنے والا نہیں ہے تو یہ ایسے ہی ہو گیا جیسے فضل کو نااہل کی جانب منسوب کر دیا جائے اور جیسے بانجھ مرد کی طرف اولاد کی نسبت کر دی جائے جو گناہ اور معصیت ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ اور بہتان ہے، باوجودیکہ اس طرح کی باتیں جن پر خود اس کا قائل عمل پیرا نہ ہو وہ مفضی الی المرام نہیں ہوتی ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے" ان القول الذی یخرج عن اللسان لایبلغ الآذان ، والذی یخرج عن الجنان و قع علی الجنان" (جو بات زبان سے نکلتی ہے، کان تک بھی نہیں پہنچتی اور جو بات دل سے نکلتی ہے، دل میں گھر کرتی ہے)

اورحدیث پاک میں آیا ہے جس کو اسامہ بن زید روایت کرتے ہیں"عن اسامة بن زید انه قال سمعت رسول الله ﷺ یقول مررت لیلة اسری بی الی السماء باقوام تقرض شفاهھم بمقاریض من النار! فقلت من ھولاء یا جبرئیل؟ قال خطباء امتک الذین یقولون مالا یفعلون "

ترجمہ:۔حضرت اسامہ بن زید نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا" شب اسری میں آسمان میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے" میں نے جبریل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جبرئیل؟ انہوں نے کہا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں جو لوگوں کو نصیحت کرتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے)

یہاں اس موقع پر ایک دلچسپ حکایت ہے جس کو علامہ اسماعیل حقی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے: بیان کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک بہت ہی مؤثر الکلام اور دلوں پر قوی التصرف واعظ ہوا کرتا تھا اس کی مجلس وعظ کا یہ عالم تھا کہ اس کے جلسے سے اکثر دو ایک آدمی اس کے وعظ کی شدت اثر سے خوف الٰہی میں جاں بحق ہو جایا کرتے تھے اور اسی شہر میں ایک بوڑھی عورت رہا کرتی تھی جس کا ایک نیک رقیق القلب لڑکا تھا اور وہ بڑھیا اس کو واعظ کی مجلس میں

جانے سے منع کرتی تھی، لیکن ایک دن وہ لڑکا بڑھی ماں کی لاعلمی میں واعظ کی مجلس میں جا پہنچا تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بحکم خدا شدت اثر سے فوت ہوگیا، پھر ایک دن بڑھیا کی اس واعظ سے راستے میں ملاقات ہوگئی، تو وہ اس سے بول اٹھی:

اتھدی الانام ولا تھتدی الا ان ذالک لا ینفع

فیا حجر الشحذ حتی متیٰ تحد الحدید و لا تقطع

ترجمہ:۔کیا تو لوگوں کو ہدایت ورہنمائی کرتا ہے اور خود ہدایت نہیں پاتا، سن لے یہ تیرا ہدایت اور نصیحت کرنا نفع نہیں دے گا۔تو اے پتھر دل سخت انسان آخر کب تک تو تلوار کی دھار تیز کرے گا اور کاٹے گا نہیں)

واعظ نے جب یہ اشعار سنے تو ایک چیخ ماری اور غش کھا کر اپنے گھوڑے سے زمین پر گر پڑا لوگوں نے اسے اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا پھر وہ مرگیا!

تو تم پر لازم ہے کہ جو بات اپنی زبان سے نکالو تو اس پر عمل بھی کرو۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ کی فصل ثانی کے پندرہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۷)امرتک الخیرلکن ما ائتمرت بہ وما استقمت فما قولی لک استقم

ترجمہ: میں تجھے امر خیر کرتا ہوں لیکن میں خود اس پر عامل نہیں اور میں جب خود راہِ راست پر نہیں تو تیرے حق میں میرے اس قول کی کیا حقیقت ہے کہ تو راہ راست پر آ۔

ربط: شاعر ذی فہم نے اس سے پہلے اس مفہوم کو بیدار مغز لوگوں کو مخاطب کرنے کے لئے مبہم عبارت میں ذکر کیا

اور پھر بعد میں اسی مفہوم کو کند ذہنوں سے خطاب کرنے کے لئے واضح عبارت میں لائے۔ کہتے ہیں:

امرتک الخیر لکن ما ائتمرت به　　　وما استقمت وما قولی لک استقم

تشریح: " امرتك " اور " لقد نسبت " کے درمیان کمال اتصال ہونے کی وجہ سے، حرف عطف کو ترک کر دیا گیا ہے اس لئے کہ یہ شعر اس کا تفسیر بیان ہے۔

(امرتك الخير) بمعنی 'طلبت منك الخير' یعنی میں نے تجھ سے خیر طلب کی، تجھے بھلائی کا حکم دیا۔ 'امر' ان افعال میں سے ہے جو متعدی بدو مفعول ہوتے ہیں، پہلا مفعول براہ راست بغیر کسی حرف کے واسطے سے ہوتا ہے اور دوسرا مفعول بھی کبھی اسی طرح بغیر حرف کے واسطے سے ہوتا ہے اور کبھی کسی حرف جر کے واسطے سے بھی ہوتا ہے، دونوں صورتیں کسی شاعر کے اس شعر میں جمع ہیں:

امرتک الخیر فافعل ما امرت به　　　فقد ترکتک ذا مال و ذا حسب

(ترجمہ: میں نے تجھے بھلائی کا حکم دیا تو، تو کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تو میں نے تجھے ذی مال وحسب بنا کر چھوڑ دیا)

شاعر ذی فہم کے اس قول " امرتك الخير '' میں ایک وہم وگمان تھا کہ اس نے خود عمل کیا ہو لیکن انہوں نے یہ کہہ کر وہم کا ازالہ کر دیا " لكن ما ائتمرت به " (ائتمرت)، الائتمار' مصدر باب افتعال سے بمعنی فرمانبرداری کرنا، حکم قبول کرنا ہے۔ (به) یعنی ان تمام خیر اور بھلائی پر عمل نہیں کیا جو نصیحتیں کہ " فلا ترم بالمعاصی کسر شهوتها " سے " استغفر الله من قول بلا عمل " تک بیان کی جا چکی ہیں، یعنی (' به ' میں ضمیر اس خیر کی جانب راجع ہے) جو پہلے مذکور ہوئی)

اور " خير " سے جنس خیر بھی مراد لی جا سکتی ہے جو سب کو شامل ہو مذکور وغیر مذکور سب کو۔

" ما استقمت " کا " ما ائتمرت " پر عطف ہے، یہ 'الاستقامة مصدر باب استفعال سے ہے اور لفظ استقامت ، تمام انواع خیر کو جامع ہے جو ان اوامر ونواھی کے مقتضیات پر مداومت چاہتا ہے جس کو شریعت مستقیم اور نبی کریم

ﷺ لائے ہیں۔اسی وجہ سے جب اللہ سبحان وتعالیٰ کا یہ فرمان نبی کریم ﷺ کے لئے نازل ہوا۔ (فاستقم کما امرت) تو آپ ﷺ ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے آپ پرغم وحزن کا ساتھ ہوگیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں " مانزل علی رسول اللہ ﷺ من ھذہ الآیۃ حتی قال ماقال"

استقامت کا بیان

اسی وجہ سے ارباب سلوک کے نزدیک استقامت سب سے بلند درجہ اورسب سے ارفع مقام ہوتا ہے،اس کے ذریعہ کمال امور کو پہنچا جاتا اوراس کے وجود سے خیرات اوراس کے نظام کو حاصل کیا جاتا ہے،تو جو مستقیم اورراہ راست پرنہیں ہوااس کی اعمال میں ساری سعی وجہد ناکام وبرباد ہوگئی۔

علامہ میر ابوعلی جرجانی فرماتے ہیں" کن صاحب استقامۃ لا طالب کرامۃ" (صاحب استقامت بنو نہ کہ طالب کرامت)۔اوردوسرے لوگوں نے فرمایا" ذرۃ استقامۃ خیر من الف کرامۃ"(استقامت کاایک ذرہ ہزاروں کرامتوں سے افضل ہوتا ہے)۔اورکسی نے کہا "ما الکرامۃ الا الاستقامۃ" (کرامت صرف استقامت کا نام ہے)

(فما قولی لك استقم) یعنی اس لئے کہ سامع اس قول کااعتبار نہیں کرتا اوراس وقت تک اس کے مقتضیٰ پرعمل پیرانہیں ہوتا ہے جب تک کہ خود قائل اپنے قول پر مضبوطی کے ساتھ عامل نہ ہو، حدیث پاک میں وارد ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علی نبینا علیہ الصلوٰۃ و السلام) پروحی بھیجی کہ اے عیسیٰ ابن مریم پہلے اپنے نفس کونصیحت کرو،اگر وہ نصیحت قبول کرلے تب لوگوں کونصیحت کرواوراگر نہ قبول کرے،تو مجھ سے حیا کرو"

اللہ تبارک وتعالیٰ یہودیوں کے ان مذہبی پیشواؤں کی مذمت کرتا ہے جواپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا کرتے تھے، اپنے اس فرمان میں(اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم و انتم تتلون الکتٰب افلا تعقلون)

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شیخ کبیر کو امامت کے لئے آگے کیا گیا تو آپ نے فرمایا 'صفیں سیدھی کرو اور مستقیم ہو جاؤ' کہ اتنے میں ان پر غش طاری ہو گیا! پھر جب آپ ہوش میں آئے تو فرمایا 'آہ' مجھے کیا ہو گیا کہ میں لوگوں کو تو استقامت کا حکم دے رہا ہوں اور اپنے آپ کو بھول گیا، (العمدۃ ص ۱۸۹ سے ص ۱۹۵ تک)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

اب ہم اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے گزشتہ سے پیوستہ، فصل ثانی کے سولھویں شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۸) ولا تزودت قبل الموت نافلۃ　　　ولم اصلی سوی فرض ولم اصم

ترجمہ: اور نہ تو میں نے سفر موت سے پہلے نفلی عبادت کا زادِ راہ اکٹھا کیا اور نہ ہی فرائض و واجبات کے علاوہ نمازیں ادا کیں اور روزے رکھے۔

تشریح: " تزود " (زادِ راہ لینا) سے یہاں بطور تشبیہ عمل صالح کرنا مراد ہے۔ عمل کو زاد یعنی توشہ سے تشبیہ دینے کے لئے، تزود کا ذکر کر کے عمل مراد لیا، پھر استعارہ کو فعل میں جاری کر دیا اس طریقے سے کہ " عملت " کو " تزودت " سے تشبیہ دی اور تزودت کا استعارہ کر کے تشبیہ یعنی عملت مراد لیا۔ تو اس میں استعارہ تبعیہ تخیلیہ ہے اور عمل کو " تزود " سے تعبیر کرنے کا سبب یہ ہے کہ شاعر ذی فہم نے ملاحظہ کیا کہ موت ایک لمبا اور مشکلات و پریشانیوں سے پُر سفر ہے اور مصائب و آلام سے پُر ایسے سفر میں توشہ یعنی زادِ راہ رکھنا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔ (التزود) بمعنی اخذ زاد یعنی توشہ اور زادِ راہ لینے کے معنی میں ہے۔

شاعر ذی فہم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان کو مدنظر رکھتے ہوئے موت کو لمبے اور پُر مشقت سفر سے تشبیہ دی اور

اسی سفر کے لئے زادِراہ جمع نہ کرنے پر ناظم اسی فرمان الٰہی کی وجہ سے نادم ہوئے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (و تزودوا فان خير الزاد التقویٰ)

اور مفسرین کرام کا موقف ہے کہ یہاں ، 'تـــــزود' سے مراد اس زادِراہ کو جمع کرنا ہے جو انسان کو مطلوب تک پہنچادے، اور آیت پاک میں تقویٰ سے مراد وہ چیز ہے جس سے دست سوال دراز کرنے کی ذلت اور رسوائی سے بچا جاسکے۔یعنی وہ چیز جس سے انسان اپنے آپ کو ہاتھ پھیلانے کی رسوائی سے بچالے تو تقویٰ سے یہاں وہ ہی چیز مراد ہے مورد کی جانب نسبت کی وجہ سے اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نا کہ مورد اور سبب کے خصوص کا تو آیت کا مورد اور سبب خاص میں وارد ہونا اس کو مانع نہیں ہے کہ تقویٰ سے مانگنے کی رسوائی سے بچانے والی چیز مراد ہو۔اور تقویٰ سے مراد جو اس سے عام ہو یعنی اوامر کو ادا کرنا اور نواہی سے اجتناب یعنی اس سے بطور تشبیہ اوامر کو ادا کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا مراد ہے، جس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔

(نـافله) یعنی فرض نماز کے علاوہ میں نے کوئی نماز ادا نہ کی ،یعنی میں نے موت سے پہلے نوافل مستقلہ اکٹھا نہیں کیں ،تو یہاں 'نـافله' سے نوافل مستقلہ مراد ہیں نا کہ وہ عبادات زائدہ جو فرائض کے ضمن میں پائی جاتی ہیں کہ اس بنیاد پر کسی کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہوتا کہ نوافل جب فرائض کے ضمن میں پائی جاتی ہیں تو ناظم نے یہ کیوں اور کیسے فرمادیا" ولا تزودت قبل الموت نافلة" جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں " نافله " سے ضمنی نوافل مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے نوافل مستقلہ مراد ہیں اور مشہور ہے کہ نوافل ،فرائض کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔علامہ قرطبی کی تصنیف لطیف (التـــذكــره) میں امام شافعی سے وارد ہوا کہ نوافل ان فرائض کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں جو سہواً فوت ہوئے ہوں اور اگر عمداً فرائض کا ترک ہوا ہو تو نوافل ان کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے اگر چہ نفلی عبادت کثیر ہوں تب بھی وہ مجبر نقائص فرائض نہیں۔

شاعر ذی فہم نے نماز روزے کو مخصوص بالذکر کر کے یوں کہا" ولم اصل سوىٰ فرض ولم اصم "اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں محض عبادت بدنیہ ہیں اور ایمان کے متعلق سکوت فرمایا اس لئے کہ ایمان ان عبادات میں سے نہیں

جن کی نقل ہوسکتی ہو۔

دوسرمصرعے میں فعل کے اندر نفل کا ذکرنہیں کیا یعنی "لم اصم" سے نفل کو حذف کر دیا اور یوں تصریح نہیں کی گئی "ولم اصم سوىٰ فرض" یا" لم اصم نفلا" اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل اول میں تصریح فعل ثانی پر دلالت کر رہی ہے۔اسی وجہ سے اس پر اکتفا کیا۔

شاعر ذی فہم نے عُجب وریا سے بچنے کے لئے ،فرائض وواجبات کے علاوہ کی نفی کی اوراپنے نفس کو متہم کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے فرائض کے علاوہ کوئی نفلی عبادت نہیں کی۔

اور یہ کہہ کراعتراض کرنا کہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نفلی نماز ادا کرنے کے لئے پہلے اس کی نذر مانی ہواور پھرنماز ادا کی ہو،اوراسی طرح نفلی روزے نذر مان کرر کھے ہوں؟(ا) تو یہ انتہائی بعید ہے۔ان تمام اشعار کی خاصیت یہ ہے کہ اگرکسی شخص کے علم وعمل میں ریایا عجب داخل ہوگئی ہوتو اس کو چاہئے کہ ان اشعار کوطلوع فجر کے وقت لکھ لے اور اکہتر اے مرتبہ ان اشعار کا ورد کرے اور پھران لکھے ہوئے اشعار کواپنے بائیں بازو پر، پہلو کی طرف جھکا کر باندھ لے تو انشاءاللہ ایسا کرنے سے وہ متواضع اور عجب وریا سے مامون ہوجائے گا۔

حاشیہ: (ا)یدل لہ مااخرجہ احمد:۱۰۳/۴،ابوداؤد:۸۶۴،وابن ماجہ:۱۴۲۵،والدارمی:۱۳۲۹ والحاکم:۲۶۲/۱،والبیھقی: ۳۸۷/۲وغیرھم،عن ابی ہریرۃ وتمیم الدارمی من حدیث قدسی یقول فیہ اللہ تعالیٰ(اتموالعبدی فریضتہ من تطوعہ)

عند احمد:۴۲۹/۵،عن رجل من الانصار مرفوعا(لاینقص احدکم من صلاتہ شیئاالااتمھااللہ من سبحتہ)

قال الامام القاضی ابو زید الدبوسی: النوافل شرعت لجبر نقصان تمکن فی الفرض، لان العبد، و ان علت رتبتہ۔ لایخلو عن تقصیر!!(الخیر الباقی ۶۱۳)

☆☆☆☆☆☆

الفصل الثالث

فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ کی فصل ثالث کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے جو نبیٔ کریم ﷺ کی مدح وثنا پر مشتمل ہے،اس فصل کا پہلا شعر یہ ہے۔ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۲۹)ظلمت سنۃ من احیا الظلام الی ان اشتکت قدماہ الضر من ورم

(ترجمہ: میں نے ان کی سنت مبارکہ سے روگردانی اور ناانصافی کی جو کہ تاریک رات میں اتنی شب بیداری فرمایا کرتے تھے کہ ان کے قدمہائے مبارک متورم ہوجایا کرتے تھے(ان کے قدم شریف ورم کی سختی کی شکایت کرنے لگتے تھے)۔

ربط: شاعر ذی فہم جب فصل ثانی سے فارغ ہوگئے جس میں انہوں نے معرفت نفس کا ذکر کیا تھا کہ نفس برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے اوراس نے اعمال صالحہ کے ذریعے اس بوڑھے مہمان کی میزبانی کا انتظام بھی نہیں کیا جو بغیر حیا کئے ہوئے اس کے سر پراتر آیا اور نفس برے اعمال میں مشغول اوراس کی نگاہیں محارم کے مشاہدے سے پر ہے ،تو فصل ثانی میں شاعر ذی فہم نے اسی طرح آخر تک استغفار، ندامت ،نصیحت وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور پوری فصل اسی بیان پر مشتمل ہے۔اب یہاں سے ناظم فاہم نفس کا ذکر کر کے، نبی اکرم ﷺ کی مدح وثنا کی طرف منتقل ہوتے ہیں جو کہ وصول الی اللہ اور معرفت الٰہی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے،حدیث پاک میں وارد ہوا'' من عرف نفسہ فقد عرف ربہ''(جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو وہ اپنے رب کو پہچان لے گا)

ناظم شعر جب ان تمام چیزوں کا ذکر کر چکے تو انہوں نے گزشتہ تمہید کے بعد محسوس کیا کہ وہ اب نعت نبی علیہ السلام

لکھنے کے کچھ لائق ہو چکے ہیں۔تو کہتے ہیں:

ظلمت سنة من احيا الظلام الى ان اشتكت قدماه الضر من ورم

تشریح: (الظلم) شئی کو غیر محل میں رکھنے کو کہتے ہیں، اور اس کا ایک دوسرا معنی اور ہے وہ ہے 'کمی کرنا' نقص کرنا جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان میں ہے (ولا تظلمون فتيلا)

السنة)، دین میں مطلقا طریقۂ مسلوکہ کو کہتے ہیں، اس کا ایک معنی اور ہے وہ یہ کہ وہ قول وفعل جو نبی کریم ﷺ سے صادر ہوا ہو اور وہ نہ فرض ہو اور نہ ہی واجب۔تو " ظلمت سنة من احيىٰ الظلام " کا معنی ہوگا کہ میں نے نبئ اکرم ﷺ کی سنت کو غیر محل میں رکھ دیا۔ جب کہ مناسب یہ تھا کہ مجھے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتیں ادا کرنی چاہئے تھیں اور اس پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہئے تھا لیکن افسوس میں نے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتیں ادا نہ کیں تو گویا میں نے سنتوں پر عمل نہ کرکے، اس کو غیر محل میں رکھ دیا اور دوسرے معنی یعنی نقص و کمی کے معنی کی تقدیر پر مفہوم ہوگا کہ میں نے سنت کے اعمال میں کمی کی یعنی میں نے فرائض وواجبات کے علاوہ کچھ نفلی عبادت نہیں کی تو اس صورت میں یہ شعر ماقبل کی تاکید ہوگا (کہ میں نے ان کی سنت مبارکہ سے روگردانی اور ناانصافی کی جنھوں کہ تاریک رات میں شب بیداری فرمائی یہاں تک کہ آپ کے قدمہائے مبارک متورم ہوگئے)

" من احيىٰ الظلام " میں 'من' موصولہ سے حضور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ مراد ہے جن سے بطور تلطف اور بطور محبت اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (يآ يها المزمل ° قم الليل الا قليلا)

(احىٰ الظلام) یعنی آپ ﷺ نے تاریک رات کو شب بیداری کرکے روشن کیا اتنا کہ آپ ﷺ کے قدمہائے مبارک متورم ہوگئے اگرچہ آپ بارہ رکعات سے زیادہ قیام نہیں فرمایا کرتے تھے لیکن قیام اتنا طویل فرماتے کہ قدمہائے مبارک متورم ہوجاتے تھے۔جیسا کہ صحیح البخاری وغیرہ کتب حدیث میں آیا'' ولكنه ﷺ اطال القيام حتى اشتكت قدماه الضر من ورم"

(احىٰ) سے مراد ترک نوم، بے خوابی باللیل اور تاریک رات کو عبادت سے روشن کرنا ہے، اس لئے کہ عبادت

جس طرح عابد کے چہرے کو روشن کرتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا، " من کثرت صلاته باللیل حسن وجهه بالنهار " جو رات میں نمازوں کی کثرت کرتا ہے، اس کا چہرہ دن میں روشن ہوجاتا ہے" تو عبادت جس طرح عبادت گزار کے چہرے کو منور کرتی ہے اسی طرح اس زمانے کو بھی روشن کرتی ہے جس زمانے میں عبادت ادا کی جائے۔ (الظلام) سے رات مراد ہے لازم ذکر کر کے ملزوم مراد لیا گیا ہے (اس لئے کہ رات کا لازم تاریکی ہے) تو "ظلام " سے تاریک رات مراد ہے اور یہاں استعارہ تصریحیہ تبعیہ اور استعارہ مکنیہ ہے، استعارہ تصریحیہ تبعیہ تو ان کے قول " احییٰ " میں ہے، اس لئے کہ ناظم شعر نے سیر و بے خوابی اور قیام باللیل اور رات کے منور کرنے کو عبادت سے تشبیہ دی ہے۔ (الضر) بمعنیٰ شدت حال (سختی) (الورم) کہتے ہیں اتنی زیادہ سوجن کو جو حد طبیعی سے متجاوز ہوجائے۔ (من ورم) کے متعلق وجہ اعراب بیان کی جا چکی ہے لیکن پھر بھی اس کا اعادہ کرا دینے میں کوئی حرج نہیں (من ورم) یا تو ظرف لغو ہے جو " اشتکت " کے متعلق ہے یا پھر وہ " الضو " سے بدل ہے تو اس تقدیر پر وہ موضع نصب میں " الضو " کا بدل ہوگا اور " الضو " مبدل منہ، یا وہ " الضو " کی صفت ہے اور " کائن " محذوف سے متعلق ہے یا پھر وہ " الضو " سے حال واقع ہے اور " کائنا " محذوف سے متعلق ہے۔ (من ورم) میں " من " حرف جر، سببیہ ہے جو "اشتکت " کے متعلق ہوسکتا ہے، یعنی ان کے قدمہائے مبارک سختی کا شکایت کرنے لگتے تھے، " ورم " کے سبب اور گزر چکا کہ " الضو "منصوب بنزع الخافض ہے اس کی تقدیر یوں ہوگی " اشتکت من الضو " اور وہ اللہ کے حبیب سیدنا محمد ﷺ ہیں جو پوری رات اپنے رب کی عبادت میں قیام فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کے قدم شریف متورم ہوجایا کرتے تھے، اسی موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب سے فرمایا تھا ﴿ ما انزلنا علیك القرآن لتشقیٰ ﴾ اور (طه) کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محبوب اپنا پیر زمین پر رکھ دو کیوں کہ آقا علیہ السلام اس آیت کے نزول سے پہلے اپنے ایک قدم شریف پر قیام فرماتے تھے اور اتنی دیر تک قیام فرماتے کہ قدم مبارک سوج جاتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے (طه) فرما کر اپنے حبیب سے خطاب کیا اور اپنے حبیب کو خبر دی کہ اے حبیب ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نہیں

اتارا کہ تم مشقت اور پریشانی اٹھاؤ، بے شک ہم نے تمہارے سبب تمہارے اگلے پچھلوں کی خطائیں معاف فرمادیں۔

اور عالم یہ تھا کہ حبیب اللہ ﷺ اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں خوب تضرع فرماتے اور جب صحابہ آپ سے اس سلسلے میں بات کرتے تو آپ فرماتے (افلا اکون عبدا شکورا) ''تو کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں'' اور یہ اس لئے تھا تا کہ دیکھنے والے جان لیں کہ حق عبودیت کیسے ادا کیا جائے اور تا کہ امت کو طریقۂ عبادت کی رہنمائی ہوتا کہ وہ گزشتہ قوموں کی طرح برباد نہ ہو جائیں اور تا کہ گمراہ کی اتباع نہ کر بیٹھیں فاسق ہو یا کافر۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

فصل ثالث کے دوسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۰) وشد من سغب احشائه وطوی　　　تحت الحجارة کشحا مترف الادم

ترجمہ: (میں نے ان کی سنتوں کو ترک کیا جنہوں نے تاریک رات کو عبادتوں سے روشن کیا) اور جنہوں نے بھوک کی وجہ سے اپنے شکم مبارک کو باندھا اور اپنے نرم و نازک کمر پر پتھر کسے۔

تشریح: (وشد) میں 'واو' عاطفہ ہے اور "شد" بمعنی ربط وعقد (باندھنا) ہے (من) سببیہ ہے۔ (سغب) بفتحتین بمعنی جوع (بھوک) (احشائه) "حشا" کی جمع ہے اور "حشا" کہتے ہیں جس پر آنت تلی، جگر کلیجہ وغیرہ کا اندرونی حصہ لپٹا ہو یعنی پیٹ کے اندر کی چیزیں۔ "احشائه" کی ضمیر ''اسم موصول 'من' کی جانب راجع ہے (جس کا گزشتہ شعر میں ذکر تھا یعنی ظلمت سنة من) میں

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی بھی انسان کے اندر دو دل ہی پیدا نہیں فرمائے تو ناظم

"حشـا" کوجمع کیوں لائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ناظم شعراس لفظ کو تعظیم وتکریم کے لئے جمع لائے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے (فـنـعـم الـمـاهـدون) تو یہ مجاز اور استعارہ ہے کہ پہلے آقاعلیہ ﷺ کے قلب مبارک کو مہتم بالشان ہونے میں بہت سارے قلوب سے تشبیہ دی پھر قلوب کثیرہ آپ کے قلب مبارک کے لئے استعارہ کیا گیا۔ تو قلوب کا ذکر کر کے، قلب مبارک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد لیا گیا ہے۔

(وطویٰ) میں 'واو' عاطفہ ہے" طویٰ" بمعنی لپٹنا،" الطی "مصدر سے"نشر" کی ضد ہے (تـحـت الحجارۃ) یہ" طویٰ" کا ظرف ہے، وضع کے معنی کی تضمین سے۔" الحجارۃ" یعنی وہ پتھر جس کو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے شکم مبارک پر باندھا تھا۔ (کشحا) اس حصہ اعضاء کو کہتے ہیں جو پہلو اور پہلو کی نچلی پسلی کے درمیان ہوتا ہے۔

(متــرف)" الکشح" سے حال واقع ہے، یہ 'الاتــراف' مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بمعنی نرم ونازک (الادم) بفتحتین 'ادیم' کی جمع ہے بمعنی جلد۔ 'مترف' کی اضافت 'الادم' کی طرف "اضــافة الـصفة الى موصوفها" کی قبیل سے ہے یعنی اس کا معنی ہے نرم ونازک جلد۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ شکم پر پتھر باندھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آنتیں، معدے سے مل جاتی ہیں اور حرارت کچھ کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بھوک کا زیادہ احساس نہیں ہوتا، اس لئے کہ معدہ جب کھانے سے بھرا ہوا ہوتا تو حرارت اس کو ہضم کرتی رہتی ہے لیکن معدہ جب کھانے سے خالی ہوتا ہے تو اس وقت حرارت رطوبت جسم کو چاہتی ہے جس کی وجہ سے انسان بے چین رہتا ہے مگر پتھر باندھ دینے سے وہ حرارت زیادہ ہو جاتی ہے اور انسان کی کچھ تکلیف اور بھوک کم ہو جاتی ہے۔

شکم مبارک پر پتھر باندھنے کے متعلق روایات

امام مسلم 'شد' کے بارے میں روایت کرتے ہیں 'عـن انــس قــال جـئـت رسـول الـلـه ﷺ یومافوجدته جالسا مع اصحابه یحدثهم و قد عصب بطنه بعصابة فقالوا من الجوع"

ترجمہ۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں آقائے دوعالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اوران سے گفتگو فرمارہے ہیں اور آپ ﷺ نے اپنے بطن مبارک کوکسی کپڑے سے باندھ رکھا ہے! صحابہ نے بتایا کہ بھوک کی وجہ سے ایسا کرر کھا تھا) اس کو باندھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پتھر کی برودت، پیٹ کی اندرونی حرارت کو کچھ کم کر دیتی ہے۔

مزید امام بخاری نے بھی اس بارے میں روایت کیا ” عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه انه قال انا یوم الخندق نحفر، فعرضت كدية شديدة، فجاو ءا النبی ﷺ فقالوا هذه كدية عرضت فی الخندق فقال انا نازل، ثم قام و بطنه معصوب بحجر ولبثنا ثلاثة ايام لا نذوق ذواقا، فاخذ النبی ﷺ المعول، فضرب، فعاد كثيبا اهيل او اهيم، فقلت يا رسول الله ائذن لی الی البيت ، فقلت لا مراتی رايت بالنبی ﷺ شيئا، ماكان فی ذالک صبر، فعندك شی ء؟ قالت عندی شعير وعناق، فذبحت العناق و طحنت الشعير، حتی جعلنا اللحم فی البرمة، ثم جئت النبی ﷺ و العجين قد انكسر و البرمة بين الاثا فی قد كادت ان تنضج، فقلت طعيم لی، فقم انت يا رسول الله و رجل و رجلان قال كم هو؟ فذكرت له ،قال كثير طيب، قال قل لها لا تنزع البرمة، ولا الخبز من التنور حتی آتی، فقال قوموا ۔ فقام المهاجرون و الانصار، فلما دخل علی امراته، قال و يحک ُ جاء النبی ﷺ بالمهاجرين والانصار ومن معهم قالت: هل سألک؟ قلت نعم فقال ادخلوا ولا تضاغطوا، فجعل يكسر الخبز و يجعل عليه اللحم و يخمر البرمة والتنور اذا اخذ منه، و يقرب الی اصحابه ثم ينزع، فلم يزل يكسر الخبز و يغرف حتی شبعوا و بقی بقية قال كلی هذا و اهدی، فان الناس

اصابتهم مجاعة"

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر ہم خندق کھود رہے تھے کہ سخت چٹان آ گئی تو تمام صحابۂ کرام نے نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور خندق میں یہ سخت چٹان سامنے آ گئی ہے آقا ﷺ نے فرمایا میں آ رہا ہوں پھر آقا ﷺ کھڑے ہوئے اور آپ کے بطن مبارک پر اس وقت پتھر بندھا ہوا تھا اور حال یہ تھا کہ ہم لوگ تین دن سے یہیں مشغول اور مقیم تھے اور ہم نے تین دن سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے کدال لے کر جو اس پر ضرب لگائی تو وہ سخت چٹان ڈھیر لگی ہوئی یا جمع شدہ ریت میں بدل گئی۔ (حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا حضور! مجھے گھر جانے کی اجازت عطا فرمائیں، تو میں نے (گھر آ کر) اپنی زوجہ سے کہا کہ میں نے نبیٔ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک ایسی چیز دیکھی جس میں صبر نہیں ہے تو کیا تمہارے پاس گھر میں کچھ ہے؟ اس نے بتایا کہ میرے پاس کچھ جَو ہے اور بکری کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے تو میں نے اس بکری کے بچے کو ذبح کیا اور جَو پیسا یہاں تک کہ ہم نے گوشت کو ہانڈی میں ڈال دیا پھر میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں اس وقت گیا تھا جب گندھا ہوا آٹا نرم ہو چکا تھا اور ہانڈی، چولہے پر چڑھ چکی تھی کہ بس پکنے ہی جا رہی تھی تو میں نے حضور کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضور! میرے یہاں تھوڑا کھانا ہے، آپ تشریف لے چلیں اور اپنے ساتھ ایک دو آدمیوں کو لے لیں، سرکار نے دریافت فرمایا کہ کتنا کھانا ہے؟ میں نے بتایا اتنا ہے تو اس پر حضور نے فرمایا بہت زیادہ ہے اور فرمایا کہ اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ جب تک میں آ نہ جاؤں ہانڈی اور روٹی کو تنور میں نہ چڑھائے اور پھر سرکار ﷺ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ سب کھڑے ہو جائیں تو سب مہاجرین اور انصار کھڑے ہو گئے، تو جب وہ (حضرت جابر) اپنی اہلیہ کے پاس آئے تو ان سے کہا ہائے اللہ رحم کرے، نبی اکرم ﷺ انصار و مہاجرین اور جو ان کے ساتھ تھے سب کے ساتھ تشریف لے آئے ہیں (میری اہلیہ) نے کہا کہ کیا آقا نے آپ سے پوچھا تھا؟ میں نے کہا ہاں، پھر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کھانا ڈالو اور بالکل تنگی اور کمی نہ کرنا، پھر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روٹی توڑنا شروع کی اور اس پر گوشت

ڈالنے لگےاور جب ہانڈی اور تنور سے نکالتے تو اسے ڈھک دیتے،اور اپنے اصحاب سے قریب ہوتے پھر اسے نکالتے تو حضور اسی طرح روٹی توڑتے رہےاور دیتے رہے یہاں تک کہ سب شکم سیر ہوگئے اور کچھ بچ بھی گیا، سرکار نے فرمایا اس کو کھاؤ اور ہدیہ کرو اس لئے کہ لوگ بھوکے ہیں ((رقم الحدیث ۴۱۰۱))

ایک اعتراض اور اس کا جواب

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ شکم مبارک پر بھوک کی وجہ سے پتھر باندھنے والی بات خود حضور ہی کے فرمان سے مشتبہ ہوجاتی ہے جو فرمایا آقا نے کہ " ابیت عند ربی یطعمنی و یسقینی "کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں رات بسر کرتا ہوں۔ میر راب مجھے کھلاتا پلاتا ہے) اس لئے کہ جس کا یہ حال ہو کہ اس کا رب اسے کھلاتا پلاتا ہو، وہ اپنے شکم مبارک پر بھوک کی وجہ سے کیوں پتھر باندھے گا اور کیوں کر اپنی پسلیوں اور آنتوں کو پتھر کے نیچے کسے گا؟

جواب:۔ حدیث پاک کا معنی یہ ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میں اپنے رب کے جلال کا مشاہدہ کررہا ہوتا ہوں اور میں اپنے رب کے جلال کے سامنے حاضر ہوتا ہوں) تو میرا رب مجھے کھانے اور پینے والوں کی طاقت وقوت عطا فرماتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لئے آپ کے بدن مبارک کی قوت اور آپ کے جسم منور کی نرم و نازکی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جمع فرمادیا ہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا دیدار کرنے والا کوئی بھی شخص آپ کو بھوکا پیاسا نہیں گمان کرسکتا، جیسا کہ اس طرف خود ناظم شعر نے یوں اشارہ کیا ہے" مترف الادم" تو یہ احتراس' کی قبیل سے ہے، تو کھلانے پلانے والی حدیث پاک، آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھوک لگنے کے منافی نہیں ہے (ص ۱۱،۲۰)

صحیح البخاری سے جس قصۂ مبارک کو ہم نے نقل کیا، اس سے قارئین کرام پر خوب واضح ہوگیا ہوگا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمارے آقا کی ذات مبارکہ کو تمام بشر میں طاقت وقوت کے اعتبار سے بھی ممتاز فرمایا ہے اور قارئین پر علامہ باجوری کے بیان کردہ افادے کا صدق بھی روشن ہوگیا ہوگا جس کو ہم نے ماسبق میں نقل کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے آپ کے جسم مبارک اور بدن شریف کی طاقت وقوت اور سرسبز و شادابی کو

جمع فرما دیا ہے کہ جو بھی آپ ﷺ کو دیکھتا وہ ہرگز آپ کو بھوکا پیاسا گمان نہیں کرتا۔
اور گزر چکا کہ یہ اکثر اوقات پر محمول ہے اور اس بنیاد پر کہ آپ کا حال اکثر لوگوں سے پوشیدہ رہتا ہے تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ بعض لوگ، بعض اوقات میں آپ کے حال پر مطلع ہوں، تو اس بنیاد پر آپ ﷺ اس پر بھی قادر ہیں جس کو تمام بشر نہیں کر سکتے ہوں اور آپ ظاہر کے اعتبار سے تو بشر ہیں لیکن حقیقت میں نوری فرشتے بلکہ فرشتوں سے بھی افضل واعلیٰ ہیں۔

بطور اشارۃ النص مذکورہ حدیث سے اور دیگر معانی کا ثبوت

اس حدیث شریف میں خلق ایثار کی جلوہ گری ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے پہلے خود نہ تناول فرمایا بلکہ صحابۂ کرام کو کھانا کھانے کا پہلے موقع عطا فرمایا اور مزید یہ کہ اس حدیث پاک میں آپ ﷺ کا اپنے صحابہ کو پہلے کھلا کر ان کا اکرام کرنا ہے اور تواضع فرمانا ہے اور آپ کا صحابہ کی اور ان روٹی پکانے والی خاتون کی معاونت فرمانا ہے اور صالحین کے آثار سے تبرک وتوسل کی شریعت دینا ہے اس طرح کہ آپ ﷺ نے اپنا لعاب دہن ہانڈی اور آٹے میں ملا دیا، اور مزید روایت کی جاتی ہے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام جب وضو فرماتے تو صحابہ کرام آپ کے وضو کا پانی لینے میں ایک دوسرے سے سبقت کرتے اور حضور سے پانی کے جو قطرے گرتے اسے لے کر اپنے چہروں پر مل لیا کرتے تھے اور جن کو آقا کے وضو کا پانی نصیب نہیں ہوتا تو وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں کی تری کو لے لیتا۔
اور مزید روایت کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" تربة ارضنا بريقة بعضنا تشفى سقيمنا باذن ربنا" (ہمارے زمین کی مٹی، ہم نبیوں میں سے بعض کے تھوک سے ہے جس سے ہم میں کا بیمار، ہمارے رب کے اذن سے شفایاب ہوتا ہے)۔ اور یہی حدیث پاک اس بات کی دلیل ہے کہ تمام صحابۂ کرام کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام بلاؤں کو دفع فرمانے والے، ملجاء وماوا، سختیوں میں جائے پناہ اور شدت احوال میں سے مضبوط سہارا ہیں اور یہی تمام اہلسنت وجماعت کا صحابہ سے لے کر اب تک متوارث عقیدہ ہے، اس موضوع پر میرے جد کریم، فرید الدہر امام احمد رضا نے ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس کا نام آپ نے " الامن

والعلی لناعتی المصطفیٰ بدافع البلاء" رکھا ہے۔
تو جیسے یہ قصہ حضور کے قوت باہرہ اور آپ کے عظیم معجزے پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نے سخت چٹان جو خندق میں کھودنے کے دوران آ گئی تھی اس کو پاش پاش فرما دیا اور کم کھانے کو زیادہ فرما دیا، اسی طرح یہ قصہ صحابہ کرام کے حسن بلا اور شدت احوال میں ثابت قدم رہنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور اس مشقت کے موقعہ پر صحابہ کے استقامت پر دلیل ہے۔ (اور بڑی مشہور بات ہے کہ) الاستقامة فوق الکرامة' اور یہ ایسی کرامت ہے جس کے بعد کوئی کرامت نہیں اور یہ ساری کرامت صحابۂ کرام کو سرکار کی صحبت سے نصیب ہوئی۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے تیسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۱) ورا و دتہ الجبال الشم من ذھب عن نفسہ فارھا ایما شمم

(ترجمہ:۔ اونچے اونچے بلند پہاڑوں نے سونا بن کر، آپ ﷺ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانا چاہا اور خود کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا لیکن آپ ﷺ نے اس سے استغنا کا اظہار فرمایا اور اس سے اعراض کیا)

ربط: جب ناظم شعر کے اس قول " شد من سغب " میں ایک وہم پیدا ہوا یعنی شکم مبارک پر پتھر باندھنے والی بات پر کسی بھی شخص کے ذہن میں یہ گمان گزر سکتا تھا کہ شاید آپ ﷺ نے فقیری اور مفلسی کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے تھے، تو شاعر ذی فہم نے گزشتہ شعر سے پیدا ہونے والے اس وہم کو اس شعر سے دفع فرمایا ہے فرماتے ہیں:

ورا ودتہ الجبال الشم من ذھب عن نفسہ فارھا ایما شمم

تشریح: " المراودة' مصدر سے بمعنیٰ مطالبہ کرنا، چاہنا۔ (راودتہ) یعنی پہاڑوں نے چاہا ان سے" اور '

مراودۃ 'یعنی چاہنے کی اسناد' جبال ' کی طرف مجازی ہے اس لئے کہ فاعل حقیقی تو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے، اس نے تو آپ ﷺ کو اس میں اختیار دیا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو یہ پہاڑ سونے کے ہو جائیں اور یہ اسناد حقیقی بھی ہوسکتی ہے اس لئے کہ کوئی چیز بھی اس بات میں مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو قوت ادراک عطا فرمادی ہو اور ان میں شعور پیدا فرمادیا ہو تو ان پہاڑوں نے حقیقتاً حضور سے ارادہ ظاہر کیا ہو۔ ' الجبال ' میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد یہاں مکہ مکرمہ کے پہاڑ ہیں۔

اس شعر کی دلیل یہ حدیث صحیح ہے نبیٔ اکرم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا " عرض علی ربی بطحاء مكة ذهبا فقلت لا يارب و لكن اجوع يوما و اشبع يوما فاذا شبعت حمدتك و اذا جعت تضرعت اليك و دعوتك "

ترجمہ:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ پر مکہ کے پہاڑوں کو سونا کر کے پیش کیا تو میں نے عرض کیا نہیں اے میرے رب بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن شکم سیر رہوں تو جب سیر ہوں تو تیری حمد بجالاؤں اور جب بھوکا ہوں تو تیری بارگاہ میں گڑگڑاؤں اور تجھ سے دعا کروں) گزشتہ اوراق میں اس کے مثل بیان کیا جاچکا ہے۔

مزید روایت کی جاتی ہے کہ سیدنا جبرئیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر فرماتے ہیں " ان الله يقرئك السلام ويقول لك اتحب ان تكون هذه الجبال ذهبا وفضة تكون معك حيثما كنت فاطرق ساعة ثم قال يا جبرئيل ان الدنيا دارمن لا دارله ومال من لا مال له يجمعها من لا عقل له، فقال له جبرئيل ثبتك الله بالقول الثابت "

یعنی بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو سلام پیش فرمایا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ آپ کے لئے یہ پہاڑ سونے اور چاندی کے ہو جائیں اور آپ کے ساتھ رہیں جہاں آپ رہیں تو حضور نے تھوڑی دیر تک اپنا سر مبارک جھکایا پھر فرمایا کہ اے جبرئیل بلاشبہ دنیا ایک اس کا گھر ہے جو بے گھر ہے اور اس کا مال ہے جو

بے مال ہے اس کو نہیں جمع کرے گا مگر وہ جو بے عقل ہے۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے لئے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قول ثابت پر ثابت قدم فرمائے۔ (الشم) 'شمم' سے اونچا اور بلند ہونے کے معنی میں ہے اور " اشم " کی جمع ہے۔

(من ذهب) اس کا معنی یہ ہے کہ پہاڑوں نے چاہا کہ وہ آپ کے خاطر سونے کے ہو جائیں تو " من ذهب " یہ 'تكون' " محذوف کی 'خبر' ہے اور اس سے حال واقع نہیں ہے، بعض کے موقف کے برخلاف، اس لئے کہ پہاڑ وہ ارادہ کرنے کے وقت سونے کے نہیں تھے بلکہ وہ تو حضور سے گزارش اور عرض کر رہے تھے کہ وہ سونے کے ہو جائیں۔ یہی علامہ باجوری کا قول ہے۔

(عن نفسه) یعنی آپ ﷺ کے خاطر اور آپ کی وجہ سے، تو اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں 'عن' افادہ تعلیل کے لئے ہے۔ (فاراها ايما شمم) یعنی حضور نے اس سے اعراض اور روگردانی ظاہر فرمائی اور سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اس لئے کہ اللہ کے یہاں اس میں کوئی خیر و بقا نہیں ہے۔

شیخ زادہ نے " من ذهب " قول کے اعراب کے متعلق دو اور وجہیں اختیار فرمائی ہیں جو علامہ باجوری نے نہیں اختیار کیں۔ اور مزید انہوں نے " ايما شمم " قول کے متعلق وہ افادہ کیا۔ جس کو علامہ باجوری نے نہیں لیا! تو اتمام نفع کے لئے یہاں پر اس کو بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شیخ زادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، کہ (من ذهب) حال ہے یا صفت یعنی یا تو " كائنة " ہے یا " الكائنة منه " ہے اور " ايما " میں " ما " صلہ ہے جو تاکید کے لئے لایا گیا ہے اور " اى " موصوف کی صفت ہے جو " اراها " فعل کا مفعول ثانی ہے یعنی شمما ای شمم یعنی اتنی بلندی جس کی حقیقت کو نہیں پہنچا جا سکتا اور جس کی قدر و منزلت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا:

رأى زينة الدنيا التى هى للفنا　　　و امسى الى دار البقا يتجهز

(حضور اکرم ﷺ نے دنیا کی زیب و زینت جو کہ فانی ہے، کہ بنظر حقارت دیکھا اور آپ ہمیشہ دار بقا کی تیاری کرتے رہے)

زخارف دنيانا لا حمد لم ترق　　　ولا كان من شىء بها يتحيز

(ہماری دنیا کی زینت اور اس کا ساز و سامان احمد مختار علیہ السلام کو تعجب میں نہ ڈال سکا اور حضور نے دنیا کی کسی بھی

شئی کا قصدوارادہ نہ فرمایا)

زهادته فيها وقد عرضت له   دليل بان القلب للحق مبرز

(دنیا و مافیھا سے حضور کی بے رغبتی اور وہ سونا چاندی جو آپ پر پیش کیا گیا سے آپ کا اعراض فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا قلب شریف شہودحق سے روشن ہے)

زيوفا رأى كل النقود التى بها   و من مثله فى نقد دنيا مميز

(وہ تمام نقود جو دنیا کے نقد میں ممتاز اور سب میں بہتر ہوتے ہیں، ان کو آپ نے کھوٹا جانا اور بے کار سمجھا) (من شیخ زادہ)

قلت: شاید اعراب کے متعلق جو وجہ علامہ باجوری نے ترک فرمادی اور جس وجہ کوانہوں نے دلیل سے باطل کردیا وہ میرے حساب سے زیادہ قوی دلیل ہے، اس لئے کہ اس بات میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ پہاڑوں کوسونا کر کے حضور کے سامنے پیش کیا گیا ہواور پھر آپ کواس میں اختیار دیا گیا ہواس بات کی تائید دوسری حدیث بھی کرتی ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا مجھ پر مکہ کے پہاڑ سونا کر کے پیش کئے گئے اور مزید یہ کہ جب کلام درست ہوتو فعل کو مع ضمیر حذف کر کے قول کی طرف منتقل نہیں ہوا جاتا ہے۔

(شیخ زادہ کے کلام کے مشکل الفاظ کی حل لغات کی جارہی ھے) :

(یتجهز) یہ تجهز الامر سے بمعنی تیاری کرنا، سامان مہیا کرنا ہے۔ (زخارف) جمع ہے "الزخرف" کی بمعنی سونا اور زینت شئی کا کمال حسن، کہا جاتا ہے "زخرف الارض" زمین کے سبزی کا رنگ "زخرف القول" جھوٹ سے آراستہ کی ہوئی گفتگو (لم ترق)، راق روقا سے صاف ہونا، فضیلت وخوبی میں بڑھ جانا اور تعجب میں ڈالنا کے معنی میں ہے۔ (یتحیز) 'الرجل' بمعنی قیام کا ارادہ کرنا پھر دیر کرنا (لم ترق) "راق روقاً" سے بمعنیٰ صاف ہونا، فضیلت وخوبی میں بڑھ جانا اور تعجب میں ڈالنا۔ (تتحیز) بمعنیٰ ایک ہی جگہ میں منحصر کرنا یعنی قیام کا ارادہ کرنا پھر قیام کرنے میں دیر کرنا" یتحیز الیهم" بمعنیٰ ملاپ کرنا اور سب کا رائے میں متفق ہونا (زهارة) بمعنیٰ کسی چیز سے بے رغبت ہونا، سب سے کم کفایت کو لینا (جس کا حلال ہونا متیقن ہو

اس میں آسانی سے راضی ہونا، اللہ تعالیٰ کے لئے زائد کو ترک کرنا، (مبرز) 'ابرز' سے بمعنیٰ سفر کا عزم کرنا' ابرز الشئی' بمعنیٰ ظاہر کرنا،' ابرز الکتاب' بمعنیٰ شائع کرنا،" ابرز یبرز ابرازا فھو مبرز و مبروز" (زیوفا) جمع ہے" زیف" کی اور یہ مصدر ہے، اس سے صفت بیان کی جاتی ہے کہا جاتا ہے" درھم زیف" کھوٹا درھم اور بمعنیٰ چھجہ جو بارش وغیرہ سے دیوار کی حفاظت کرتا ہے، اور بمعنیٰ سیڑھی کے پائے (قلعہ یا دوسری عالیشان عمارتوں میں طاقچے)، اس کی جمع زیوف، ازیاف، زیاف آتی ہے، کہا جاتا ہے" زافت النقود زیفا وزیوفا و زیوفۃ" بمعنیٰ نقد میں خرابی ظاہر ہوئی، نقد کھوٹا ہے، تو یہ اشعار اور خاص طور پر شاعر کا یہ قول' زھادتہ فیھا و قد عرضت لہ" مزید شارح کا متضافی ہے، تو اللہ کی مدد سے اس کی مختصر شرح کر دینا مناسب ہے، فنقول: " زھادتہ فیھا" کا مطلب، آپ ﷺ کا دنیا و مافیھا سے بے رغبت ہونا، دنیا سے دور ہونا اور اس کے تھوڑے پر راضی ہونا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا قلب مبارک دنیا میں نہ مشتغل ہے اور نہ ہی اس سے متعلق ہے اور نہ اس کے ظاہر سے دھوکہ کھانے والا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ کا قلب شریف حقیقت پر مطلع ہے اور شہود حق میں مشغول ہے اور آپ کے قلب مبارک پر اشیاء کے حقائق کو ظاہر فرما دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے آپ کا قلب مبارک مشاہدۂ حق سے غافل نہیں ہوتا ہے، آپ کا شہود حق، ہمیشہ شہود خلق پر مقدم ہے تو آپ ﷺ خود بزبان حال فرماتے ہیں کہ میں ہر شئی سے پہلے اپنے رب کا دیدار کرتا ہوں (یعنی میں کسی بھی شئی کو دیکھنے سے پہلے اپنے رب کو دیکھتا ہوں لیکن آپ ﷺ کے علاوہ جو اہل کمال ہیں وہ وسائل کے ذریعے، مقصود کی طرف ترقی کرتے ہیں تو وہ شہود میں آپ کے مرتبے سے نیچے ہیں اور آپ ﷺ کے علاوہ اہل کمال جو یہ کہتے ہیں کہ ''میں ہر شئی کے بعد اللہ کو دیکھتا ہوں'' تو وہ اپنے منصب کی خبر دیتے ہیں۔ لہذا حضور اکرم ﷺ " مار أیت شیئا الا و رأیت اللہ قبلہ" کے منصب پر ہیں یعنی حضور ہر شئی کو دیکھنے سے پہلے رب کا دیدار کر لیتے ہیں اور حضور کے علاوہ باقی اہل کمال "مار أیت شیئا الا ورأیت اللہ بعدہ" کے منصب پر ہیں کہ وہ ہر شئی کو دیکھنے کے بعد دیدار الٰہی کرتے ہیں۔)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے چوتھے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۲)واکدت زھدہٗ فیھا ضرورتہ ان الضرورۃ لا تعدو علی العصم

ترجمہ:۔ آپ ﷺ کی ضرورتوں اور حاجتوں نے مزید دنیا ومافیھا میں آپ کے زہد اور بے رغبتی کو مؤکد اور مضبوط کیا بے شک ضرورت، عصمت اور معصومیت پر تجاوز نہیں کرسکتی)

ربط: اس شعر میں یہ مفہوم اس وہم کو دفع کرنے کے لئے لایا گیا ہے جو کسی آدمی کے ذہن میں گزر سکتا تھا کہ آپ ﷺ کا وہ زہد و ریاضت جس کو گزشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک امر مدخول فیہ ہے تو معترض یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ شاید آپ ﷺ کی ضرورت اور احتیاج ذکر کردہ امور میں مانع ہو، تو اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ناظم شعر اس مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں" اکدت زھدہٗ فیھا ضرورتہ۔اھ

تشریح: (اکدت)" التاکید" مصدر سے فعل ماضی ہے۔ اور تاکید کا معنی ثابت کرنا اور مضبوط کرنا ہے۔ اور 'زھد' و 'زھادۃ' ایک ہی معنی میں ہے، جس کا معنی ماسبق میں گزر چکا ہے اور ذکر کردہ معنی کی امر واحد کی طرف تاویل کی جاتی ہے اور وہ معنی ترك الشئی اور قلۃ الرغبۃ ہے۔ (فیھا) میں ضمیر یا تو 'جبال' کی ہے یا پھر وہ ضمیر مقام ومناسبت کے دلالت کرنے کی وجہ سے 'دنیـــا' کی ہے بہرحال اولیٰ یہ ہے کہ ضمیر کو جبال سونے کے پہاڑ) کی طرف لوٹایا جائے (جس کا ذکر گزشتہ شعر میں ہے) یہاں" ضـــرورۃ" سے مراد سخت حاجت ہے۔ (ضرورتہ) یہ 'اکدت فعل کا فاعل ہے اور یہ جملہ مستأنفہ از سرنو بیان کرنے کے لئے ہے، گویا سائل کہہ رہا ہے کہ حضور ﷺ کی جب ضرورت اور حاجت بڑھ جاتی ہوگی تب حضور کیسے دنیا سے اعراض فرماتے ہوں گے؟ تو اس کا جواب یوں دیا جارہا ہے" ان الضرورۃ لا تعدو علی العصم" یعنی ضرورت، عصمت پر نہیں بڑھ سکتی

ہے، 'تعدو' بمعنیٰ 'تتعدی' جب کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے اور کسی پر غالب آ جاتا ہے، اس وقت کہا جاتا ہے (عدا علیه) بمعنیٰ " ظلمه وغلب علیه" (العصم) یہ 'عصمة' کی جمع ہے اور 'عصمة' مصدر ہے اسی وجہ سے جائز ہے کہ اس مصدر سے اسم مفعول مراد ہو۔ تو اس بنیاد پر " العصم " سے 'المعصومون' یعنی انبیاء ومرسلین مراد ہو سکتے ہیں۔

علامہ باجوری یہاں اس موقع پر حذف مضاف کا دعویٰ کرتے ہیں اس اعتبار سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ معنیٰ (جو اوپر بیان کیا گیا ہے) اس صورت میں ہو سکتا ہے ہے کہ جب 'العصم' کو بکسر عین اور بفتح صاد پڑھا جائے جیسا کہ مشہور ہے، اس بنیاد پر کہ وہ 'عصمة' کی جمع ہے لیکن اگر 'العصم' بفتح عین اور بکسر صاد پڑھا جائے، اس بنیاد پر کہ اس کی اصل 'عصیم' بمعنیٰ معصوم ہے، 'یا' کو ضرورةً حذف کر دیا گیا تو کلام میں کوئی حذف نہیں ہوگا (باجوری ص ٢١)

لیکن جو وجہ ہم نے پہلے بیان کی ہے جس کو شیخ زادہ اور علامہ خرپوتی نے بھی بیان فرمایا وہ زیادہ قوی ہے ممکن ہے کہ کہا جائے مصدر کا حمل اور اس کا اطلاق، مبالغے کے طور پر ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "زید عدل" میں مبالغہ ہے تو اس بنیاد پر کوئی حذف نہیں ہوگا اور مصدر میں تاویل کے ارتکاب کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی اور نا ہی ایک کلمۂ غریبہ 'عصیم' (بحذف الیاء ضرورةً) کا ادعا کرنا پڑے گا۔

بہر حال معنیٰ یہ ہے کہ وہ نبی جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام بشر پر فضیلت بخشی ہو اور تمام انسانوں سے افضل کیا ہو بلکہ تمام مخلوق پر بزرگی عطا فرمائی۔ اور جن کو رب نے درجوں بلند کیا کہ کوئی شرف وعزت والا ان کے مرتبے ومقام تک نہیں پہنچ سکتا اور جن کے لئے ان کے رب نے ان کے صدر مبارک کو کشادہ فرمایا اور ان کے اوپر سے اس بوجھ کو اتار لیا جو پیٹھ توڑ دے اور ان کے نام کو ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ ملایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذکر کو اپنا ذکر قرار دیا اور اپنے نبی کو کمال ہدایت اور اتنی عظمت و بزرگی عطا فرمائی ہو اور اتنی فضیلت بخشی ہو تو ان کی ضرورت و حاجت ان کی عصمت پر کیسے اور کیوں کر بڑھ سکتی ہے تو وہ جو ظاہر کے اعتبار سے حاجت وضرورت نظر آ رہی ہے وہ

ہرگز آپ کی بلند عصمت پر غالب نہیں آسکتی اور نہ ہی اس پر تجاوز کرسکتی ہے بلکہ جو چیز ظاہر کے اعتبار سے ضرورت نظر آرہی ہے وہ تو مزید دنیا سے آپ کے زہد و بے رغبتی کو مضبوط کرتی ہے تو دنیا کی زینت کے لئے آپ کی چشم مبارک نہ کسی طرف پھری اور نہ حد سے بڑی یعنی جس مقام پہ عقلیں حیرت زدہ ہوجایا کرتی ہیں وہاں آپ ﷺ ثابت رہے اور اپنے بلند مقصود سے تجاوز نہیں کیا۔

حضور اکرم ﷺ کے دنیا و مافیہا سے اعراض کا بیان

شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ روایت کی گئی ہے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے حاملہ اونٹنیاں پیش کی گئیں تو آپ نے ان سے اعراض فرمایا اور نگاہ پھیر لی، باوجودیکہ یہ اونٹنیاں آپ کا سب سے زیادہ پسندیدہ مال تھیں اور آپ کے نزدیک اموال میں سے نفیس ترین مال تھیں، اس لئے کہ وہ بار برداری کے کام میں آتی ہیں، گوشت اور دودھ دیتی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی ایک عظمت اور برتری تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (و اذا العشاء عطلت) تو پھر جب آپ نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی تو حضور سے دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ مال تو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے پھر آپ کیوں اس کی طرف نظر نہیں فرماتے ہیں، حضور نے فرمایا " قد نهانی الله تعالیٰ عن ذالك " کہ میرے رب نے مجھے اس سے منع فرمایا ہے پھر حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی (لا تمدن عينيك الى ما متعنابه) الآیۃ۔ تو یہ معاملہ ہے حضور کا اس دنیا کے ساتھ اور آخرت کی طرف توجہ کا یہ حال کہ حضور اپنے ساتھ رفیق اعلیٰ کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ اس سے معصوم کی ضرورت اور غیر معصوم کی ضرورت کے درمیان فرق سمجھا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس کی ضرورت جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے محفوظ فرمادیا ہو یعنی معصوم کی ضرورت اس کو احسن اشیاء کی طرف بھی نہیں بلاسکتی حقیر چیز تو دور کی بات اور غیر معصوم کی ضرورت اسے حقیر چیز اور احسن الاشیاء کی طرف بڑھا دیتی ہے یہاں تک کہ اس کے لئے اس چیز کا کھانا بھی مباح ہوجاتا ہے جس کو بلاضرورت کھانا درست نہیں حتی کہ اصلا حرام چیز کا کھانا بھی بوقت ضرورت مباح ہوجاتا ہے جیسے مردار کا گوشت!!

ابھی ماسبق میں ہم اس کے جواب کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ حضور کی جو ضرورت اور حاجت نظر آ رہی ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے۔ علامہ باجوری نے یہ افادات ذکر کرنے کے بعد اپنی گفتگو کو اس کلام پر ختم کیا کہ "الهمزية" میں کتنی بہترین بات کہی گئی ہے کہ:

مستقل دنياك ان ينسب الام　　　مساك منها اليه و الاعطاء(ص۲۱)

مناسب معلوم دیتا ہے کہ اس شعر کی شرح کر دی جائے بحول اللہ: (مستقل دنياك) یعنی آپ ﷺ حقیر اور برا جانتے ہیں کہ دنیا کو جمع کرنا آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور آپ دنیا کی اشیاء کو بانٹنا اور تقسیم کرنا پسند فرماتے ہیں، تو اس تقدیر پر "الاعطاء" مصدر، مفعول کی جانب مضاف ہے۔

گزشتہ سوال کے جواب میں مزید میرے ذہن میں یہ بات روشن ہوئی کہ آقائے دو عالم ﷺ نے جو احتیاج و ضرورت ظاہر فرمائی تھی وہ دراصل اپنی امت کے فقراء کی اعانت کے لئے اور ان کی تعلیم کے طور پر تھی کہ بوقت احتیاج کیا کرنا چاہئے؟ اور سخت ضرورت کے وقت اپنے آپ کو بلند اور اپنی عظمت کو کیسے محفوظ رکھا جائے اور اُس حال میں رذالت اور دناءت سے کیسے دور رہا جائے اور مزید اس میں یہ تعلیم تھی کہ خوش حالی میں صدقہ ادا کرنا چاہئے۔

اس موقع پر مجھے ایک حدیث پاک یاد آ رہی ہے جو حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ کا نقشہ ہو بہو ہمارے سامنے کھینچ دے گی، تعجیل صدقہ کے سلسلے میں۔ امام بخاری نے اپنی سند میں حضرت عقبہ ابن حارث سے روایت کیا: (باب من احب تعجيل الصدقة من يومها) میں "حدثنا ابو عاصم ‘عن عمر بن سعيد، عن ابن ابى مليكة ان عقبة بن الحارث حدثه قال صلى العصر، فاسرع ثم دخل البيت فلم يلبث ان خرج ، فقلت ـ او قيل له فقال ’كنت خلفت فى البيت تبرا من الصدقة ، فكرهت ان ابيته فقسمته‘

ترجمہ: فرمایا کہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز ادا فرمائی پھر حضور گھر میں تشریف لے گئے تو حضور نے گھر میں تاخیر نہ

فرمائی کہ فوراباہر تشریف لے آئے،تو میں نے کہایا ان سے کہا گیا(شك من الروای) تو حضور نے فرمایا کہ میں نے گھر میں بغیر ڈھلا ہوا سونے کا ڈلا صدقہ کے لئے چھوڑا تھا تو میں نہ پسند کرتا ہوں کہ میں اسے گھر میں رکھوں،اس لئے میں نے اسے تقسیم کر دیا۔ ((۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ ۱۹۲/۱)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

ربط: یہ قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کا پانچواں شعر ہے اب بعون اللہ تعالیٰ اس کی شرح کی جارہی ہے۔ناظم فاہم جب حضور کے ریاضت شدیدہ اور مجاہدۂ مدیدہ کو بیان کر چکے تو اب وہ شستہ اور دلکش اسلوب اور خوبصورت پیرایہ میں حضور کے فضائل بیان کررہے ہیں اس شعر اور ماقبل شعر کے درمیان ربط بتا کے اور گزشتہ مفہوم کی مزید ایسی تاکید کر کے جو معنی جدید کی بنیاد رکھنے سے ملا ہوا ہو۔فرماتے ہیں:

(۳۳)وکیف تدعو الی الدنیا ضرورة من لولاہ لم تخرج الدنیا من العدم

ترجمہ:۔تو بھلا کیسے اس ہستی کو،اس کے ظاہری حوائج دنیا کی طرف بلا سکتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو دنیا کو عدم سے وجود میں نہیں نکالا جاتا۔

تشریح: (واو) عاطفہ ہے،اس کا جملہ مقدرہ پر عطف ہے یعنی آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام صرف اپنے رب کی طرف مائل ہیں اور(جس کی یہ کیفیت ہو)اس کو دنیا اور اس کی نعمتیں جنت اور جنت کی نعمتیں کیوں کر بلا سکتی ہیں اور اس میں ایک حدیث قدسی کی جانب اشارہ بھی ہے کہ "الدنیا حرام علی اھل الآخرة و الآخرة حرام علی اھل الدنیا، وکلاھما حرام علی اھل اللہ تعالیٰ" (دنیا اہل آخرت پر حرام ہے اور آخرت اہل دنیا پر حرام ہے اور یہ دونوں اہل اللہ پر حرام ہیں)اور اس شعر میں مزید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا و

آخرت ایک ساتھ وجہ کمال پر جمع نہیں ہوسکتیں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ " انھما ضرتان او مثل کفتی المیزان" کہ دنیا وآخرت یہ ایک دوسرے کی دوسوتن ہیں (یعنی ایک دوسرے کی ایسی مخالف ہیں جیسے دوسوتن ایک دوسرے کی مخالف ہوتی ہیں یا یہ دونوں ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں) اور آقا علیہ السلام نے فرمایا" من احب دنیاہ اضر بآخرتہ و من احب آخرتہ اضر بدنیاہ ، فاثر وا ما یبقی علی ما یفنی "یعنی جس نے دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی آخرت سے محبت کی اس نے دنیا کو نقصان پہنچایا، تو تم فانی ہونے والی شئی پر باقی رہنے والی شئی کو ترجیح دو۔

(کیف) ، المعجم الوسط" کے مطابق ایسا اسم ہے جو مبنی بر فتحہ ہے اور اکثر اس کا استعمال استفہام کے لئے ہوتا ہے، اب استفہام حقیقی ہو جیسے کیف زید؟ یا غیر حقیقی جیسے فرمان باری تعالیٰ کیف تکفرون باللہ ہو تو وہ اس کی خبر واقع ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوگا مثلا کیف زید۔ اور اگر اس کے بعد کوئی فعل ہو تو وہ حال یا مفہوم مطلق واقع ہونے کی بنیاد پر محل نصب میں ہوگا مثلا کیف جاء زید؟ اور کبھی شرط کیلئے بھی آتا ہے تو اس وقت وہ لفظاً و معنیً دو متفق غیر مجزوم فعل کا مقتضی ہوگا جیسے کہا جاتا ہے "کیف تصنع اصنع یا کیفما تصنع اصنع "الخ

بہر حال یہاں استفہام ، استبعاد کے لئے ہے اس بنیاد پر جو شیخ زادہ نے فرمایا ہے اور علامہ باجوری نے اس کو استفہام انکاری مانا ہے۔ بہر حال مقصد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ حضور علیہ السلام کا کمال زہد بیان کرنا ہے۔ تو (کیف) حال یا مفعول مطلق ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے جیسا کہ ابھی ماسبق میں ' المعجم الوسیط' سے نقل کیا جاچکا ہے یا پھر وہ ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے جیسا کہ شیخ زادہ نے افادہ فرمایا ہے۔ (الدعاء) بمعنی طلب، میلان،، الحمل علی الشئی اور بمعنی احتیاج وغیرہ ہے۔

(الدنیا) ' الادنی' (اسم تفضیل کی تانیث ہے اس کے بارے میں دو قول ہیں (۱) ایک یہ کہ وہ 'دنو' سے مشتق ہے اور یہ اصل میں صفت تھی پھر اس کو اسمیت کی طرف نقل کر دیا گیا پھر اس کو اس دار کا اسم بنا دیا گیا جس میں ہم موجود ہیں اور کبھی اس کے اعراض اور جاہ و مال سے اس کی زینت پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں

پر یہی مراد ہے(۲) یا پھروہ 'الدنائة' مصدر سے مشتق ہے بمعنی خساست اور کہا جاتا ہے کہ دنیا وہ ہے جو تمہیں قرب مولیٰ سے مشغول کردے۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ دنیا کی اصل دنویٰ تھی، ان کے اس قول کے دلالت کرنے کے سبب (دنوت الی الشئی دنوا) پھر 'واو' کو 'یا' سے بدل دیا گیا لیکن " قصوی " میں اس طریقے کا تقلب نہیں کیا گیا اس لئے کہ دنیا کو اسم کی جگہ پر رکھا، ان کے اس قول 'الدنیا والآخرۃ' میں اگر چہ اس کی اصل صفت ہے لیکن اس کو خفیف کیا گیا اس لئے کہ اسم احق بالتخفیف ہے۔

پھر یہ کہ دنیا کی نسبت میں عرب سے دینی ودنیوی ہی سنا گیا اور بعض نے دنیا کی الف کو بیضاء'' کی الف سے دونوں کے علامت تانیث ہونے میں تشبیہ دی ہے تو انہوں نے کہا مافیہا دنیاوی پھر 'الدنیا' کو تنوین سے نصب کرنا غلط ہے اس لئے کہ 'دنیا' اور اس کے ہم وزن کو تنوین نہیں دی جاتی ہے تو اگر سوال کیا جائے کہ دنیا کو دنیا کیوں کہا جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کے 'دنو' ہونے یعنی آخرت سے قریب ہونے کی وجہ سے یا اس کے مشتہیات کے دل سے قریب ہونے کی وجہ سے یا پھر (اس کو 'دنـاءۃ' سے مشتق ماننے کی صورت میں) دنیا کے گھٹیا اور خسیس ہونے کی وجہ سے موسوم کیا گیا اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو دنیا کی اتباع کرتا ہے وہ خسیس ہو جاتا ہے۔

کلمہ ''لولا'' کی تحقیق

(لولا) ایسا حرف ہے جو امتناع شئی لوجود غیرہ پر دلالت کرتا ہے اور تین طریقوں پر استعمال ہوتا ہے:

اول: یہ کہ وہ دو جملوں پر داخل ہو، اسمیہ اور فعلیہ، وجود اولیٰ سے امتناع ثانی کا ربط بتانے کے لئے جیسے لولا العلاج لهلك یعنی اگر علاج موجود نہ ہوتا تو وہ ضرور ہلاک ہو جاتا اور اگر ضمیر اس سے متصل ہو تو حق یہ ہے کہ ضمیر رفع کی ہو مثلا (لولا انتم لكنا مومنين) اور " لولای "، 'لولاك' " لولاه" یہ قلیل الاستعمال ہیں۔ (یعنی ان میں ضمیر رفع کی نہیں تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ کم سننے میں آتے ہیں یعنی قلیل الاستعمال ہیں۔)

ثـانی: یہ کہ وہ تخصیص اور عرض کے لئے ہوتا ہے اور مضارع کے ساتھ مختص ہوتا ہے یا اس کے ساتھ جو مضارع کی

تاویل میں ہوجیسے (لولا تستغفرون الله)،(لولآ اخرتنی الی اجل قریب) تواس مثال میں فعل ماضی،مضارع کی تاویل میں ہے یعنی یوں ہے،لو لا تؤخرنی۔

ثالث:توبیخ وتندیم کے لئے ہوتا ہےاور ماضی کے ساتھ مختص ہوتا ہے مثلا(لو لا جآء و علیه باربعة شهدآء) 'لولا' اصل میں 'لو' اور 'لا' تھا،'لو' کو'لا' کے ساتھ مرکب کردیا گیااوراس کے لئے لازم ہے کہ اسکا جواب مذکور ہویاایسا مقدر ہو کہ اس پرکوئی دلیل دلالت کرے جیسے (لو لا فضل الله علیکم و رحمته و ان الله تواب حکیم) اس مثال میں جواب محذوف ہے جس پر سیاق کلام دلالت کررہا ہے یعنی لعوجلتم بالعذاب۔(مطلب یہ کہ اگرتم پراللہ تبارک وتعالیٰ کافضل وکرم نہ ہوتا توضرورتمہیں عذاب دیا جاتا)

"لولا" کے جواب میں 'لام' اکثر استعمال ہوتا ہے مگر جب وہ منفی 'بلم' ہوتونہیں آتا یعنی 'لام' اس کے جواب میں اکثر داخل ہوتا ہے علاوہ اس صورت کے کہ جب وہ جواب منفی بلم ہوتو اس وقت لام کا دخول اس پر ممتنع ہوجاتا ہے یا پھراس کا جواب منفی ہو 'ما' سے تب اس کے جواب پر 'لام' کا دخول قلیل ہوجاتا ہے۔اسی طرح 'المعجم الوسیط' میں ہے کچھ تغیر کے ساتھ۔اور 'لولا' کی خبرواجب الحذف ہے جب کہ وہ امورعامہ میں سے ہوجیسے موجود یا ثابت ورنہ تو اس کوحذف کرنا جائزنہیں ہے مگر جس وقت کوئی قرینہ قائم ہوجائے۔

حضورﷺ کا وجود دنیا کے وجود کی علت ہے

اورناظم شعر کاقول(لو لاهٔ) مضاف کےحذف کے ساتھ ہے جومبتداء ہے یعنی"لولا وجوده ثابت لم تخرج الدنیا من العدم الی الوجود" یعنی وہ مضاف محذوف 'وجود ہے۔(لم تخرج) بربنائے فعل مضارع ہےاوروہ"تخرج" معروف یا مجہول مطلب یہ ہے کہ اگرآپﷺ کا وجود پاک نہ ہوتا تودنیا معدوم ہی رہتی اوراپنے عدم پرہی برقراررہتی،وجود میں نہ آتی،تو آپﷺ کا وجود دنیا کے وجود کی علت ہےتو اگرآپ کی ضرورت آپ کودنیا کی طرف بلاتی ہوتی توضرورآپ کاوجود دنیا کے وجود کا معلول ہوتا جوکہ خلاف مفروضہ ہے(اس کومنطقیوں کی اصطلاح میں "قیاس الخلف" کہتے ہیں یعنی ایک نقض کے امتناع سے دوسرے کے ثبوت پر

استدلال کرنا)۔ بہر حال اس قضیہ کی اصل اور بنیاد وہ روایت ہے جس کو امام حاکم اور امام بیہقی نے روایت کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب اللہ تبارک وتعالیٰ سے حضور کے وسیلے سے دعا کی اور عرض کیا کہ میرے مولیٰ، محمد مصطفےٰ کے وسیلے سے میری خطا معاف فرمادے اور یہ دعا اس لئے کی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرش کے پایوں پر"لا الـه الا الـلـه محمد رسول الله (ﷺ) لکھا دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے فرمایا" سئلتنی بحقه ان اغفرلك ولولاه ما خلقتك!" کہ اے آدم تو نے اس کے وسیلے سے سوال کیا ہے کہ اگر اس کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا! تو وجود آدم علیہ السلام، وجود محمد ﷺ پر قائم ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے باپ، ابوالبشر ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے آدمی کے لئے ہی پیدا فرمایا ہے اور شمس وقمر لیل ونہار وغیرہ کو ان کے لئے مسخر فرمایا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:(وسـخـر لكم الشمس والقمر دائبين و سخر لكم الليل والنهار) تو جب یہ تمام چیزیں صرف اور صرف بشر کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور ابوالبشر کو آپ ﷺ کی وجہ سے پیدا کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ ساری دنیا کو حضور ہی کی وجہ سے اور حضور ہی کے خاطر پیدا کیا گیا ہے تو تمام اشیاء کے وجود کا سبب وہ حضور ہی کی ذات پاک ہے (ﷺ) (باجوری ص ۲۱،۲۲)

شیخ زادہ نے اس باب میں ایک نص یوں بیان کی ہے: "عـن سـعيد بن ا لمسيب عن ابن عباس رضی الـلـه تـعـالیٰ عنهما قال اوحی الله تعالیٰ الی عیسیٰ علی نبینا و علیه الصلوٰة والسلا م ان صـدق بـمـحـمـد ﷺ واأامـرامتك مـن ادركـه منهم ان يؤمنوا به فلولا محمد ماخلقت آدم ولـولا مـحـمد ماخلقت الجنة والنار ولقد خلقت العرش فاضطرب فكتبت عليه (لا اله الا الله محمد رسول الله)، فسكن"

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ عـلـی نبینا و علیه الصلوٰة و السلا م پر وحی نازل فرمائی کہ وہ محمد مصطفےٰ (ﷺ) کی تصدیق کریں اور اپنی امت کو

یہ حکم دیں کہ ان میں سے جو کوئی ان کا زمانہ پائے تو وہ ان پر ایمان لے آئے، اللہ فرماتا ہے اس لئے کہ اگر محمد کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا، جنت و دوزخ بھی پیدا نہ کرتا، اور تحقیق کہ میں نے عرش بنایا تو وہ کانپنے لگا پھر تو میں نے اس پر (لااله الا الله محمد رسول الله لکھ دیا تو وہ ٹھہر گیا۔

تو دنیا تو صرف حضور کے باران کرم کے فیض کا ایک قطرہ ہے اور بحار نعم کی موجوں کا صرف ایک چھینٹا ہے تو جب حضور کی یہ شان ہے تو آخر کیسے ان کے فاقے کی ضرورت ان کو دنیا کی طرف بلاسکتی ہے؟ اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی حاجت ہمت توڑ دے اور سخت ضرورت اور حاجت کے وقت صبر کرنا یہ معصومین کے خواص میں سے ہے۔(ص ۷۱)

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ایک حدیث قدسی کی جانب تلمیح ہے جو اس سلسلے میں منقول ہے کہ ''لولاك لما خلقت الا فلاك'' کہ اے محبوب اگر تمہیں پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں افلاک کو بھی پیدا نہ کرتا۔ اور افلاک سے مراد تمام مکنونات ہیں، اسم جز کا کل پر اطلاق کرتے ہوئے (ص ۷۱)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

اس فصل کے پانچویں شعر کی شرح کرنے کے بعد اب ہم چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کررہے ہیں۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۴)محمد سید الکونین و الثقلین　　و الفریقین من عرب و من عجم

(ترجمہ: حضرت محمد ﷺ دنیا و آخرت، جن و انس اور عرب و عجم سب کے سردار ہیں۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ اشعار میں حضور ﷺ کی ریاضت شدیدہ اور مجاہدہ مدیدہ کو تعظیما بطور ابہام بیان

کرنے کے بعد حضور ﷺ کے زہد عن الدنیا اور عصمت کو ایسے کلام سے مؤکد کیا جو حضور کی تمام مخلوق پر فضیلت کا مقتضی ہو (ان تمام امور کو بیان کرنے کے بعد) اب انہوں نے حضور کی توصیف میں ایسے اسلوب کو اختیار کیا جو نئے معنی کو مستلزم ہو، تو انہوں نے حضور کے اسم مبارک کی صراحت فرمائی اس لئے کہ ابہام کے بعد تصریح دلوں میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

ناظم شعر فرماتے ہیں:

محمد سید الکونین و الثقلین　　　و الفریقین من عرب و من عجم

تشریح:(محمد) مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے، اس میں رفع جائز ہے وہ مبتدا محذوف 'ھو' ہے یعنی ھو محمد ﷺ، اور منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں" امدح" کی تقدیر پر اور 'من' سے بدل ہونے کی بنیاد پر حالت جری میں بھی ہوسکتا ہے جو ناظم شعر کے سابقہ قول میں محل جر میں واقع ہے یعنی اس قول میں 'کیف تدعوا لی الدنیا ضرورة من

(محمد) تحمید (مصدر باب تفعیل) سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، بار بار تعریف کیا ہوا تو وہ مبالغہ ہے، پھر بعد میں اس کو اسمیت کی طرف نقل کر کے نبی اکرم ﷺ کو اس سے موسوم کر دیا گیا اس لئے کہ آپ ﷺ اپنے خَلق و خُلق میں محمود ہیں۔

اسم رسالت (محمد ﷺ) کی تحقیق

علامہ قاضی عیاض شفا شریف میں فرماتے ہیں کہ حضور کے اس مبارک یعنی ''محمد'' کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا محفوظ فرما رکھا تھا کہ عرب وعجم میں کوئی بھی اس نام سے موسوم نہیں کیا گیا یہاں تک کہ حضور کی ولادت سے کچھ پہلے سارے عالم میں یہ بات شائع ہوگئی تھی کہ ایک نبی رحمت مبعوث ہونے والے ہیں جن کا نام نامی اس گرامی ''محمد'' ہوگا اسی وجہ سے ایک قوم نے اپنے بچوں کے نام، اسم رسالت پر اس امید پر رکھے کہ شاید ان میں سے کوئی وہ نبی ہو۔ لیکن اللہ جانتا ہے کہ کہاں رسالت عطا کرنی ہے اور لفظ 'محمد' یہ ' التحمید' از باب تفعیل کا مصدر ہے اور

اس باب کی خاصیت تکثیر ہےتو وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ جنات و ملائکہ اور انسان میں سے ہر ایک کی زبان پر آپ ﷺ کی تعریف ہو اور حضور سب کے محمود ہوں، بلکہ وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر وہ جو رحمان کی تسبیح اور اور اس کی حمد بجالاتے ہیں جمادات ونباتات اور حیوانات میں سے وہ سب حضور کی بھی تعریف کریں، اور جل جلالہ فرماتا ہے ﴿ وان من شئی الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم ﴾ (الاسراء:٤٤)

اس لئے کہ تکثیر ایسی شئی ہے جو عموم واطلاق کو چاہتی اور ایسی رسی ہے جو کثرت و بہتات کو مقتضی ہوتی ہے اور یہ حضور کی رسالت کے عموم کے لائق ہے، اسی وجہ سے رسالت کے مقتضاء کے مطابق ہی حضور کا نام رکھا گیا جو تمام عالم کا احاطہ کرلے تو مشرق و مغرق آپ کے ذکر سے مملو ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں: 'مامن شئی الا یعلم انی رسول اللہ الا مردۃ الجن والانس'، یعنی کائنات کی ہر شئی جاتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، چند سرکش جن وانس کو چھوڑ کر''۔ لہذا حضور اپنے اسم مبارک (محمد ﷺ) اور اپنی رسالت کے عموم کے مقتضا کے مطابق، دوامی طور پر محمود الکل ہیں اور یہ اس بات کو چاہتا ہے کہ حضور کی حقیقت ان کے خالق کے سوا کوئی نہ جانتا ہو، اسی وجہ سے کسی شاعر نے سچ کہا:

وعلی تفنن واصفیه بوصفه ۔۔۔ یفنی الزمان و فیه مالم یوصف

ترجمہ:۔ حضور کے واصف، حضور کی مدحت سرائی طرح طرح کے اسلوب سے کرتے رہے ہمیشہ (لیکن پھر بھی) یہ زمانہ فنا ہوجائے گا اور حضور کے وہ اوصاف پھر بھی باقی رہ جائیں گے جن کی مدحت سرائی نہیں کی گئی

اللہ جل شانہ فرماتا ہے (قل لوکان البحر مدادالکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثله مددا) اس آیت پاک میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے حضور کی قدر و منزلت کی بلندی کا اظہار کرنا ہے اور لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ حضور کمال کی اس بلندی کو پہنچے ہوئے ہیں کہ تمام مخلوق مل کر بھی جب حضور کی توصیف کریں تب بھی وہ حضور کے اس مرتبے و مقام تک پہنچنے سے عاجز رہیں گے تو آیت پاک میں کلمٰت ربی) سے مراد حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے اس سے اللہ جل وعلا کی صفات مراد لینا جائز نہیں

اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات 'نفاذ' یعنی نیست ونابود ہونے اور فنا ہونے سے پاک ہیں،۔
حضور کی ذات بھی اللہ کی ذات پاک پر دلالت کرتی ہے،اور حضور اللہ کی بارگاہ تک ہمارا وسیلہ ہیں،حضور ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک پہنچا جاتا ہے۔اب رہا یہ سوال کہ " کلمٰت "جمع کا صیغہ ذکر کیوں فرمایا گیا؟ تو اس کو افادۂ تعظیم کے لئے جمع لائے ہیں اور ایسا بہت ہوتا ہے یعنی جمع کا مفرد پر اطلاق کثیر الاستعمال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (فیہ آیٰت بینٰت مقام ابراھیم) اور اللہ کا یہ فرمان بھی مقام کے مناسب ہے فرماتا ہے (ام یحسدون الناس علی ما آتاھُم) النساء۵۴) آیت پاک میں " الناس " سے حضور سیدنا محمد ﷺ مراد ہیں حضرت قتادہ نے فرمایا کہ 'النـاس' سے تمام عرب مراد ہیں اس لئے کہ یہود نے عربوں سے نبوت پر حسد کیا تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اکرام عطا فرمایا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضور اور حضور کے اصحاب مراد ہیں لیکن حضرت عبد اللہ ابن عباس، حضرت حسن، حضرت مجاہد ایک جماعت نے یہی کہا کہ آیت پاک میں ' الناس ' سے صرف حضور مراد ہیں اور بس۔(بغوی ۱/۴۴۲)
بہر حال مقصد دونوں قول کے قائلین کا ایک ہی ہے یعنی اس جماعت کا اور حضرت قتادہ کا مقصد ایک ہی ہے اس لئے کہ عرب اور خصوصا صحابہ کرام کی تکریم کی وجہ نبوت ہی ہے یعنی یہ اکرام انہیں صرف نبی اکرم ﷺ کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے تو حضور سبب اکرام ہیں اور یہی دونوں قول کے قائلین کی مراد ہے اور حضور کو (کلمٰت ربی) سے متصف کرنا یہ بتاتا ہے کہ حضور اپنے اوصاف میں اور ہر اس چیز میں جس سے آپ ﷺ کے وصف بیان کئے جائیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے مظہر اتم ہیں جیسے مثال کے طور پر ''ہمارا رب نور ہے'' اور ہمارے نبی ﷺ کو ان کے رب نے نور کہا۔اسی طرح ''ہمارا رب مالک ہے'' اس کے بندوں میں بہت سارے لوگوں کو 'مالک' کہا جاتا ہے تو ہمارے نبی ''مالک'' کہے جانے کے زیادہ حق دار ہیں۔اور اسی طرح ''ہمارا رب بادشاہ حقیقی ہے'' اور ہمارے نبی ﷺ اپنے رب کی عطا سے بادشاہ حقیقی کے مظہر ہیں اور مثلاً ''ہمارا رب مولیٰ ہے اور ہمارے حبیب نبی اکرم ﷺ بھی اپنے رب کے حکم سے مولیٰ ہیں،۔علی ھذا القیاس حضور کی اطاعت واجب

ہے کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حکم فرما چکا ہے کہ (من یطع الرسول فقد اطاع الله)الآیۃ اور چوں کہ لفظ 'سید' مالک وغیرہ کے تمام معانی کو جامع ہے، اسی وجہ سے ناظم شعر نے (سیدالکونین) کہا اور مضاف کے محذوف ہونے کا قول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یعنی اہل مضاف محذوف ماننے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ ﷺ "سید الکونین" بھی ہیں اور "سید اهل الکونین "بھی ہیں اور کونین سے مراد دنیا و آخرت ہے یا عالم شہادت اور عالم غیب مراد ہے اور ثقلین سے جن وانس مراد ہیں، اس لئے کہ یہ دونوں زمین کو ثقیل یعنی بھاری کئے ہوئے ہیں۔اور جن وانس کو ثقلین اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں زمین کو ثقیل یعنی وزنی کئے ہوئے ہیں یا پھر ان کے گناہوں کے بھاری ہونے کی وجہ سے۔

کونین کے بعد ثقلین کا ذکر تعیم کے بعد تخصیص ہے یہ بتانے کے لئے کہ حضور جیسے تمام انسان کے رسول ہیں ویسے ہی حضور تمام جنات کے بھی رسول ہادی ہیں۔

(عرب) "قفل" کی طرح بمعنی عرب، عجم کی ضد ہے، اور عجم سے مراد ما سویٰ عرب ہے، یہاں بھی تعیم کے بعد تخصیص ہے یہ بتانے کے لئے کہ حضور تمام انسانوں کے رسول ہادی ہیں (صرف عرب کی تخصیص نہیں ہے)

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: عُرب، قفل کی طرح بمعنی عرب ہے اور یہ عجم کا عکس ہے، 'عرب' بتاویل طائفہ مونث ہے کہا جاتا ہے " العرب العاربة و العرب العرباء "بعض لوگوں نے عرب کو شہروں میں رہنے والوں کے ساتھ مخصوص کیا (یعنی جو اس کے شہروں میں رہتے ہیں صرف وہی عرب ہیں) اور بعضوں نے شہری اور بدوی دونوں کو عرب ہونے میں شامل کیا ہے، بہرحال مراد یہاں یہی ہے۔

'البصائر' میں مذکور ہے کہ اعراب یہ عرب کی جمع نہیں ہے، جیسا کہ وہم ہوتا ہے اس لئے کہ اعراب کا مفرد نہیں آتا، لیکن علامہ راغب نے اپنی مفردات میں فرمایا ہے کہ اعراب، عرب کی جمع ہے اور "مصباح اللغة" میں ہے کہ عرب کی جمع 'اعرب' آتی ہے جیسے 'زمن' کی جمع 'ازمن' اور 'عرب' کی جمع 'عرب' بھی آتی ہے جیسے اسد کی جمع اُسدُ ۔۔انتھی

عجم سے مراد وہ جو ماسواعرب ہو،تو لفظ عجم ترکی، کردی فارسی، رومی، ہندی وغیرہ سب کو شامل ہے۔اور 'عجم' سے پہلے 'من' حرف جار کا اعادہ ضرورت وزن کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

دنیا وآخرت میں حضور کی سیادت کا ذکر

علامہ خرپوتی نے آپ ﷺ کی سیادت دارین کا ذکر بہت ہی واضح انداز میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ حضور کی دنیا میں سیادت تو یہ ہے کہ حضور خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور معجزۂ معراج بھی صرف حضور ہی کا خاصہ ہے اور حضور کے ساتھ ہی مخصوص ہے نہ کہ تمام انبیاء کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ نے اٰپ کو جنات اور ملائکہ کا بھی رسول بنایا اور آپ ﷺ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا حتی کہ عذاب میں تاخیر کے اعتبار سے آپ کی ذات کفار کے لئے بھی رحمت ہے۔ اور اسی طرح دنیا میں آپ کی سیادت یہ ہے کہ آپ کا شہر تمام شہروں سے افضل ہے، آپ کی مسجد تمام مسجدوں سے افضل ہے اور وہ بقعۂ نور جس میں حضور آرام فرما ہیں، وہ کعبے سے افضل ہے بلکہ عرش سے بھی افضل ہے۔ اور اسی طرح آپ ﷺ کی سیادت، روحانی نور ہونے کے اعتبار سے، تمام اشیاء سے افضل ہے اور یہ فضیلت کثیر احادیث وآثار سے ثابت شدہ ہے، بلکہ آپ کا نور لطیف تمام انبیاء کے انوار کی اصل ہے۔

'مواھب' میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے **(واذا اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتٰب و حکمة ثم جآء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن به، و لتنصرنه قال ءَا قررتم و اخذتم علی ذالکم اصری قالوا اقررنا)[آل عمران: ۸۱، ۸۲]الآیة.**

حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ''مابعث اللہ تعالیٰ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیه المیثاق: لئن بعث محمد علیه الصلوٰة والسلام وھو حیٌ لیؤمنن به و لینصرنه۔

ترجمہ: جو بھی نبی تشریف لائے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے عہد و میثاق لیا کہ اگر محمد ﷺ مبعوث ہوں اور وہ نبی حیات ظاہری کے ساتھ دنیا میں ہو تو وہ ضرور حضور (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر ایمان لائے اور ضرور ان کی حمایت وتصدیق

کرے)

نیز ' المواھب ' میں حضرت عبدالرزاق سے بروایت جابر حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ 'جاننا چاہئے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور کو پیدا فرمایا، پھر اس نور محمدی سے لوح وقلم، عرش وحاملین عرش، کرسی ملائکہ، آسمانوں اور زمینوں، جنت ودوزخ سب کو پیدا فرمایا، نیز مومنین کی آنکھوں، دلوں اور ان کی جانوں کے نور کو بھی نور محمدی ہی سے پیدا فرمایا۔

اور رہی حضور کی آخرت میں سیادت تو علامہ قرطبی نے اس کا یوں ذکر کیا ہے کہ قیامت کے دن فرشتوں کی ایک جماعت جہنم کو لائے گی اس حال میں کہ جہنم چار پایوں پر چل رہی ہوگی اور ستر ہزار لگاموں سے اسے کھینچا جا رہا ہوگا، ہر لگام میں ستر ہزار حلقے ہوں گے اور ہر حلقے پر ستر ہزار فرشتے ہوں گے کہ اچانک ان فرشتوں کے ہاتھوں سے جہنم کی لگام چھوٹ جائے گی اور وہ فرشتے جہنم کے اتنا بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو پکڑ نہیں پائیں گے پھر اہل محشر جھک جائیں گے حتی کہ مرسلین عظام بھی اور حضرت ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام عرش کے پایوں کو پکڑ لیں گے اور حال یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل کو، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون کو، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم کو بھول چکے ہوں گے اور سب یہ کہتے ہوں گے یا اللہ نفسی نفسی اے اللہ میں آج اپنے سوا کچھ نہیں مانگتا جب کہ اس حالت اور اس عالم میں ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر امتی امتی ہوگا کہ اے میرے رب میری امت میری امت کو سلامت رکھ نجات عطا فرما۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کھڑے ہوں گے اور جہنم کی نکیل پکڑ کر فرمائیں گے کہ اے جہنم واپس لوٹ جا شکست خوردہ ہو کر تو وہ کہے گی کہ آپ میرا راستہ چھوڑ دیں اس لئے کہ آپ اے محمد مجھ پر حرام ہیں پھر عرش کے شامیانے سے آواز آئے گی کہ اے جہنم جو وہ کہہ رہے ہیں اسے سن اور ان کا کہا مان پھر جہنم کو کھینچ کر عرش کی شمالی جانب کر دیا جائے گا تب جا کر اہل محشر کا ڈر کچھ کم ہوگا'' یہ علامہ خرپوتی کے کلام کی نقل تھی یہاں پر ان کا کلام مختصر سی تغیر کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

علامہ خرپوتی نے اپنی عبارت میں لفظ ' فینادی '' استعمال کیا ہے اور ایسا ہی ہمارے پیش نظر نسخے میں ہے لیکن

میرے حساب سے زیادہ بہتر فینا دی کے بجائے فتنا دی ہوگا۔

شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے سید العرب والعجم ہونے پر حضور کا یہ فرمان دلیل ہے کہ میں بنی آدم کا سردار ہوں لیکن مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، اور یہ آیت بھی دلیل ہے (کنتم خیر امة) اور حضور کا جن وانس سے افضل ہونا حضور کے اس فرمان سے مستفاد ہے کہ میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا خاص وقت ہوتا ہے کہ کسی بھی مقرب فرشتے اور کسی بھی رسول کی اس وقت میں گنجائش نہیں ہوتی'' اور حضور ﷺ کی کونین (دنیا وآخرت) پر فضیلت یعنی سید الکونین ہونے کی معرفت اس سے بھی ہوتی ہے جس کی طرف میں اشارہ کررہا ہوں کہ آپ ﷺ کا مقام وحدت میں تحقیق ہے اور آپ اثنینیت کو رفع کرکے اس سے فائق ہیں اور آپ ﷺ لباس شربت کو اتار کر لباس نورانیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مقام وحدت اور مقام رفع اثنینیت پر آپ ﷺ کے فائز ہونے پر دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ﴾ نیز یہ فرمان ﴿ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ﴾ زبان حقیقت حال سے انہی معانی ومفاہم میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:

وانی وان کنت ابن آدم صورۃ ۔۔۔ فلی فیہ معنی شاھد بابوتی

ولولای لم یوجد ولولای لم یکن ۔۔۔ شھود ولم یعھد عھود بذمتی

(یعنی گویا حضور خود بزبان حال فرماتے ہیں کہ میں اگرچہ صورتا اور ظاہرا بنی آدم ہوں لیکن حقیقتا میرے لئے اس سلسلے میں ایک ایسا معنیٰ ہے جو میری ابوت اور میرے باپ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو ان کو بھی پیدا نہ کیا جاتا اور اگر میں نہ ہوتا تو کوئی موجود نہ ہوتا اور نہ ہی کوئی مکلّف وذمہ دار بنایا جاتا۔)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

بحمد للہ تعالیٰ ہم اس فصل کے بیت سادس کی شرح سے فارغ ہو چکے اور اب اسی فصل کے ساتویں شعر کی شرح متصلا کی جاری ہے: شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۳۵)نبینا الآمر الناھی فلا احد ابر فی قول لا منه ولا نعم

ترجمہ: ہمارے پیارے نبی (نیکیوں) کا حکم کرنے والے، (برائیوں سے) روکنے والے ہیں، تو کوئی حضور سے زیادہ سچا نہیں، 'نا' کہنے میں اور نہ ہی 'ہاں' کہنے میں۔

ربط: اس شعر کا تعلق ماقبل شعر سے ہے، اس شعر میں لفظ 'سید' کے بعض معانی کی تشریح ہے یعنی لفظ 'سید' جن معانی کو شامل ہے۔ سید و مولیٰ اسے کہتے ہیں جو قوم کے ان مصالح کو قائم رکھنے کا فریضہ انجام دیتا ہے جو مملکت کا انتظام رکھے اور قوم کی صلاح بہبود کا ضامن ہو اور یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ مولیٰ اور سید وہ ہوتا ہے جو قوم کے دنیا و آخرت میں کام آئے اور ان کو ان غیبی باتوں سے باخبر کرے جس کی انہیں اپنی صلاح وفلاح میں حاجت ہو اور ان کو نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور ان کو اپنی متابعت کے ذریعے کامیابی و کامرانی کی راہ پر گامزن کردے۔ اسی لئے ناظم شعر اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نبینا الآمر الناھی فلا احد ابر فی قول لا منه ولا نعم

تشریح: ناظم شعر کے قول (نبینا) میں اعراب کی وہی تینوں صورتیں ہیں جو اسم رسالت (محمد ﷺ) کے متعلق گزر چکی ہیں۔ (نبینا) میں اضافت، مضاف الیہ کو بزرگی دینے کے لئے (مشرف کرنے کے لئے ہے) علامہ باجوری کے قول کے مطابق۔

اقول: نبینا میں اضافت بھی یہی بتانے کے لئے ہے کہ ہم بالکلیہ حضور ہی کی جانب مائل ہیں اور حضور کے

غلام ہیں اور ہم نے اپنے آپ کو حضور کے سپرد کر دیا ہے اور ہم حضور کی مہربانی اوران کے فضل و کرم کے ہیشگی کے طالب ہیں ناظم شعر کا" الآمر الناھی " کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ، اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے آمر و نــاھی ہیں اوروہ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نیکیوں کا حکم کرنے والا اور برائیوں سے روکنے والا ہو وہ رسول ہوتا ہے تو حضور کو آمر و ناھی سے متصف کرنا، حضور کو صفت رسول سے متصف کرنا ہے۔

مذکورہ عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاعر ذی فہم نے نبی اکرم ﷺ کی مدح وثناء میں دو وصف بیان کئے ہیں یعنی نبی اور رسول، لہذا اس سوال کو قائم کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی جس کو علامہ خرپوتی نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے کہ ''اگر یہ سوال کیا جائے کہ ناظم شعر نے لفظ رسول کے بجائے، صفت نبی کو کیوں اختیار کیا اور صفت نبی کو صفت رسول پر کیوں ترجیح دی، حالانکہ وزن شعر کی ضرورت بھی متحقق نہیں تھی کہ وزن شعر کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے لفظ نبی کو اختیار کرلیا ہو؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ نبی کو آمر وناھی یعنی رسول پر کیوں مقدم کیا؟ تو اس کو وزن شعر کی رعایت کی وجہ سے مقدم کیا اور مزید اس وجہ سے بھی مقدم الذکر کیا کہ لفظ نبی میں رفعت کا معنی ہوتا ہے جو لفظ ''سید'' کو متضمن ہے۔

لفظ نبی کی تحقیق

(النبی) ،علامہ راغب کی'مفردات' کے مطابق بغیر ہمزہ کے ہے،اس لئے کہ نحوی اس بات کے قائل ہیں کہ اس کی اصل ہمزہ تھی پھر بعد میں ہمزہ کو ترک کر دیا گیا، ان کا مستدل یہ قول ہے" مسیلمة نبئ سوٗ"لیکن بعض علماء کرام یہ فرماتے ہیں کہ لفظ' نبی' الـنبوۃ' مصدر بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو 'نبی 'اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا مرتبہ ومقام تمام لوگون سے ارفع واعلیٰ ہوتا ہے،جس پر یہ آیت دلیل ہے (ورفعنه مكانا عليا) تو 'النبی 'بغیر ہمزہ کے،'النبی' بالھمزہ سے زیادہ بلیغ ہے اس لئے کہ ہر" منباء" (خبر دیا ہوا (رفیع القدر و المنزلت) نہیں ہوتا ہے،اسی وجہ سے آقا علیہ السلام نے اس شخص سے فرمایا جس نے آپ کو 'یا نبی اللہ " کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ 'انـا لست نبیء الله و لكن نبی الله 'یعنی میں نبئ اللہ (بالھمزہ) نہیں ہوں بلکہ اللہ

کا نبی ہوں، یہ آپ نے اس وقت فرمایا جب آپ ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ شخص بغض وعناد کی وجہ سے بالھمزہ مخاطب کرر ہا ہے۔

نبوت، اللہ اور اس کے بندوں کے مابین وسیلہ ہے دنیا وآخرت میں ان کی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے اور نبی کا ''منبأ'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی خبریں دیتے ہیں جس سے عقلیں سکون واطمینان حاصل کرتی ہیں اور اس لفظ کا وزن 'فعیل' بمعنی 'فاعل' ہونا درست ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق (نبی عبادی) (قل اُوْنَبِّئُکُمْ) اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بمعنی مفعول ہو اس فرمان رب تعالیٰ کی وجہ سے (نبانی العلیم الخبیر) بہر حال یہ تمام تشریحات اس بات کو مفید ہیں کہ 'نبی' اللہ تبارک وتعالیٰ کا وہ بندۂ خاص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے منتخب فرما کر اس کو اپنے غیب پر مطلع فرما دیا ہے اور اس کو اپنی معرفت میں مستقل فرمایا ہے نہ کہ تمام بشر کو، اور اس کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان سفیر بنا کر قائم کیا ہے تا کہ بندوں کی دنیاوی اور اخروی بیماریوں کو دور کیا جائے اسی وجہ سے 'المواھب' میں مرقوم ہے کہ نبوت یہ غیب پر مطلع ہونے کا نام ہے اور منجد میں ہے کہ نبی غیب کی خبریں دینے والا اور الہام سے مستقبل کی باتیں بتانے والا ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر وواضح ہو جاتا ہے کہ جس نے بھی آپ ﷺ کے علم غیب کا انکار کیا اس نے اپنے ایمان کی بنیادوں کو منہدم کیا اور اپنے ہاتھوں خود کو نقصان وخسارے کے گڑھے میں گرایا، اس لئے کہ اس نے اس انکار سے دراصل نبوت ورسالت ہی کا انکار کر دیا حالانکہ نبی کے علم غیب پر ایمان رکھنا، ایمان کا ایک ایسا جز ہے جو ایمان باللہ کو ثابت ومتحقق کرتا ہے تو جس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مطلقا علم غیب کی نفی کی، وہ نہ حضور پر ایمان لایا اور نہ حضور کے رب پر۔

اور علامہ ابن ہمام کے کہنے کے مطابق 'نبی' رسول کا مرادف لفظ ہے یہ محققین کا قول ہے اور یہ قول ان تین اقوال میں سے ایک ہے جو 'المسامرة شرح المسايرة' میں مذکور ہے، اس کی تصریح یوں کی گئی ہے: ''نبی اور رسول کے معنی میں تین اقوال ثابت ہیں (۱) ان دونوں میں فرق تبلیغ کا حکم کرنے اور نہ کرنے کا ہے۔ (یعنی نبی وہ ہوتا

ہے جوتبلیغ کا حکم نہیں کرتا ہے اور رسول اس کا برعکس ہوتا ہے) یہ پہلا قول ہے جومشہور ہے (۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے شریعت اور کتاب دی گئی ہو یا وہ گزشتہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کردے (۳) اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور یہی قول محققین کی جانب منسوب ہے۔(ص ۱۹۴)

اس کے علاوہ ' المسایرة ' میں اور بھی کئی امور ذکر کئے گئے ہیں جونبوت میں مشروط ہیں،ان کو یہاں بیان کردینا فائدہ سے خالی نہیں۔

" المسایرة " میں یوں تصریح کی گئی ہے:''نبوت کی شرطیں یہ ہیں: مرد ہو،اپنے اہل زمانہ میں،عقل کے لحاظ سے اخلاق وکردار کے لحاظ سے، ذہانت وفطانت کے لحاظ سے اور رائے کی قوت کے لحاظ سے اکمل ہو،آبا واجداد اورامہات کی دناءت وخساست سے پاک ہو،سنگ دلی اور قابل نفرت عیوب جیسے برص وجزام وغیرہ سے سالم ہو، قلت مروت جیسے راستے میں کھانا اور ذلیل پیشہ جیسے حجامت وغیرہ سے بری ہو۔

کفر سے معصوم ہو،وغیرہ اوران شرطون کے علاوہ باقی بعد میں مذکور ہوں گی[ص:۱۹۱]

" المسامرة ' جو " المسایرة " کی شرح ہے اس میں مسایرة کے اس قول (فمن موجبات النبوة متاخر عنها) کے تحت یہ مذکور ہے۔

'فمن' یعنی ' فهو من موجبات النبوة' موجبات جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے مطلب یہ ہے وہ سارے امور کہ منصب نبوت جن امور کو چاہتی ہے وہ اس سے متاخر ہیں جیسا کہ موجب کی شان ہوتی ہے تو اسی وجہ سے اس میں اس کی شرط نہیں لگائی گئی،اسی پر جمہور ہیں اور رہا انبیاء کا صغائر وکبائر سے قبل وبعد نبوت محفوظ ومعصوم ہونا تو اس کی شرط لگانا ممتنع نہیں ہے۔(ص ۱۹۱)

قال الازهری: نبی اور رسول میں اگر چہ معنی کے اعتبار سے عموم خصوص کی ایک نوع مغایرت ہے لیکن وہ ہمارے نبی ﷺ کی جانب نسبت کی وجہ سے مصداق کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے،اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی سورۂ اعراف میں یوں صفت بیان کی (الذین یتبعون الرسول النبی الامی) اس عبارت سے

دوسرے انداز میں اس سوال کا جواب ظاہر ہوجاتا ہے جس کا ذکر گزر چکا۔
نبوت کے معنی کے متعلق ہمارے ذکر کردہ امور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آپ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے بلاؤں کو دفع کرنے میں قائم مقام ہیں اور آپ ﷺ ہی دشواریوں کو آسان کرنے میں اور بخشش وعطا کے حصول میں سبب ہیں اور غم وحزن کو خوشیوں میں بدل کر رنج زائل کرنے کا ذریعہ ہیں، تو آپ ﷺ ہی دافع البلاء ہیں، جیسا کہ جد کریم شیخ الاسلام امام احمد رضا قدس سرہ نے بہت ہی واضح بیان کے ساتھ اپنے رسالے ''الامن و العلی لنا عتی المصطفیٰ بدافع البلا'' میں ثابت فرمایا ہے۔
اور نیز، 'المفردات' سے منقول عبارت سے مزید یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ 'نبیء' ہمزہ کے ساتھ ابہام ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھا جاتا ہے، سوائے ایک قرأت کے، اور ہمارا ایک قرأت کے استثناء کرنے میں امام نافع کی قرأت سے احتراز ہے اس لئے کہ انہوں نے '' نبیء '' ہمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ جیسا کہ 'المسایرۃ' میں بیان کیا گیا ہے کہ نافع نے ہمزہ کے ساتھ 'النبأ' مصدر سے قرأت کی ہے اور جمہور نے بغیر ہمزہ کے قرأت کی ہے (نبینا) یا تو اسم رسالت، 'محمد' ﷺ کی صفت ہے اور اسی طرح 'الآمر و الناھی' بھی صفت ہوگی یا پھر وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور '' الآمر الناھی '' اس کی یا تو صفت ہے یا پھر یہ دونوں خبر کے بعد خبر ہیں، اور امر ونہی کا متعلق عام ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا یعنی '' الآمر بکل معروف والناھی عن منکر '' ہر بھلائی کا حکم کرنے والے اور ہر برائی سے روکنے والے ہیں۔

اہم نحوی فائدہ

شیخ زادہ نے یہاں ایک اہم نحوی فائدہ ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نحویوں نے '' لا رجل فی الدار '' بالتنوین اور '' لا رجل '' بغیر التنوین کے درمیان فرق کیا ہے، اس لئے کہ مؤخر الذکر یعنی لا رجل بغیر تنوین کے یہ '' من استغراقیہ ' کو متضمن ہونے کی وجہ سے استغراق میں قطعی ہے۔
قال الازھری: وہ دائرہ نفی میں واقع ہونے کی وجہ سے استغراق میں قطعی ہے اسی لئے وہ عام ہوگیا اور یہی سبب

بنأ ہے لیکن پہلا والا غیر قطعی ہے یہاں تک کہ پہلے والی صورت میں جائز ہے کہ ایک نہیں بلکہ دو مرد ہوں گویا اس نے کہا 'لا رجل فی الدار بل رجلان' یعنی گھر میں ایک مرد نہیں بلکہ دو مرد ہیں یہ غیر قطعی ہوا، لیکن ثانی میں یہ جائز نہیں اس لئے کہ وہ استغراق میں قطعی ہوتا ہے تو 'لا رجل فی الدار' کا مطلب ہوا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ برخلاف لفظ 'احد' کے اس لئے کہ وہ دونوں صورتوں میں استغراق میں قطعی ہوتا ہے، لفظ 'واحد' کے برعکس، اس لئے کہ 'لا واحد' لا رجل کے مثل ہے۔ (شیخ زادہ ص ۸۴، ۸۵)

(فلا احد) میں 'فا' جزاء کے لئے ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی " اذا کان محمد ﷺ سید الکونین۔ و نبینا الآمر الناھی فلا احد" یعنی جب آقائے دو عالم جناب محمد رسول اللہ سید الکونین ہیں اور ہمارے نبی اکرم آمر وناھی ہیں تو نہیں ہے کوئی جو آپ سے زیادہ سچا ہو۔

لفظ " احد " کے متعلق علامہ خرپوتی بیان فرماتے ہیں: کہ تمام نحوی اور اہل لغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لفظ 'احد' دو معنی میں مشترک ہے پہلا بمعنی واحد ہے جو دو کا آدھا ہوتا ہے اور دوسرا جنس ذوی العقول (قلیل و کثیر سب کو شامل ہے) کے معنی میں ہے اقل سے بے شمار تک، پہلا والا 'احد' جو بمعنی واحد ہے، اس کا 'فا' کلمہ کا ہمزہ واو سے مبدلہ ہے اور دوسرے والے 'احد' کا ہمزہ اصلی غیر مبدلہ ہے بہرحال یہ مذکورہ معانی ہی شائع و ذائع ہیں لیکن نحویوں کے نزدیک یہ بات ابھی غیر واضح ہے کہ دونوں لفظوں کی صورت اور مادہ ایک ہی ہے اور لفظ وحدۃ ان دونوں لفظوں کو شامل ہے اور اگر 'واؤ' ان دونوں لفظوں میں اصلی ہے تو قطعی طور پر 'الف' کا 'واؤ' سے مشتق کرنا اور دوسرے کو نہ کرنا یہ ترجیح بلا مرجحہ ہے؟

ہم آپ کے اس اشکال کا جواب دیتے ہیں کہ فرق مذکور کی جانب سیبویہ نے 'الکتاب' وغیرہ میں اشارہ کیا ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ ''ان دونوں کا لفظ مادے اور صورۃ کے لحاظ سے ایک ہی ہے'' تو آپ کا یہ قول تو تسلیم ہے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان دونوں لفظوں کا اتحاد، ان کے معانی کے اتحاد پر بھی دلالت کرتا ہے، یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں کا معنی متغایر ہو؟ (الفاظ متحد ہوں معانی متغایر ہوں) اس کی مثالیں بہت ہیں جیسے " قلی فھو قال "

بمعنی بغض رکھنا اور" قلا فھو قال" بمعنی بھوننا، تلنا، پکانا اور نیز یہ کہ وہ لفظ جو بمعنی واحد ہے، وہ عام نہیں ہوتا ہے اور وہ نفی و اثبات میں ہوتا ہے اور عقلا و غیر عقلا سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے وہ جماعت کے معنی میں نہیں ہوتا ہے اور رہا دوسرا والا تو وہ نفی کے ساتھ مختص ہوتا ہے، مبرد کے قول برخلاف اور وہ ذوی العقول کے ساتھ خاص ہوتا ہے، اور بمعنی جماعت آتا ہے اور عام ہوتا ہے برخلاف اول کے کہ وہ عام نہیں ہوتا (خرپوتی ص ۷۵)

اقول: قارئین محسوس کررہے ہوں گے کہ اس فرق کا جواب جس کا سوال سائل نے کیا ہے وہ حاصل نہیں ہوا سائل نے تو یہ کہا تھا کہ "ایک لفظ کو 'وحدۃ' سے مشتق ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا یہ ترجیح بلا مرجح ہے" اور اس کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دو لفظوں کا متحد ہونا، معانی کے متحد ہونے پر دلالت کرتا ہے" غیر محل میں ہے، اس لئے کہ سائل نے تو ان لفظوں کے معانی کے اتحاد کا دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ اس نے دونوں لفظوں کا مادے اور صورت کے لحاظ سے متحد ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

اور ان کا یہ کہنا کہ "فرق مذکور کی جانب سیبویہ نے 'الکتاب' وغیرہ میں اشارہ کیا ہے" تو یہ قول تو اشکال کو رفع کرنے میں ذرا بھی نفع بخش نہیں، اشکال تو اپنی جگہ پر ہی رہا، اور فرق کرنے والے تو وہ معانی و مطالب ہوتے ہیں جو دلیل دے کر فرق کرتے ہیں۔

یہ جو مذکور ہوا اور جو علامہ راغب کی مفردات میں ہے وہ اس کی بعض صورتوں میں مخالفت کرتا ہے اور اس بات کو رد کرتا ہے جو دعویٰ کیا گیا کہ ہمزہ ایک صورت میں مبدلہ اور دوسری صورت میں اصلیہ ہے اس طور پر کہ انہوں نے مطلقا ابدال کی تصریح کی اور اس کو کسی اور مواقع اور جگہ سے مقید نہیں کیا۔ علامہ راغب کی مفردات میں تصریح یوں ہے: 'احد' کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے: ایک تو صرف نفی میں ہوتا ہے اور دوسرا اثبات میں اور رہا نفی کے ساتھ مختص ہونا تو وہ جنس ناطقین کے استغراق کی وجہ سے ہے اور وہ قلیل و کثیر کو اجتماع اور افتراق کے طور پر شامل ہوتا ہے جیسے: مافی الدار احد 'یعنی' واحد' یعنی گھر میں ایک نہیں ہے اور نہ ہی دو اور نہ دو سے زیادہ، نہ بطریق اجتماع اور نہ بطریق افتراق! لہذا اس معنی کی بنیاد پر اس کا اثبات میں استعمال صحیح نہیں ہوگا اس لئے کہ دو

متضاد شئی کی نفی تو صحیح ہے لیکن ان دونوں شئی کا اثبات درست نہیں! اور اگر 'فی الدار و احد' کہا جائے تو ضرور اس میں واحد کا اثبات ہوگا، مافوق الواحد کے اثبات کے ساتھ اجتماعا اور افتراقا اور وہ یقیناً واضح ہے اور اس کا ما فوق الواحد کو شامل ہونے کی وجہ سے یہ کہنا صحیح ہوگا، " ما من احد فاضلین " اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی طرح (فما منکم من احد عنه حاجزين)

اور لفظ' احد' کا اثبات میں مستعمل ہونا تین طریقوں پر ہے:

اول: اس کا استعمال اس واحد میں ہوتا ہے جو عشرات سے ملا ہوا ہو مثلاً احد عشر واحد وعشرين۔

دوم: وہ مضاف یا مضاف الیہ ہو کر بمعنی اول مستعمل ہوتا ہے، مثلا اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے (اما احدكم فيسقى ربه خمرا) اور جیسے کہا جاتا ہے یوم الاحد یعنی یوم الاول، اور یوم الاثنین،

سوم: مطلقا صفت ہو کر مستعمل ہو اور اس معنی کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ کی صفت میں واقع ہوگا باری تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی صفت واقع نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے سبب (قل هو الله احد) اس کی اصل 'وحد' ہے لیکن 'وحد' اس کے علاوہ میں مستعمل ہے جیسے نابغہ کا یہ شعر:

كأن رجلي و قد زال النهار بنا بذى الجليل على مستأنس وحد

(ابر) " البر" مصدر سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے بمعنی صادق فی الکلام ،جیسا کہ سیاق وسباق اس معنی کو مفید ہے اور بمعنی وسعت وکشادگی بھی ہے جیسا کہ علامہ راغب کی مفردات میں ہے اور کبھی قبول کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " حج مبرور "اور کبھی قبول حکم سننے ماننے اور نافذ ہونے کے معانی کو بھی بتاتا ہے، تو ان تمام معانی ومفاہم کی بنیاد پر ناظم شعر کے قول (فلا احد ابر) کا معنی ہوگا کہ کوئی بھی حضور اکرم ﷺ سے زیادہ نہ تو قول کے اعتبار سے سچا ہے نہ شریعت کے اعتبار سے وسعت والا ہے، نہ کلمے کے اعتبار سے موثر ہے، نہ تو کوئی حضور سے زیادہ قبول کئے جانے کا حقدار ہے اور نہ ہی کوئی آپ سے زیادہ سے سننے، جاننے اور اطاعت کئے جانے کا مستحق ہے۔

(فی قول لا) یہ 'ابر' کے متعلق ہے یعنی نہیں ہے کوئی ان سے زیادہ سچا 'لا' کہنے میں اور (لا) یہ نفی سے کنایہ ہے اور ناظم شعر کے اس قول (ولا نعم) کا عطف (لا ابر) ہے یعنی حضور سے سچا کوئی 'نعم' کہنے میں بھی نہیں ہے اور (نعم) یہ اثبات سے کنایہ ہے اور یہاں یہ 'لا اور نعم' دینے یا نہ دینے سے کنایہ نہیں ہے یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بخشش وعطا کرنے اور نہ کرنے سے کنایہ نہیں ہے، اس لئے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کوئی بھی چیز مانگی گئی، اس کے جواب میں حضور نے صرف 'نعم' ہی کہا کسی صاحب کمال نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان اقدس میں کیا خوب کہا ہے۔

ماقال 'لا' قط الا فی تشهده　　　ولا نعم قط الا جاءت النعم

(حضور نے 'لا' صرف کلمۂ شہادت میں فرمایا، اس کے علاوہ کبھی کسی کو نہ نہیں کہا اور نہ ہی کسی کو کبھی 'نعم' کہا مگر اتنے میں نعمتیں آ گئیں)

اور شاعر نے جو یہ کہا کہ ''حضور نے کبھی نہ نہیں فرمایا'' یہ اس بات پر محمول ہے کہ حضور سے جب بھی دنیا کی حوائج کے متعلق دست سوال دراز کیا گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کبھی ''نہیں'' نہ فرمایا بلکہ اگر حضور کے پاس بروقت موجود ہوتی تو فوراً عطا فرما دیتے اور اگر اس وقت وہ شئی موجود نہ ہوتی تو سکوت فرماتے یا بعد میں عطا فرمانے کا وعدہ فرما لیتے نیز کسی نے کہا:

ماقال 'لا' قط الا فی تشهده　　　لولا التشهد كانت لاءه نعم

(ترجمہ: حضور نے 'لا الہ الا اللہ' کے سوا کہیں بھی کبھی 'لا' نہیں فرمایا، اگر تشہد نہ ہوتا تو حضور کا 'لا' بھی 'نعم' ہوتا، یعنی حضور کی 'نہ' بھی 'ہاں' ہوتی)

یہ معنی اکثر کے اعتبار سے ہے ورنہ تو صحیح بخاری میں موجود ہے کہ اشعری حضرات حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر آئے اور آ کر حضور سے سہارا طلب کیا تو حضور نے فرمایا " واللہ لا احملکم (حدیث) (واللہ میں تم لوگوں کو سواری نہیں دوں گا)

روحانی فائدہ

اس شعر کی اور اس سے پہلے والے شعر کی خاصیت، مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہونے سے چھٹکارا پانا ہے، تو جو شخص ان دونوں اشعار کو پڑھنے پر مواظبت اختیار کرتا ہے وہ مصائب میں پڑنے سے آزاد رہتا ہے اور اگر کوئی شخص ان اشعار کو پڑھنے سے پہلے کسی پریشانی میں مبتلا ہوا اور پھر اس نے ان اشعار کو آدھی رات میں پڑھنا شروع کیا اور نبیٔ اکرم ﷺ کے وسیلے سے دعا کی، تو انشاء اللہ اس سے وہ پریشانی رفع ودفع ہو جائے گی: علامہ باجوری نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين

یہ اس قصیدۂ مبارکہ کی فصل ثالث کا آٹھواں شعر ہے، ہم بعون اللہ تعالیٰ اس شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۶) هو الحبيب الذى ترجىٰ شفاعته لكل هول من الاهوال مقتحم

(ترجمہ: وہی اللہ کے حبیب ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے اور جن کی شفاعت ہی سے تمام سختیوں اور ہولناکیوں کے آپڑنے کے وقت توقع ہے)

ربط: شاعر ذی فہم کا یہ شعر محل تعلیل میں ہے، انہوں گزشتہ دعوے پر دلیل در دلیل دی ہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ آقائے دو عالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ سید الکونین ہیں دونوں جہاں کے سردار ہیں تو اب ناظم شعر یہاں اسی دعوے کو بہترین انداز اور مزید وضاحت کے ساتھ مخاطب سے بیان کرنا چاہتے ہیں، اسی وجہ سے ناظم فرماتے ہیں (هو الحبيب الذى۔الخ) صلى الله تعالىٰ على الحبيب المشفع ۔ ضمیر فصل ھُوَ یا تو اسم رسالت (محمد ﷺ)

کی جانب راجع ہے یا پھر (نبینا) کی طرف اور جملہ اسم رسالت 'محمدؐ' کی صفت کے بعد صفت ہے اور ضمیر منفصل افادۂ حصر کے لئے لائے ہیں اور حصر یہاں حصر حقیقی ہے نہ کہ اس طرح جو کہا جاتا ہے " زید ھو المنطلق "اور ضمیر فصل 'ھو' مبتداء ہے اور 'الحبیب' اس کی خبر ہے اور خبر کو معرفہ، صفت حبیب کو اس موصوف پر منحصر کرنے کے لئے لائے جو مبتداء ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے حبیب اللہ ہونے پر قرآن وحدیث سے شواہد

اور حضور کا حبیب ہونا، قرآن کی دلالت النص اور حدیث کے عبارۃ النص سے ثابت ہے۔

رہا قرآن سے ثبوت، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے (ما ودَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلىٰ)، دلالت نص سے یہ مستفاد ہے کہ آپ ﷺ، اللہ تبارک وتعالیٰ کے علی وجہ الکمال حبیب ہیں اس لئے کہ ہر ایک کی اپنے شناسا کے ساتھ تین حالتیں ہوتی ہیں۔(۱) یا تو وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے (۲) یا وہ اسے مکروہ جانتا ہے (۳) یا پھر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو جب رب تعالیٰ نے 'تودیع' (چھوڑنے) اور 'قلی' (مکروہ جاننے اور نفرت کرنے) کی نفی کر دی تو یہ اس بات پر دلیل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ مکروہ جانا بلکہ آپ کو اپنا حبیب بنالیا، نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے (یٰآیھا النبی) (یٰآ ایھا المزمل) (یٰآ یھا المدثر) اس طور پر کہ رب نے تمام انبیائے کرام کو ان کے اسماء کے ساتھ ندا فرمائی لیکن اپنے حبیب کو نام کے ساتھ ندا نہ فرمائی۔

اور اللہ فرماتا ہے (عفا اللہ عنك) یہ آیت اس طور پر دلیل ہے کہ معافی کی بشارت کو عتاب پر مقدم کیا، نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان (لیغفر لك اللہ ما تقدم من ذنبك و ما تأخر) بھی حضور کے حبیب ہونے پر دلیل ہے، اس حیثیت سے کہ اس آیت پاک میں حضور کو معافی وغفران کی بشارت دی گئی باوجودیکہ حضور کے یہاں گناہ و عصیان کا کوئی تصور ہی نہیں، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کو معصیت سے محفوظ ومعصوم کیا ہے، بلکہ (حقیقت تو یہ ہے کہ) اس طرح بیان فرما کر حضور کی عصمت اور معصومیت کی خبر دی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منصب شفاعت پر متمکن فرمایا ہے نیز آپ ﷺ کو اگلوں اور پچھلوں کے عفو وغفران کا

سبب کیا تو اسی وجہ سے بخشش وغفران کی تعمیم کی گئی آپ کے ماسوا کے لئے۔

اور حضور کے حبیب ہونے پر سب سے مضبوط دلیل، اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے، (قل ان کنتم تحبون الله فاتبعون يحببكم الله) اس لئے کہ جو حضور کی شرف متابعت کے ذریعے اور حضور کی اتباع کرکے، محبوبیت کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے تو حضور اکرم ﷺ کا حبیب اللہ ہونا تو سب سے زیادہ مناسب ہے اور یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ حبیب، خلیل سے افضل ہو۔

"لطائف الاشارات" میں ہے کہ حبیب وخلیل میں یہ فرق ہے کہ خلیل نے کہا (فمن تبعنی فانه منی) اور حبیب نے کہا (فاتبعونی يحببكم الله) ، تو خلیل کا متبع ان کا ہوا اور حبیب کا متبع اللہ کا محبوب ہوا۔ اور حضور اکرم رسول مکرم کا خیر الانبیاء والرسل ہونا، اس آیت سے مستدل ہے (كنتم خير امة اخرجت للناس) اور خیر الانبیاء والرسل ہونا آپ ﷺ کے علی وجہ الکمال حبیب ہونے کو مستلزم ہے

اور اب رہا حدیث سے ثبوت، تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعض صحابہ کی مجلس سجی ہوئی تھی اسی اثنا میں حضور کا ان پر سے اس حال میں گزر ہوا کہ وہ حضرات آپس میں مذاکرے میں مشغول تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل کیا (تو وہ خلیل اللہ ہیں) دوسرے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا (تو وہ کلیم اللہ ہیں) تیسرے نے کہا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں، چوتھے نے کہا کہ حضرت آدم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منتخب کیا (اور خلیفۃ اللہ کیا) تو اتنے میں نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا" سمعت كلامكم و عجبكم۔ الخ میں نے تمہاری گفتگو اور تمہارے حیرت واستعجاب کا ملاحظہ کیا، تم نے کہا ابراہیم خلیل ہیں، بے شک وہ ہیں، تم نے کہا موسیٰ کلیم اللہ ہیں بے شک وہ ہیں، تم نے کہا عیسیٰ روح اللہ وکلمۃ اللہ ہیں بے شک وہ ہیں تم نے کہا آدم اللہ کے منتخب ہیں بیشک وہ ہیں، مگر سن لو میں حبیب اللہ ہوں، لیکن کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن لوائے حمد کو اٹھانے والا ہوں جس کے نیچے آدم اور ان کے علاوہ وہ سبھی ہوں گے لیکن کوئی فخر نہیں، میں روز جزا سب سے پہلے شفاعت

کرنے والا ہوں گا لیکن فخر نہیں میں وہ ہوں جو سب سے پہلے جنت کے حلقے کو حرکت دوں گا تو اللہ اسے کھول دے گا اور پھر مجھے فقرائے مومنین کے ساتھ اس میں داخل فرمائے گا، لیکن فخر نہیں اور میں اکرم الاولین والآخرین ہوں، مگر فخر نہیں'' (الحدیث)

تو جب اس حدیث پاک میں حضور کے حبیب اللہ ہونے کا ذکر، حضور کے شفیع ہونے کے ساتھ ہے تو ناظم نے اسی وجہ سے شعر میں حضور کی شفاعت کو حضور کے حبیب ہونے کے ساتھ ہی ذکر کیا اور اسی وجہ سے انہوں نے دونوں مفہوم کو ایک ہی لڑی میں پرویا ہے۔ (شیخ زادہ ص ۷۷)

حضور اکرم ﷺ کی شفاعت کا بیان

اور اب جبکہ آپ ﷺ کی محبوبیت کے ذکر نے ہمیں حدیث شفاعت تک لا پہنچایا، جس کا ذکر ابھی حدیث پاک میں گزرا، تو مناسب معلوم دیتا ہے کہ اب ہم شفاعت کے معانی و مفاہیم بیان کریں اور ان بعض معانی کی تفصیل کریں جو شفاعت کے متعلق وارد ہوئے ہیں نیز ان مراتب کا بھی ذکر کریں جن سے احادیث کے اختلافات میں جمع و تطبیق ہو سکے، تو میں عرض کرتا ہوں کہ علامہ سیف اللہ المسلول فضل رسول '' المعتقد المنتقد '' میں فرماتے ہیں:

انہیں اعتقادات میں سے یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی بھی امتی (اور نہ صرف امتی) بلکہ تمام انبیاء میں سے ہر ایک حضور کی جاہ و منزلت سے مستغنی نہیں ہوں گے اور جب تک حضور شفاعت کا دروازہ نہیں کھولیں گے، کوئی بھی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ (ص:۱۵۱)

اور جد کریم امام احمد رضا '' المستند المعتقد '' میں ان کے اس قول کہ ''جب تک حضور شفاعت کا دروازہ نہیں کھولیں گے، کوئی بھی شفاعت نہیں کر سکے گا'' کے تحت فرماتے ہیں:

یہ ایک معنی ہے، حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان عالی شان کے معانی میں سے کہ (انا صاحب شفاعتهم) یعنی میں ان کی شفاعت کا مالک ہوں اور دوسرا معنی اس سے زیادہ لطیف و اشرف ہے کہ اللہ ذی العرش جل جلالہ کی

بارگاہ میں سوائے قرآن اور اس حبیب مرتجیٰ ﷺ کے علاوہ کسی کو بلا واسطہ شفاعت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا لیکن رہے باقی تمام شفیع جیسے ملائکہ انبیاء اولیاء، علماء، حفاظ، شہداء، حجاج، صلحاء وغیرہ تو ان سب کی پہنچ حضور کی بارگاہ تک ہی ہوگی اور وہ سب حضور کے یہاں سفارش کریں گے اور پھر حضور جن کا انہوں نے ذکر کیا ہوگا اور جن کا نہیں کیا ہوگا، سب کی شفاعت فرمائیں گے اپنے رب کی بارگاہ میں۔

علامہ فضل رسول بدایونی مزید فرماتے ہیں:

تو آخرت میں شفاعت اسی معنی میں ہے اور اس کا وجوب قرآن وسنت سے ثابت ہے، رہا اول الذکر سے ثبوت تو اللہ فرماتا ہے (عسیٰ ان یبعثك ربك مقاما محمودا)، (ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ)، (من ذا الذی یشفع عنده الا باذنه)، (یومئذ لا تنفع الشفٰعة الا من اذن له) اور کافروں کے حق میں فرماتا ہے (فما تنفعهم شفٰعة الشٰفعین)، تو اگر مومنین کے حق میں شفاعت ثابت نہ ہو تو کافروں کے لئے شفاعت نہ ہونے کی تخصیص بے فائدہ ہوجائے، اور فرماتا ہے (و استغفر لذنبك وللمومنین والمؤمنٰت)

اور رہا سنت سے ثبوت، تو نبیٔ اکرم ﷺ فرماتے ہیں ہر نبی کے لئے ایک ایسی دعا ہے جو مقبول ہے تو کچھ انبیاء نے اس سے اپنی قوم کو بددعا دی، اور کچھ نے اس کو دنیا میں استعمال کرلیا اور میں نے اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لئے مؤخر کررکھا ہے، اس شخص کے لئے جس نے کہا ''لا الہ الا اللہ '' حضور اور فرماتے ہیں ''مجھے ان دو چیزوں میں اختیار دیا گیا کہ یا تو میری آدھی امت جنت میں داخل ہوجائے یا تو شفاعت اختیار کروں تو میں نے شفاعت کو اختیار کیا، کیوں کہ وہ سب کو شامل ہے، کیا تم شفاعت کو صرف متقین کے لئے گمان کرتے ہو، نہیں، بلکہ وہ خطاکاروں گنہگاروں کے لئے بھی ہے'' مزید آقا علیہ السلام نے فرمایا کہ میں زمین کے شجر وحجر سے بھی زیادہ لوگوں کو کل قیامت کے دن شفاعت کروں گا'' اور فرمایا ''میری شفاعت میری امت کے بڑے گنہگاروں کے لئے ہے'' (بہرحال) شفاعت کے متعلق صحاح اور حسان میں حدیثیں مختلف الفاظ کے ساتھ اتنی

روایت کی گئی ہیں کہ اگر میں یہاں ایک ایک بھی بیان کروں تو وہ ضرور شفاعت کے اثبات میں حد تواتر کو پہنچ جائیں گی۔

اور آپ ﷺ کی شفاعت کی کئی قسمیں ہیں: ان میں سے میدان محشر کی ہولنا کی سے مخلوق کو راحت پہنچانے کی شفاعت ہے، اور یہ شفاعت باتفاق مسلمین ثابت ہے حتی کہ معتزلہ بھی اس میں متفق ہیں اور یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے اوران شفاعت کی قسموں میں سے بعض لوگوں کو بے حساب و کتاب جنت میں داخل کرنے کی شفاعت ہے، اوران میں سے حساب کے بعد اوراس کے دخول نار کے مستحق ہو جانے کے بعد، جہنم سے نجات اور عدم دخول کی شفاعت ہے اوران میں سے بعض موحدین کو جہنم سے نکالنے کی شفاعت ہے اوران میں سے درجات کو بڑھانے کی شفاعت ہے اوران میں سے طاعت و فرماں برداری میں کوتاہی کو نظر انداز فرمانے کی شفاعت ہے اوران میں سے تخفیف عذاب کی شفاعت ہے بعض جگہوں اور وقتوں میں ان لوگوں کے لئے جو خلود فی النار کے مستحق ہوئے جیسے ابو طالب، اوران میں سے مشرکین کے چھوٹے بچوں کو جنت میں داخل کرنے کی شفاعت ہے اوران میں سے ان کی شفاعت کرنا ہے جو مدینہ منورہ میں وفات پایا اوراس کی تکلیف پر صابر رہا اور جس نے حضور کے اس دنیا سے وفات پا جانے کے بعد آپ کے روضہ کی زیارت کی اور جس نے مؤذن کا جواب دیا اور (بعد اذان) آپ کے لئے وسیلے کی دعا کی اوراس کے لئے جس نے جمعہ کے دن ورات میں حضور پر درود بھیجی اوراس کے لئے جس نے چالیس حدیثیں یاد کر کے اس پر عمل کیا اوراس کے لئے جس نے ماہ شعبان کے روزے حضور ﷺ کو محبوب ہونے کی وجہ سے رکھے اوراس کے لئے جس نے اہل بیت پاک کی مدح وثنا کی وغیرہ ذالک شفاعتیں ہیں جو حدیث پاک میں وارد ہوئی ہیں (ص:۱۵۲،۱۵۳)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں سب سے پہلے اٹھوں گا جب لوگ (قبروں سے) نکالے جائیں گے، میں ان کا قائد ہوں گا جب وہ (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) حاضر ہوں گے، میں (ان کے جانب) سے بولنے والا ہوں گا (رب کی بارگاہ میں) جس وقت کہ وہ خاموش ہوں گے، میں ان کا شفیع

ہوں گا جب وہ قید کرلئے جائیں گے میں ان کو بشارت سنانے والا ہوں گا جب وہ مایوس ہوں گے، کرامت و بزرگی اور (جنت کی) کنجیاں اس دن میرے ہاتھ میں ہوں گی، لوائے حمد اس دن میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں ہی اللہ کے یہاں بنی آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں، میرے ارد گرد ہزاروں خدمت گزار ایسے گھومتے رہتے ہیں جیسے پوشیدہ جوہر آبدار ہوں یا بکھرے ہوئے موتی۔'' یہ حدیث امام ترمذی اور امام دارمی نے روایت کی ہے، امام ترمذی نے اس حدیث پاک کو غریب بتایا ہے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن تمام نبیوں کا سردار اور ان کا خطیب اور ان کی شفاعت کا مالک ہوں گا، لیکن فخر نہیں۔

قال الازهری: یہ حدیث پاک اس بات کی تائید و توثیق کرتی ہے جس کی تصریح جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ سے ابھی ماسبق میں گزری کہ آپ نے "المعتمد المستند" میں فرمایا کہ اللہ ذی العرش العظیم کی بارگاہ میں، سوائے قرآن عظیم اور اس حبیب امید گاہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلا واسطہ کسی کو شفاعت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس امر کا مشاہدہ کرایا گیا جو میرے بعد میری امت کو پیش آئیں گے، ایک دوسرے کا خون بہائیں گے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ پیش آئے گا جو سابقہ امتوں کو پیش آیا اسی وجہ سے میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے عرض کی کہ مجھے قیامت کے دن شفاعت عطا فرمادے (ان کے معاملے میں) تو اللہ نے عطا فرمادی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کو شفاعت کے سلسلے میں کیا عطا ہوا؟ فرمایا، میری شفاعت اس کے لئے ہے جس نے خلوص دل سے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (کہ اس کی زبان اس کے دل کی تصدیق کرتی ہو)

اور حضرت نضر ابن انس کی حدیث میں ہے جو انہوں نے اپنے والد سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے

فرمایا کہ میں پل صراط کے قریب کھڑا اپنی امت کا انتظار کررہا ہوں گا کہ اتنے میں حضرت عیسیٰ آکر کہیں گے کہ اے محمد رسول اللہ یہ انبیاء کرام آپ کے پاس یہ گزارش لیکر آئے ہیں کہ آپ بارگاہ الٰہی میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ تمام امتوں کو جیسے چاہے پار فرمادے بوجہ اس عظیم معاملے کے جس میں وہ مبتلا ہیں۔

'مواھب الدنیه' اور ''شفا شریف'' میں کثرت کے ساتھ اس موضوع پر حدیثیں نقل کی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر ہم نے جو حدیثیں یہاں نقل کی ہیں وہ کافی ووافی ہیں۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ شفاعت کے اقسام میں سے اس جماعت کی شفاعت کرنا بھی ہے جو جہنم میں داخل ہو چکی ہو کہ وہ آپ کی شفاعت سے دوزخ سے نکل آئے اور یہ شفاعت صرف آپ ہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اوروں کے لئے بھی ثابت ہے جیسے علماء واولیاء وغیرہ نیز اسی میں سے جنت میں لوگوں کے درجات بلند کرنے کی شفاعت ہے اور اس شفاعت کا آپ ﷺ کے ساتھ مختص ہونا ثابت نہیں ہے۔

اقول:۔ آقائے دوعالم ﷺ کے اس فرمان (انا صاحب شفاعتھم) سے وہی معنی ظاہر ومستفاد ہے جو مواھب سے گزرا کہ آپ ﷺ کا رب کی بارگاہ میں بلاواسطہ شفاعت کرنا صرف آپ ہی کے ساتھ مختص ہے جیسا کہ جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ نے بیان فرمایا ہے، ہم گزشتہ اوراق میں ان کے کلام کو نقل کرآئے ہیں اور اس حدیث کو بھی نقل کر چکے ہیں جو ان کے کلام کی تائید کرتی ہے۔فتذکر! اسی لئے شفا اور مواھب میں روایتوں کے اختلاف کو وہاں ذکر نہیں کیا۔

مبحث ابی طالب

یہ (ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ) علامہ باجوری وغیرہ نے بھی آپ ﷺ کی اس شفاعت کے بارے میں موافقت کی ہے کہ آپ ﷺ بعض کافروں کی، ان کے اوپر سے تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے اور علامہ باجوری نے اس کی مثال میں آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کا ذکر کیا ہے لیکن باجوری اس سلسلے میں منفرد ہیں، انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس میں قابل ذکر اختلاف ہے۔

علامہ باجوری اس کے متعلق اپنی شرح میں یوں تصریح فرماتے ہیں ''اس میں سے (یعنی شفاعت کی قسموں میں سے) آپ ﷺ کا بعض کافروں کے اوپر سے تخفیف عذاب کی شفاعت کرنا ہے، مثلا ابوطالب کے اوپر سے تخفیف عذاب فرمانا، اور یہ تخفیف عذاب کی شفاعت ابوطالب ان کے لئے اس قول کی بنیاد پر ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ نہیں فرمایا کہ وہ زندہ ہونے کے بعد آپ ﷺ پر ایمان لے آئے ہوں یہی قول مشہور ہے اور وہ لوگ جو اہل بیت پاک سے محبت کرتے ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ ابوطالب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوبارہ زندہ فرمایا اور پھر وہ آپ ﷺ پر ایمان لائے، اللہ تعالیٰ تو ہر ممکن شئی پر قادر ہے اور آپ ﷺ کا بعض کافروں سے تخفیف عذاب کی شفاعت کرنا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان (لا یخفف) کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس فرمان باری تعالیٰ میں تو صرف تخفیف عذاب کفر کی نفی کی گئی ہے (یعنی ان کے اوپر سے صرف کفر کا عذاب کم نہیں ہوگا) لیکن رہا کفر کے علاوہ کا عذاب تو آیت پاک اس کے منافی نہیں ہے کہ حضور کی شفاعت سے ان کے اوپر سے غیر کفر کے عذاب کی تخفیف ہو جائے (حاشية الباجوری علی متن البردہ ص ۲۳)

تو جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ علامہ باجوری کی مذکورہ بالا عبارت میں ان کی جانب سے یہ تصریح ہے کہ جمہور علماء وفقہاء اور سواد اعظم کا یہی موقف ہے کہ ابوطالب کی کفر پر موت ہوئی اور علامہ باجوری بھی جمہور میں سے ہیں اور ان کا بھی وہی موقف ہے جو جمہور کا ہے اس طرح کہ انہوں نے تسلیم کیا کہ ابوطالب کے ایمان نہ لانے کا قول ہی مشہور ہے اور انہوں نے اقرار وقبول کے ضمن میں ابوطالب کے زندہ کئے جانے اور پھر ایمان لانے والی بات کی تردید فرمائی اور اہل بیت پاک سے محبت تو صرف اس نسبت کی وجہ سے ہے جو ان کو مصطفیٰ جان رحمت ﷺ سے ہے اور ایمان کی شرط حضور ﷺ سے محبت ہے اور آپ ﷺ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نفسانی خواہشات ان تمام امور کی تابع ہو جائیں جن کو آقا علیہ السلام لے کر تشریف لائے جیسا کہ خود آپ ﷺ نے فرمایا'' لا یومن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به'' یعنی تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک اس کی خواہشات ان تمام چیزوں کی تابع نہ ہو جائین جن کو میں لے کر آیا ہوں۔

اور تمام اہل بیت پاک بھی اسی سلسلے میں منسلک ہیں جنہوں نے ابو طالب کی کفر پر موت کے بارے میں اتفاق کیا تو اہل بیت پاک سے محبت، بھی اتباع شرع اور ان کی ہدایت کی پیروی ہی میں ہے اور ان سے محبت یہ نہیں کہ ان کی ہدایت رد کرکے، اجماع مسلمین کے خلاف کیا جائے اور اگر معاملہ صرف ان سے محبت کا ہوتا چاہیں جیسے ہوتو ضرور یہ طریقہ حضرت علی کے شیخین سے افضل ہونے کے اعتقاد تک لے جاتا اور اس کے علاوہ ان اعتقاد تک پہنچا دیتا جو شیعوں کے معمولات ہیں دعویٰ محبت اہل بیت کی وجہ سے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ علامہ باجوری نے جو یہ بیان کیا وہ بعض فتنہ پرور لوگوں کی جانب سے فریب دہی ہے، اور یہاں علامہ باجوری کے کلام میں دو جگہ صریح تضاد موجود ہے اس طرح کہ علامہ باجوری نے پہلے تو اقرار کیا کہ ایمان نہ لانے والی بات ہی مشہور ہے اور پھر اس بات کی تائید کرتے چلے گئے لیکن بعد میں ثانی الذکر موقف کی تائید اور اس میں ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے لگے۔

جد کریم سیدنا امام احمد رضا قدس سرہ کا اس موضوع پر ایک مستقل جامع رسالہ ہے جس کو انہوں نے "شرح المطالب فی کفر ابی طالب" کے نام سے موسوم کیا ہے، تو اس مقام کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم دیتا ہے کہ اس میں سے کچھ باتیں ہم نقل کردیں جو مقصود اور مرام تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوں اس طرح کہ جد کریم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تمام علمائے کرام نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ ابو طالب کے کفر پر اجماع ہے۔

پھر آپ بعض نصوص کی تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: شرح المقاصد" "شرح التحریر" اور" رد المحتار علی الدر المختار" کے باب المرتدین میں آیا ہے کہ مطالبہ اقرار کے باوجود، عدم اقرار پر مصر رہنے والا بالاتفاق کافر ہے، اس لئے کہ وہ عدم تصدیق کی علامتوں میں سے ہے۔

اور ملا علی قاری ''شرح شفا'' میں فرماتے ہیں جس شخص کو کلمۂ شہادت ادا کرنے کا حکم دیا جائے اور وہ باز رہے اور کلمۂ شہادت ادا کرنے سے انکار کرے جیسے ابو طالب تو بالاجماع کافر ہے۔

"مرقاۃ شرح مشکاۃ" میں علماء کا اس شخص کے سلسلے میں اختلاف نقل کرنے کے بعد جس نے قلب سے تصدیق کی اور بغیر کسی عذر و مانع کے زبان سے اقرار کرنے کا کہ آیا یہ اعتقاد بغیر اقرار کے، اسے آخرت میں کچھ نفع

پہنچائے گا کہ نہیں؟ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ یہ اختلاف علماء کے مابین اس صورت میں ہے کہ جب اس سے اقرار وقبول اسلام طلب نہ کیا گیا ہو، لیکن اگر مطالبۂ قبول اسلام کے بعد وہ انکار کرتا ہے تو وہ بالاجماع کافر ہے جیسے ابوطالب کا معاملہ ہے۔

اس کتاب کے باب "اشـراط السـاعة" کی فصل ثانی میں ہے کہ ابوطالب اہل سنت کے نزدیک ایمان نہیں لائے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی "سـفـر السعـادہ" کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مشائخ وعلمائے اہل سنت اس موقف پر ہیں کہ ابوطالب کا ایمان لانا ثابت نہیں اور صحاح ستہ میں وارد ہوا کہ آقا علیہ السلام ان کے پاس ان کے موت کے وقت تشریف لائے اور ان پر اسلام پیش کیا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔

علامہ ابن حجر مکی اس شعر کو ذکر کرنے کے بعد جو صحیح بخاری میں مروی ہے وہ شعر یہ ہے 'ابیـض یستسـقـی الـغـمـام بـوجهـه" فرماتے ہیں کہ یہ شعر ابوطالب کے مجموعۂ قصیدہ میں سے ہے، اس میں آپ ﷺ کی عجیب طریقے سے مدح ہے کہ شیعہ اس قصیدے سے ان کے اسلام لانے کا قول کرتے ہیں۔

اہل بیت پاک میں سے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ابوطالب کے کفر کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں کہ یہ اہل بیت پاک میں سے سب کے سردار حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ابوطالب کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ مشرک ہے اور آپ نے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم فرمانے کے باجود ان کے تجہیز وتکفین میں تامل عرض کیا اور سید السادات، سید الکائنات عـلـيه و على آله افضل الصلوات و اكمل التحيات نے پھر اقرار کروایا پھر بھی حضرت علی جنازے میں شرکت سے باز رہتے۔ نیز سیدنا جعفر اور سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما مسلمان ہونے کی وجہ سے کفار کے ترکہ سے میراث نہیں پاتے سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میراث نہ پانے کی وجہ ابوطالب کے کفر کو بتاتے ہیں اور پھر داماد اہل بیت امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم اس سے استدلال کرتے ہیں کہ مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوگا اور حضرت سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوئی ابوطالب کے بارے میں جب سوال کرتا تو وہی جواب دیتے جو مذکور ہوا یعنی نبی اکرم ﷺ کے اس قول "هـو فـی ضحضـاح" کی طرف

اشارہ کرتے کہ وہ جہنم کے کم گہرے گڑھے میں ہے (یعنی جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں نہیں ہے) اور سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت (وان یھلکون الا انفسھم) ابوطالب کے حق میں نازل ہوئی۔ الخ

قارئین کرام کو یہ بتانا ہم بھول نہ جائیں کہ علامہ باجوری نے جو یہ کہا ''کہ وہ لوگ جو اہل بیت پاک سے محبت رکھتے ہیں ایمان ابوطالب کے قائل ہیں'' ان کا یہ قول ان حضرات پر تہمت وافتراء پر مشتمل ہے جو کفر ابوطالب کا قول کرتے ہیں یعنی یہ ان کی جانب سے جمہور علماء وفقہاء پر اہل بیت پاک سے محبت نہ کرنے کا الزام واتہام ہے اور جیسا کہ قارئین کرام جانتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا الزام ہے جس کی طرف اس عبارت کا مفہوم مخالف پہنچا رہا ہے کیوں کہ کتاب کے تمام مفاہم حجت ہوتے ہیں اس لئے یہ اس قول کے الحاق ہونے کے گمان کو قوی کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے قوی گمان یہی ہے کہ یہ عبارت الحاق ہے اس لئے کہ علامہ باجوری جیسے عظیم وجلیل فاضل سے اس طرح کی بات کا صدور متصور نہیں۔

اس بات کی وضاحت ہوگئی اور دوسری بات یہ ہے کہ علامہ ابن حجر مکی کی " النعمة الکبریٰ" میں بھی وہی بات واضح ہے جو علامہ باجوری کی " شرح البردہ" میں مذکور ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کے والدین کریمین کے ساتھ ابوطالب کے دوبارہ احیاء کئے جانے والی بات کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے اس قول کو علامہ قرطبی کی جانب اس طرح منسوب کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کے والدین کریمین اور چچا ابوطالب کو دوبارہ زندہ فرمایا یہاں تک کہ وہ زندہ ہونے کے بعد آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور علامہ قرطبی نے ' التذکرہ ' میں اس بات کا ذکر کیا ہے'' پھر علامہ ابن حجر مکی نے خود اپنے قول کو " افضل القری لقراء ام القری " میں رد کر دیا اور علامہ قرطبی کی تصریحات کی بھی " المفھم " میں مخالفت کر دی۔ علامہ ابن حجر مکی کی تصریح شرح مطالب سے گزر چکی نیز ان باتوں کا رد تصریحات قرطبی بھی کر رہی ہیں کہ علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں متعدد جگہ اس کا بیان کیا ہے تو علامہ

قرطبی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (وھم ینھون عنه و ینئون عنه و ان یھلکون الآ انفسھم) کے تحت یہ کہتے ہوئے تصریح کرتے ہیں کہ یہ قول تمام کفار کے لئے عام ہے، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ کفار لوگوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے سے روکتے ہیں اور خود بھی دور بھاگتے ہیں۔

لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ آیت پاک ابو طالب کے ساتھ خاص ہے کہ جو کفار کو حضور کی ایذا رسانی سے تو روکتے تھے مگر خود ایمان لانے سے دور بھاگتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مزید روایت ہے اور اہل سیر نے بھی اس کو روایت کیا کہ آپ نے فرمایا کہ ایک دن نبیٔ اکرم ﷺ کعبۂ معظّمہ کی جانب نماز پڑھنے کے ارادے سے نکلے تو جب آپ نے نماز شروع کردی تو ابوجہل لعنة الله علیه بولا کہ کیا کوئی ہے جو اس شخص کے پاس جائے اور اس کی نماز فاسد کردے؟ (العیاذ بالله) چنانچہ ابن زبعری کھڑا ہوا اور اس نے خون اور لید لے کر نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کو آلود کردیا (نعوذ بالله من ذالك) جس کی وجہ سے نبیٔ اکرم ﷺ اپنے نماز سے الگ ہوگئے پھر آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے پاس آکر فرماتے ہیں کہ اے چچا کیا آپ کو نہیں پتہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ، ابو طالب کہتے ہیں کہ یہ کس نے کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا عبداللہ ابن زبعریٰ نے (اتنا سنتے ہی) ابو طالب کھڑے ہوئے اور اپنی تلوار کو اپنے کندھے پر رکھ کر، آپ ﷺ کے ساتھ قوم کے پاس آئے ، پھر جب قوم نے ابو طالب کو آتے دیکھا تو سب کھڑے ہونے لگے، تو ابو طالب نے کہا کہ خدا کی قسم اگر کوئی بھی شخص کھڑا ہو تو میں اس کی اپنی تلوار سے گردن ماردوں گا، تو سب بیٹھ گئے یہاں تک کہ وہ لوگوں تک پہنچ گئے ، پھر کہتے ہیں بیٹے ، بتاؤ یہ حرکت کس بد بخت نے کی ہے؟ فرمایا عبداللہ ابن زبعریٰ نے تو ابو طالب نے لید اور خون لے کر ان سبھوں کے چہروں داڑھیوں اور کپڑوں پر سان دیا اور ان کو برا بھلا کہا۔ تب اس موقعہ پر یہ آیت پاک نازل ہوئی (وھم ینھون عنه و ینئون عنه) تو نبیٔ اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ چچا آپ کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے، بولے وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ آپ قریش کو میری ایذا رسانی سے روکتے ہیں لیکن مجھ پر ایمان لانے سے انکار

کرتے ہیں۔تب ابوطالب نے یہ اشعار کہے تھے۔

واللہ لن یصلوا الیک بجمعھم حتی او سد فی التراب دفینا

(خدا کی قسم وہ (قریش جو آپ کے دشمن ہیں) ہرگز آپ کو ایذا رسانی نہیں کرسکیں گے یہاں تک کہ میں زمین میں دفن کر دیا جاؤں)

فاصدع بامرك ما علیک غضاضۃ و ابشر بذالک و قر منک عیونا

(تو آپ بلا جھجک خوشی سے اعلان حق کریں آپ کے لئے کوئی پریشانی نہیں اور آپ خوش رہیں اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھیں۔)

ودعوتنی و زعمت انک ناصحی فلقد صدقت و کنت قبل أمینا

(اور آپ مجھے دین حق کی طرف بلاتے ہیں اس یقین سے کہ آپ میرے ناصح ہیں،تو بے شک وشبہ آپ سچ کہتے ہیں اس لئے کہ آپ یہ دعوت اسلام پیش کرنے سے پہلے امین تھے)

و عرضت دینا قد عرفت بانہ من خیر ادیان البریۃ دینا

(اور آپ نے مجھ پر دین اسلام پیش کیا، یقیناً میں یہ بات جانتا ہوں کہ یہ دین دنیا کے تمام دینوں سے افضل ہے

لولا الملامۃ او حداز مسبۃ لوجدتنی سمحا بذالک یقینا

(لیکن اگر ملامت کا اندیشہ نہ ہوتا یا برا بھلا کہے جانے کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً آپ مجھے اس سلسلے میں کشادہ قلب پاتے)

صحابۂ کرام نے حضور سے عرض کیا ''یا رسول اللہ'' ابوطالب کو ان کی حمایت ونصرت نے کچھ فائدہ پہنچایا کہ نہیں؟ فرمایا ہاں دین اسلام کی نصرت کرنے کی وجہ سے ان کے اوپر سے سخت پیاس کا عذاب ہٹا دیا گیا اور ان کو شیاطین کے ساتھ نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی ان کو سانپ اور بچھو کے گہرے کنویں میں داخل کیا گیا ان کا عذاب صرف آگ کی دو جوتیوں میں ہے (جو ان کے پیر میں ہیں) جن کی وجہ سے ان کے سر میں ان کا دماغ جوش مارتا ہے اور وہ تمام

جہنمیوں میں سب سے کم تر عذاب پانے والے ہیں۔اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول پر یہ آیت نازل فرمائی کہ (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل) (الاحقاف: ۳۵)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول مکرم ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا " قـل لا اله الا الله اشهد لك بها يوم القيامة" کہ آپ بس لا اله الا الله فرمادیں میں کل قیامت کے دن اس شہادت کے سبب آپ کی گواہی دے دوں گا ، ابو طالب نے جواب دیا کہ اگر قریش مجھے عار نہ دلاتے کہ وہ کہیں گے کہ موت کے ڈر نے ابوطالب کو یہ کہنے پر مجبور کردیا، اگر اس عار کا خوف نہ ہوتا تو بیٹا میں وہ گواہی دے کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا'' تب اس موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (انك لا تهدی من احببت ولكن اللـه يهدی من يشاء) [القصص: ۵۶]،اسی طرح روایت مشہور ہے (حدیث پاک میں لفظ آیا ' الـجزع ') یہ جیم اور 'زا' کے ساتھ بمعنی خوف ہے اور حضرت ابوعبیدہ نے فرمایا کہ 'الجزع' کے بجائے" الخرع" خائے منقوطہ اور رائے مہملہ کے ساتھ بمعنی ضعف وکمزوری ہے۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہنمیوں میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کا ہوگا، ان کو آگ کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جس سے ان کا دماغ ابل پڑے گا (۴۰۵/۲۔ ۴۰۶)

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان (انك لا تهدی من احببت) کے تحت علامہ زجاج فرماتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ آیت پاک ابوطالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ (۲۹۹/۱۳)

اس آیت (ما كان للنبی و الذين آمنوا) کے تحت ان کی یہ تصریح موجود ہے:

امام مسلم نے حضرت سعید ابن مسیّب کی روایت بیان کی جو انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ابوطالب کو جب وفات کا وقت قریب ہوا تو نبی اکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو آپ نے وہاں دیکھا ابو جہل اور عبداللہ ابن ابی امیہ ابن مغیرہ موجود ہیں، پھر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اے چچا جان، آپ بس کلمۂ لا الــه الا اللــه ادا

کر دیں، میں اس کلمہ شریف کے سبب اللہ کی بارگاہ میں آپ کی گواہی دے دوں گا'' کہ اتنے میں ابوجہل اور عبداللہ ابن ابی امیہ بول پڑے کہ اے ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جانا پسند کرتے ہو؟! تو رسول اکرم ﷺ ابوطالب پر دین پیش کرتے رہے اور اس بات کا بار بار اعادہ فرماتے رہے یہاں تک کہ ابوطالب نے سب سے آخری بات جو حضور ﷺ سے کہی وہ یہی تھی کہ وہ عبدالمطلب کے دین پر ہیں اور انہوں نے کلمۂ لا الہ الا اللہ اپنی زبان سے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، اسی وجہ سے رسول مکرم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں ضرور آپ کے لئے اس وقت تک دعائے مغفرت کرتا رہوں گا جب تک آپ کے سلسلے میں مجھے منع نہ کر دیا جائے، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (ما کان للنبی و الذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لهم انهم اصحٰب الجحیم) نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابوطالب کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا (انك لا تهدی من احببت ولکن الله یهدی من یشاء وهو اعلم بالمهتدین) (۲۷۳-۲۷۲/۸)

(بہرحال) اس روایت سے تمسک کرنا چاہئے اور رہی ابوطالب کے کلمۂ شہادت ادا کرنے والی روایت تو وہ ضعیف ہے، علامہ ابن حجر مکی نے 'افضل القریٰ' میں اور علامہ عسقلانی نے 'الاصابہ' میں اس کے ضعیف ہونے کی تصریح فرمائی ہے اور خود روایت میں اس کی تردید ہے اور وہ آپ ﷺ کا اپنے چچا حضرت عباس سے یہ فرمانا ہے کہ میں نے ان کی (ابوطالب کی) شہادت کو نہیں سنا

ناظم شعر کا قول (الذی ترجی) یعنی جن کی شفاعت متوقع ہے، اور شفاعت کہتے ہیں " طلب الخیر للغیر من الغیر " کو یعنی کسی کے بارے میں کسی دوسرے سے بھلائی چاہنا ہر ہولناکی کے وقت، تو ناظم شعر کے قول (لکل هول) میں 'لام' بمعنی 'عند' ہے، اسی طرح ہے جس طرح اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (یٰلیتنی قدمت لحیاتی) یا یہ 'لام' توقیت کے لئے ہے جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (اقم الصلوٰة لدلوك الشمس)، یا پھر یہ 'لام' حذف مضاف کی وجہ سے لایا گیا یعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی " لدفع کل

ھـول" (یعنی اس صورت میں 'دفـع' مضاف مقدر ہوگا)اور یہ جار مجرور یا تو (تـرجـی) سے متعلق ہے یا (شفاعته) سے اور رہا سوال یہ کہ (ھول) میں تنوین کس لئے ہے؟ تو یہاں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی ھول عظیم (سخت ہولناکی) اور (مـن الاھـوال) یہ ھـول کی صفت ہے، اور اس کی جمع اس لئے لائے تاکہ تمام اخروی اور دنیاوی حالتوں کو عام ہو چاہیں دنیا کی ہولناکی ہو یا آخرت کی سب میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت ہی سے امید ہے۔

علامہ باجوری نے افادہ فرمایا ہے کہ ناظم شعر کا یہ قول (مـن الاھوال) حال ہونے کی بنیاد پر محل نصب میں ہے، اس کا معنی (حال ہونے کی تقدیر پر) اس طرح ہوگا: ''اس حال میں کہ یہ ہولناکی تمام سہا دینے والی ہولناکیوں میں سے ہے۔

ناظم شعر کا قول (مـقتحم) حائے مہملہ کے نصب کے ساتھ، 'الاقتـحـام' مصدر سے بمعنی کسی امر میں کر ہاً کود پڑنا جب زید کسی معاملے میں کرہاً داخل ہوجائے تب کہا جاتا ہے" اقتـحـم زیـد الامر" یعنی اس امر میں پڑ گیا تو وہ حذف وایصال کی قبیل سے ہے، تو حرف جار کو حذف کر کے ضمیر کو اس سے متصل کر دیا گیا یا پھر 'مـقتحم' جر کے ساتھ اسم فاعل کے صیغہ پر ہے یعنی وہ شدت جو لوگوں پر اچانک آپڑنے والی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناظم شعر نے آپ ﷺ کی شفاعت کو امید ورجا کے الفاظ سے کیوں تعبیر کیا باوجودیکہ آپ ﷺ کی شفاعت قطعی و یقینی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا اس طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا کہ کسی بھی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ آپ ﷺ کی شفاعت پر اعتماد کر کے گناہوں میں مستغرق ہوجائے اور حضور ﷺ کی ذات پر تکیہ کر کے اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالے رکھے، اس لئے کہ ہر فرد کے لئے شفاعت کے حصول کا تیقن، اس کے شفاعت مستحق اور اہل ہونے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے اور یہ ایسا امر ہے جو ہر ایک کے لئے متیقن نہیں یہی وجہ ہے کہ ناظم شعر نے اس کی تعبیر " رجـــا" سے کی نیز اس وجہ سے بھی کہ لفظ رجاً کبھی محل قطع ویقین میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (الـذین یظنون انھم ملٰقو اربھم) نیز"

لطائف الاشارات" میں ہے کہ 'ظن' کبھی ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد یقین ہے (۴۴/۱) تو ان اصولوں کی بنیاد پر کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ "رجا" سے تعبیر کر کے اس سے معنی یقین مراد لیا جائے اسی لئے اس مصرع کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "وہی ہیں اللہ کے حبیب جن کی شفاعت یقینی ہے"

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِo

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین

اس منفرد المثال قصیدہ مبارکہ کی فصل ثالث کے اب نویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۷) دعا الی الله فالمستمسکون به مستمسکون بحبل غیر منفصم

(ترجمہ: آپ ﷺ سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ (کے دین) کی طرف بلانے والے ہیں، تو آپ کے دامن سے وابستہ سبھی حضرات ایسی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں جو ٹوٹنے والی نہیں۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے جب گزشتہ شعر میں آپ ﷺ کا محبوبیت اور شفاعت میں منفرد ہونا بیان کر دیا تو اب وہ یہاں اس شعر میں اسی معنی کو مزید مؤکد کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی انفرادیت صرف انہیں مذکورہ امور میں نہیں ہے بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان چیزوں میں بھی فضیلت وانفرادیت عطا فرمائی ہے جو ان سے بھی زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہیں اور یہ امور مذکورہ باتوں میں آپ ﷺ کے تفرد کو تو چاہتے ہی ہیں مزید یہ ان چیزوں میں بھی آپ ﷺ کی انفرادیت کے مقتضی ہیں جو مذکور نہیں ہوئے جیسے آپ ﷺ کا معرفت الٰہی میں بلا واسطہ منفرد ہونا، آپ ﷺ کا تمام مخلوق سے افضل ہونا، آپ ﷺ کا تمام مخلوق کو معرفت الٰہی کی جانب داعی ہونا، اور بارگاہ الٰہی تک سب کو پہنچانا آپ ﷺ کا قاسم نعمت الٰہیہ ہونا وغیرہ ذالک ان مقتضیات میں سے جو چاہتی ہیں کہ آپ ﷺ تمام مخلوق کے حق میں، اللہ کی بارگاہ تک پہنچنے میں وسیلہ کبریٰ اور واسطۂ عظمیٰ ہوں، اسی وجہ سے ناظم شعر نے معنی

مزید کی تاسیس میں تاکید کا افادہ کیا اور وہ معنیٰ زائد جس کی تاسیس اس شعر میں کی گئی ہے وہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دعوت وارشاد میں منفرد ہونا ہے نیز بندوں کو خیر عطا کرنے اور ان کو مراد تک پہنچا کر کامیاب کرنے میں منفرد ہونا ہے۔

بہرحال اس کلمے کے ہر معنی ومفہوم سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہی تنہا داعیٔ حقیقی ہیں اور وہ اس لئے کہ 'دعا' میں طلب واحضار کا معنیٰ ہوتا ہے نیز اس میں شئی کے مقصد پر ابھارنا اور لوگوں کو کھانے پر بلانے کا معنی ہوتا ہے۔ تو اس اعتبار سے معنی ہوگا کہ آپ ﷺ ہی سب کے داعی ہیں یعنی تمام لوگوں کو توحید کی طرف بلانے والے ہیں اور آپ ہی طالب مقصد حقیقی ہیں اور سالکین کو بادشاہ بزرگ تر کی بارگاہ تک پہنچانے والے ہیں اور آپ ہی بارگاہ الٰہی کے قرب میں دسترخوان پر اپنے متبع کو حاضر کرنے والے ہیں۔ اس معنیٰ کی رعایت کی وجہ سے شاعر ذی فہم نے (''دعا'' فعل کے مفعول کو ذکر نہیں کیا اور اسی وجہ سے کلمۂ جلالت کے مضاف یعنی ''دین'') کی تصریح بھی نہیں فرمائی (یعنی انہوں نے مضاف کو مقدر رکھا) گویا انہوں نے یوں کہا ''دین اللہ'' (یعنی اللہ کے دین کی طرف بلانے والے ہیں) اور رہا یہ سوال کہ ''دعا'' فعل سے پہلے شاعر ذی فہم نے ''واو عاطفہ'' کو ترک کیوں کر دیا اور یوں کیوں نہیں کہا ''ودعا الی اللہ'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ناظم شعر نے یہاں ''واو عاطفہ'' یہ بتانے کے لئے ترک فرما دیا کہ ہر صفت مستقل طور پر، آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وصف بیانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ناظم شعر کا یہ قول (دعا) یہ 'ھو' مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ جملہ فعلیہ مستانفہ ہے۔

علامہ ابن علان صدیقی مکی اپنی شرح 'الذخر والعدۃ' میں فرماتے ہیں کہ حضور تمام جن وانس میں سے ہر ایک کے داعی ہیں جن کی جانب آپ مبعوث کئے گئے ہیں جیسا کہ اس میں حذف معمول اس کی خبر دے رہا ہے۔ (الی اللـــہ) کا مطلب یہ ہے کہ آپ داعی ہیں اللہ کی توحید کی طرف، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف اور اپنی رسالت کے اقرار کرانے کے داعی ہیں (۵۳)

نیز علامہ باجوری قصیدہ بردہ کے متن پر اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) حضور علیہ الصلوٰۃ و

السلام لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (ادع الی سبیل ربك) اور اللہ کے دین اور اللہ کے راستے سے مراد اسلام ہے، تو مصنف کے کلام میں مضاف محذوف ہے، (جو دین ہے) اور مفعول بھی محذوف ہے اور وہ مفعول محذوف " عبادهٗ " ہے جو ملائکہ کو بھی شامل ہے (یعنی حضور علیہ السلام) اللہ کے تمام بندوں کو چاہیں انسان و جنات ہوں یا ملائکہ سب کو اللہ کے دین یعنی دین اسلام کی طرف بلانے والے ہیں تو آپ ﷺ انہیں ان کے اکرام کے لئے وہ باتیں بتانے کے لئے بلاتے ہیں جو وہ نہیں جانتے ہیں اس لئے کہ جب انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے وہ جانا جو وہ نہیں جانتے تھے تو حضور اکرم ﷺ سے نہ معلوم چیز کو جاننا بطریق اولیٰ چاہئے۔ (ص:۲۴)

قلت: مقدمے میں ہم اس جانب اشارہ کر آئے ہیں کہ آپ ﷺ کی رسالت مذکورہ امور سے عام ہے، اس لئے کہ آقا علیہ السلام جن و انس اور ملائکہ یعنی اللہ کے ماسوا تمام عالمین کے رسول ہیں، حدیث پاک میں امام مسلم سے مروی ہے کہ "کان النبی یبعث الی قومه خاصة ارسلت الی الخلق کافة" یعنی ہر نبی کو خاص طور پر ان کی قوم ہی کی جانب مبعوث کیا جاتا ہے لیکن مجھے تمام مخلوق کی جانب بھیجا گیا ہے اور اس بات کی تصدیق خود قرآن پاک میں اس طرح موجود ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے (تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعٰلمین نذیرا) نیز حضور علیہ السلام کی رسالت کے عام ہونے پر دوسرے مقام پر ایک اور نص موجود ہے جس میں اس جانب اشارہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی رسالت آپ کے ''نذیر'' ہونے کے معنیٰ سے عام ہے یعنی آپ کی رسالت عذاب الٰہی سے ڈرانے کے علاوہ کو بھی شامل ہے اور آپ کی رسالت اللہ کے ماسوا سب کو عام ہے اور سب کو شامل ہے۔ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ ان تصریحات کو میں نقل کر چکا ہوں جو جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ کی تصنیف لطیف " الامن و العلی لناعتی المصطفیٰ بدافع البلاء " پر میرے حاشیہ میں یوں موجود ہے: (وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمین) یہ آیت پاک آپ ﷺ کی رسالت کے عموم پر دلالت کر رہی ہے تو آپ جن و انس اور ملائکہ سب کے رسول ہیں بلکہ تمام مخلوق کی جانب رسول بنا کر بھیجے گئے

ہیں، اسی وجہ سے صحیح مسلم میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ''ہر نبی کو خاص طور پر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا لیکن مجھے عمومی طور پر تمام مخلوق کی جانب مبعوث کیا گیا ہے'' اور آپ ﷺ نے مزید فرمایا'' عالم میں کوئی بھی شئی ایسی نہیں جو یہ نہ جانتی ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں سوائے سرکش جن وانس کے'' اور یہ آیت پاک جو مذکور ہوئی اسی عموم رسالت کے معنی کو بتانے میں اس آیت پاک کے مثل ہے (تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعٰلمین نذیراً) [الفرقان: ۱] نیز مذکورہ بالا آیت پاک اس معنیٰ مزید کو بھی مفید ہے کہ آپ ﷺ صرف عذاب الٰہی سے خوف دلانے (نـذارـۃ) کے ہی رسول نہیں ہیں بلکہ آپ ﷺ رسول رحمت بھی ہیں اور اپنے وجود کا فیضان تمام موجود پر فرمانے والے ہیں اور آپ عین رحمت ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی رحمت کو تمام موجودین کے لئے عام فرمایا تو ہر ایک ایجاد و امداد میں آپ ہی کا سہارا لئے ہوئے ہے اور سبھی ابتداء اور انتہاء (مبدا اور معاد (دنیا وآخرت) میں آپ ہی کے محتاج ہیں، اسی مفہوم کو میں نے اشعار میں یوں ادا کیا:

قـد عـم الـكـون بـرحـمتـه   اذ كـل الـرحـمـىٰ رحـمـاه

قـد نيط حياة الكون به   فـالـكـل عـديـم لـولاه

(ترجمہ: حضور کی رحمت تمام کائنات کو عام ہے اس لئے کہ تمام رحمتیں حضور کی ہی رحمت ہیں تمام کائنات کا وجود آپ ہی سے وابستہ ہے تو اگر حضور نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا)

حضور اکرم ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا بیان

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجنا اس بات کا مقتضی ہے کہ آپ ﷺ تمام عالم سے افضل اور سب پر مقدم ہوں، نیز یہ اس بات کو بھی چاہتا ہے کہ آپ تمام کائنات کے وجود کا سبب ہوں تو آپ وجود کی آنکھ کی پتلی ہیں اور ہر موجود کا سبب ہیں! یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ 'مواہب' میں مذکور ہے کہ حضور تمام اجناس پر جنس عالی اور تمام موجودات اور تمام لوگوں کے جد اعلیٰ ہیں۔

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ 'دلائل الخیرات شریف'' کی شرح 'مطالع المرات' میں لفظ رحمت کے تحت

ایک نفیس نکتہ اور عمدہ کلام مذکور ہے جو مجھے اس موقع پر اچانک یاد آ گیا کہ شیخ مرسی فرماتے ہیں ''تمام انبیائے کرام کی خلقت رحمت سے ہوئی ہے لیکن ہمارے نبی کی ذات تو وہ عین رحمت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وما ارسلنٰك الا رحمة للعلمين) [الانبياء: ۱۰۷]

علامہ شیخ سید عبدالجلیل قصری اس آیت پاک کے تحت فرماتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے تمام عالم پر رحمت کیا گیا ہے، اس آیت کریمہ سے یہی معنیٰ مستفاد ہے، نیز اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام خیرات وانوار اور برکات جو زمانے میں شائع وذائع اور کائنات میں نظر آتی ہیں یا اول ایجاد سے آخر ایجاد تک نظر آئیں گی وہ سب کی سب حضور ﷺ ہی کے سبب سے ہیں!

امام ابوعبداللہ ترمذی'' نوادر الاصول '' میں فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت کا ایک زائد دروازہ بنایا ہے اور وہ زائد دروازہ حضور نبیٔ رحمت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جو رحمت وتوبہ کا دروازہ ہیں، تو جب سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دروازے کو پیدا فرمایا ہے تب سے یہ توبہ اور رحمت کا باب کھلا ہوا ہی ہے، کبھی بند نہیں ہوا لیکن جس دن سورج پورب کی بجائے پچھّم سے نکلے گا، اس دن یہ توبہ اور رحمت کا باب بند کر دیا جائیگا پھر قیامت کے دن تک نہیں کھلے گا اور تمام اعمال کے دروازوں کو نیک اعمال پر تقسیم کیا گیا ہے۔

امام ترمذی مزید فرماتے ہیں کہ ''لیکن رہا جنت کا باب التوبہ جو تمام ابواب پر زائد ہے تو وہ اعمال کے ابواب میں سے نہیں ہے بلکہ وہ صرف رحمت عظمیٰ کا دروازہ ہے، اس میں بندوں کی توبہ داخل ہو کر اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچتی ہے، اسی وجہ سے آقا علیہ السلام نے فرمایا میں نبیٔ التوبہ اور ھادی و مھدی رحمت ہوں یعنی میں ایسی رحمت ہوں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کو بطور ہدیہ دی گئی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے تحفۃً بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ تو محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ تمام عالمین کے لئے رحمت ہے اور تمام انبیائے کرام کی بعثت رحمت ہے اسی وجہ جس کسی نے بھی انبیائے کرام کی ہدایت کو قبول کیا جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں تو وہ فیروز بخت اور کامیاب ہوا اور جس نے ان سے اعراض کیا اس پر فوراً عذاب آ گیا۔ نیز سیدنا محمد

رسول اللہ ﷺ کا مولد و مسکن اور آپ کی ذات رحمت و امان ہے اور اسی طرح آپ کا مدفن مبارک رحمت ہے، الغرض اس رحمت و امان کی حرمت و تعظیم قائم و دائم ہے۔ انتہی۔ (الامن والعلی ص ۳۵۔۳۶)

ناظم شعر کے قول (فالمستمسکون) میں 'فا' برائے نتیجہ اور برائے افادۂ تفریع ہے یعنی آپ ﷺ کے "داعی الی اللہ، ہونے پر، استمساک اور اعتصام کا معنی متفرع ہے، اور اس مفہوم کو اسمیت سے اس لئے تعبیر کیا تا کہ ثبوت واستمرار کا معنی رہے۔ تو 'دعا' کا صیغہ اگر چہ فعل ماضی ہے لیکن پھر بھی وہ افادۂ ثبوت و دوام ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح ان فرامین باری تعالیٰ میں ہے: (وکان اللہ علیما حکیما) (وکان فضل اللہ علیک عظیما) وغیرہ ذالک ان میں تعبیر ماضی (کان) سے کی گئی ہے لیکن مراد دوام و استمرار ہی کا معنی ہے۔ اور حضور کے فضل کے دائم و قائم ہونے پر سب سے مضبوط دلیل کلمۂ شہادت "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے علامہ ابن فورک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں اور آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ کے رسول ہیں یعنی تمام زمانیں میں جو آپ کے وصال کے بعد تا قیامت آنے والے ہیں، آپ ﷺ حقیقی طور پر ان سب زمانوں میں اللہ کے رسول ہیں نہ کہ مجازی طور پر۔ اور قبر مبارک میں آپ کی حیات اس طرح ہے کہ آپ اذان و اقامت کے ساتھ نماز ادا فرماتے ہیں، علامہ ابن عقیل حنبلی نے فرمایا کہ آپ اپنی قبر انور میں اپنی ازواجۂ مطہرات کے ساتھ شب باشی فرماتے ہیں اور دنیا سے اکمل طریقے پر اپنی ازواج سے استمتاع فرماتے ہیں، انہوں نے یہ بات قسم اٹھا کر کہی، حالانکہ یہ بات ظاہر و واضح ہے کوئی چیز اس میں مانع نہیں!

معنی "داعی" کے متعلق جو ابھی مذکور ہوا، اس کی مناسبت سے ہم ایک حدیث پاک اس موقع پر ذکر کر دینا چاہتے ہیں جس کی تخریج امام بخاری نے کی ہے اور 'مشکاۃ المصابیح' میں بھی حضرت جابر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ فرشتوں کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں اس حال میں حاضر آئی کہ آپ ﷺ سو رہے تھے، تو وہ ملائکہ آ کر کہتے ہین کہ آپ لوگوں کے آقا و مولی کے لئے یہ کہاوت ہے تو ان کے لئے یہ بیان کر دینا۔ کچھ راویوں نے 'انہ نائم' کہا ہے اور کچھ نے کہا کہ آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں لیکن قلب مبارک بیدار

تھا۔ پھر انہوں نے یہ مثل بیان کی کہ "ان کی کہاوت اس شخص کی سی ہے جس نے ایک گھر تعمیر کیا اور پھر اس میں دعوت طعام کا انتظام کیا اور لوگوں کو دعوت پیش کرنے کے لئے ایک داعی بھیجا تو جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل بھی ہوا، اور اس شخص کے ساتھ طعام دعوت بھی تناول کیا لیکن جس نے دعوت قبول نہ کی تو وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ اسے دعوت کا کھانا کھانے کو ملا۔ پھر انہوں نے کہا کہ اس کہاوت اور مثال کو سمجھ کر تفسیر کرو تو کچھ نے کہا کہ آپ ﷺ سو رہے تھے کچھ نے کہا کہ آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں مگر قلب مبارک جاگ رہا تھا، پھر انہوں نے کہا کہ اس کہاوت میں گھر سے مراد جنت ہے اور داعی سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ تو جس نے حضور کی اتباع کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے حضور کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی تو حضور کی ذات ہی لوگوں کے درمیان فیصل ہے [رقم الحدیث: ۱٤٤]

امام طیبی نے فرمایا کہ اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ ملائکہ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عالمین پر پہلے رحمت یوں فرمائی کہ آپ ﷺ کو ایسا رحمت للعالمین بنا کر بھیجا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ایک تحفہ ہیں۔ جیسا کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے (وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمین)، پھر اللہ تعالیٰ کا مخلوق کو جنت مہیا کرنا اور آپ ﷺ کا تمام لوگوں کو جنت اور اس کی نعمت و بہار کی طرف بلانا پھر حضور کا مخلوق کو جنت کے راستے کی رہنمائی کرنا اور تمام مخلوق کا قرآن وسنت کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر آپ ﷺ کی اتباع کرنا کہ وہ دورسی عالم سفلی میں لٹک رہی ہیں اور گویا لوگ اپنی طبیعت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی طبیعت کی شہوات وخواہشات میں مبتلا ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے لطف وکرم سے ان کو بلند فرمانا چاہتا ہے اسی وجہ سے اس نے قرآن وسنت کی دورسی ان کے لئے عالم سفلی کی طرف لٹکائی ہیں تاکہ وہ انہیں پکڑ کر اس بھنور سے نجات حاصل کریں تو جو کوئی بھی ان دورسیوں سے متمسک رہا وہ نجات پا گیا اور فردوس اعلیٰ و جناب اقدس میں جگہ حاصل کر گیا بادشاہ مقتدر کے یہاں اور جو دنیا و مافیہا کی طرف مائل رہا وہ ہلاک ہو گیا اور اس نے اللہ کی رحمت سے اپنے حصے کو ضائع کر دیا۔ ملائکہ نے اس کی مثال اس کریم میزبان سے دی ہے کہ جس نے گھر تعمیر کیا اور اس میں قسم قسم کے لذیذ کھانے اور

طرح طرح کے میٹھے اشربہ کا بے شمار انتظام کیا جس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ پھر لوگوں کے پاس داعی بھیجا۔ جو انہیں ان کی عزت افزائی کے طور پر ضیافت پر بلاتے تو جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول کیا اور اس کی اتباع کی اس نے ان کرامتوں اور آسائشوں کو پالیا اور جس نے اتباع نہ کی وہ ان آسائشوں سے محروم رہا۔ (شـــــرح الطیبی: ۱/ ۳۰۰)

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناظم شعر نے (فالمستمسکون) کے بجائے (فالمجیبون) کیوں نہیں کہا؟

حالانکہ "مجیبون" داعی' کے معنی کے مناسب تھا لیکن ناظم نے اس سے 'فالمستمسکون' کی طرف عدول کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اس جانب اشارہ کرنے کے لئے اعراض کیا کہ آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ متمسک رہا جائے نیز آپ ﷺ کی اجابت کا معاملہ بذات خود آپ کی جانب احتیاج کو محسوس کرنا اور آپ سے کبھی مستغنی و بے نیاز نہ ہونا ہے بلکہ آپ سے توسل کے اعتقاد پر قائم و دائم رہنا ہے اس لئے کہ عقیدۂ توسل کے انکار و نفی کے ساتھ محض زبانی اقرار و قبول کرنا، بالکل نفع بخش نہیں جیسا کہ بعض محروم عن الایمان کرتے ہیں۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ ناظم شعر نے (فالمجیبون له) اھ۔ نہیں کہا اگر چہ وہ 'دعا' کے مناسب تھا، اس لئے کہ وہ اس سے تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ صرف زبان وغیرہ سے قبول کرنا ہلاکتوں سے نجات دلانے میں کافی نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے دامن سے استمساک ضروری ہے جس طرح کوئی انسان (گڑھے) سے باہر نکلنے کے لئے رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اوپر چڑھتا ہے اور اگر رسی سے استمساک میں ذرا بھی کوتاہی برتی تو وہ گڑھے میں واپس جا گرے گا اسی طرح آپ ﷺ کے دامن کو چھوڑنے والا اور پل بھر بھی استمساک سے اعراض کرنے والا ہلاکتوں کے گڑھے میں جا گرے گا) (ص:۲۴)

قلت: (علامہ باجوری کی مذکورہ بالا عبارت اس امر میں واضح ہے کہ تمام لوگ اپنے دینی و دنیاوی امور میں حضور

ﷺ کے محتاج ہیں اور بعض محرومین جو یہ گمان کرتے ہیں کہ دین کسی کا بھی محتاج نہیں حتی کہ دین کو رسول اللہ ﷺ کی بھی احتیاج نہیں تو ہم نے ان کے اس خام خیال کا رد ایک مستقل رسالے میں کیا ہے جس کا نام ہم نے " سد المشارع بان الدین لا یستغنی عن الشارع " رکھا ہے اس رسالے مین ہم نے ان کے زعم باطل کا مکمل رد کیا ہے جن کا یہ گمان ہے کہ (معاذ اللہ) دین کو رسول اللہ ﷺ کی بھی احتیاج نہیں۔

(والمستمسکون) بمعنی متمسک رہنے والا یعنی وہ جو متمسک رہا اور " حبل " سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک ہے اس لئے کہ آپ ہی کی ذات حصول خیرات میں واسطہ و وسیلہ ہے اور درجۂ کمال پر پہنچنے کا ذریعہ ہے یا پھر 'حبل' سے قرآن مراد ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی مضبوطی رسی ہے اور یہی روشن و واضح نور ہے اور نفع بخش شفا ہے جو اس سے متمسک رہا اس کے لئے اللہ کی حفاظت ہے اور جس نے اس کی اتباع کی اس کے لئے نجات ہے''

اس شعر میں اس آیت کریمہ کی جانب تلمیح ہے (و اعتصموا بحبل اللہ) امام قیشری نے 'لطائف الاشارات' میں فرمایا کہ حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب اس مضبوط واسطے سے تمسک رکھنا ہے جو حضور صلوٰت اللہ علیہ کی ذات ہے اور اس واسطۂ عزیز سے تمسک کتاب و سنت سے تعلق قائم رکھ کر ہی ممکن ہے (۱/۱۶۵)

شعر کا معنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے (فمن یکفر بالطٰغوت و یؤمن باللہ فقد استمسك بالعروۃ الوثقی لا انفصام لها)

"الفصم" بالفا'' بمعنی بغیر فصل اور جدا کئے، توڑنا " القصم " بالقاف بمعنی جدا جدا کر کے توڑنا، اور ناظم شعر نے "غیر منفصم" کہہ کر اس لئے تعبیر کیا تا کہ لزومی طور سے اس بات پر دلالت کرے کہ اضعف کی نفی، اقوی کی نفی کو مستلزم ہے اور اقوی وہ "منقصم" ہے بالقاف اور ان دونوں الفاظ کے موافق نے دونوں ہی لفظوں کے معنی کا اثر لیا ہے۔

ناظم شعر کے اس قول (فالمستمسکون به مستمسکون بحبل) میں تشبیہ بلیغ ہے کہ انہوں نے متبعین کو مستمسکین سے تشبیہ دی اور اس میں استعارہ تبعیہ ہے اور اسی طرح (غیر منفصم) میں ترشیح پر ترشیح ہے اور یہ ان امور میں سے ہے جو حسن استعارہ میں اضافہ کرتے ہیں۔

یہ شعر استئنافیہ ہے جو اوصاف شماری کے طرز پر بیان کیا گیا ہے (یعنی ایک ایک کر کے اوصاف وخوبیاں شمار کرائی جارہی ہیں) جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ہے (الرحمن علم القرآن ۰ خلق الانسان ۰ علمه البیان) اسی وجہ سے ناظم شعر نے حرف عطف کو اپنے آگے آنے والے شعر میں بھی ترک فرمادیا، یعنی اپنے اس شعر میں۔

فاق النبیین فی خلق وفی خلق ولم یدانوه فی علم ولا کرم

اس شعر کا روحانی فائدہ ایمان کی حفاظت اور اس کے سلب سے امان ہے اور وہ اس طرح کہ ہر نماز کے بعد اس شعر کو دس مرتبہ پڑھا جائے اور وہ بھی آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مخصوص درود پاک کے صیغہ کے ساتھ درود پڑھتے ہوئے اور درود پاک کا وہ مخصوص صیغہ یہ ہے (اللهم صل و سلم علی نبیك البشر الداعی الیك باذنك السراج المنیر) (حاشیۃ الباجوری،۲۴)

حضور نبیٔ کریم علیه الصلوٰة و التسلیم کے شاهد هونے کا بیان، یعنی حضور کے حاضر و ناظر هونے کا بیان

ضمیمہ: یہ اوپر ایک بات کا ذکر ہوگیا اور دوسری بات یہ کہ آپ ﷺ کا داعی ہونا، آپ کے بالعموم شاہد ہونے کو مستلزم ہے اس لئے کہ داعیٔ کا معنی اس کے عموم کو چاہتا ہے نیز یہ امر آپ کی تعظیم وتوقیر کا بھی مقتضی ہے، اسی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا (انا ارسلنك شهدا و مبشرا و نذیرا۔ لتومنوا بالله و رسوله و تعزروه و توقروه) [الفتح: ۸۔۹]

علامہ اسماعیل حقی کے کلام میں ایک انتہائی عمدہ بات پر مجھے آگاہی ہوئی، مقام و نکتے کی مناسبت سے میں یہاں نقل

کر دینا چاہتا ہوں جو اہم فوائد پر مشتمل ہے، علامہ اسماعیل حقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ "روح البیان" میں اس فرمان باری تعالیٰ (و تعزروہ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں حضور کی تعظیم وتوقیر کا معنی ظاہر و باطن میں حقیقی طور پر حضور کی سنت کی اتباع کرنا ہے اور اس بات کا اعتقاد رکھنا ہے کہ آپ ﷺ ہی تمام موجودات کا خلاصہ اور لب لباب ہیں آپ ہی محبوب ازلی ہیں اور سبھی کو آپ ہی کی اتباع وفرماں برداری کرنی ہے اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا کیوں کہ جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی مخلوق ہیں تو آپ حق سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت کے شاہد ہیں اور تمام موجود کو پردۂ عدم سے وجود بخشے جانے کے شاہد ہیں یعنی ارواح ونفوس، ارکان واجسام واجساد، معدنیات، نباتات، حیوانات، جنات، فرشتے انسان وشیاطین وغیرہ ذالک سبھی کو عدم سے وجود میں نکالے جانے کا مشاہدہ کرنے والے ہیں اور آپ ان تمام موجودات کے اس لئے شاہد ہیں تا کہ رب تعالیٰ کے افعال کے اسرار اور اس کی قدرت وصنعت کے عجائب وغرائب کا وہ علم جس کا درک مخلوق کے لئے ممکن ہے وہ آنے سے نہ رہ جائے اور اس میں کوئی بھی آپ کا شریک نہیں، اسی لئے تو آقا علیہ السلام نے فرمایا " علمت ماکان ومایکون " کہ جو کچھ ہوا اور جو کچھ بھی ہونے والا ہے سب میں نے جان لیا، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ تمام اشیاء کے شاہد ہیں اور کچھ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں نیز آپ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے شاہد ہیں۔ اسی وجہ سے آپ نے خود ارشاد فرمایا" کنت نبیا و آدم بین الماء و الطین " کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے یعنی اس وقت میری تخلیق ہو چکی تھی اور میں یہ بات جانتا تھا کہ میں نبی ہوں، مجھے نبوت عطا کی گئی ہے۔ حالانکہ اس وقت حضرت آدم جسم و روح کی تخلیق کے درمیان تھے یعنی جسم و روح میں سے کسی ایک کی اس وقت تک تخلیق نہیں ہوئی تھی تو اس سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان باتوں کے بھی شاہد ہیں جو ان کے ساتھ پیش آئیں مثلاً ان کا اکرام وجہ لغزش جنت سے اخراج اور پھر بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا آپ کی توبہ قبول فرمانا وغیرہ ذالك امور جو حضرت آدم کے ساتھ پیش آئے۔ حضور سب کے شاہد ہیں نیز آپ شاہد ہیں ابلیس کی پیدائش کے اور طول عبادت اور وفور علم ہونے کے

باوجود صرف ایک حکم کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس کے لعن وطعن کے مستحق ہو جانے کے۔تو آپ ﷺ کو ان تمام حوادثات و واقعات کے علم کا حصول ہوا جو انبیاء و مرسلین عظام اور ان کی امتوں پر پیش آئے ، پھر آپ کی روح مبارک کو آپ کے قالب میں ڈھال کر نازل فرمایا گیا تا کہ آپ نور علی نور ہو جائیں تو تمام موجود کا وجود آپ ہی کے وجود کے سبب سے ہے۔تمام انبیاء واولیاء کے علوم آپ ﷺ کے علوم سے ہیں یہاں تک کہ حضرت آدم وابراہیم و موسیٰ وغیرہ کے صحیفے وغیرہ جو کتب الٰہیہ میں سے ہیں آپ علیہ السلام ان کے علوم سے بھی آپ واقف ہیں۔

بعض اکابرین نے فرمایا کہ ہر نیک بخت کے ساتھ روح نبی ﷺ سے اس کا ایک محافظ ہوتا ہے جو اس پر مقرر ہے تو اس کا اس کی طرف توجہ نہ کر کے اس سے اعراض کرنا اس کی بے حرمتی وخلاف ورزی کا سبب ہے جب حضرت آدم علیہ السلام سے روح محمدی نکال لی گئی تو وہ نسیان ولغزش وغیرہ پیش آئی۔آقا علیہ السلام کے فرمان سے بھی اس جانب اشارہ ملتا ہے:" **اذا اراد اللّٰہ انفاذ قضائہ و قدرہ سلب ذوی العقول عقولھم**" کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جب اپنی قدر وقضا کو نافذ فرمانا چاہتا ہے تو وہ پہلے عاقلوں کی عقلوں کو سلب فرما دیتا ہے مزید آقا علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اسی طرف مشعر ہے" لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن" کہ زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا ہے یعنی پہلے اس سے ایمان زائل کر دیا جاتا ہے پھر وہ زنا کرتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ ہر نبی کو ولایت ونبوت حاصل ہوتی ہے پھر اگر وہ رسول ہے تو اس کو ولایت ، نبوت اور رسالت حاصل ہوتی ہے تو عالم الرسالت وہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ ووسیلہ ہوتا ہے اسی طریقہ سے اگر وہ اپنی طرف رسول ہے یا اپنے اہل وعیال کی طرف رسول ہے یا اپنی قوم کی طرف یا سب کی طرف تو رسول کے ساتھ صرف اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنے علم کی انہیں پیغام رسالت پہنچانے میں ضرورت ہے اور جو بقیہ ہے تو اس کا وہ عالم الولایت ہوتا ہے۔

نیز یہ کہ جب امتیں کثیر ہوئیں تو مرسلین بھی زیادہ ہوئے۔تو قیامت کے دن ایک نبی اس حال میں تشریف لائیں گے کہ ان کے ساتھ ان کی امت ہوگی ، دوسرے اس حال میں آئیں گے کہ ان کے ساتھ ان کی قوم ہوگی ،

تیسرے اس حال میں آئیں گے کہ ان کے ساتھ ان کا ''رھط'' یعنی گروہ ہوگا اور ''رھط'' اس گروہ کو کہتے ہیں جو دس افراد سے کم ہو اور کوئی نبی اس حال میں تشریف لائیں گے کہ ان کے ساتھ ان کے صاحب زادے ہوں گے، اور کوئی نبی اس حال میں تشریف لائیں گے ان کے ساتھ صرف ایک شخص ہوگا اور ایک نبی اس حال میں آئیں گے کہ انہوں نے لوگوں سے اپنی متابعت کرنے کو کہا ہوگا لیکن کوئی ان کا تابع نہ ہوا ہوگا، انہوں نے دعوت وتبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا ہوگا لیکن کسی نے قبول نہ کیا ہوگا، ان کے شدید تاریکی اور گمراہی والے وقت میں تشریف لانے کی وجہ سے، لیکن جب ہمارے نبی اکرم ﷺ، اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے نور ہوکر تشریف لائے تو تمام عالم کا ظاہر و باطن آپ کے نور سے منور ہو گیا اور سارے جہاں کو آپ نے منور فرمادیا، اسی وجہ سے آپ کی امت تمام امتوں سے زیادہ فیروز بخت ہے اور تعداد میں بھی سب سے زیادہ کثیر ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی امت کل محشر میں اسی ۸۰ صفوں میں آئے گی جب کہ باقی ساری امتیں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سبھی امتیں چالیس صفوں میں ہوں گی۔ مزید اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو " مبشر " فرمایا اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب اپنا حبیب گوروں اور کالوں کے پاس بھیجا تو ان کو اس بات کی خوش خبری اور بشارت دی کہ ان سب لوگوں کے لئے اس حبیب مکرم کی اتباع میں درجۂ محبوبیت ہے جو اس حبیب ہی کی امت کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ امت اس درجۂ محبوبیت میں تمام انبیاء ومرسلین کی امتوں سے ممتاز ہے، نیز اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو 'نذیرا' فرمایا تاکہ آپ کی امت دارین میں کسی بھی چیز کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے دور نہ ہو جیسا کہ اکثر امتوں کا رشتہ رب تعالیٰ سے منقطع ہو گیا اور پھر وہ کسی چیز پر نہیں رہے (۹/۱۸۔۱۹)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه هداة الدین القویم، والتابعین لهم باحسان الی یوم الدین، صلاة دائمة یوم لاینفع مال ولابنون الا من اتی الله بقلب سلیم.

ترجمۂ خطبہ: ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہیں اور درود وسلام بھیجتے ہیں اس کے مکرم رسول پر اور اس رسول کے آل واصحاب پر جو دین مستقیم کے ہادی ہیں نیز ان اصحاب کی قیامت کے دن تک احسان واخلاص کے ساتھ اتباع کرنے والوں پر ایسا درود جو اس دن بھی قائم ودائم رہے جس دن مال ودولت اور اولاد کچھ کام نہیں آئے گی مگر صرف وہ جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا (وہی نفع اٹھائے گا۔)

یہ قصیدۂ مبارکہ کی فصل ثالث کا دسواں شعر ہے، ہم اس کی شرح کا آغاز کررہے ہیں ناظم فاہم فرماتے ہیں۔

(۳۸) فاق النبیین فی خلق و فی خلق ولم یدانوه فی علم ولا کرم

(ترجمہ: حضور نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حسن صورت وحسن سیرت میں تمام انبیائے کرام سے فائق وافضل ہیں اور کوئی بھی علم وکرم میں حضور کے برابر نہیں۔

ربط: یہ شعر گزشتہ تمام اشعار کے تمام معانی ومفاہم کی تاکید ہے اور مزید اس بات کی تصریح ہے کہ حضور کا سیادت ومحبوبیت وشفاعت وعموم دعوت میں منفرد ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ حضور ظاہراً وباطناً علم وکرم میں تمام انبیائے کرام پر تفوق رکھتے ہوں کہ کوئی بھی علم وکرم میں حضور کے برابر اور ہم پلہ نہیں۔ نیز ان امور کو بھی مستلزم ہے کہ مزید علم وکرم حضور کے ساتھ ہی مختص ہو، اور حضور درجے اور مرتبے میں تمام انبیاء سے افضل ہوں اور دنیا وآخرت میں ان سے مقدم ہوں، ہر کمال میں حضور اصل ہوں، سب حضور کے سبب سے ہوں اور سبھی حضور کے ہی محتاج ہوں تو جب یہ تمام فضائل حضور کے ساتھ ہی مختص ہیں تو پھر آخر کوئی کیسے علم وکرم میں حضور کے برابر ہوسکتا ہے۔ اسی مفہوم کو شاعر ذی فہم نے اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

کیف ترقی رقیک الانبیاء یاسماء ما طاولتها سماء

لــم یــدا نــوک فــی الــعــلاء وقــد حــال ســنــا مــنــک دونهــم و ثــنــاء

(ترجمہ: آخرانبیائے کرام آپ کے مرتبے تک کیسے پہنچ سکتے ہیں اور آخر کیسے وہ آپ کے مقام سے آگے بڑھ سکتے ہیں اے وہ آسمان کہ فضل و بخشش میں کوئی اس آسمان سے اونچا نہیں ہے۔اورکوئی بھی آپ کے بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ آپ کی بلندی اور رفعت ان کے درمیان حائل ہے)

تشریح: (فاق الشئی فوقاً فواقاً) کا معنیٰ بلند ہونا، فائق ہونا ہے، کہا جاتا ہے" فاق اصحابهٗ'' کہ فلاں اپنے ساتھیوں اوراپنے معاصرین پر فائق ہوگیا، ان سے بہتر وافضل ہوگیا۔

ناظم شعر کے قول (الــنــبــیــن) میں''الف لام'' استغراقی ہے یعنی تمام کے تمام مرسلین، اس لئے کہ وہ نبی ورسول دونوں کو عام ہے، یا تو مطلقاً نبی کے عموم کی وجہ سے یا نبی ورسول کا مترادف ہونے کی بنیاد پر۔

(الــخــلــق) کا معنیٰ لغت کے اعتبار سے ایجاد وتقدیر ہے اور (مصدر چونکہ کبھی اسم فاعل کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی اسم مفعول کے) تو یہاں" خــلــق " مصدر اسم مفعول کے معنیٰ میں بمعنیٰ مخلوق ہے، اس سے مراد حسن صورت، اوراعضاء وشکل ورنگ کا متناسب ہونا اوراطراف کا معتدل ہونا ہے وغیرہ ذالک کمالات ظاہرہ ہیں۔

(الــخُلُق) نفس کی وہ راسخ طبیعت وفطرت جس سے افعالِ خیر وشر کا بغیر غور وفکر کئے صدور ہوتا ہے یعنی طبعی خصلت وعادت ایسا ہی " الـمعجم الوسيط " میں ہے اور" الـمصباح المنير " میں مرقوم ہے کہ " الخُلُق "بضمتین بمعنیٰ طبیعت وفطرت، اور'القاموس' میں مذکور ہے کہ''الـخلق "(خا کے ضمہ کے ساتھ ہو خواہ خاٗ اور لام کے ضمہ کے ساتھ) ہر دوصورتوں میں بمعنیٰ طبیعت وفطرت، دین ومروت ہے اوراس کے حاشیہ میں ہے کہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (انک لـعلى خلق عظيم) اوراس کی جمع اخلاق آتی ہے، اس کے علاوہ اس لفظ کی تکثیر نہیں آتی ہے، حدیث پاک میں آیا ہے کہ " لیـس شئی فی الميزان ثقل من حسن الخلق'' کہ میزان پر حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی شئی نہیں ہے۔

قال الازهری: قاموس میں جو یہ مذکور ہوا کہ''اس لفظ کی تکثیر نہیں آتی''اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ خُلُق کی صرف

افعال' کے وزن پر جمع آتی ہے، اس کے علاوہ اس لفظ کی جمع تکثیر کے طور پر کوئی جمع نہیں آتی اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی جمع صرف ' اخلاق ' ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ ''خُلُق'' 'فا' و'لام' کے ضمہ کے ساتھ 'خُلُق' ، بمعنیٰ طبیعت حسنہ کی جمع ہے۔ اور علامہ خرپوتی کا یہ قول جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ ان معانی کے برخلاف ہے جو ابھی ہم نے لغات سے نقل کئے ہیں۔ نیز ان کا طبیعت حسنہ کی قید لگانا (یعنی طبیعت کو حسنہ کے ساتھ مقید کرنا کہ صرف اچھی طبیعت وفطرت ہی کو خُلُق کہتے ہیں) یہ معنیٰ واحد پر اقتصار کرنا ہے جو مروّت ہے اور امر اس میں آسان ہے جب کہ جس مصدر کو علامہ خرپوتی نے ذکر کیا اس کے بارے میں تو ہمیں ذرا بھی علم نہیں۔

اور ناظم شعر کا یہ قول (فی خَلْقٍ و فی خُلُق) متعلق ہے ان کے اس قول سے (فاق النبین) اور یہ تعلق تمیز کی قوت کے معنی میں ہے، اس کو فوقیت کی نسبت میں ابہام کو رفع کرنے کے لئے لائے ہیں (یعنی آخر حضور کو فوقیت ہے تو کس چیز کی نسبت سے فوقیت ہے؟ تو اس پوشیدگی کو دفع کرنے کے لئے کہا کہ خَلق و خُلق میں فوقیت ہے) یعنی یہ بتانے کے لئے اس کی تصریح کی کہ حضور علیہ السلام کو خَلق وخُلق میں فوقیت حاصل ہے۔

(خَلقٍ) میں تنوین مضاف الیہ کے عوض کے طور پر ہے، اور وہ مضاف الیہ ''ہٗ'' کی ضمیر ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ کی جانب راجع ہے (یعنی فی خلقہ) تقدیری عبارت یوں ہوگی'' فاق النبین فی خَلقه وفی خُلقه'' یعنی حضور اپنی خلقت، اپنی حسن صورت، اپنے کمالات باہرہ اور اپنی طبیعت کریمہ، اپنی مروت عظیمہ اور اپنے دین و شریعت میں (جو باقی شرائع کے لئے ناسخ ہے) تمام انبیاء پر فائق ہیں۔ تو اس بنیاد پر ناظم شعر کا یہ قول (فی خَلق و فی خُلق) اگرچہ نکرہ ہے لیکن نکرہ ہونے کے باوجود وہ معرفہ کی قوت میں ہے یا پھر یہ نکرہ معینہ ہے جو آپ ﷺ کو مخصوص ومعین کررہا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ '' خَلق النبین و خُلق النبین ''کو کیوں ترک کردیا گیا؟ یعنی ناظم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ حضور کا حسن صورت وسیرت تمام انبیائے کرام کے حسن صورت وسیرت سے افضل ہے؟ آخر یہاں مضاف کیا ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مقدر ہے اور مقام اس کی تقدیر کا مقتضی ہے۔ تو معنی

ہوگا کہ آپ ﷺ کا حسن صورت، اپنے غیر تمام نبیوں کے حسن صورت سے بلند و بالا ہے اور ایسے ہی آپ ﷺ کا حسن سیرت بھی تمام انبیائے کرام کے حسن سیرت سے افضل واعلیٰ ہے۔

ہمارے مذکورہ شواہد ودلائل سے علامہ باجوری کا قائم کردہ اعتراض دفع ہوجاتا ہے جو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ''ناظم شعر پر یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ ناظم شعر کی عبارت سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ ﷺ انبیائے کرام سے صرف بعض حسن صورت وسیرت میں افضل ہیں سب میں نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے دونوں لفظ (خَلق و خُلق) نکرہ استعمال کئے ہیں جو اثبات وثبوت کے سیاق وسباق میں ہیں نہ کہ عام ہیں اور اس طرح حضور کی مدح تام نہ ہوئی اس لئے کہ ان کا یہ کلام اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ بعض دیگر اخلاق اور حسن صورت میں انبیائے کرام حضور ﷺ کے برابر ہوں نیز اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ اس میں حضور سے فائق ہوں بہرحال تو اگر انبیاء کا تفوق، حضور کے تفوق کے برابر ومساوی ہے تو معادلہ پایا جائے گا اور اگر انبیا کا تفوق حضور کے تفوق سے افضل اور زیادہ ہے تو اس سے ناظم کا مقصود (جو کہ مدح ہے) فوت ہوا جاتا ہے''

أجيب:۔ اس سے مراد'' خَلقهم و خُلُقهم'' ہے یعنی حضور تمام انبیائے کرام سے ان کے تمام حسن صورت و سیرت میں فائق ہیں، تو اس صورت میں یہ دونوں لفظ معنیً مضاف اور عام ہیں، اس اصل کی بنیاد پر کہ نکرہ کبھی اثبات کے سیاق میں ہونے کے باوجود عام ہوتا ہے (ص ۲۴)

قارئین کرام پر واضح ہوگا کہ ناظم فاہم کے کلام کا مقتضی اور مقصود وہ نہیں ہے جس کا معترض نے دعویٰ کیا ہے۔ اور لزوم مفاضلہ ومعادلہ کا جو معترض نے ذکر کیا ہے وہ محض اس تقدیر کے مقتضیٰ سے رفع ودفع ہوجاتا ہے جس کو ہم نے مقدر مانا ہے جیسا کہ یہ اعتراض شروع میں ناظم کے یہ کہنے (فاق النبين) اور آخری میں ان کے یہ کہنے (ولم يدانوهٗ) سے پہلے سے ہی مدفوع ہے۔

ناظم شعر کا دوسرے مصرع میں یہ کہنا (ولم يدانوه) مزید افادۂ فوقیت میں اضافہ ہے اور فوقیت وافضلیت کا معنیٰ بتانے کی تاکید ہے کہ آپ ﷺ رفعت وبلندی کے اس مرتبے پر باریاب ہوئے کہ کوئی نبی اس مرتبے کو نہیں

پہنچ سکتا، نہ تو علم میں اور نہ ہی کرم میں۔

حضور اکرم ﷺ کے حسن صورت وسیرت اور علم وکرم کا بیان:

شیخ زادہ فرماتے ہیں ''آپ ﷺ کے حسن صورت وسیرت اور علم وکرم کے بیان کی جانب بعض آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے نیز احادیث صحیحہ میں اس کا بیان ثقات سے مروی ہے لیکن ان تمام امور میں اصل یہ آیت پاک ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی تو ہر نبی کو کوئی نہ کوئی فضیلت عطا ہوئی پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام فضیلتوں کو جمع فرمایا اور ان فضائل میں مزید اضافہ بھی فرمایا یہاں تک کہ وہ فضل عظیم ہوگئیں پھر حضور کے حسنِ صورت اور جمال طلعت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا (والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ)، اس طرح کہ 'ضحیٰ' (چاشت کے وقت) کا آپ ﷺ کے روشن ومنور چہرۂ مبارک سے استعارہ فرمایا اور "لیل" سے حضور کے شدید السواد زلف مبارک کی طرف اشارہ فرمایا اور ان دونوں کا ذکر فرما کر ان کی قسم یاد فرمائی، (یاد رہے کہ) یہ قول اس بنیاد پر ہے جس کی تصریح بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر میں فرمائی ہے۔

قارئین کرام کو اس موضوع پر حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان کافی ثابت ہوگا کہ فرماتے ہیں " انا املح "کہ میں حسن ملیح والا ہوں، نیز حضور کے حسن سیرت واخلاق کے تعلق سے دلیل کے طور پر یہ آیت کفایت کرے گی (و انك لعلى خلق عظيم) اور اس بات پر دلیل کہ حضور تمام مخلوق میں سب سے اعلم ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان ہے (وعلمك مالم تكن تعلم) اور آپ کے زیادتی شرف پر یہ آیت پاک دلیل ہے (الم نشرح لك صدرك) اور آپ ﷺ کا ارباب جودوکرم میں سب سے زیادہ اکرم اور صاحب جودوکرم ہونے پر حضور کا یہ فرمانا دلیل ہے (انا اکرم ولد آدم) صلوات الله و سلامه عليه فى كل وقت وحين (ص۸۰ / ۸۱)

حسن وصورت وسیرت نبوی

یہ شیخ زادہ کے تصریحات تھیں، اس کے علاوہ امام بغوی نے اپنی 'معالم' میں اس آیت پاک (و انك لعلى خلق عظيم) کی تفسیر کے دوران، حضور کے حسن صورت وسیرت کے متعلق کچھ حدیثین ذکر کی ہیں، ان میں سے بعض کو

ہم یہاں نقل کر دینا چاہتے ہیں، علامہ بغوی تصریح فرماتے ہیں کہ ”حضرت ابواسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت براء کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ خوب سیرت تھے، نہ تو آپ بہت زیادہ دراز قد تھے اور نہ ہی پست قد۔ (بلکہ آپ کا قد شریف درمیانی تھا) حضرت انس ابن مالک فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال حضور کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کیا لیکن حضور نے مجھے 'اف تف' تک کبھی نہ فرمایا اور میرے کسی کام کو یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اور نہ ہی میری کسی بھول کو یہ فرمایا کہ تم نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟ بے شک رسول اللہ ﷺ سب سے بہتر اخلاق و کردار اور حسن سیرت والے تھے اور میں نے آج تک کسی ریشم کو نہیں چھوا کہ جو حضور کے کف مبارک سے زیادہ نرم و ملائم ہو اور نہ ہی میں نے کوئی مشک و عطر ایسا سونگھا جو حضور کے پسینۂ مبارک سے زیادہ خوشبودار ہو۔

حضرت عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے کہ حضور کے یہاں بد خلقی اور بے حیائی کا تصور نہ تھا آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ با خلاق و با کردار ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک عورت مدینہ منورہ کے کسی راستے میں حضور سے ملی اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے، حضور نے فرمایا ”اے ام فلاں مدینہ کے جس راستے میں چاہو بیٹھو، میں بیٹھ جاؤں گا تمہارے پاس“ فرمایا کہ پھر ان خاتون نے ایسا کیا، اور حضور ان کے پاس بیٹھے یہاں تک کہ ان کی ضرورت کو پورا فرما دیا۔

حضرت انس ابن مالک فرماتے ہیں کہ شہر مدینہ کی کوئی بھی باندی اگر چاہتی تو حضور کا دست مبارک تھام سکتی تھی اور جہاں چاہتی حضور کو لے جا سکتی۔

حضرت انس ابن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی شخص سے مصافحہ فرماتے تو اپنے دست مبارک کو اس شخص کے ہاتھ سے خود نہیں کھینچتے یہاں تک کہ وہ شخص خود ہی اپنا ہاتھ الگ کرتا اور نہ ہی حضور اپنے رخ انور کو اس شخص کے چہرے سے پھیرتے یہاں تک کہ وہ شخص خود ہی اپنا چہرہ پھیرتا اور حضور اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف

پیز نہیں پھیلایا کرتے تھے۔صلوات الله و سلامه عليه

ایک اور بات یہ کہ جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ کا حضور کے انتہائی حسن و جمال کے متعلق بہت ہی خوبصورت کلام ہے جو حضور کے علمی مقام و مرتبے کی رفعت و بلندی پر روشنی ڈالتا ہے نیز یہ کلام اہل حق کے عقیدے کا اعلان بھی کرتا ہے۔آپ اپنے رسالے " الدولة المكيه بالمادة الغيبيه " میں یوں تصریح فرماتے ہیں ''ہم اہل حق کی جماعت نے بحمداللہ تعالیٰ تحقیقی طور پر یہ بات جان لی ہے کہ یہ جو تفاصیل بیان ہوئیں اول یوم سے آخر یوم تک علم ماكان و مايكون کی، یہ تو ہمارے نبی اکرم ﷺ کے علوم کا تھوڑا سا حصہ ہے۔

اس پر دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان ہے (علمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما)(النساء ۱۱۳)

أقول:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت پاک میں اپنے حبیب ﷺ پر احسان عظیم فرمایا وہ علم دے کر جو آپ پہلے خود سے نہیں جانتے تھے اور اس احسان کا ختم اس چیز پر ہوا جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ احسان و منت بہت عظیم ہے، کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا(وكان فضل الله عليك عظيما) اور یہ بات معلوم ہے کہ ماکان و مایکون کے علم کا معنیٰ مذکور تمام کا تمام فرداً فرداً تفصیل تام کے ساتھ لوح محفوظ میں ثبت ہے اور لوح محفوظ نہیں مگر دنیا، اس لئے کہ قیامت کے دن کے بعد آخرت ہے اور دنیا و آخرت کے ماورا صرف ذات الٰہی اور اس کی صفات ہیں جس کو لوح و قلم نہیں سمیٹ سکتے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے بارے میں فرمایا(قل متع الدنيا قليل)(النساء ۷۷) تو وہ جسے اللہ تعالیٰ نے تھوڑا اور قلیل بتایا، اس چیز سے کیا نسبت رکھے جسے اللہ نے عظیم فرمایا اور جس کی شان کی بڑائی ظاہر کی ہو۔

اور ان تمام چیزوں کے باوجود آپ ﷺ کا علم شریف قیامت کے دن کے مابعد تک کو شامل ہے جیسے حشر و نشر، حساب و کتاب وغیرہ۔اس تفاصیل کو شامل ہے جو وہاں ہے یعنی، ثواب و عقاب کے علم سے لے کر لوگوں کے جنت و دوزخ اپنے اپنے ٹھکانوں میں اترنے کے علم کو شامل ہے اور اس کے علاوہ وہ ان باتوں کو شامل ہے جو اللہ تبارک و

تعالیٰ نے آپ کو بتانا چاہی اور بے شک آپ ﷺ نے اپنے رب عزوجل کی ذات وصفات سے اتنا جانا جس کی قدر وہ خدا ہی نے چاہا، جو یہ بخششیں اپنے مصطفیٰ کو عطا کرنے والا ہے۔تو اس وقت یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ 'ماکان ومایکون' کا علم جو لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے وہ ہمارے آقا ہمارے محبوب ﷺ کے علوم کا صرف ایک ٹکڑا ہے نہ یہ کہ وہ علم ہمارے نبی کے حق میں زیادہ ٹھہرے اور انہیں حاصل نہ ہو۔اسی وجہ سے امام شرف الدین بوصیری (اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے برکات سے نفع پہنچائے) فرماتے ہیں:

فان من جودك الدنيا وضرتها　　　ومن علومك علم اللوح والقلم

ترجمہ:۔تو بے شک دنیا اور اس کے حوائج یارسول اللہ آپ کے جودوکرم کا ایک صدقہ ہیں اور لوح وقلم کا علم یارسول اللہ آپ کے علوم کا ایک ٹکڑا ہے۔

امام شرف الدین بوصیری نے اپنے مذکورہ شعر میں 'من' تبعیضیہ ذکر فرما کر ہر قلب مریض پر غیظ وغضب کے پہاڑ ڈھائے ہیں﴿ قل موتوا بغيظكم ان الله عليم بذات الصدور﴾ (آل عمران ۱۱۹)

علامہ علی قاری 'زبدۃ' میں شعر مذکور کے تحت فرماتے ہیں کہ اس شعر کی توضیح یہ ہے کہ علم لوح سے مراد وہ علم ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے جیسے نقوش قدسیہ اور صُوَر غیبیہ وغیرہ اور علم قلم سے مراد وہ علم ہے جسے اللہ نے جس طرح چاہا اس میں ودیعت فرمایا اور یہ اضافت ادنیٰ علاقہ کی وجہ سے ہے اور لوح وقلم کے علم کا آپ ﷺ کے علوم سے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے علوم حقائق ودقائق اور عوارف ومعارف،کلیات وجزئیات کی جانب متنوع ہیں؟ کہ ذات وصفات سے متعلق ہیں۔نیز یہ کہ لوح وقلم کا علم تو آپ کے علوم کے سطروں میں سے ایک سطر ہے اور آپ کے بحر علم کی ایک نہر ہے پھر ان تمام چیزوں کے باوجود علم لوح وقلم تو صرف حضور علیہ السلام کے وجود مسعود ہی کے سبب سے ہے۔(الدولۃ المکیہ ص۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱) یہ حوالہ مترجم کی جانب سے ھے اصل کتاب میں حوالہ نہ تھا۔

امام احمد رضا قدس سرہ اپنی اسی تصنیف لطیف میں خطبہ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے جو تمام غیوب کو خوب جاننے والا ہے، گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، عیوب کو چھپانے والا ہے، سرمجوب پر اپنے مرتضیٰ (پسندیدہ) رسولوں کو مطلع (مسلط) فرمانے والا ہے اور سب سے افضل دردود اور اکمل سلام ہو ان پر جو ہر مرتضیٰ (پسندیدہ) سے زیادہ پسندیدہ ہیں، ہر حبیب سے بڑھ کر حبیب ہیں، غیوب پر اطلاع پانے والوں کے سردار ہیں، جن کو اللہ نے تعلیم دی اور اللہ کا ان پر فضل عظیم ہے تو وہ ہر غیب پر امین ہیں نہ غیب کی خبریں بتانے میں بخیل اور نہ ہی وہ اپنے رب کی نعمت واحسان سے بے خبر ہیں کہ جو ہوا اور ہوگا کا علم (علم ماکان و مایکون) ان سے پوشیدہ ہو، تو وہ ملک وملکوت کے مشاہدہ کرنے والے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات وصفات کے ایسے دیکھنے والے ہیں کہ آنکھ نہ کج ہوئی نہ حد سے بڑھی، تو کیا تم جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں اس میں ان سے جھگڑتے ہو، اللہ نے ان پر قرآن نازل فرمایا ہر چیز کا روشن بیان کردینے کو تو حضور نے تمام اگلے پچھلے علوم پر احاطہ فرمایا اور ایسے علموں پر جو کسی حد پر نہ رکیں اور نہ شمار کئے جاسکیں اور تمام جہاں میں ان کو کوئی نہیں جانتا تو آدم علیہ السلام کا علم اور تمام عالم کا علم اور لوح وقلم کا علم یہ سب مل کر ہمارے محبوب ﷺ کے بحر علم سے ایک بوند ہیں اس لئے کہ حضور ﷺ کے علوم (اور تو نے کیا جانا کہ حضور کے علم کیا ہیں) سب سے بڑا چھینٹا اور عظیم تر چلو ہیں اس غیر متناہی سمندر یعنی علم قدیم الٰہی سے، تو حضور اپنے رب سے مدد لیتے ہیں اور تمام جہاں حضور سے مدد لیتا ہے تو اہل علم کے پاس جو کچھ علوم ہیں وہ سب حضور کے علم اور حضور کے سبب سے ہیں اور حضور کی سرکار سے آئے ہیں اور حضور ہی سے اخذ کئے گئے ہیں ﷺ

کلھم من رسول اللہ ملتمس غرفا من البحر او رشفا من الدیم

(ترجمہ: تمام مخلوق، رسول اللہ ﷺ سے ملتمس ہے اور سبھی حضور کے بحر علم سے ایک چلو پانی یا حضور کے باران کرم

سے ایک گھونٹ کے خواہاں ہیں)

واقــفــون لــديـــه عـــنــد حــدهــم　　　　من نـقـطة الـعـلـم او من شكلة الحكم

(ترجمہ: اور سبھی حضور علیہ السلام کے سامنے اپنی اپنی حد اور مرتبے پر کھڑے ہیں اور واقف ہیں علم کے ایک نقطے پر یا حکم کے ایک شکلے پر)

صلى الله تعالىٰ عليه وسلم و على آله و صحبه و بارك و كرم آمين۔ ختم شد (الدولة المکیہ ص۲۵۹،۲۶۰)

علامہ خرپوتی کا کہنا ہے کہ یہ وہ دوسرا شعر ہے جس کو سماعت فرمانے کے بعد حضور علیہ السلام نے تمایل فرمایا جس وقت کہ امام نے اسے عالم رویا میں حضور کے سامنے گنگنایا تھا، اسی وجہ سے اس قصیدے کے قاری کو چاہئے کہ وہ اس شعر کو بار بار پڑھا کرے اور یاد رہے کہ تکرار طاق عدد میں ہو۔ (ص۸۱)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه اجمعين و من تبعهم باحسان الی یوم الدين

یہ قصیدہ مبارکہ کی فصل ثالث سے گیارہواں شعر ہے، افضل البشر ﷺ کی مدح میں، ہم اس کی شرح کا آغاز کررہے ہیں؛ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۳۹) کلهم من رسول الله ملتمس　　　　غـرفـا مـن الـبـحـر او رشـفـا من الديم

(ترجمہ: یارسول اللہ آپ کے عوارف و معارف کے سمندر اور کرم وسخا کی مسلسل بارش سے، تمام کے تمام انبیائے کرام ایک چلو یا ایک گھونٹ کے خواہاں ہیں)

ربط: شاعر ذی فہم مسلسل ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کے طرف منتقل ہوکر، حبیب محبوب ﷺ کی مدح

میں تفنن اختیار کررہے ہیں نیز معنیٰ جدید کی تاسیس میں تفنن کے ساتھ ساتھ تاکید کا لحاظ کررہے ہیں تو گزشتہ معانی و مفاہیم کی تاکید اور مجاز کے وہم کو دفع کرنے کے لئے (جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں کہا جاتا ہے (فسجد الملٓئکة کلھم اجمعون) اور تمام افراد کے محیط ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ہی، ناظم فاہم اپنے شعر میں لفظ" کل" لائے اور یوں ذکر فرمایا(کلھم) تاکہ عموم پر اس طرح دلالت کرے کہ کوئی بھی فرد اس سے خارج نہ ہو، نیز علم و کرم اور غایت وشرافت میں اصالت کے افادے ہی کے لئے (عموم رسالت جس کو چاہتا ہے) انہوں نے کہا: " کلھم من رسول الله ملتمس الخ' 'اور اسی معنیٰ کی وجہ سے شاعر ذی فہم نے حضور کے تمام اوصاف میں سے وصفِ رسول کو ترجیح دی جو تمام اوصاف کی شمولیت پر دلالت کرتا ہے، افاضہ اور امداد میں منفرد ہونے اور تمام مخلوق کا استمداد میں حضور کا محتاج ہونے کی وجہ سے اسی لئے انہوں نے کہا " کلھم من ۔الخ' 'اور ناظم شعر نے اسم رسالت کی تصریح اس لئے نہیں فرمائی کہ ُرسول ' سے حضور ہی مراد ہیں، اس کے مطلق ہونے کی وجہ سے (اور لفظ رسول جب مطلق ہو اس امت کی کتب میں تو اس سے حضور علیہ السلام ہی مراد ہوتے ہیں)

(کلھم) میں ضمیر مجرور اس کی طرف راجع ہے جس کا ذکر گزشتہ اشعار میں کیا گیا ہے یعنی 'نبیّین ' کی طرف راجع ہے یا پھر یہ عموم دعوت ورسالت کے مفہوم یعنی تمام مخلوق کی جانب راجع ہے اور ضمیر کو اسی طرف لوٹانا زیادہ مناسب ہے کمالا یخفٰی اور اسی وجہ لطیف کی جانب اشارہ ہمارے نقل کردہ خطبے میں گزر چکا جس کو جد کریم امام احمد رضا قدس سرہٗ نے اپنے رسالے " الدولة المکیه "میں مقدم کیا ہے(کہ جد کریم نے خطبہ میں یوں فرمایا کہ "تمام مخلوق حضور سے مدد لیتے ہیں'')

ناظم شعر کا یہ قول(من رسول الله) متعلق ہے ان کے اس قول سے (ملتمس) لیکن متعلق کو متعلق بہ پر وزن شعری اور افادۂ حصر کی وجہ سے مقدم کیا یعنی سب صرف آپ سے ملتمس ہیں نہ کہ کسی اور سے (برائے افادۂ حصر)

(وکلھم) مبتدا ہے اور اس میں 'واؤ' یا تو عاطفہ ہے یا ابتدائیہ ہے اور (ملتمس) یہ اسی مبتدا کی خبر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خبر کو مفرد کیوں لائے جب کہ مبتدا 'کلھم ' ہے جس میں جمع و کثرت کا معنی ہے؟ تو اس کا جواب

یہ ہے کہ خبر کو مفرد لفظ 'کــــل' کی رعایت کی وجہ سے لائے (جو کہ مفرد ہے) اور لفظ کل جیسا کہ علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ وہ 'اکلیل' (سر کا تاج) سے ماخوذ ہے جو سر کے ہر چہار جانب کو محیط ہوتا ہے تو اسی وجہ سے وہ موجب احاطہ ہوتا ہے تو 'کل' ان اسماء سے ہے جو لازم الاضافت ہوتے ہیں مگر صرف اسماء پر داخل ہوتے ہیں اس لئے کہ اضافت، اسم کے خصائص سے ہے اور اصولیوں کے نزدیک لفظِ کل جب معرفہ کی جانب مضاف ہو تو وہ موجب احاطۂ اجزاء ہوتا ہے اور جب نکرہ کی جانب مضاف ہو تو افراد کے احاطہ کو ثابت کرتا ہے تو اسی وجہ سے انسان کا یہ کہنا درست ہے " کـل التـفــاح حــامض " یعنی پورا سیب، اس کے تمام اجزاء کھٹے ہیں، لیکن اس کے برعکس یہ کہنا درست نہیں ٹھہریگا " کـل تـفـاح حـامض " کہ ہر سیب کھٹا ہے اس وجہ سے کہ بعض سیب میٹھے ہوں۔ (ص ۸۱، ۸۲)

اور ابھی جو ہم نے کہا کہ (کـلـهم) مبتدا ہے تو یہ اعراب وترکیب کے اعتبار سے ہے لیکن رہا معنیٰ و مفہوم کے اعتبار سے، تو تمام انبیائے کرام، ہمارے نبیٔ اکرم ﷺ کی خبر مقدم ہیں اور آپ ﷺ مؤخر مبتدا ہیں جو ان سب کی اصل اور تمام مخلوق کی اصل ہیں جیسے بیج، درخت کی اصل ہوتا ہے اور درخت اپنی تمام ٹہنیوں، شاخوں، پھولوں، کلیوں اور جو کچھ اس کے تنے سے قائم ہے سب کے ساتھ بیج کی خبر ہوتا ہے اور وہ تخم شگوفہ اور کلی میں اپنے بارے میں خبر دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اس شجر کی اصل ہے، اور مبتداء مؤخر ظہور میں مؤخر اور پیچھے ہوتا ہے لیکن جو کچھ نکلتا ہے اسی سے نکلتا ہے تو اسی وجہ سے آپ ﷺ شجرة الكون ہیں، سیدنا ابی عربی کا ایک مستقل رسالہ ہے جس میں انہوں نے اسی معنیٰ کو ثابت کیا ہے جس کا نام انہوں نے ''شجرة الكون'' رکھا ہے۔

ہمارے ثابت کردہ امور سے یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ " كلهم " یہ " كل احدهم " کے معنیٰ میں ہے یعنی یہ اس بات کو مفید ہے کہ 'کل' حقیقت کے اعتبار سے تمام افراد کو محیط ہے، ضمیر جمع کے قرینے سے یا پھر وہ حذف مضاف کے طور پر ہے جس کو ہم نے مقدر مانا ہے۔

(مـلـتـمـس) مصدر التماس سے ہے بمعنیٰ سوال وطلب کرنا ہے مگر لفظ التماس میں رعایت ادب ہے اسی وجہ سے

انہوں نے ''ملتمس'' سے ہی تعبیر کیا، انبیائے کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ پاس ادب کی وجہ سے۔

لفظِ 'ملتمس' معنیٰ اخذ کو شامل ہے یعنی ''طلب کرنے والا اور اسی وقت میں اخذ کرنے والا'' اس پر ان کا قول غرفاً دلالت کرتا ہے۔

(غرفاً) یہ مصدر ہے اسم فاعل کے معنی میں یعنی '' غارفین '' تو اس صورت میں وہ حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا پھر وہ اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی ''مغروف''، اور یہی بات (رشفا) کے متعلق کہی گئی ہے تو اس بنیاد پر '' رشفاً ''مفعول '' ملتمس '' ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

غرف (مصدر): چلو سے پانی لینا یعنی ہتھیلی بھر کر پانی لینا۔

'' رشف '' رشیف مصدر ہے بمعنیٰ گھونٹ گھونٹ پانی پینا یعنی ہونٹ سے پانی چوسنا۔

(البحر) یہ ''البر'' (خشکی) کی ضد ہے، بحر کو بحر اس کے گہرے اور وسیع ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

(الدیم) یہ '' دیمۃ '' کی جمع ہے اور 'دیمۃ' اس بارش کو کہتے ہیں جو بغیر گرج اور بجلی کے دائم اور مسلسل ہو۔ اور 'دیم' و 'بحر' میں سے ہر ایک میں استعارہ تصریحیہ ہے، آپ ﷺ کے معارف کو بحر سے اور آپ کے کرم وسخا کو 'دیم' سے تشبیہ دی گئی ہے اور '' غرفاً '' ترشیح ہے اسی طرح '' رشفا '' بھی ترشیح ہے، اس طور پر کہ لینے اور اخذ کرنے کو غرف چلو اور گھونٹ سے تشبیہ دی تو ان دونوں لفظوں میں بھی استعارہ ہے۔

بہر حال معنی یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام کے علوم و معارف، حضور ﷺ کے علوم کے سمندر سے ایک غرفہ اور چلو ہیں اور ان تمام انبیائے کرام کے کرم وسخا آپ ﷺ کے کرم کی بارش کا ایک چھینٹا اور قطرہ ہیں۔

حاصل معنیٰ: آپ ﷺ کا علم وسعت میں سمندر کے مثل ہے اور تمام ندیوں نالوں کا چشمہ اسی سمندر سے جاری ہے اور اسی طرح آپ کا کرم وسخا، موسلا دھار بارش کے مثل ہے تو اسی وجہ سے آپ ﷺ علوم و معارف اور کرم وسخا کا فیضان فرمانے والے ہیں اور تمام مخلوق اس فیضان سے مستفیض ہونے والی ہے۔

علامہ خرپوتی نے اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے آپ ﷺ کی روح کو پیدا فرمایا اور تمام انبیائے کرام کے علوم اور ما کان و ما یکون کا علم اس میں رکھ دیا پھر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو پیدا فرمایا تو انہوں نے اپنے علوم آپ ﷺ سے اخذ کئے، مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب تمام اشیاء سے پہلے نور محمدی ﷺ کو پیدا فرمایا تو لوح وقلم اور زمین و آسمان، عرش و کرسی، جنات و ملائکہ، جنت و دوزخ، انبیاء ومرسلین کی ارواح اور ان کے قلوب اور نفوس کے نور کو آپ ﷺ کے نور سے پیدا فرمایا، تو انبیائے کرام کا علم ایک نقطے کے مثل ہے اس لوح وقلم کے علم کی بنسبت جو آپ ﷺ کے نور سے پیدا شدہ ہے۔ تو پتہ چلا کہ انبیائے کرام کا علم، حضور ﷺ کے علم سے ایک نقطہ ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

پھر جاننا چاہئے کہ یہ وہ تیسرا شعر ہے جس پر حضور نے تمایل فرمایا تھا تو پڑھنے والے کے لئے مناسب ہے کہ وہ اس شعر کو بار بار پڑھا کرے بشرطیکہ یہ تکرار طاق عدد میں ہو۔ (ص ۸۳)

ناظم شعر کے ان الفاظ (غــرفــا)، (رشفــا) میں اس جانب ایک لطیف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ تمام پر فوقیت رکھتے ہیں اور تمام سے افضل ہیں اور حضور کا عظیم ورفیع جود وکرم عالم علوی وسفلی کو محیط ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ کی فصل ثالث سے بارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٤٠) وواقـفـون لـديــه عـنـدحـدهـم　　　　مـن نـقـطة الـعـلـم او مـن شكلة الحكم

(ترجمہ: تمام مخلوق اپنے اپنے مقام اور اپنے اپنے مرتبے پر حضور علیہ السلام کے پاس کھڑی ہے اور سب کے سب واقف اور مطلع ہیں علم کے ایک نقطے یا حکمتوں کی ایک علامت سے۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ اشعار میں یہ بیان کیا کہ حضور علیہ السلام سید الکونین ہیں اور پھر وہ آہستہ آہستہ اس معنیٰ کی تاکید کرتے ہوئے اور اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے معنیٰ جدید کے ساتھ آگے بڑھے یہاں تک کہ وہ انتہائی بیان تک آپہنچے کہ انہوں نے فرمایا " فاق النبيين في..الخ۔" پھر انہوں نے چاہا کہ معنیٰ معقول کو محسوس کی جانب نکالا جائے جو قوت لامسہ کے مدرک کی طرح ہو، ایسا تخیل کرادے کہ گویا ناظرین ان احوال کو دیکھ رہے ہیں، اس لئے فرماتے ہیں " كلهم من رسول الله ملتمس۔ الخ " اور انبیائے کرام کا ملتمس اور خواہاں ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ قائم اور واقف ہوں تو اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے انہوں نے اس معنیٰ کی تصویر آنکھوں میں اس طرح کھینچی اور ایسا تصور کرایا کہ گویا وہ قوت باصرہ سے انہیں محسوس اور ان کا مشاہدہ کررہے ہیں: فرماتے ہیں۔

وواقفون لديه عند حدهم　　　　من نقطة العلم او من شكلة الحكم

تشریح: (واقفون) یہ 'الوقوف' مصدر سے لازم ومتعدی دونوں طرح چند معانی میں مستعمل ہے، کہا جاتا ہے " وقف يقف وقوفا " بمعنی جلوس اور نشست سے اٹھنا، چلنے کے بعد ٹھہر جانا، رک جانا، کسی چیز پر مطلع ہونا، معائنہ کرنا، کہا جاتا ہے " وقف فلان ما عند فلان " یعنی بمعنی جان لینا، پتہ لگنا،" وقف الماشي و الجالس وقفاً " بمعنی ٹھہرانا، کھڑا کرنا۔" وقف فلانا عن الشئي " بمعنیٰ منع کرنا، روکنا،" وقف فلانا على الامور " بمعنیٰ واقف کرانا کسی امر پر فلاں کو مطلع کرنا۔ یہی معانی المعجم الوسيط ، میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔

اور انبیائے کرام کا اپنے اپنے مقام و مرتبے پر وقوف کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ تمام انبیائے کرام آپ ﷺ کے حضور علم وحکم میں اپنی حد اور اپنے اس مرتبے پر ثابت وقائم ہیں جو ان حضرات کے لئے مقرر کیا گیا ہے یعنی وہ ان حدود سے آگے بڑھنے والے اور تجاوز کرنے والے نہیں۔

اور رہی حضور اکرم ﷺ کی ذات تو حضور تو ہر آن اور ہر گھڑی اپنے مرتبے اور درجے سے ترقی فرماتے رہتے ہیں تو

علم وحکم میں تمام انبیائے کرام کے مراتب کی جو انتہا ہے وہ حضور اکرم ﷺ کے مرتبے ومقام کی ابتدا ہے اس علم وحکم کی وجہ سے جو کہ حضور کو عطا کیا گیا ہے تو انبیائے کرام کا حضور علیہ السلام کے پاس وقوف فرمانا ایک انتہا والے ذی غایت کا اپنے غیر کے مبدأ اور سرچشمے کے پاس وقوف کرنا ہے۔(حاشیۃ الباری ص ۲۵)

لفظ ''لدیٰ'' کی تحقیق

اور ناظم شعر نے (لدیٰ) ذکر فرمایا جو ظرف مکان ہے بمعنیٰ 'عند' اور یہ کبھی ظرف زمان کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے'' جئتك لدیٰ طلوع الشمس ''یعنی میں تمہارے پاس وقت طلوع شمس آیا۔

اور جب اس لفظ کی اضافت کسی ضمیر کی طرف کردی جاتی ہے تو اس کے 'الف' کو 'یا' سے بدل دیا جاتا ہے، اسی وجہ 'یا' کے ساتھ یوں کہا جاتا ہے، لدیك، لدیه، اور اس وقت یہ اصل اور عمدہ ہو جاتا ہے (اور نحویوں کی اصطلاح میں عمدہ اس کو کہتے ہیں جس کو کلام میں حذف کرنا درست نہ ہو اور یہ 'فضلہ' اور زائد کی ضد ہے) تو 'لدیٰ' اور وہ جو اس کے مشابہ ہیں (مثلاً 'لدن' وغیرہ) مبتداء کی خبر واقع ہوتے ہیں، قرآن پاک میں آیا:

﴿ولدینا کتٰب ینطق بالحق ﴾، اور مشتعل کرنے اور برانگیختہ کرنے کے موقع پر کہا جاتا ہے '' لدیك فلاناً'' اور یہ اسی قول کے مثل ہے کہ 'علیك فلاناً'۔

اور (لدن)، لدی 'ہی کے معنیٰ میں ہے لیکن اس لفظ میں کئی لغات ہیں جیسے : لَدُنْ ، لَدنْ، لُدْن، لَدُ، لُدُ لَدُ۔

نیز ناظم شعر نے (عــنــد) استعمال کیا جو کہ شئی حاضر اور شئی قریب اور شئی غائب کے لئے ظرف مکان ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ 'عند' کئی معانی میں مستعمل ہے تو کہا جاتا ہے'' عنده اخبار، عنده خیر وشر'' اور 'عند' جب کسی زمانے کی طرف مضاف ہو تو ظرف زمان ہوتا ہے جیسے 'نهضت عند الفجر ''یعنی میں فجر کے وقت اٹھا۔

اور کبھی حکم یا ظن کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے 'هذا عندی افضل من هذا، ' یعنی یہ میرے حکم وفیصلے میں یا میرے ظن وگمان میں فلاں چیز سے افضل وبہتر ہے۔ اور یہ لفظ معرب ہے، ظرفیت کی بنیاد

پر منصوب ہوتا ہے اور کبھی صرف 'من' کی وجہ سے مجرور ہو جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے، 'ساخرج من عندك ظهراً' یعنی میں تمہارے یہاں سے وقت ظہر نکلوں گا۔ اسی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا ہے 'ذهبت الی عنده' اور نہ ہی 'لعنده' کہنا درست ہوگا۔ (ماخوذ از المعجم الوسیط)

(نقطة) یہ 'نقط الحرف علیه نقطا' سے ہے یعنی بمعنیٰ حرف پر نقطے لگانا یا حرف کی تمیز کرنے کے لئے نقطے کا اضافہ کرنا، 'نقط الکتاب' بمعنیٰ اعراب لگانا تحریک کو با اعراب کرنا، اعراب سے پر کرنا، اور وہ اعراب و حرکات جو حروف پر لگائے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک پر لفظ نقطہ کا اطلاق ہوتا ہے اور (نقطة العلم) اور (شكلة الحكم)، ان دونوں میں اضافت 'اضافة المشبه به الی المشبه' کی قبیل سے ہے۔

اور 'علم' سے مراد یا تو رسول اللہ ﷺ کا علم ہے یا پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا علم پاک مراد ہے۔ بر تقدیر اول معنی ہوگا کہ انبیائے کرام کو جو علم و حکم عطا کیا گیا ہے وہ ہمارے نبیٔ اکرم ﷺ کے علم سے ایک نقطے اور ایک شکلے اور اعراب کی منزل میں ہے اور 'او' یہ تنویع و تقسیم کے لئے ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی چیز اس میں مانع نہیں ہے کہ وہ یہاں بمعنیٰ 'واو' ہو۔ اور بر تقدیر ثانی شعر کا معنیٰ یہ ہوگا کہ حضور نبیٔ اکرم ﷺ کا علم، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علم و حکم کی نسبت کمی وقلت میں ایک نقطے اور اعراب کے مثل ہے اور یہ مثال بھی محض تقریب فہم کے لئے ہے اور قلت کے مفہوم کو فقط ذہن کے قریب لانے کے لئے ہے ورنہ تو مخلوق کے علوم و حِکَم کو تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علم پاک سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم اس کی صفت قدیم ہے جو اس کے لئے محیط تفصیلی ہے، غیر متناہی بالفعل ہے اور ٹکڑے ہونے جز ہونے اور کسی دوسرے کی طرف منتقل ہونے سے پاک و منزہ ہے لیکن اس کے برعکس مخلوق کے تمام علوم چاہیں کتنے ہی زیادہ ہوں وہ فی نفسہ قلیل ہے، وہ تو ان کو محض اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہوئے ہیں، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾ الآیة اسی مفہوم کو جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ نے 'الدولة المكيه' میں بیان فرمایا ہے۔

نیز مذکورہ قول اس قول کے مثل ہے جو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ علی نبینا و علیهما الصلوٰة و السلام

سے کہا تھا جس وقت کہ انہوں نے پرندے کو سمندر سے پانی لیتے ہوئے دیکھا کہ آپ کا اور میرا علم اور تمام مخلوق کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم کے سامنے صرف اسی کے مثل ہے کہ جس طرح چڑیا نے سمندر میں سے اپنی چونچ کے ذریعہ پانی لیا۔اور 'علم' کہتے ہیں اس ادراک کو جو واقع کے مطابق ہو اور بمعنیٰ معلوم ہو۔

اور 'الحکم' یہ 'حکمة' کی جمع ہے جس کا معنیٰ علم ہے اور کہا جاتا ہے بمعنیٰ رائے وتدبیر کو نافذ کرنا ہے اور بمعنیٰ علم وعمل کو مضبوط کرنا۔ ملا علی قاری 'الزبدة' میں فرماتے ہیں کہ علم کو نقطے اور اعراب کو حکم کے ساتھ خاص اس وجہ سے کیا کہ اعراب وشکلہ سے مزید وضاحت اور ایسا بیان زائد حاصل ہوتا ہے جو نقطے سے نہیں حاصل ہوتا؛ اسی طرح یہ بھی ایک قول ہے کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ نقطہ ظہورِ علم میں اولیٰ ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس کی اضافت علم کی طرف کی گئی اور 'شکلہ' یعنی اعراب یہ ایک امر زائد اور مفہوم کی ماہیت سے خارج ہوتا ہے یعنی مفہوم اعراب پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ مفہوم اس نقطے پر موقوف ہوتا ہے کہ جس پر وضاحت وبیان کا مدار رہتا ہے، اسی وجہ سے 'شکلہ' یعنی اعراب کو 'حکم' کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور 'حکم' ان علوم دقیقہ کو کہتے ہیں جو علوم شریعہ سے متفرع اور نکلے ہوئے ہیں۔

ہماری ذکر کردہ تنبیہات سے جو کہ جد کریم امام احمد رضا نے بیان فرمائی ہیں اور علامہ ملا علی قاری کی جانب ہم نے جو منسوب کیا اس سے قارئین کرام پر اہل سنت وجماعت کی برأت روشن وواضح ہوگئی ہوگی تو اہل سنت نبی اکرم ﷺ کو علم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے مساوی اور برابر کہنے سے بری ہیں! حاشاهم عن ذالك

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم ، و آلہ و صحبہ اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

ہم قصیدۂ مبارکہ کی فصل ثالث کے تیرہویں شعر تک آپہنچے ہیں ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۴۱)فھو الذی تم معناہٗ و صورتہ ثم اصطفاہٗ حبیباً باریٔ النسم

(ترجمہ: پس وہی ہیں جن کے کمالات ظاہری اور کمالاتِ باطنی (یعنی صورت و سیرت) اکمل و اتم ہوگئے، پھر ارواح عالم کو پیدا کرنے والے نے انہیں حبیب منتخب کیا۔)

ربط: ہم اس شعر کی شرح کرنے کے سلسلے میں بادشاہ حقیقی اللہ رب العزت سے اعانت و مدد کے خواہاں ہیں، تو بتوفیق الٰہی (وھو حسبناو نعم المعین) ہم عرض کرتے ہیں کہ شاعر ذی فہم نے گزشتہ اشعار میں ان امور پر روشنی ڈالی ہے کہ حضور نبیٔ اکرم ﷺ بلند و بالا عظمت و بزرگی پر واصل ہیں اور حضور کو حسن صورت و سیرت (خَلق و خُلق) میں سب پر فوقیت و افضلیت حاصل ہے اور حضور علم و کرم کی بلند و رفیع چوٹی پر متمکن و فائز ہیں مزید انہوں نے یہ بیان کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اہل کمال کے لئے منصب تکمیل پر قائم فرمایا اور سب علم و حکم کی اس حد پر قائم ہیں جو کہ آپ تک پہونچتی ہے سب آپ ﷺ کے حضور دست بستہ کھڑے ہیں تو مقتضائے امور یہ ہوا کہ حضور ہر حال میں اتم و اکمل ہیں ناظم اس مفہوم کی طرف ضمناً اپنے اس شعر میں اشارہ فرما چکے ہیں کہ (فاق النبین فی خلق و فی خُلق) لیکن پھر بھی انہوں نے چاہا کہ وہ اس معنیٰ کو مزید مؤکد و ثابت کردیں تو انہوں نے اس مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لئے نتیجہ کے طور پر یہ شعر کہا کہ گزشتہ اشعار اس نتیجہ تک پہنچا رہے تھے تو گویا وہ گزشتہ اشعار اس شعر کے لئے مثلِ مقدمہ ہوئے، پس ناظم فاہم نے یوں فرمایا

(فھو الذی تم معناہٗ و صورتہٗ☆ ثم ا صطفاہ حبیبا باریٔ النسم)

اور شاعر ذی فہم نے یہ شعر اس لئے بھی کہا تا کہ یہ ان کی طرف سے اس پر دلیل ہو کہ یہ شعر مسبب ہے جو ذکر کردہ

سبب پر مرتب ہے اور یہ ترتیب 'فا' کے استعمال کا ایک طریقہ ہے! تو 'فا' یہاں مسبب پر زائد ہے جیسا کہ کبھی 'فا' سبب پر زائد ہوتا ہے، جیسے اس قول میں ہے: "اذا جاء الشتاء فتأهب" (کہ "تاهب" پہ 'فا' زائدة المقحمة ہے یعنی جب جاڑے آجائیں تو تیاری کرو، لہذا جاڑے کا آنا سبب ہے تیاری کرنے کے لئے تو بیان 'فا' زائدہ ہے نہ کہ ترتیب کے لئے)

حضور اکرم ﷺ کا حبیب اور مصطفیٰ ہونا

مذکورہ بالا عبارت میں بیان کردہ امور سے قائین کرام پر واضح ہو گیا ہوگا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا برگزیدہ اور منتخب ہونا یعنی مصطفیٰ ہونا مذکورہ تمام خصائل وشمائل کو لزومی طور پر شامل اور ملحق ہے یعنی گزشتہ اشعار میں حضور کے جو خصائل ذکر کئے گئے جیسے حضور ﷺ کا سیادت وعموم نبوت اور شمول دعوت میں منفرد وتنہا ہونا، ہر ایک کے واسطے حضور علیہ السلام کا منصب تکمیل پر قائم اور فائز ہونا، حضور علیہ السلام کی نبوت کا فیضان انبیائے کرام کو عام وشامل ہونا وغیرہ ذالک۔ (تمام خصائل وشمائل حضور علیہ السلام کے برگزیدہ یعنی مصطفیٰ ہونے کے ساتھ مقترن وملحق ہیں اور یہ فضائل وخصائل ہر وقت اور ہر آن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہیں تو ناظم فاہم کا شعر یہی معنیٰ بتا رہا ہے (فهو الذى تم معناهٔ و صورتهٔ....) یہ شعر مذکورہ معنیٰ کو اس طرح مفید ہے کہ شاعر ذی فہم نے 'معنی' یعنی روح کو 'صورة' یعنی جسم پر مقدم کیا اور پھر ان دونوں کے لئے معنیٰ تمام وکمال کو ثابت کیا جب کہ ہے بھی یہی کہ روح جسم پر مقدم ہوتی ہے تو سیاق وسباق کے قرینے سے یہ اس بات کو متقضی ہے کہ حضور کو تمام کمال کا وافر اور کثیر حصہ ملا ہو اور وہ حضور کو روح وجسم (معنیٰ وصورت) میں بطور دوام حاصل ہو۔ عالم ارواح میں بدایت امر سے لے کر، عالم اشباح میں حضور کے حسن طلعت کے ظہور تک، نیز آپ ﷺ کا اصطفاء اور برگزیدہ ہونا، آپ کے معنیٰ وصورة (یعنی روح وجسم) کے ساتھ ہر حال اور ہر وقت ملا ہو۔

نیز یہاں سے علامہ باجوری کے ثابت کردہ معنیٰ کی صحت بھی معلوم ہوگئی جو انہوں نے بایں الفاظ بیان کیا "لفظ ثم"، حضور کی صفات میں ترتیب بیان کرنے کے لئے نہیں ہے جیسا کہ بعض نے کہا بلکہ ترتیب تو بیان وذکر کرنے

اور خبر دینے میں ہے (ص ۲۵) اور پھر علامہ باجوری نے انہی بعض قائل کے قول کی تصحیح کی جانب یہ کہہ کر اشارہ کیا کہ ''ان بعض قائلین کے کلام کو ان کے قول پر حمل کرنا اس طور پر ممکن وصحیح ہوسکتا ہے کہ اس کو بتقدیر مضاف مان لیا جائے جبکہ ترتیب کی اصل صفات کے ذکر ہی میں ہے۔ (۲۵۔۲۶) اور اسی صورت کو علامہ علی قاری نے 'زبدۃ' میں وجہ اور سبب بیان کرتے ہوئے اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں ''ایک قول یہ ہے کہ وہ یعنی 'لفظ ثم' اپنی اصل اور اپنے باب یعنی تراخی پر ہے یعنی حضور کے حسن صورت وسیرت کے اتم واکمل ہوجانے کے بعد حضور کو مرتبۂ نبوت عطا کیا گیا اگرچہ اس مرتبۂ معنویہ (مرتبۂ نبوت) کو عطا کرنا، کمالات صوریہ (حسن صورت وسیرت) کے وجود پر موقوف نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر شئی پر یکساں طور پر قادر ہے اور اختلاف تو صرف امور عادیہ پر مبنی ہے اور اس میں مدت اربعینہ یعنی چالیس سال تک انتظار کرنے کی وجہ کی طرف اشارہ ہے نیز اس میں حضور کی حضرت یحیٰ وعیسیٰ پر فضیلت اور ترجیح کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے کہ ان کو بچپن اور عالم طفولیت ہی میں نبوت عطا ہوئی (الزبدة ص ۵۷)

بہر حال اسی طرح وہ جوش وروانی بھی ظاہر وواضح ہوگئی جو علامہ خرپوتی وغیرہ کے کلام میں آگئی تھی کہ کلمۂ 'ثم' یا تو اپنی اصل پر 'تراخی' زمانی کے لئے ہے اس بنا پر کہ حضور ﷺ کے حبیب منتخب ہونے سے مراد بعد البعثت ہے یعنی حضور کو مبعوث کئے جانے کے بعد حضور کو حبیب منتخب فرمایا گیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضور کا مبعوث کیا جانا اور حضور کی بعثت حضور کے مرتبۂ کمال کو پہنچنے سے متراخی ہے اور اس بنا پر بھی کہ حضور کا حبیب منتخب ہونا معراج میں ہوا تھا، اس طرح کہ روایت کی جاتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شب معراج حضور سے فرمایا کہ اے محمد (دنیاوی) بادشاہ جب کسی کو ملک دینا چاہتے ہیں اور جب اسے معزز ومحترم بادشاہ بناتے ہیں تو وہ اس کے شرف و بزرگی کے اظہار میں عجلت سے کام لیتے ہیں تو کون سی چیز تم پسند کرتے ہو کہ تمہیں عطا کی جائے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا'' أضفني اليك يا رب بالعبودية'' یعنی اے میرے رب مجھے بندگی کے ساتھ اپنی طرف نسبت تشریف فرمالے اور (محبوبیت میں خود سے جدا نہ کرنا) تب حضور پر یہ وحی بھیجی گئی ﴿سبحٰن الذی

اسریٰ بعبدہ ﴾ (الآیۃ) پھر رب نے فرمایا کہ تم نے یہ فرمائش کی ہے بلکہ تمہارے لئے تو اس سے بہتر چیز ہے اور وہ تمہارا مجھ سے مرتبۂ حبیبیت میں ملنا ہے تو تم حبیب اللہ ہو! (علامہ خرپوتی فرماتے ہیں) کہ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معراج بعثت وکمال کے بعد ہوئی لہذا اس بنا پر ''ثم'' اپنی اصل یعنی تراخی پر ہے۔ (ص۸۵،۸۶)

نظم کا سیاق وسباق علامہ خرپوتی کے بیان کی تردید کررہا ہے جیسا کہ ہم نے اپنے ثابت کردہ امور میں اس طرف اشارہ کیا تھا اور اسی طرح ناظم فاہم کا یہ مصرع بھی صراحتہً اس کی تردید کررہا ہے (منزہ عن شریك فی محاسنہ) کہ یہ مصرعہ تمام محاسن روحانیہ اور جسمانیہ میں حضور کے تفرد کو چاہتا ہے نیز حضور کے تقدم اور حضور کی نبوت کے تقدم پر قطیع الدلیل آیات وروایات کا دلالت کرنا بھی اس کی تردید کررہا ہے اور تمام اشیاء سے قبل حضور کی تخلیق ہونا اور تمام اشیاء کی حضور کے نور سے تخلیق ہونا بھی اس کا رد ہے اور مزید یہ کہ غیر معروف، معروف ماثور ومشہور کے معارض نہیں ہوتا، اس بنیاد پر کہ اس روایت کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کہ اصطفاء کی مزید خبر دینا شب معراج تک مؤخر تھا علامہ ملا علی قاری نے فرمایا کہ (فھو) میں 'ھا' کے سکون کے ساتھ شعر کو پڑھا جائے گا اور (معناہ) میں ''ہ'' کو اشباع کیساتھ (یعنی کھینچ کر لمبا کرکے) پڑھا جائے گا۔ اور یہ دونوں لغت مشہور اور قرأت متواتر ہیں لہذا جس نے کہا کہ ضرورت شعری کی وجہ سے ہے، اس نے خطا کی۔

(تم) بمعنیٰ پورا اور کامل ہونا، شئی کے صلہ سے بمعنی پورا ہونا اور (معنٰی) یہ اسم مکان ہے یا مصدر میمی بمعنی مفعول ہے، (عینیت بکلامی کذا) سے یعنی میں نے اپنے کلام سے یہ مراد لیا ہے اور اس کا قصد کیا ہے۔ تو شئی کا معنٰی وہ ہوتا ہے جو اس سے مقصود ہو اور انسان کا معنیٰ اس کا کمال ہے یعنی جس سے وہ کامل ہوا۔

(صورۃ) بمعنیٰ شکل وھیئت، معنیٰ کو صورت پر صرف اس لئے مقدم کیا کہ معنیٰ اصل مقصود ہوتا ہے۔

اور یہاں شعر میں معنیٰ وصورت سے مراد کمالات باطنی اور کمالات ظاہری ہیں یعنی حسن صورت وسیرت یا وحی باطنی اور بعثت ظاہری یا باطریقت اور شریعت یا روحانیت وجسمانیت یا علم وعمل یا حضور کی عبادتِ حق اور معاملات خلق۔

(ثم اصطفاہ): الاصطفاء مصدر سے بمعنیٰ انتخاب واختیار۔ (حبیبا)، 'اصطفاہ' ضمیر سے حال واقع

ہے یا جعل کے معنیٰ کو شامل ہونے کی وجہ سے اس فعل کا مفعول ثانی ہے۔ (بــارئ) بمعنیٰ خالق۔ (الـنسم) بفتحتین، نسمة کی جمع ہے اس کا معنیٰ یا تو نفس ہے یا ہر ذی روح اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنیٰ انسان ہے۔
علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: شعر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی جانب تلویح ہے ﴿**اللــه یصـطـفی من الملئکة رسلا**﴾ (الآیة) نیز اس حدیث پاک کی جانب تلمیح ہے جو حضرت واثلہ بن الاسقع سے روایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اولاد میں حضرت اسماعیل کو چنا اور حضرت اسماعیل کی اولاد سے بنی کنانہ کا انتخاب فرمایا اور بنی کنانہ میں سے قریش کو چنا اور قریش میں بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چنا اور منتخب فرمایا'' (اس حدیث پاک کو امام مسلم نے روایت کیا) اور ایک روایت میں ہے'' **ان اللــه اصـطـفیٰ من ولد ابراھیم اسماعیل**'' کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل کا انتخاب فرمایا۔ (امام ترمذی نے اسے روایت کیا) نیز آقائے دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ میں کل قیامت کے دن بنی آدم کا سردار ہوں گا لیکن کوئی فخر نہیں، میرے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا مگر فخر نہیں اور حضرت آدم اور ان کے ماسوا سب نبی اس دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور میں ہی وہ ہوں کہ سب سے پہلے جس سے زمین شق ہوگی لیکن (بطور) فخر نہیں (کہتا) اور سب سے پہلے میں ہی شفاعت کرنے والا ہوں گا لیکن (اس پر مجھے) فخر نہیں۔ (امام احمد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے یہ حدیث روایت کی اور ایسا ہی 'زبدۃ' میں ہے (خرپوتی ص۹۶، زبدۃ ص۵۷، ۵۸)
(**فھـو الـذی تـم مـعناہ و صورتـه**)، شاعر ذی فہم کا یہ مصرعہ حضور اکرم ﷺ کے ذکر ولادت اور میلاد شریف کا اہتمام کرنے کو شامل ہے کـمـا لا یخفیٰ اور یہ ان کی جانب سے قرآن وسنت کے طریقہ پر صادر ہوا ہے، اس لئے کہ کتاب وسنت میں آیات وحدیث حضور اکرم ﷺ کے ذکر ولادت کرنے اور اس کے اہتمام کے حسن ہونے پر دال ہیں مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے ﴿**لـقـد جآء کم رسول من انفسکم**﴾ (الآیة) اور فرماتا ہے ﴿**قد جآء کم من الله نور**﴾ مزید فرماتا ہے ﴿**لـقـد من الله علی المومنین**﴾ (الآیة) اور جیسے حضور اکرم

ﷺ نے فرمایا" انا اول الانبیا خلقا و آخرھم بعثاً"، یعنی میں تخلیق کے اعتبار سے تمام انبیاء سے اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے مؤخر ہوں، بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ وہ حدیث اصطفاء (چننے اور انتخاب کرنے والی حدیث) جو ابھی مذکور ہوئی وہ یقیناً اس پر دلالت کرتی ہے جس کو ملا علی قاری نے آپ ﷺ سے روایت کی ہے۔

اور جیسے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان" لم یزل اللہ ینقلنی من الأصلاب الطیبة الی الأرحام الطاھرة "،یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ مسلسل میرے نور کو پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل فرماتا رہا یہ حدیث پاک بتا رہی ہے کہ ذکر میلاد اپنی اصل کے اعتبار سے سنت الٰہیہ وسنت نبویہ ہے اور ایسا طریقہ ہے جس پر صحابہ و تابعین اور ان کے مابعد سے لے کر آج تک سب کا معمول رہا۔

مذکورہ حدیث پاک قارئین کرام کے لئے اس بات کو مفید ہوگی کہ حضور اکرم ﷺ کا نسب شریف شرک کی نجاست و غلاظت سے پاک ومنزہ ہے اور یہ ایک ایسا مکرر مسئلہ ہے جو محصلین کے یہاں بار بار ہوتا ہے لہذا میلاد شریف کے اہتمام اور اجلاس کو بدعت کہنا اور یہ کہنا کہ حضور کا ذکر ولادت کرنا کتاب وسنت کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہے خرق اجماع ہے تو یہ قول تو خود بدعت کہے جانے کے زیادہ لائق ہے۔

حبیب وخلیل کے معنیٰ کی تحقیق

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا آپ ﷺ کو حبیب منتخب فرمانا، اس بات کو بتاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضور سیدنا محمد ﷺ کو اپنا خلیل بنایا جیسا کہ حضرت ابراہیم کو خلیل کیا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو وصف میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر فضیلت میں خاص فرمایا ہے، اور وہ اس لئے کہ آپ کے لئے دو وصف اتحاد کے ساتھ بیان کی گئی (اور آپ کی ذات میں دونوں اوصاف ہیں، ایک تو خلت اور دوسرا محبوبیت) نیز جب ثابت ہوگیا کہ حضور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی تنہا ذات مبارکہ میں وہ تمام اوصاف جمع ہیں جو باقی دیگر تمام انبیائے کرام میں متفرق طور پر موجود ہیں تو تمام انبیاء کے فضائل حضور میں جمع ہیں اسی وجہ یہاں اس

موقعہ پر امام قاضی عیاض کا ایک نفیس کلام ہے جو شفا شریف میں ہے ہم اسے ذکر کر دینا چاہتے ہیں:
قاضی عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں تصریح فرماتے ہیں: ''یہ فصل محبت وخلت میں حضور کی تفضیل کے بارے میں ہے (یعنی حضور کی تمام انبیائے کرام پر تفضیل کے متعلق ہے حتی کہ حضرت سیدنا ابراھیم علیہ السلام پر بھی تفضیل ہے جیسا کہ عنقریب اس پر سے پردہ اٹھے گا) اس موضوع پر آثار صحیحہ وارد ہوئی ہیں نیز حبیب اللہ مسلمانوں کی زبانوں پر حضور ہی کے ساتھ مختص ہے اور امام قاضی عیاض نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ضرور میں ابوبکر کو خلیل کرتا'' اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بے شک تمہارے آقا و مولیٰ اللہ کے خلیل ہیں؛ مزید حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے صحابہ حضور کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے (حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں) کہ اتنے میں حضور تشریف لائے اور ان سے قریب ہوئے اور انہیں مذاکرہ کرتے ہوئے دیکھا اور ان کی گفتگو کو سماعت فرمایا کہ ان میں سے ایک نے کہا کیا ہی عجیب بات ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے حضرت ابراہیم کو خلیل کیا پھر دوسرے نے فرمایا کہ کیا چیز حضرت موسیٰ کے کلام سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا پھر تیسرے نے کہا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں!! چوتھے نے کہا حضرت آدم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چن لیا ہے کہ اسی اثناء میں کہ وہ مذاکرے میں مشغول تھے حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لے آئے پھر سلام کیا اور فرمایا کہ میں نے تمہاری گفتگو اور تمہارے استعجاب کا ملاحظہ کیا کہ تم نے کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل کیا اور وہ ہیں بھی خلیل، تم نے کہا موسیٰ نجی اللہ ہیں بے شک وہ ہیں، تم نے کہا عیسیٰ روح اللہ ہیں بے شک وہ ہیں، تم نے کہا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم کا انتخاب فرمایا بے شک فرمایا مگر سن لو میں حبیب اللہ ہوں لیکن فخر نہیں، میں قیامت کے دن لوائے حمد کو اٹھانے والا ہوں لیکن بطور فخر نہیں کہتا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی لیکن فخر نہیں اور میں سب سے پہلے جنت کے حلقے کو حرکت دوں گا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ میرے لئے جنت کا دروازہ کھول دیگا اور پھر مجھے اس میں داخل فرمائے گا اس حال

میں کہ میرے ساتھ فقرائے مومنین ہوں گے مگر اس پر فخر نہیں اور میں اکرم الاولین والآخرین ہوں لیکن فخر نہیں''
نیز حدیث ابو ہریرہ میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا" انی اتخذتك خليلاً " یعنی میں نے تمہیں اپنا خلیل کیا اسی وجہ سے تورات شریف میں بھی حضور اکرم ﷺ کا اسم شریف 'حبیب الرحمٰن' مکتوب ہے۔
امام قاضی عیاض مزید فرماتے ہیں کہ علماء کا خلت کی تفسیر اور اس کے اشتقاق کی اصل کے بارے میں اختلاف ہے تو بعض نے کہا کہ ''خلیل'' اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ایسا خاص میلان اور لگاؤ رکھنے والے کو کہتے ہیں کہ پھر رب کی جانب میلان میں اور رب سے محبت میں اس کو کوئی چیز خلل پذیر نہ ہو۔
اور بعض کہتے ہیں کہ خلیل مختص کو کہتے ہیں اور اسی قول کو کئی حضرات نے اختیار کیا۔
اور بعض نے کہا کہ ''خلت'' کی اصل استصفاء یعنی انتخاب کرنا، خالص دوست بنانا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ الحب فی الله و البغض فی الله کرتے یعنی اللہ کے لئے محبت فرماتے اور اللہ کے لئے دشمنی کرتے۔ اور اللہ کی ان سے ''خلت'' ان کی مدد فرمانا اور انہیں بعد والوں کے لئے امام بنانا ہے۔
اور کہا گیا ہے کہ خلیل کی اصل فقیر محتاج منقطع ہونا ہے جو خَلت (بفتح خا) سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ حاجت ومحتاجی ہے تو حضرت ابراہیم کو خلیل اللہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی حاجت کو اپنے رب کے ساتھ خالص کرلیا ہے یعنی وہ اپنی حاجت صرف اسی کے سامنے رکھیں گے اور وہ اپنے غم کے ساتھ اپنے رب کی جانب مائل ہو گئے ہیں اور خالص اپنے رب سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی کی جانب نگاہ نہیں اٹھاتے ہیں اس لئے کہ حضرت جبرئیل جب آپ کے پاس تشریف لائے جس وقت کہ آپ منجنیق میں تھے آگ میں پھینکے جانے کے لئے تو انہوں نے آ کر آپ سے کہا کہ کیا آپ کو میری حاجت ہے؟ فرمایا تمہاری تو نہیں'' علامہ ابوبکر ابن فورک فرماتے ہیں: ''خلت'' اس خالص محبت کو کہتے ہیں جو اسرار کے ساتھ مختص ہونے کو ثابت کرتی ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ خلت کی اصل محبت ہے اور اس کا معنیٰ مدد کرنا لطف وکرم کرنا، بلند کرنا، سفارش قبول کرنا ہے اور اسی معنیٰ کو کتاب اللہ میں یوں

بیان کیا گیا ہے ﴿وقالت الیھود و النصٰریٰ نحن ابنٰٓؤا اللہ و احبّٰٓؤہ قل فلم یعذبکم بذنوبکم﴾ (المآئدۃ ۱۸) اس آیت پاک سے مفہوم مخالف کے طور پر محبوبوں کے لئے گناہوں پر مواخذہ نہ کرنا ثابت ہوا بشرطیکہ محبوب کے یہاں گناہ متصور وممکن ہو ورنہ محبت تو ان کے لئے ہوتی ہے جنکو اللہ تبارک وتعالیٰ نبوت کے ساتھ خاص فرمالیتا ہے اور پھران کے دل میں محبت ڈال دیتا ہے اور انہیں اپنا محبوب بنالیتا ہے جواس بات کو چاہتا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک اور معصوم ہوں) فرماتے ہیں خلت وہ رشتۂ فرزندی سے قوی تر ہوتا ہے اس لئے کہ رشتۂ فرزندی میں کبھی عداوت بھی ہوتی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ان من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم فاحذروھم﴾ (التغابن ۱۴ الآیۃ) لیکن اس کے برعکس خلت کے ساتھ عداوت ہونا ممکن نہیں اور اگر ایسا ہے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضور سیدنا محمد ﷺ کو خلت سے موسوم کرنا، یا تو آپ دونوں حضرات علیھما الصلوٰۃ والسلام کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب میلان اور خاص تعلق رکھنے، اور اپنی حوائج وضروریات کو رب کے سپرد کردینے، وسائط واسباب سے اعراض کرنے اور اللہ کے ماسوا سے علیحدگی اختیار کرنے کی وجہ سے ہے یا پھر ''خلت'' سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ دونوں علیھما السلام کے لئے رب کی جانب سے شدتِ اختصاص ہے اور آپ دونوں ہی کے یہاں اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم پوشیدہ ہے اور آپ دونوں کے باطن اسرار الٰہیہ اور پوشیدہ غیوب ومعرفت کے ساتھ خاص ہیں یا پھر موسوم کرنے کی وجہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا آپ دونوں کا انتخاب فرمانا اور آپ دونوں کے قلوب کا اپنے رب کے ماسوا سب سے خالی اور صاف ہونا ہے کہ کسی دوسرے کی محبت ان کو خلل نہیں ڈال سکتی۔

حبیب اور خلیل میں کون افضل؟

اسی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا کہ خلیل وہ ہوتا ہے کہ جس کے دل میں رب کے سوا کسی کی گنجائش نہ ہو اور ان حضرات کے نزدیک حضور ﷺ کے اس فرمان کا یہی معنیٰ ہے " ولو کنت متخذا خلیلا لا تخذت ابابکر خلیلا " یعنی اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ضرور ابوبکر کو بناتا لیکن ان سے اسلام کی اخوت ہے۔

اہل دل علماء اس امر میں مختلف ہیں کہ ان دونوں میں سے کون سا مرتبہ زیادہ بلند ہے؟ مرتبہ خلت یا مرتبۂ محبت؟ تو کچھ علماء نے دونوں درجوں کو برابر اور مساوی ٹھہرایا یعنی حبیب خلیل ہوتا ہے اور خلیل حبیب ہوتا ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام خلت کے ساتھ مخصوص ہیں اور حضور سیدنا محمد (ﷺ) کو محبت کے ساتھ مخصوص کیا اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ درجۂ خلت ارفع ہے اور وہ حضرت آقائے دوعالم ﷺ کے اس فرمان کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں" **لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی عزوجل لاتخذت ابابکر** "یعنی اگر میں رب کے سوا کے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن حضور نے کسی کو اپنا خلیل نہ بنایا۔

لیکن اس کے برعکس محبت کی تعمیم فرمائی حضرت فاطمہ، اِن کے دونوں شہزادگان اور حضرت اسامہ وغیرہ کے لئے (یعنی محبت کا لفظ ان کے لئے تو استعمال فرمایا لیکن لفظ خلت کا استعمال کسی کے لئے نہیں کیا) تو اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درجۂ خلت ارفع ہے۔

لیکن اکثر علماء نے درجۂ محبت کو درجۂ خلت سے ارفع قرار دیا ہے اس لئے کہ ہمارے نبی حبیب اللہ ﷺ کا درجہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے درجے سے بلند ہے نیز محبت کی اصل اور حقیقت، محبّ کی پسندیدہ چیزوں کی طرف میلان ہے لیکن یہ تعریف اس کے حق میں ہے جن سے رغبت و میلان ممکن ہو جب کہ موافق اور پسندیدہ اشیاء سے فائدہ حاصل کرنا تو مخلوق کا کام اور مخلوق کا مرتبہ ہے نہ کہ خالق کا لیکن خالق **جل و علا** تو ان اغراض سے پاک ہے تو معلوم یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب بندے کو سعادت وعصمت کی توفیق عطا فرماتا ہے، تقرب کے اسباب مہیا فرماتا ہے، اس محبوب بندے پر اپنی رحمت کا فیضان فرماتا ہے اور اس کی رحمت کی انتہا، اس محبوب بندے کے دل سے سارے پردے اٹھا دینا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے نورِ قلب وبصیرت سے اس کا دیدار اور نظارہ کرتا ہے پھر وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو کہ حدیث پاک میں کہا گیا ہے" فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصربه ولسانه الذی ینطق به" یعنی رب فرماتا ہے کہ جب میں کسی بندے کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اسے خصوصی قوت سماعت عطا

کرتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اسے خاص قوت بینائی عطا کرتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور خاص قوت گویائی عطا کرتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے'' (الغرض وہ محبوب بندہ پھر وہی کرتا ہے جو اس کا رب پسند فرماتا ہے) تو اس حدیث پاک سے صرف یہی معنیٰ اخذ کرنا مناسب ہے کہ پھر وہ محبوب بندہ دنیا ومافیہا سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے جدائی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے، وہ صرف اللہ کا ہو جاتا ہے، غیر اللہ سے اپنا تعلق ختم کر لیتا ہے، اس کا دل اللہ کے ماسوا سب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے اور اس کے اعمال وافعال صرف لوجہ اللہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ حضور کا خُلق قرآن ہے حضور کی رضا سے راضی ہوتا ہے اور حضور کی ناراضگی سے ناراض ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کسی نے 'خلت' کی تعبیر اپنے اشعار میں یوں کی:

قد تخللت مسلك الروح مني　　　وبذا سمي الخليل خليلا

فاذا ما نطقت كنت حديثي　　　واذا ما سكت كنت الغليلا

(شرح وترجمہ: یعنی اے میرے محبوب! تو میری روح کے راستے میں داخل ہو گیا ہے یعنی جہاں روح کا مقام ہے اور جہاں روح سرایت کرتی ہے، اے محبوب تو بھی وہاں سرایت کر چکا ہے (اور روح انسان کے بالوں کو چھوڑ کر پورے جسم میں رگ، خون، ہڈی، کھال، وغیرہ سب میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہے تو اے محبوب تو روح کے راستے میں داخل ہو کر دل کی گہرائیوں میں پہنچ گی اہے) اور خلیل کو اسی وجہ سے خلیل کہا جاتا ہے کہ خلیل کے دل میں کسی اور کی جگہ نہیں ہوتی اور اس کی محبت روح کے تمام اجزاء میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور شاعر آگے کہتا ہے کہ تو چوں کہ میرے جسم میں ہے اس لئے میں جب بولتا ہوں تو اے محبوب تو ہی میرا کلام ہوتا ہے اور جب میں خاموش ہوتا ہوں، تو میرا مشتاق رہتا ہے اور ایک نسخے میں یوں آیا ہے: ''فاذا ما نطقت کنت صحیحا واذا ما سکت کنت علیلا'' یعنی جب میں بولتا ہوں تو صحیح رہتا ہے اور جب میں خاموش ہوتا ہوں، تو بیمار پڑ جاتا ہوں۔

یہ ابیات مشہور عابدہ زاہدہ ولیہ حضرت رابعہ بصریہ کی جانب منسوب ہیں۔ فقیر محمد ارسلان رضا قادری غفرلہٗ

تو پتہ چلا کہ خلت اور محبت کی فضیلت اور خصوصیت تو ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہی ہے، ایسے

آثار صحیحہ کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے جو مختلف کتب حدیث میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ حدیثیں "تلقی امت بالقبول" کے درجے کو پہنچ چکی ہیں۔ نیز حضور کے حبیب ہونے پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کافی ہے ﴿ان کنتم تحبون الله ﴾ (الآیة آل عمران ۳۱) مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت پاک نازک ہوئی تو کفار کہنے لگے کہ محمد ﷺ تو اپنے رب کو ایسا مشفق و مہربان بنانا چاہتے ہیں جیسا کہ نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کیا، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کافروں سے ناراضگی اور ان کے اقوال سیئہ کے رد کے طور پر یہ آیت پاک نازل فرمائی ﴿قل اطیعوا الله و الرسول﴾ (آل عمران ۳۲) تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو حضور کی اطاعت کرنے کا حکم فرما کر اور حضور کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے ملا کر حضور کے شرف و بزرگی میں اضافہ فرمایا، اور پھر حضور کی اطاعت سے پھرنے اور اعراض کرنے پر یہ فرما کر وعید سنائی ﴿فان تولوا فان الله لا یحب الکٰفرین﴾ (آل عمران ۳۲)

خلیل اور حبیب میں فرق

مزید یہ کہ علامہ ابوبکر ابن فورک نے محبت وخلت کے درمیان فرق کے متعلق بعض متکلمین کا کلام نقل فرمایا ہے جو کافی طویل ہے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مقام محبت، مقام خلت سے افضل وارفع ہے ہم یہاں اس کلام کا ایک حصہ نقل کر دینا چاہتے ہیں جو باقی ماندہ کلام پر روشنی ڈال دے گا تو اس کلام میں متکلمین کا یہ کہنا ہے کہ "خلیل" بالواسطہ و اصل حق ہوتا ہے، فرمان باری تعالیٰ کے بموجب ﴿وکذالک نری ابرٰھیم ملکوت السمٰوٰت والارض﴾ (الانعام ۷۵) لیکن اس کے برعکس حبیب اپنے رب کی بارگاہ میں بغیر کسی واسطے کے پہنچتا ہے اس فرمان باری تعالیٰ کے بموجب ﴿فکان قاب قوسین او ادنی﴾ (النجم ۹) اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ خلیل وہ ہوتا ہے جس کی مغفرت حد طمع میں ہوتی ہے رب تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے ﴿والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین﴾ (الشعراء ۸۲) اور حبیب وہ ہوتا ہے جس کی مغفرت حد یقین میں ہوتی ہے بوجہ ایں فرمان باری تعالیٰ ﴿لیغفرلک الله ما تقدم من ذنبک و ما تأخر﴾ (الآیة الفتح: ۲) خلیل

نے کہا﴿ ولا تحزنی یوم یبعثون﴾ (الشعراء۸۷) اورحبیب سے کہا گیا﴿ یوم لایجزی الله النبی﴾ (التحریم: ۸) یعنی مانگنے سے پہلے ہی بشارت سنا کرآغاز کیا گیا۔خلیل نے آزمائش میں کہا ﴿حسبی الله﴾ اورحبیب سے کہا گیا ﴿ یایها النبی حسبک الله ﴾ (الانفال: ٦٤) خلیل نےعرض کیا﴿ واجعل لی لسان صدق فی الآخرین﴾ (الشعراء: ٨٤) اورحبیب سےفرمایا گیا﴿ ورفعنالک ذکرک﴾ (الانشراح:٤) یعنی بغیر مانگے عطا کیا گیا،خلیل نے دعا کی﴿ واجنبنی و بنی ان نعبد الاصنام﴾ اور حبیب کوبشارت سنائی گئی﴿ انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت﴾ (الاحزاب:۳۳)

ہمارے ذکرکردہ کلام میں ان قائلین کوتنبیہ ہے جومقامات واحوال کی تفضیل کرتے ہیں﴿قل کل یعمل علی شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدی سبیلا﴾ (الاسراء ٨٤)

امام قاضی عیاض کا کلام یہاں پراختتام پذیر ہوا، ہماری جانب سے مختصرتغیرات کے ساتھ (ماخوذ)(الشفا:ص۱۴۸۔۱۵۱)

تنبیه: قارئین کرام کوطمع کے معنی پرآگاہ کردیناضروری سمجھتے ہیں جس کا ذکرابھی ماسبق میں گزرا!

یہ بات جاننا انتہائی ضروری ہے کہ کسی بھی نبی کا طمع کرنا (خواہش اورتمنا کرنا) (صلی الله علی سیدنا محمد وعلی سائر النبین) درجۂ یقین سے نہیں گرتا اس لئے کہ انبیائے کرام کی امیدورجاءوہ پایۂ ثبوت اوریقین کی منزل میں ہوتی ہے اورآیت پاک کے دوسرے پہلو کے متعلق قارئین کرام کا متفکراورفکرمند ہونالازمی ہے کہ تمام انبیائے کرام علیهم الصلوٰة والسلام تو معصوم عن الخطاء ہیں تو آیت پاک میں 'خطیئة' مؤول ہے اوراپنے ظاہری معنیٰ میں نہیں ہے اورمعاملہ تواضع پرمحمول ہے یا پھر خطایا خطیئة سے حضرت ابراہیم کے اصحاب وخواص کی خطائیں مراد ہیں جیسا کہ اس فرمان کے متعلق کہا گیا ہے﴿ و استغفر لذنبك و للمومنین﴾ تواب معنیٰ یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیه الصلوٰة والسلام نے اپنے بارے میں خبردی کہ ان کو اس مغفرت کا یقین ہے جومغفرت کہ انبیائے کرام کے ساتھ مختص ہےاورقربیٰ کی مغفرت سے جدااورالگ ہے یا

پھر وہ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ وہ مرتبۂ شفاعت کے خواہاں اور متمنی ہیں جو کہ سید الانبیاء کے وسیلے اور وساطت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔اور حضور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ، حضور سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے بایں طور ممتاز اور منفرد ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کو یہ فرما کر بشارت دی ﴿ لیغفر لك ﴾
یعنی اس کو حضور کے سپرد اور حضور کے ذمے یہ باقی نہ چھوڑا برخلاف حضرت خلیل کے علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام۔
حاشیہ: اس آیت پاک (لیغفر لک) کی تفسیر میں امام ابو منصور ماتریدی کا انتہائی نفیس کلام گزشتہ اوراق میں بیان کر آئیں ہیں فتذکر (الازہری غفرلہ)

☆☆☆☆☆

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدۂ بردہ شریف کی فصل ثالث سے چودھویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٤٢) منزه عن شريك فی محاسنه فجوهر الحسن فيه غير منقسم

(ترجمہ: حضور علیہ السلام اپنے اوصاف وخوبیوں میں شرکت سے پاک اور بالاتر ہیں (یعنی حضور کے محاسن میں حضور کا کوئی شریک نہیں) پس آپ ﷺ میں جوہر حسن ایسا ہے جو تقسیم ہونے والا نہیں)

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ اشعار میں حضور اکرم ﷺ کے ان بعض خصائل وشمائل اور اوصاف کا ذکر خوب تفصیل کے ساتھ کیا جن اوصاف میں حضور منفرد اور ممتاز ہیں اور اب وہ یہاں سے اپنے نوکِ قلم کو تفصیل سے اجمال کی طرف پھیر رہے ہیں اور حضور علیہ السلام کی مدح وثنا کر کے اپنے کلام کو مزین کررہے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے یہ بے مثال اور خوبصورت شعر کہا: منزه عن شريك۔الخ

تشریح: (منزه) یہ "هو" کی خبر کے بعد خبر واقع ہے جو گزشتہ شعر میں مذکور ہوا (یعنی فهو الذی تم

معناه.الخ) یا پھر یہ 'ھو' محذوف کی خبر ہے۔اور" تنزیه" مصدر ہے بمعنیٰ پاک کرنا،دور کرنا،یعنی معنیٰ ہوگا کہ وہ مقدس ذات والا، پاک اور بالاتر ہے کسی شریک اور ہمسر سے یعنی ہر شریک سے منزہ ہے تو(عن شریك) یہ (منزہ) سے متعلق ہے اور" شریك "نکرہ ہے جو سیاق نفی میں واقع ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ سیاق نفی میں واقع ہونے کی وجہ سے عام ہے اور سب کو شامل ہے،۔(اسی وجہ سے ہر شریک کہا گیا)(فی محاسنه) ناظم شعر کے ان دونوں قول کے ساتھ یعنی (شریك) اور (منزله) دونوں کے ساتھ متنازع ہیں،اسی وجہ سے وہ یا تو (شریك) سے متعلق ہے یا پھر (منزہ) سے متعلق ہے اور " محاسنه" میں اضافت مفید اختصاص ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے حضور اکرم ﷺ کے وہ محاسن مراد ہیں جو حضور کے ساتھ ہی مختص ہیں، نہ کہ وہ محاسن جو مشترک ہیں، حضور اور تمام انبیائے کرام کے مابین (صلی الله تعالیٰ علیه و علیهم اجمعین) بہر حال تو اس اعتراض کو قائم کرنے کی کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہ جاتی جس کو علامہ باجوری اور علامہ خرپوتی نے قائم کیا ہے۔علامہ خرپوتی ان الفاظ میں اعتراض قائم کرتے ہیں:

''تو اب اگر اعتراض کیا جائے کہ یہاں اس شعر میں نفی ہے ہی نہیں جو عموم کا افادہ کرے؟ تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ اگر چہ بظاہر نفی نہیں ہے لیکن نفی کا مفہوم 'تنزیه' کے معنی میں پایا جارہا ہے اس لئے کہ وہ" لم یکن له شریك" کے معنیٰ میں ہے اور 'شریك' فعیل کے وزن پر بمعنیٰ فاعل یعنی بمعنیٰ معادل (ہمسر وہم پلہ) ہے اور " محاسن" علی خلاف القیاس ''حسن'' کی جمع ہے اور (فی محاسنہ) متعلق ہے (شریک) سے ایک سوال یہ ہے کہ شاعر ذی فہم نے" فی محاسنه" کے بجائے" فی شمائله" نہیں کہا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محاسن حسن و جمال کو شامل ہوتا ہے برخلاف شمائل کے،اس لئے انہوں نے 'فی محاسنه' فرمایا تا کہ حسن و جمال کو عام ہو اور خُلق و خصال کے ساتھ مختص نہ ہو،اور کوئی اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ یہ حکم لگانا نہ کہ حضور علیہ السلام اپنے تمام محاسن میں تمام شریک وہمسر سے پاک ومنزہ ہیں' فاسد ہے،اس لئے کہ تمام انبیائے کرام محاسنِ نبوت ورسالت اور غیر اللہ کو عبادت نہ کرنے کے حسن میں حضور علیہ السلام کے شریک ہیں؟ یا اللّٰہ تو اس کا یہ

جواب دیا جائے گا کہ یہ محض ہمارا دعویٰ ہے تو اس پر غور کرنا چاہئے۔ (الخرپوتی: ۸٤)

(المحاسن) علی خلاف القیاس، 'حسن' کی جمع ہے اور گزشتہ اشعار میں حضور علیہ السلام کے محاسن کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔اور حضور علیہ السلام کے جامع محاسن یہ ہیں کہ آپ ﷺ باب نبوت کو کھولنے والے ہیں اور آپ ہی پر نبوت کا دروازہ بند کیا گیا نیز آپ جود وکرم کے دروازے کو کھولنے والے ہیں، آپ تمام موجود کے وجود کا سبب ہیں، آپ اپنے بحر علم اور باران کرم سے تمام مخلوق پر فیضان فرمانے والے ہیں اور تمام مخلوق آپ ﷺ کے حضور اپنی حد اور اپنی غایت پر کھڑی ہے اور آپ ﷺ تمام مخلوق کو ٹھہرانے والے ہیں، ان کی حد اور غایت پر جو ہر ذی غایت کا مرتبہ ہوتا ہے اور آپ ﷺ کا ترقی میں مبدأ، غیر متناہی ہے تو آپ ﷺ ہی ان دروازوں کو کھولنے والے ہیں جو بند تھے اور آپ ہی خاتم (یعنی نبوت کے دروازے کو بند کرنے والے) بھی ہیں۔ بہرحال یہ تمام باتیں ثابت شدہ اور معلوم ہیں۔

اور علامہ خرپوتی کا اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنا کہ ''وہ تو محض میرا دعویٰ ہے''؟ کسی طرح مناسب نہیں! اور ناظم شعر کے اس قول (فجوهر الحسن فيه غير منقسم) میں ''فا'' برائے نتیجہ ہے یعنی وہ اس شرط کا خلاصہ بیان کر رہا ہے جس پر جزاء مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ ''جب آقائے دو عالم ﷺ اپنے محاسن میں شریک وسہیم سے پاک ومنزہ ہیں تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ حضور میں جوہر حسن غیر منقسم ہو۔

لفظ ''جوہر'' کی تحقیق

(الجوهر): بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ گوہر کا معرب ہے اور بعض کے مطابق یہ لفظ 'جهر' مادے سے مشتق ہے یا پھر 'الجهارة' سے مشتق ہے جو اس پتھر کو کہتے ہیں جو سمندر سے نکالا گیا ہو اور جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے جیسے یاقوت، زبرجد، زمرد، اور جوہر کا معنی شئی کی اصل اور اس کی وہ جبلت ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔اور فلاسفہ کے نزدیک جوہر ھیولیٰ کو کہتے ہیں یعنی شئی کا وہ مادہ جس کی اپنی کوئی معین شکل وصورت نہ ہو بلکہ وہ مختلف صورتیں اور شکلیں اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ نیز ان کے نزدیک وہ صورت، جسم، عقل، اور نفس کے معنی میں

بھی آتا ہے۔

اور متکلمین کے نزدیک، " جوھر فرد " کے معنیٰ میں آتا ہے یعنی " جزء لا یتجزأ" کو جوہر کہتے ہیں اور نفس کو بھی جوہر کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مقصد و مفاد، حضور کے حسن کے لئے اصالت کو ثابت کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ حضور علیہ السلام کا حسن، تمام غیر لوگوں کے حسن کی اصل ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں، آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان اس مفہوم کو بتارہا ہے کہ ''انہیں یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا ایک جز دیا گیا ہے'' لیکن اس کے برعکس آپ ﷺ کے حسن میں تجزی و تقسیم نہیں اور حضور کا حسن، کسی غیر کے حسن کا جزو حصہ نہیں۔

اور ناظم شعر نے ضمیر کو ظاہر کر کے (فیــــه) کہا، جو کہ ظرف مستقر اور حسن کی صفت ہے یعنی بتانا یہ ہے کہ وہ حسن جو حضور کی ذات میں موجود ہے، یا پھر "فیـه" ترکیب میں 'حال' واقع ہے اور (حسن) جو عرض ہے، اس کی طرف (جـوھـر) کی اضافت کرنے میں اور اس پر یہ حکم لگانے میں کہ وہ منقسم ہونے والا نہیں، ایک حسین نکتہ اور لطافت ہے جو پوشیدہ نہیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

یہ قصیدۂ بردہ شریف کی فصل ثالث کا پندرہواں شعر ہے ہم بعـون الله تعالیٰ و بتوفيقه اس کی شرح کا آغاز کررہے ہیں۔ ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٤٣) دع ما ادعته النصاری فی نبیهم   واحكم بما شئت مدحاً فيه واحتكم

(ترجمہ: نصرانیوں (عیسائیوں) نے اپنے نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے حق میں جو دعویٰ کیا اور جو حکم لگایا

(کہ خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیا) بس اسے چھوڑ کر اپنے نبی (حضور سیدنا محمد رسول اللہ) کی شان میں مدح کے طور پر جو کہنا چاہتے ہو اور جو منسوب کرنا چاہتے ہو کر سکتے ہو۔)

ربط: گزشتہ اشعار جب اس بات کی طرف مشعر ہوئے کہ آپ ﷺ کی کمالات میں ترقی کسی ایک حد پر جا کر منتہی ہونے والی نہیں برخلاف تمام انبیائے کرام کے (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیھم اجمعین)

تب ناظم شعر کو اس بات کا اندیشہ ہوا اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ چیز اور یہ فضائل ناقصوں کو اس حد فاصل کو تجاوز کرنے تک نہ پہنچا دیں حد فاصل کہ مخلوق کی مدح اور خالق و مالک حقیقی کی مدح و ثنا کے درمیان ہے، تو اسی وجہ سے انہوں نے چاہا کہ یہ بیان کر دیا جائے کہ حضور علیہ السلام کی مدح و ثنا کی ایک حد ہے کہ جس سے تجاوز کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں مزید یہ کہ حضور کی مدح و ثنا کا ایک ضابطہ ہے جس کی رعایت کرنا انتہائی ضروری اور واجب ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی مدح میں کوئی بھی شخص ایسا مبالغہ نہ کرے جو کہ نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے حق میں کیا اور نہ ہی حضور کی مدح میں اتنا افراط اور اتنی زیادتی کرے جو کہ الوہیت کی حد تک تجاوز کر جائے (تو جس طرح ایسی افراط جائز نہیں، اسی طرح) حضور کی مدح میں تفریط اور کمی کرنا بھی کسی حال میں جائز نہیں کہ (خدانخواستہ) حضور کی ایسی چیز سے مدح کر دی جائے جو کہ کسی طرح بھی حضور کی شان کے مناسب نہ ہو بلکہ واجب ہے کہ حضور کی ایسے امور ایسی اشیاء سے مدح کی جائے جو حضور کی رفعت مکان اور علو شان کو بیان کرتی ہوں۔ متمسک اور معتصم رہتے ہوئے قابل اعتماد اشیاء اور مضبوط لگام سے۔

تشریح: (دع) امر کا صیغہ ہے، 'ودع' مادے سے بمعنیٰ ترک کرنا اور اس کا ماضی مستعمل نہیں 'وذر' کی طرح، علامہ شیخ زادہ کے کہنے کے مطابق! **قلت:** اور اسی طرح اس لفظ کا مصدر بھی مستعمل نہیں، اہل لغت تصریح فرماتے ہیں کہ اہل زبان نے اس لفظ کے ماضی اور مصدر کا استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے اور یہ اس بات پر محمول ہے کہ اس کا ماضی اور مصدر اکثر استعمال نہیں کیا جاتا ہے تو یہ اس بات کے منافی نہیں کہ جو اس کے مصدر کا استعمال بطور قلت وارد ہوا ہے کہ آقائے دو عالم ﷺ نے فرمایا" لینتهین اقوام عن ودعهم الجماعات او يختمن

علی قلوبھم" کہ قومیں ضرور جماعتوں کوترک کرنے سے باز آ جائیں گی یا تو پھران کے قلوب پر مہر لگا دی جائے گی۔اوروہ جواس کے ماضی کا استعمال کسی شاعر کے شعر میں موجود ہے کہ

لیت شعری عن خلیلی ماالذی غالہ فی الحب حتی ودعہ

(ترجمہ: کاش مجھے اپنے محبوب کے بارے میں خبر ہوتی کہ عشق میں آخراسے کس چیز نے اچانک پکڑ لیا اور کیا چیز اسے لاحق ہوئی کہ اس نے پھر عشق ہی چھوڑ دیا۔)

یعنی بتانا یہ ہے کہ ان دومثالوں میں حدیث میں اور شعر میں ''ودع'' جو مصدر اور فعل ماضی کے طور پر استعمال ہوا ہے وہ قلیل الاستعمال ہے ورنہ اکثر اوراغلب یہی ہے کہ اس کے ماضی اور مصدر کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔)

نیز یہ کہ حضرت عروہ اور حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ آپ دونوں نے اس فرمان باری تعالیٰ کی قرأت (مــاودعك) تخفیف کے ساتھ کی ہے،اس بات کو علامہ خرپوتی نے علامہ حسن چلپی کے مطول حاشیہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔(ص ۸۷)

اورشاعر کا یہ قول (غـال یـغول غولا) بمعنیٰ ہلاک کرنا ہے یعنی اس طرح اچانک پکڑنا کہ وہ نہ جان سکے پھر اسے ہلاک کر دینا،اور کہا جاتا ہے (غـالتـه الخمر) کہ شراب نے اسے ہلاک کر دیا جس وقت کہ وہ شراب پیئے پھر شراب اس کی عقل یا اس کی بدن کی صحت لے جائے۔اور کہا جاتا ہے (غـالته الارض) بمعنیٰ زمین کا اس کو ہلاک کرنا،اور کہا جاتا ہے (غالته الغول) بمعنیٰ ''اس نے اسے سیدھے راستے سے بھٹکا دیا،گمراہ کر دیا۔اور کہا جاتا ہے (غال فلانا کذا کذا) جب کسی شخص سے کسی شخص کو تکلیف پہنچے۔ایسا ہی" المعجم الوسیط ''میں ہے(ماخوذ) بہر حال شاعر کے اس قول کا معنیٰ" مـاالـذی غـالہ'' یہ ہوگا کہ کس چیز نے اس کی عقل کو فاسد کر دیا یا کس چیز نے اسے گمراہ کر دیا، یا کس نے اسے محبت میں تکلیف پہنچائی۔

اور شعر میں خطاب ہر اس شخص کو عام ہے جو مخاطب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ان میں سے جو آپ ﷺ پر ایمان لائے ہیں اور (ما) موصولہ ہے اور (النصاریٰ) یہ نصران کی جمع ہے جیسے سکاریٰ،سکران کی اور ندامی،

ندمان کی جمع ہے، اور ''نصرانی'' میں ''یا'' برائے مبالغہ ہے جیسا کہ 'احمری' میں 'یا' مبالغہ کے لئے ہے اور نصاریٰ یہ قوم عیسیٰ ہے جو اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصرت و مدد کی تھی یا پھر وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس قریہ میں تھے جسے 'نصران' یا ناصرۃ کہا جاتا ہے تو انہوں نے اس قریہ کے نام پر اپنا نام رکھ لیا

بہر حال مراد یہ ہے کہ چھوڑ دو اور ترک کر دو، وہ دعویٰ جو نصرانیوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ واجب الوجود کے حق میں کیا جو وہ مفضی ہے تولید، حلول، اتحاد، انقسام، اور نزول کی جانب، اللہ پاک ومنزہ ہے ان سے۔

نصرانیوں کے فرقوں کا بیان

علامہ خرپوتی ''الملل و النحل'' سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ان فرقوں میں سب سے بڑے تین فرقے ہوئے: ملکانیه، سطوریه، یعقوبیه

(۱) تو ملکانیه، اصحاب ملکان ہیں جو روم میں ظاہر ہو کر اس پر قابض ہوئے، یہ فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ کلمہ پہلے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیه السلام کی ذات میں جمع ہوا اور پھر اس نے لباس انسانیت زیب تن کر لیا اور 'کلمے' سے ان کی مراد ''اقنوم علم'' ہے اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح قدیم ازلی ہیں اور حضرت مریم نے ازلی معبود کو جنا نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ابوت اور بنوت کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں (معاذ اللہ) تعالیٰ الله عن ذالك، (اللہ تعالیٰ ان صفات سے پاک ومنزہ ہے) اور حضرت مسیح پر لفظ ابن کا اطلاق کرتے ہیں، اپنے اس گمان کے بموجب کہ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انجیل میں یہ لکھا پایا ''انك انت الابن الوحید'' کہ تم ہی تنہا ولد ہو۔

(۲) دوسرا فرقہ ''نسطوریه'' یہ نسطور حکیم کے اصحاب کا ہے جو مامون رشید کے زمانے میں ظاہر ہوا اور اس فرقے نے انجیل میں تحریف کی اور کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہے صاحب اقانیم ثلاثہ ہے یعنی وجود، علم اور

حیات والا ہے اور یہ اقانیم ذات پر زائد نہیں ہیں اور پھر یہ صفات حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات میں حلول کر گئے اسی وجہ سے وہ مردوں کو زندہ فرماتے اور اندھوں کوڑھیوں کو شفا دیتے۔

(۳) فرقہ "یعقوبیہ" یعقوب جو ایک نصرانی شخص تھا، یہ اس کے اصحاب ہیں، یہ فرقہ اقانیم ثلاثہ کا قائل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور اس فرقے کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کلمہ گوشت اور خون میں تبدیل ہو کر خدا ہو گیا اور وہ خدا مسیح ہیں جو اپنے جسم کے ساتھ ظاہر ہیں (جو ظاہر بجسد عنصری ہوئے۔)

نصرانیوں کے تمام فرقوں کا بیان تفصیلی طور پر 'الملل و النحل' کتاب میں موجود ہے، علامہ خرپوتی کی نقل کردہ عبارت یہاں اختتام پذیر ہوئی، ہماری جانب سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ (خرپوتی: ص۸۸)

ناظر شعر کا قول (واحتكم) یا تو بمعنیٰ 'واحكم' ہے تو اس صورت میں وہ اول کی تاکید ہوگا یا پھر وہ "واحتكم القوم الى الحاكم تحاكموا اليه" سے ہے یعنی قوم مقدمے کو حاکم کے پاس لے گئی اور 'حکم' کہتے ہیں نسبت مفیدہ کو اثباتاً یا نفیاً واقع کرنے کو۔ (شیخ زادہ ص۸۸)

بہرحال مراد یہاں پر یہ ہے کہ جس چیز سے چاہو حکم لگاؤ بشرطیکہ وہ حضور ﷺ کی مدح ہو اور پھر اسے شرعی عدالت میں پیش کرو اور اس حکم کو شریعت کی جانب پھیر دو اور خواہشات نفسانیہ کی متابعت میں اپنے نفس کی مخالفت کرو اور اپنے مقدمے کو اس حاکم کی بارگاہ میں لے جاؤ جو شرع مطہرہ ہے۔ یا پھر وہ بمعنی حکمت کو طلب کرنا اسے استعمال کرنا اور حکم کو مضبوط کرنا ہے یعنی آپ ﷺ کی شان میں مدح سرائی کرنے میں حکمت کا خیال کرو، اس طرح کہ حضور کی جناب میں لائق و مناسب مدح اپنی زبان پر لاؤ نہ کہ وہ مدح جو اس جناب میں لائق نہیں، اس لئے کہ یہاں حکم بمعنیٰ مدح ہے۔

ناظم شعر کا قول (مدحا) یا تو مفعول مطلق، اس معنی سے جو حکم کے مفہوم سے سمجھ میں آ رہا ہے، اس لئے کہ حکم یہاں مدح رسول ہے ﷺ یا پھر وہ حال واقع ہے بمعنیٰ (مادحاً) 'احكم' فعل امر میں 'انت' ضمیر پوشیدہ سے اور وہ 'ماشئت' سے حال واقع ہے، نیز تمییز ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے۔

(فیه) یاتو (واحکم) سے متعلق ہے یا (شئت) سے، یا پھر (مدحا) سے
شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ شعر کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ناجائز باتوں کو چھوڑ کر حضور کی جیسے چاہو مدح کرو اور جس طرح بھی تم سے ممکن ہو حضور کی مدح کر سکتے ہو اس لئے کہ آپ ﷺ کی مدح میں مجاہدہ اور کوشش کرنا ایک طرح کی عبادت اور قربت ہے جیسا کہ آپ کے حق میں ترک ادب کرنا کفر ہے۔ (شیخ زادہ: ص ۸۸)

لفظ ''نبی'' کی تحقیق

(النبی) میں تشدید اور ہمزہ جائز ہے "الزبدۃ" میں ملا علی قاری کے کہنے کے مطابق لیکن امام راغب کی 'مفردات' سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہمزہ کو ترک کرتے ہیں اور اس کی اصل ہونے کو نہیں جانتے ہیں مگر صرف ان کے اس قول سے استدلال کرنے کے طریقے سے کہ "مسیلمة نبیء سوء" (بالھمزہ) امام ابن حجر مکی نے "افضل القری" میں آقائے دو عالم ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا" لا تقولوا نبیء الله" ، تو توارث اور پے در پے ایسے ہی واقع ہونے کی وجہ سے ہمزہ پڑھنے سے اجتناب کیا جاتا ہے اور ہمزہ کی قرأت صرف تلاوت میں ہی کی جاتی اور تلاوت پر ہی ہمزہ کی قرأت کا اکتفا کیا جاتا ہے۔ تو 'النبیء' کو ہمزہ کے ساتھ صرف قرآن میں ہی استعمال کیا گیا ہے۔

قرأت کا متواتر ہونا باوجودیکہ وہ جمہور کے قول کے خلاف ہے؟ محل نظر ہے اور نہی کے ناسخ ہونے کی بنیاد پر اور حضور کے قرأت ہمزہ سے منع کرنے کی بنیاد پر، اس قرأت سے استدلال کرنا درست نہیں، اس لئے کہ منع کرنے کے بعد اجازت دینے کا کہیں علم نہیں اور احتمال و امکان کی جگہ ہونے کی وجہ سے بھی اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

بہر حال اس سے علامہ امام ابن حجر مکی کے قول کا جواب اور مفہوم معلوم ہو گیا جو انہوں نے 'افضل القری' میں تصریح فرمایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا مہموز پڑھنے سے منع فرمانا یہ کہہ کر کہ نبیء اللہ ہمزہ کے ساتھ نہ کہو بلکہ نبی اللہ بغیر ہمزہ کے کہو، اس وجہ سے ہوا ہے کہ 'نبیء' بالہمزہ کبھی بمعنیٰ 'طرید' بھی وارد ہوتا ہے۔ (اور 'طرید' بعد

میں یا پہلے ہونے والے کو کہتے ہیں)اس وجہ سے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے خیال فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابتدائے اسلام میں یہ معنی بعض ذہنوں کی طرف پہلے چلا جائے ،تو اسی لئے حضور نے ' نبیء ' کو بالھمزہ پڑھنے سے منع فرمایا، لیکن پھر جب بعد میں اسلام مضبوط ہوگیا اور اس کی قرأت متواتر ہوگئی تو سبب اور علت کے زائل ہو جانے کی وجہ سے ، مہموز پڑھنے سے نہی منسوخ ہوگئی۔ (شرح الهمزيه ص ٧٦)

علامہ علی قاری نے ' الزبدة ' میں افادہ فرمایا ہے کہ ناظم شعر کے قول (نبيهم) میں 'هم' کی میم جمع کو بڑھا کر اور کھینچ کر پڑھنا یعنی اشباع کرنا وزن شعری کی وجہ سے ہے اگر چہ بطور وقف ہو یا وقف کو بمنزل وصل اتارنے کے طور پر ہو۔(الزبدة ص: ٥٨)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے سولہویں شعر تک ہم آپہنچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٤٤)فانسب الی ذاته ماشئت من شرف وانسب الی قدره ماشئت من عظم

(ترجمہ:لہذا حضور کی ذات پاک کی طرف جو بھی صفات شرف و بزرگی میں سے منسوب کرنا چاہتے ہو، کرو اور حضور کی قدر و منزلت کی طرف جو بھی عظمت و رفعت منسوب کرنا چاہتے ہو کر سکتے ہو۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے اب چاہا کہ اپنے گزشتہ شعر کی مراد کے اوپر سے پوشیدگی اور خفا کے حجاب کو اٹھا دیا جائے اور یہ بیان کر دیا جائے کہ حکم کا مفہوم عام ہے اور حکم کے معنیٰ کو بھی شامل ہے اس وجہ سے کہ وہ مدح و ثناء جو کسی دوسرے سے صادر ہو وہ بھی صحیح ہے۔

نیز ناظم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ حضور کی مدح و ثناء میں افراط و غلو سے پاک ہیں باوجودیکہ وہ اس مبالغہ سے بہت

دور ہیں جو کہ نصاریٰ اور جھوٹے غالیوں کا طریقہ اور ان کی عادت ہے۔

تو اس بنیاد پر ''فا'' برائے عطف تفسیر ہے، اور ایک نسخے میں ''فا'' کے بجائے '' وانسب'' ہے، بہر حال مفاد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ عطف تفسیری ہے، تو اس صورت میں، اس شعر میں ''فانسب'' کا عطف ''واحکم'' پر ہے اور اسی پر عطف کرنا زیادہ قریب اور مناسب ہے، یا اس کا عطف (دع) پر ہے جیسا کہ شیخ زادہ نے فرمایا، یا پھر ''فانسب'' میں 'فا' شرط تقدیری کو بیان کرنے کے لئے، فصیحہ ہے یعنی اس تقدیر پر معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تم نصرانیوں والا دعویٰ نہیں کرتے تو اب تمہارے لئے اتنی گنجائش ہے کہ تم حضور کی ذات عظیمہ کی جانب نسبت کرنے کے وسیع دائرے میں سیر کر سکتے ہو لہذا اب حضور کی جناب میں جو چاہو اوصاف مکرمہ منسوب کرو مثلاً جمال خلق، کمال خُلق، طیب عرق، جودت عقل، صفائے قلب، بلاغۃ الکلام، فصاحۃ اللسان، وغیرہ تمام انسانی کمالات کو حضور کی ذات عظیمہ کی جانب منسوب کر سکتے ہو اس لئے کہ حضور کی ذات کریمہ تمام احسان کا سر چشمہ یعنی منبع الاحسان ہے اور رحمٰن نے آپ کو سب سے پہلے نیست سے ہست بخشا ہے (یعنی سب سے پہلے آپ ﷺ کو عدم سے وجود بخشا)، مزید اسی طرح تمہیں اجازت و رخصت ہے کہ تم حضور کے قدر و منزلت، جمال و عظمت کے احاطۂ کمال پر دائرۂ نسبت میں سیر کرنے کے بعد جو چاہو، حضور کی جناب میں منسوب کرو، اس عظمت و کرامت و معجزات کے انواع و فنون و اجناس میں سے جس کی حد کو نہیں پہنچا جا سکتا اور نہ ہی اس کی تعداد کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

(الذات) اس کی اصل ''ذو'' کی مؤنث ہے جو موصوف کو چاہتی ہے اور اکثر لازم الاضافہ ہوتی ہے مثلاً 'رجل ذو مال'، پھر بعد میں اہل لغت نے اس کو ایک معنیٰ و مفہوم میں اسمائے مستقلہ کے لئے استعمال کر لیا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے 'ذات قدیمۃ'، اور اس کے لفظ کی نسبت کے لئے کہا جاتا ہے 'ذاتی' اور کبھی یہ لفظ نفس شئی اور حقیقت شئی کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ہے اور جیسے کہ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس شعر میں ہے۔

وذالك فی ذات الالہ و ان یشأ   یبارك علی اوصال شلو ممزع

اور یہ تختۂ دار پر چڑھنا لوجہ اللہ ہے یعنی اللہ کی ذات کے لئے ہے، اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہے حالانکہ اگر وہ چاہے تو انسان کے ہر عضو میں علیحدہ علیحدہ اور الگ الگ برکت عطا فرمائے۔)

لیکن علامہ زمخشری کا کلام 'الکشاف' میں اس کے خلاف کی جانب اشارہ کررہا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

لفظِ ذات میں 'تا'، لفظ" بنت" کی 'تا' کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ لفظ 'لات" کے 'تا' کی طرح مستعمل ہے، اسی وجہ سے اہل لغت نے اللہ تبارک وتعالیٰ پر اس لفظ کے اطلاق کو جائز ٹھہرایا ہے باجودیکہ یہ حضرات ذات باری تعالیٰ پر علامت تانیث کے اطلاق سے منع فرماتے ہیں۔

(القدر) بمعنی مقدار، شئی کے مطابق اور حرمت ووقار کے معنیٰ میں آتا ہے لیکن یہاں آخری والے دو معنیٰ مراد ہیں۔(الشرف): بمعنیٰ علو و بزرگی۔(العظم) مصدر ہے، عظم الشئی عظما و عظامة سے بمعنیٰ بڑا ہونا، انسان کا عظیم المرتبت ہونا،

(ماشئت من شرف) یعنی جو بھی تم چاہو تو پتہ چلا کہ اس میں "ما" موصولہ ہے اور " النسبة" کا معنیٰ اضافت کرنا، منسوب کرنا ہے۔تو اب مفہوم یہ ہوگا کہ حضور کی ذات کریمہ کی طرف جو چاہو اوصاف شرف میں سے منسوب کرو یعنی شرف کے ان اوصاف سے نسبت کرسکتے ہو جیسے اعضاء کا متناسب ہونا، سفیدی جو سرخی سے ملی ہوئی ہو، جسم کی نظافت وغیرہ۔

(وانسب الی قدرہ) یعنی حضور کے کمال و مرتبت کی جانب جو چاہو اوصاف عظمت سے منسوب کرسکتے ہو جیسے کرم، عفو، صفح ،(یعنی گناہ معاف کرنا)، حلم، علم، وغیرہ ذالک۔

(من) دونوں جگہوں پر جنس کو بیان کرنے کے لئے ہے۔اور (شرف و عظم میں) تنوین، برائے تعظیم وتکثیر ہے، اور ذات کو شرف کے ساتھ اس لئے مخصوص کیا کہ وہ علو و بلندی میں اس کے مناسب ولائق ہے اور قدر کو عظم کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ عدم نہایہ میں اس کے مناسب ہونا ہے۔

یہ شعر جس طرح آگے آنے والے شعر کی تفسیر ہے اسی طرح گزشتہ شعر کی تاکید بھی ہے اور حضور کی اس وصف بیانی

کی تائید ہے کہ فرمایا ''منزه عن شريك فی محاسنه ☆ فجوهر الحسن فيه غير منقسم''

حضور علیہ السلام کے صفات کمال اور کمال خصال کا بیان

عن قریب اس کے متعلق مزید بیان کیا جائے گا امام ابن حجر مکی کی "افضل القری" سے۔ بہر حال قارئین کرام اگر حضور اکرم ﷺ کے مخصوص صفات جمال اور کمال خصال میں غور اور امعان نظر کریں تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ حضور ﷺ کا ہر وہ وصف جس سے آپ حضور اکرم ﷺ کی مدح سرائی شروع کریں اور آپ کے تصورات وتخیلات میں اس سے آغاز آئے ذکر اور آپ کے ذہن میں حضور کے تمام فضل وکمال پر دلائل و براہین ہوں اور آپ صراحۃً و کنایۃً عبارت کا استیعاب کرلیں تمام خصائل میں ان تمام باتوں کے باوجود، زبانیں، حضور کی وصف بیانی میں انتہا کو پہنچنے سے قاصر رہیں گی اور اذہان، حضور کے تمام اوصاف میں سے محض ایک وصف کی آخری حد تک پہنچنے سے عاجز رہیں گی قصیدہ ہمزیہ میں یہ کتنی اچھی بات کہی گئی ہے۔

كل وصف لـه ابتـدأت بـه   استوعب اخبار الفضل منه ابتدأ

(ترجمہ: حضور کا ہر وہ وصف جس سے تم آغاز کرو، وہ فضل وکرم کے جملہ اوصاف واحوال کو محض ابتدائی طور پر ہی گھیرتا ہے۔)

علامہ ابن حجر مکی قصیدہ ہمزیہ پر اپنی شرح میں فرماتے ہیں: حضور کی صفات ذاتیہ ومعنویہ میں سے ہر وہ صفت جس سے تم یا میں یا کوئی بھی آغاز ذکر کرے یا اس وصف کی غایت وانتہا کا احاطہ کرنے کے لئے آغاز ذکر کرے تو وہ صفت تمام فضائل وکمالات کے تمام احوال کو ابتداً ہی استیعاب کرلے گا یعنی جب جب آپ حضور اکرم ﷺ کے وصف سے ابتدا کریں گے اور اس پر غور کریں گے جو صریح وکنایہ کے طور پر مشتمل ہے، تو آپ اس ابتدا کئے گئے وصف کو فضل وکمال کے تمام انواع اور غایات کو جمع کرنے والا پائیں گے اور وہ وصف اس سے دور نہیں ہوگا اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کے اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں جب کہ صفات انسان سے وصف کمال متحقق نہیں ہوتا، جیسے ایک وصف حلم ہے کہ اگر اس میں بقیہ اوصاف پورے ہو جائیں جیسے علم وکرم وشجاعت وحسن خلق

وغیرہ تو اس وقت حضور اکرم ﷺ کے صفات میں سے ہر ایک صفت اپنے موضوع لہ کے معنیٰ پر پورے طور پر دلالت کرے گی اور غیر موضوع لہ پر ایماء اور استلزاماً دلالت کرے گی جیسا کہ تجربہ کار وغور وفکر کرنے والے پر پوشیدہ نہیں۔

ناظم فاہم (سقی الله عهده) کی بیان کردہ اس تحقیق سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ناظم روشن اور باریک نظر اور کامل معرفت رکھنے والے ہیں اور علوم ومعارف سے کامل حصہ پانے والے ہیں اور اس شعر کی شرح میں ہمارے ثابت کردہ امور سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ شعر قصیدہ مبارکہ کے چند خوبصورت اشعار میں سے ایک ہے اور اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھے کہ آپ ﷺ پر پورے اور کامل ایمان میں سے یہ ایمان رکھنا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اس طرح پیدا فرمایا کہ انسانوں میں کوئی بھی آپ کا مثل پیدا ہوا ہے نہ ہوگا اور اس طرح تخلیق فرمانے میں راز یہ ہے کہ ذات کا حسن، ذات میں پوشیدہ اخلاق و صفات کی عظمت وجلالت پر دلیل ہوتا ہے اور ہمارے نبیٔ کریم جناب محمد رسول اللہ ﷺ بلندی کے اس مقام و مرتبے کو پہنچے ہوئے ہیں کہ جس تک کسی بھی دوسرے کا وصل متصور نہیں۔

اسی مفہوم کو ناظم نے قصیدہ بردہ شریف میں دو شعروں کے اندر اس طرح ادا کیا ہے کہ فرمایا (فهو الذی تم معناه وصورته۔) کہ وہی ہیں جن کے کمالات ظاہری و باطنی اتم واکمل ہوگئے'' اور پھر اس شعر کے بعد انہوں نے دوسرے شعر میں یہ بیان فرمایا کہ حسن کامل کی حقیقت صرف حضور کی ذات ہی میں اتم واکمل ہوئی اور حقیقت حسن اس طرح حضور کی ذات میں اتم ہے کہ اسے اس آپ ﷺ کے غیر میں تقسیم نہیں کیا گیا اس لئے کہ وہ حضور علیہ السلام ہی کی ذات ہے جن کا حسن صورت وسیرت تام ہے نہ کہ کسی اور کی، اگرچہ غیر کسی امر میں حضور کے شریک ہیں لیکن اس کے باوجود کسی اور کے کمالات ظاہری و باطنی تام نہ ہوئے سوائے حضور کے۔

کسی کا یہ کتنا بہتر جملہ ہے کہ ''ہم پر حضور کا تمام حسن ظاہر نہیں کیا گیا (اور یہ جو حسن دیکھا جاتا ہے، یہ حضور کا حسن کامل نہیں) اس لئے کہ اگر حضور کا حسن کامل ظاہر ہوجائے تو ہماری آنکھیں حضور کے جلوۂ زیبا کا دیدار کرنے کی

تاب ہی نہ لاسکیں گی‘‘(شرح الهمزيه ص:۲۷۰،۲۷۱)

قال الازهری: مذکورہ کلام سے اس بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ شاعر ذی فہم کا یہ شعر (منزه عن شريك الى آخر البيت) محض ایک دعویٰ نہیں ہے، جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔

حضور کے جمال طلعت کا تفصیلی بیان احادیث سے

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ یہاں اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان امور کو ذکر کر دیں جو حضور کے حسن تمام اور جمال طلعت پر دلالت کرتے ہوں، علامہ ابن حجر مکی کی شرح ہمزیہ سے امام ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے بعض شمائل ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

آپ ﷺ کے چہرۂ زیبا کا ذکر: تو حضرت براٗ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث صحیح مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین چہرے والے اور سب سے اچھے اخلاق والے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی بھی چیز حضور اکرم ﷺ سے زیادہ حسین نہ دیکھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے سورج حضور کے چہرۂ مبارک میں گردش کر رہا ہو۔ حضرت براٗ سے جب پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک تلوار کے مثل ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ مثل قمر تھا یعنی تلوار کی طرح نہ تھا لمبائی میں اور نہ ہی چمک میں بلکہ گولائی میں اور تلوار کی چمک سے بڑھ کر، چاند کے مثل تھا۔

حضرت جابر ابن سمرۃ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک تلوار کی طرح نہ تھا بلکہ شمس وقمر کے مثل تھا اور گول تھا۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے حسن و چمک، ملاحت اور گولائی کے درمیان جمع کیا ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور "مکلثم" (چہرے اور رخساروں پر زیادہ گوشت والے) نہ تھے یعنی بہت زیادہ گول چہرہ والے نہ تھے بلکہ آپ کے چہرۂ مبارک میں ہلکی گولائی تھی جو عرب کے یہاں حسن وخوبصورتی تصور کی جاتی ہے اور یہی حضرت ابو ہریرہ کے یہ کہنے کا مطلب ہے کہ حضور خوبصورت لمبے رخساروں والے تھے یعنی حضور

کے رخساروں میں لمبائی تھی اور وہ ابھری ہوئی جگہ سے سالم تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ کئی ایک راویوں نے حضور کے چہرۂ مبارک کو شقۃ القمر سے تشبیہ دی ہے، وہ کیوں کر؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور کا کسی جانب چہرہ موڑنے اور پھیرنے کے وقت کی صورت کو چاند کے آدھے حصہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کے جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ چاند کے آدھے حصے سے تشبیہ دینے میں چاند میں جو سیاہی ہے اس سے احتراز ہے لیکن حضرت ابوبکر وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشبیہ اس کو قبول نہیں کر رہی ہے کہ انہوں نے یہ کہہ کر تشبیہ دی کہ حضور کا چہرۂ مبارک چودہویں رات کے چاند کی طرح تھا۔ "النہایۃ" میں ہے کہ آقائے دوعالم ﷺ جب مسرور ہوا کرتے تو اس وقت آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا! لیکن اکثر حضور کے چہرۂ مبارک کو چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے، سورج سے نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کو دیکھنے والا، اس کو پورے طور سے کمال نظر کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس سے مانوس ہوتا ہے اور اس سے اسے کسی طرح کی دقت نہیں ہوتی، برخلاف سورج کے، ان مذکورہ عام چیزوں میں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کا ایک نام بدر بھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ غزوۂ تبوک سے لوٹنے پر آپ ﷺ سے ملاقات کرنے اور آپ کے روئے زیبا کی زیارت کرنے کے لئے نکلنے والوں نے یہ پڑھ کر آپ کا استقبال کیا تھا:

طلع البدر علینامن ثنیات الوداع   ہم پر وداع کی پہاڑیوں سے چودہویں کا چاند طلوع ہوا۔

پھر جاننا چاہئے کہ یہ تمام تشبیہات عرب کی عادت اور طریقے پر مستعمل ہیں ورنہ تو کوئی بھی موجود شئی ایسی نہیں جو حضور کے صفات خَلقیہ وخُلقیہ کے برابر ہو سکے۔

حضور علیہ السلام کے چشمان مبارک کا ذکر: تو حضور کے نظر و بصر کی فضیلت میں یہ فرمان باری تعالیٰ ہی کافی ہوگا۔

﴿مازاغ البصر و ماطغی﴾

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور تاریک رات میں ایسے دیکھتے جیسے روشن دن میں دیکھتے تھے۔ اور حدیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور نماز میں اپنے پیچھے ایسے دیکھتے تھے جیسے اپنے آگے دیکھتے

یعنی رویت ادراک ایسی ہوتی جیسے کہ آنکھ سے ہو، باوجود اس کے کہ، یہ رویت جو بطور کرامت واقع ہے اہل سنت کے نزدیک بصر، وشعاع اور مقابل ہونے پر موقوف نہیں (یعنی ایسا نہیں کہ اشیاء جب اس بصر کے مقابل ہوں تبھی رویت ہوگی ورنہ نہیں)

اور جو یہ کہا گیا ہے کہ حضور کے شانہ مبارک کے درمیان میں بھی دو آنکھیں تھیں سوئی کے ناکا (چھید) کے مثل جن سے حضور پیچھے دیکھتے تھے اور کپڑے ان پر حجاب نہیں کرتے پاتے! تو یہ قول ثابت نہیں اور اصل وحقیقت اس قول کا عدم ہی ہے جیسے یہ گمان باطل ہے کہ حضور کے پیچھے کی اشیاء کی صورتیں، حضور کے سامنے کی جہت میں ڈھل جایا کرتی تھیں (پھر حضور ان کی رویت فرماتے) یا یہ گمان کہ وہ رویت، قلب کی رویت ہوتی تھی، یا پھر یہ گمان کہ اس رویت سے مراد وحی یا الہام سے جاننا ہے۔ (تو ان گمان کی اصل وحقیقت عدم ہی ہے) اور یہ حدیث "انی لا اعلم ماوراء جداری" کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے دیوار کے پیچھے کیا ہے، اس حدیث کی سند معلوم نہیں، اس حدیث کو تو صرف علامہ ابن جوزی نے اپنی کسی کتاب میں بغیر سند کے ذکر کیا ہے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ حدیث وارد اور صحیح ہے تب بھی وہ ہمارے موقف کے خلاف نہیں، اس لئے کہ اس حدیث میں، دیوار کے پیچھے اس علم کی نفی ہے جو وحی یا الہام سے معلوم نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام کی اونٹنی گم ہوگئی اور کچھ منافقوں نے یہ کہا کہ انہیں علم غیب ہونے کا زعم ہے تب حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ''واللہ میں صرف وہی جانتا ہوں جو میرا رب مجھے بتاتا ہے اور میرے رب نے مجھے اونٹنی کی خبر دی ہے وہ فلاں جگہ ہے، اس کی نکیل پیڑ میں پھنس گئی ہے'' پھر لوگ اس مقام پر گئے اور سرکار ﷺ کے کہنے کے مطابق اسے وہیں پایا۔ (یہ تو اس حدیث کو صحیح و وارد ماننے کی صورت ہے، لیکن) بصورت تعارض تو جو بات حالت نماز کے سلسلے میں گزری وہی بات اس خارج نماز کے سلسلے میں بھی مان لی جائے۔

نیز روایات میں آیا ہے کہ حضور جب کسی سے ملتفت ہوتے تو پورے طور پر ملتفت ہوتے یعنی دزدیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی دائیں بائیں گردن شریف خم فرماتے جیسا کہ خفیف العقل کرتا ہے اور حضور کی چشم مبارک کی جلالت

یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے گوشۂ چشم سے ملاحظہ فرماتے یعنی آنکھ کے ایک پہلو سے دیکھتے جو کان اور آنکھ کے درمیان کے حصہ سے ملا ہوا ہوتا ہے۔، مزید یہ کہ آپ ﷺ عظیم العینین اور لمبی پلکوں والے ہیں اور آپ کی چشمان مبارک مائل بسرخی ہیں۔

امام مسلم نے روایت کیا کہ" اشکل العینین" (سفید مائل سرخ آنکھوں والے) ہیں اور 'شکلة' کہتے ہیں اس سرخی کو جو آنکھ کی سفیدی میں ہو اور یہ محمود تصور کی جاتی ہے۔ اور " الشهلة" کہتے ہیں اس سرخی کو جو آنکھ کی سیاہی میں ہوتی ہے اور ایک روایت میں" ادعج العینین" آیا ہے (یعنی بڑی اور سیاہ آنکھوں والے)" دعج" کہتے ہیں آنکھ کا خوب سیاہ اور لمبا ہونا اور " اهدب الاشفار" کا مطلب لمبی پلکوں والے۔

حضور اکرم ﷺ کی سماعت کا ذکر: تو اس کے بیان میں ترمذی شریف کی یہ حدیث پاک کافی ہوگی کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ" میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میں وہ سنتا ہوں جس کو تمہارے کان نہیں سن سکتے، آسمان آواز نکال رہا ہے اور اس کا حق ہے کہ وہ بولے آسمان میں چار انگلی تک رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ فرشتہ اپنی پیشانی کو اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں رکھے ہوئے ہے" حضرت ابونعیم کی روایت میں" او قائم" بھی آیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک کا ذکر: حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ حضور کے موئے مبارک درمیانی تھے یعنی نہ تو "رَجل" تھے اور 'رجل' بالفتح، ان بالوں کو کہتے ہیں جو تھوڑے سے گھنگریالے ہوں اور نہ تو حضور کے بال شریف بالکل سیدھے تھے اور نہ ہی چھوٹے گھنگریالے تھے، اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور کے گیسوئے مبارک، کان اور شانہ کے درمیان تک تھے اور آپ ﷺ بالکل سیدھے بالوں والے اور بالکل گھنگریالے بالوں والے نہ تھے۔

(اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روایات میں بظاہر تعارض معلوم دیتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں) روایات میں اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ حضور کے موئے مبارک میں ہلکی سی گھنگریالی تھی، اور پہلی والی روایت میں جو نفی ہے وہ اس کی کثرت کی نفی ہے (یعنی زیادہ گھنگریالے نہ تھے)، نیز حدیث پاک میں آیا ہے کہ آپ ﷺ

کے گیسوئے مبارک کان کی لوتک تھے، ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کے نیچے تک تھے اور کہیں آیا ہے کہ آپ کے گیسوئے مبارک شانہ مبارک تک تھے، حالانکہ روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں وجہ تطبیق یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کبھی بالوں کو کاٹنا ترک فرمادیتے تو موئے مبارک لمبے ہوجاتے اور کبھی اس کا تدارک کرتے تو چھانٹ لیتے اور جب کبھی مانگ نکلتی تو اپنے آپ نکلتی ورنہ حضور علیہ السلام تو بالوں کو ان کی حالت پر رہنے دیتے۔

میرا خیال یہ ہے کہ مذکورہ صورت شروع دور میں رہی ہوگی! اس لئے کہ حدیث سے جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ بالوں کا سدل فرماتے یعنی بالوں کو لٹکاتے اور پھر مانگ نکالتے۔

اور پھر مزید یہ کہ میں نے علماء کو دیکھا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ مانگ نکالنا سنت ہے، اس لئے کہ مانگ نکالنا حضور اکرم ﷺ کی جانب منسوب ہے۔

نیز آپ ﷺ کی گردن اور کنپٹی شریف پر چند سفید بال تھے جو بیس بالوں سے زیادہ نہ تھے یعنی وہاں پر موئے مبارک زیادہ سفید نہ ہوئے تھے باوجودیکہ وہ نور اور وقار ہیں بوجہ اس روایت کے (ماشانه الله بالشيب) یعنی اللہ نے اپنے حبیب کو بڑھاپہ نہ دیا اس لئے کہ اکثر عورتیں بڑھاپے کو پسند نہیں کرتیں اور جس نے حضور اکرم ﷺ سے ذرا بھی کراہت کی وہ کافر ہوگیا۔

اور روایات، حضور اکرم ﷺ کا بالوں کی سفیدی کو مہندی وغیرہ سے تبدیل فرمانے کے سلسلے میں مختلف آئی ہیں، حالانکہ روایات میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے بہت دفعہ مہندی سے رنگ کرایسا کیا ہے لیکن اکثر اسے نہیں بھی کیا ہے، تو اسی وجہ سے مہندی لگانا ہمارے نزدیک سنت ہے۔

اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کی ریش مبارک گھنی تھی، نیز روایتوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کثرت کے ساتھ سر مبارک میں تیل لگاتے اور ریش مبارک میں کنگھا کرتے اور روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ، کے کلائی، کندھوں اور سینے کے اوپری حصے پر بال تھے اور یہ کہیں مروی نہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے حج وعمرہ کے علاوہ کسی اور موقعہ پر کبھی اپنے سر مبارک کا حلق فرمایا ہو اور یہ روایت کہ ”حضور اپنی ریش مبارک کی

لمبائی اور چوڑائی کو چھانٹتے'' کہیں سے ثابت نہیں بلکہ یہ روایت غریب ہے برخلاف اس روایت کے " اعفوا اللحیٰ " کہ اپنی داڑھیاں بڑھاؤ، تو اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اسی روایت کو لیا۔

قال الازھری: قارئین کرام جانتے ہیں کہ امام ابن حجر مکی، ہمارے سادات ائمہ شافعیہ میں سے ہیں اور انہوں نے یہاں تصریح فرمائی جو آپ نے ابھی مذکورہ بالا سطور میں ملاحظہ کی کہ انہوں نے فرمایا (اسی وجہ سے ہمارے ائمہٴ کرام نے اس داڑھی کو بڑھانے والی روایت کو اختیار فرمایا ہے)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی بڑھانا جس طرح احناف کے یہاں سنت ہے، اسی طرح شوافع کے یہاں بھی سنت ہے، بلکہ ائمہٴ اربعہ کے نزدیک سنت ہے، اور اس میں سنت قبضہ ہے، لیکن داڑھی کو چھانٹنا اور قبضہ سے کم کرنا؟ تو کسی نے ابھی اسے جائز نہیں قرار دیا، اور سبھی ائمہ نے اس کو یہودیوں اور عجمی مجوسیوں کا فعل اختیار کرنا قرار دیا ہے، جیسا کہ " الدر المختار " میں اس کی صراحت موجود ہے۔ انتھیٰ کلام الازھری۔

اور حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ جب اپنی ریش مبارک میں کنگھا فرماتے تو آئینہ میں دیکھا کرتے تھے اور وارد ہوا ہے کہ آپ کی ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ روزانہ سونے سے پہلے ہر آنکھ میں تین مرتبہ اثمد کا سرمہ لگاتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کی جبیں ناز، ابرو، ناک اور سر مبارک کا ذکر: آثار صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ روشن اور کشادہ جبین ناز والے اور ملی ہوئی ابرو والے تھے یعنی دونوں ابرو شریف کے بال ملے ہوئے تھے، ایک روایت میں آیا ہے کہ دونوں ابرو کے بال ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہ تھے؟ ابن اثیر نے اس روایت کو راجح قرار دیا ہے اور کبھی جمع بھی ہوجاتے اس لئے کہ دونوں ابرو میں بہت گھنے بال تھے۔ جیسا کہ اس روایت میں ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابرو کے بال لمبے تھے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ وہ باریک تھے: جیسا کہ تیسری روایت میں ہے کہ دونوں ابرو میں زیادہ بال ہونے کے ساتھ، ساتھ ان میں دوسری آنکھ تک لمبائی تھی اور ابرو کے دونوں کونوں اور طرفوں میں باریکی تھی، تو ابرو میں زیادہ بال ہونے کی وجہ سے وہ دور سے ایسے معلوم دیتے تھے کہ گویا ملے ہوئے

ہیں، حالانکہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں تھے! حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ بڑے سر مبارک اور بڑی جوڑوں کی ہڈیوں والے تھے، (حدیث میں لفظ آیا ہے'' کر ادیس '') جس کا مطلب، ہڈیوں کے سرے ہے۔

اور روایتوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ بلند ناک اور تنگ سوراخ والے تھے (اقـنـی الانف) یعنی ناک کی بیچ کی ہڈی بانسہ کے پتلا ہونے کے باوجود ناک شریف لمبی تھی اور اس کے درمیان میں خمیدگی تھی بعض لوگوں نے ناک شریف کی تعبیر اس طرح کی کہ وہ لمبی خوبصورت اور درمیان سے بلند اور اٹھی ہوئی تھی اور کچھ نے روایت کیا کہ آپ ﷺ پتلی ناک شریف والے تھے (دقیق العـرنین) مطلب یہ کہ ناک شریف ایسی لمبی اور بلند تھی کہ اگر کوئی بغور اس کو نہ دیکھتا تو وہ یہ گمان کرتا کہ حضور اونچی ناک والے ہیں یعنی ناک کی ہڈی لمبی تھی۔

رہا حضور اکرم ﷺ کے دہن مبارک کا ذکر: تو حدیث صحیح سے یہ ثابت شدہ ہے کہ آپ ﷺ فراخ و کشادہ دہن مبارک والے تھے، آپ دہن کے جبڑے سے کلام شروع فرماتے اور اسی سے ختم فرماتے یعنی دہن مبارک کے کشادہ اور بڑے ہونے کی وجہ سے ایسا کرتے، جس کو اہل عرب پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں جب کہ اس کے خلاف کو برا جانتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں، اور مزید یہ کہ آپ ﷺ سفید خوبصورت دانتوں والے تھے (اشـنب) یعنی آپ کے دندان مبارک میں خوب سفیدی اور چمک تھی کہ جب آپ گفتگو فرماتے تو ایسا معلوم دیتا ہے جیسے آپ کے دندان مبارک سے نور کی شعائیں پھوٹ رہی ہوں۔ (اور روایت میں آتا ہے کہ) آپ ﷺ دانتوں کے درمیان فاصلہ والے تھے (مـفلج الاسنان) یعنی دندان مبارک الگ الگ اور جدا جدا تھے، اور ایک روایت میں '' مفلج الثنتين '' آیا ہے یعنی سامنے والے چار دانت کے درمیان فاصلہ والے۔

حضور اکرم ﷺ کے لعاب دہن کا ذکر: احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آقائے دو عالم ﷺ نے غزوہ خیبر کے موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الاسنی کی آنکھ میں اپنا لعاب دہن لگایا جب کہ ان کی آنکھوں میں آشوب چشم تھا، تو حضور کے لعاب دہن لگاتے ہی ان کی آنکھیں فوراً ہی ٹھیک ہوگئیں اور پھر سرکار نے ان کو علَم عطا فرمایا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پھر ان کے ہاتھوں پر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

اور حدیث پاک میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی کنویں میں کلی فرمادی تو یہ عالم تھا کہ پھر اس کنویں سے مشک کی خوشبو پھوٹتی تھی، اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی دوسرے کنویں میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا تھا تو پھر پورے مدینہ میں اس سے زیادہ خوشبودار پانی کسی کنویں کا نہیں تھا، مزید روایتوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ یوم عاشورا کو اپنے دودھ پیتے بچوں اور حضرت فاطمہ کے دودھ پیتے بچوں کے دہنوں میں اپنا لعاب دہن ڈالتے تھے اور خواتین کو دودھ پلانے سے منع فرماتے تھے یہاں تک کہ ان بچوں کو رات تک حضور کا وہ لعاب دہن کافی رہتا نیز یہ روایت کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے کسی موقعہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا چبا کر، پانچ عورتوں کو دے دیا، تو ان سبھی خواتین نے اس ایک حضور کے کھائے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو کھایا یہاں تک کہ وہ انہیں کافی ہوا اور ان کے منہوں میں گوشت کی بو بھی نہیں پائی گئی (خلوف) اس ناپسند بو کو کہتے ہیں جو منہ سے نکلتی ہے۔

اب رہ گیا حضور کی زبان مبارک کی فصاحت، اور آپ کے جوامع الکلم اور آپ کے بیان وحکم کی بے مثالی کا ذکر تو یہ معاملہ ذکر ونشر کئے جانے سے زیادہ اظہر واشہر ہے کہ آخر اس امر کا ذکر کیسے ممکن ہو کہ جو اس انتہا کو پہنچا ہوا ہے جس کا کوئی مخلوق ادراک ہی نہیں کرسکتی یہاں تک کہ بعض علما نے فرمایا کہ حضور کا کلام قرآن کی طرح ایک معجزہ ہے۔

آپ ﷺ کی صوت مبارک کا ذکر: تو ابن عساکر نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر نبی کو خوبصورت چہرے والا اور خوبصورت آواز والا بنا کر ہی مبعوث فرمایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جب تمہارے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا تو خوبصورت رخ زیبا اور حسن صوت دے کر مبعوث فرمایا'' اور امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا یہاں تک کہ دوشیزاؤں نے اپنے مکان کے گوشے میں اسے سنا۔

حضرت ابونعیم کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جمعہ کے دن منبر شریف پر لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ تو حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے قبیلہ بنی تمیم میں حضور کی آواز سنی اور سن کر اسی جگہ بیٹھ گئے۔ اور حضرت ابن سعد کی روایت میں ہے کہ حضور نے جب منیٰ میں خطاب فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی سماعتوں کو کھول دیا تو انہوں نے حضور کی آواز اپنی اپنی جگہ پر ہی سنی۔ (افضل القریٰ ص: ۲۷۰ تا ۲۷۷)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدۂ بردہ شریف کے فصل ثالث سے یہ سترہواں شعر ہے ہم اس کی شرح کا آغاز کررہے ہیں، ناظم فا ہم فرماتے ہیں:

(٤٥) فان فضل رسول الله لیس له　　　حد فیعرب عنه ناطق بفم

(ترجمہ: پس رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کی کوئی حد نہیں کہ کوئی منہ سے بولنے والا اسے بکلام فصیح بیان کرسکے۔)

ربط: شاعر ذی فہم اس شعر کو شک وشبہ میں ڈالنے والوں کے گمان کو دفع کرنے کے لئے لائے ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کو مخلوق سے تمثیل دیتے ہیں یعنی جہت ومکان اور صعود ونزول کو معبود کی ذات پر ثابت کرنے سے نہیں ڈرتے اور انبیائے کرام کو اپنے ترازو سے ناپتے ہیں، تونتیجۃً وہ یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ایسی مدح کرنی چاہئے جیسا کہ عامۃ البشر کی، کی جاتی ہے بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ اس طرح کی مدح میں بھی کمی کرنی چاہئے اور یہ لوگ نفسانی خواہشات سے حضور کی مدح کی حد بندی کرتے ہیں اور جس ہلاکت کے قعر عمیق میں خود گرے ہوئے ہیں، دوسروں کو بھی اس میں گرادینا چاہتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے فضل کی غایت کا بیان

تو یہ شعر ماسبق شعر کی تعلیل کے لے لایا گیا! یعنی ''فا'' تعلیلیہ ہے تو گویا عبارت یوں ہے'' لان فضل رسول الله لیس له حد'' یعنی گزشتہ شعر کی یہ کہہ کر علت بیان کی جارہی ہے کہ ''اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل کی کوئی حد نہیں ہے''، یعنی کوئی انتہا اور غایت نہیں جس پر حضور کھڑے ہوں اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ مدارج کمال میں ہمیشہ ترقی فرماتے رہتے ہیں، اس فرمان باری تعالیٰ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ﴿وللآخرة خیر لك من الاولیٰ﴾ یعنی ہر آنے والا لمحہ ہر گزرے ہوئے لمحے سے افضل وبہتر ہے اس لئے کہ حضور ہر دوسرے آن میں

کمالات کی طرف ترقی فرمالیتے ہیں جو کہ گزرے ہوئے لمحے میں کی گئی ترقی سے زائد ہوتا ہے، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا" انـه لیغـان علی قلبی فاستغفر الله " کہ بےشک وہ (گزراہوالمحہ) میرے دل پر گھنے بادل کی طرح گھرآتا ہے تو میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے استغفار کرلیتا ہوں یعنی انوار تہ بتہ ہوجاتے ہیں اور جمع ہوجاتے ہیں میرے دل پر تو میں پچھلی حالت سے توبہ واستغفار کرلیتا ہوں مطلب یہ ہے کہ گزرے ہوئے احوال حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر ڈھیر لگ کراور جمع ہوکر چمکتے ہیں ان میں بعض بعض سے بلند ہوتے ہیں اور وہ احوال روشنیوں کے حال کوڈھاک دیتے ہیں اور دوسرے حال کوروشن کرتے ہیں، نیز انوار پے درپے آتے رہتے ہیں پھر وہ انوار اس حال کومزین وآراستہ کرتے ہیں نتیجۃً وہ ماسبق کے لئے حجاب ہوجاتے ہیں تو یہی وہ مغفرت ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان رفیع کے لائق ومناسب ہے اور حضور علیہ السلام کو اس مغفرت میں بہت وافر اور کثیر حصہ عطا ہوا ہے اور حضور علیہ السلام کو اس مغفرت میں اصالت کی وجہ سے تمام انبیاء کرام پر فضیلت ہے تو یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس حالت پر دوام کی دعا کرتے ہیں اور اپنے ہر گزرے ہوئے لمحے سے استغفار کرلیتے ہیں اور اپنے رب سے اس حالت پر دوام اور کمال میں ترقی کی دعا مانگتے رہتے ہیں اس مغفرت کے ذریعہ جو زوال کے لئے حاجب ہے۔علامہ باجوری فرماتے ہیں اسی وجہ سے آقائے دو عالم ﷺ نے امام ابوالحسن شاذلی سے خواب میں فرمایا تھا جس وقت کہ انہوں نے عالم رویا میں حضور سے اسی حدیث کے معنیٰ کے بارے میں دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ اے سعید وہ انوار کے بادل ہیں نہ کہ اغیار کے (حاشیۃ الباجوری ص ۲۸) یا پھر " غیـن "وہ کیفیت جس کو آپ ﷺ ہی زیادہ جانتے ہیں کہ جو آپ کے قلب نازپر ظاہر ہوتی ہے جس وقت کہ امت کے اعمال آپ پر پیش کئے جاتے ہیں اور ان اعمال میں حضور وہ مشاہدہ فرماتے ہیں جو حضور کو ناپسندیدہ ہے (یعنی امت کی بداعمالیاں) تو حضور اپنی امت کے لئے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان حکم کی تعمیل کے لئے ہے۔(و استـغفر لذنبك وللمؤ منين) تو اسی بات کو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر بیان فرمایا"و انـه ليغـان عـلـى قـلبى فاستغفر الله" تو اس میں اور اس میں کوئی

منافات نہیں ہے لہذا جمع کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔

حــاصل یہ ہے کہ یہ آیت، آیات متشابہات میں سے ہے جس میں واجب ہے کہ آپ ﷺ کو اس کے ظاہری معنی سے منزہ رکھا جائے اور اس کی مراد کو اللہ ورسول پر چھوڑا جائے۔

ناظم شعر کا قول (الفضل) بمعنیٰ احسان، (اس معنیٰ کی تقدیر پر، شعر میں) بغیر علت کے ابتدا کی گئی ہے اور بمعنیٰ زیادتی اور تفوق بھی آتا ہے اور 'فضل' مصدر ہے جو کہ بیت میں اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔

(حــد) بمعنیٰ غایت وانتہا، آتا ہے یا اس وصف کے معنیٰ میں آتا ہے کہ جو موصوف کے تمام کمال کو محیط ہو، وصف بیان کرنے والے کی جانب سے۔

اور (فیعرب) میں 'فا' برائے جواب نفی ہے اور " یعرب " 'ان' مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے جو 'الاعراب" مصدر سے بمعنیٰ فصاحت سے بولنا اور صاف بیان کرنا ہے۔ (عــنــه) 'یعرب' کے متعلق ہے اور اس کی ضمیر 'حد' کی جانب راجع ہے اور یہی زیادہ قریب ہے یا پھر 'ہائے غائب' کی ضمیر راجع بسوئے 'فضل ہے۔

(نــاطق) بمعنیٰ متکلم ہے اور (بـفم) میں 'با' استعانت کے لئے ہے اور 'بفم'' ناطق سے متعلق ہے حالانکہ 'نطق' صرف زبان سے ہی ہوتا ہے! تو ''فم'' کا ذکر یا تو تاکید کے لئے ہے اور فم سے لسان مراد ہے، محل کا حال پر اطلاق کرنے کی وجہ سے اس وجہ سے تو وہ مجاز مرسل ہوا، یا پھر 'فـم' تاکید کے لئے نہیں بلکہ تعمیم کے لئے ہے، یعنی تمام ناطق کی تعمیم کے لئے ہے، عربی ہو یا عجمی، انس وجن ہو یا فرشتہ سب کے لئے عام ہے! اور تاکید و تعمیم میں اس کی نظیر ومثال یہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿وما من دآبة فی الارض و لا طٰئر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم﴾ الآیة۔

اور ناظم شعر نے جو ان الفاظ میں یہ تعبیر کی کہ (فیعرب عنه ناطق بفم) اس میں زبان کے عجز کی طرف اشارہ ہے یا اس حد کا بیان ہے جہاں پر جا کر حضور ﷺ کے کمال منتہی ہوں گے اور اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی وجہ سے وہم کو دفع کرنے کے لئے ہم کہہ دیں کہ حضور اکرم ﷺ کے کمالات غیر متناہی بالفعل ہیں۔

اور جب کہ حضور کسی ایک حد پر قائم نہیں تو حضور کے فضل وکمال کا غیر متناہی ہونا اسی معنیٰ میں ہے اور قارئین کرام یہ بات جانتے ہیں کہ ناظم شعر کے اس قول (لیس لہ حد) میں ''حد'' سیاق نفی میں واقع ہونے کی وجہ سے عام ہے، اس لئے کہ نکرہ سیاق نفی میں عام ہوتا ہے۔ تو حد کے مفہوم میں کسی بھی طرح کی قید کا معنیٰ مستفاد نہیں ہوتا اور نہ ہی ناظم شعر کے اس قول (فیعرب عنہ) سے تقید مراد ہے بلکہ تعبیر کو مَورد بیان میں لایا گیا ہے اس لئے کہ 'اعراب' یعنی فصاحت سے بولنا صرف زبان ہی سے متصور ہے اس بنیاد پر کہ انسان پہلے عقل سے ادراک کرتا ہے پھر زبان سے تعبیر کرتا ہے یعنی بیان کرنا، ادراک بالجنان کی فرع ہے تو اس کی نفی کر کے ناظم شعر نے چاہا کہ انسان حضور کے فضل کی حد کو عقل سے ادراک کریں، تو اس تقریر سے علامہ شیخ زادہ کے وارادات دفع ہوجاتے ہیں جوانہوں نے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

'' جاننا چاہئے کہ شعر سے صرف حد مقید کا انتفاء مستفاد ہوتا ہے، جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں اور اس مقید حد کا انتفا، حد مطلق کے انتفا کو مستلزم نہیں اس لئے کہ خاص کی نفی، عام کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتی تو یہ ان قائلین کے قول کی بنیاد پر ہے جو انسان کامل کے کمالات کو منتہی کہتے ہیں، لیکن رہا ان حضرات کے قول کی بنیاد پر جو غیر متناہی کے قائل ہیں تو یہ شعر اس قول کی تائید نہیں کرتا مگر صرف اس صورت میں جب کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی بطور مجاز مراد لی جائے اور حق یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ پر جو مطلع ہوا اور جس نے عوارض بشریہ سے حضور کے انسلاخ وجدائی کو جان لیا تو وہ حضور کے فضائل کے غیر متناہی ہونے کا معترف ہوجائے گا جیسا کہ وہ خلاق مالک حقیقی کے کمالات کے متناہی ہونے کو محال جانتا ہے۔ (شیخ زادہ: ص۹۰)

پھر یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ مخلوق میں فضل وکمال کا غیر متناہی ہونا صرف مجاز کے طور پر ہے، غیر متناہی بالفعل کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ آپ ﷺ کی حقیقت اس ذات کے ساتھ مختص ہے جس نے حقیقت کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے اور وہ ذات خلاق علیم کی ذات ہے۔ اور علامہ شیخ زادہ نے جو یہ کہا کہ '' حقیقت محمدیہ پر جو مطلع ہوا وہ حضور کے فضائل کے غیر متناہی ہونے کا معترف ہوا جیسا کہ وہ خلاق علیم کے کمالات کے غیر متناہی ہونے کا

معترف ہے۔''تو ان کے یہ اقوال بالکل مناسب نہیں اس لئے کہ اس میں مقصد کے فاسد ہوجانے کا اندیشہ ہے۔
و من الله العصمة و به الاعتصام۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکريم ، و آله و صحبه الکرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

ہم بحمد اللہ تعالیٰ قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے اٹھارہویں شعر تک آپہنچے ہیں تو اب ہم اس کی شرح کا آغاز کررہے ہیں۔(اللہ ہمیں کافی ہے اور اسی سے مدد چاہتے ہیں۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے خیال کیا کہ جب وہ (یعنی ثناخواں حضور کی ثناخوانی کا پورا حق ادا کر ہی نہیں سکتا اور نہ ہی حضور کے تمام اوصاف وکمال کا احاطہ کرسکتا ہے، حالانکہ حق ثنا ادا کرنے کا گمان بھی خیالوں میں کیسے آسکتا ہے، جب کہ جو آیات ومعجزات آپ ﷺ کو عطا کئے گئے ہیں وہ تو عظمت میں حضور کی قدر ومنزلت کے برابر نہیں اور نہ ہی بزرگی میں ان آیات ومعجزات کو حضور کے فضل وکمال سے مناسبت ہے۔تو اسی مفہوم کو شاعر ذی فہم نے یہ کہہ کر ادا کیا:

(٤٦)لو ناسبت قدره آياته عظماً احيیٰ اسمه حين يدعیٰ دارس الرمم

(ترجمہ:اگر حضور کے آیات ومعجزات عظمت و بزرگی میں حضور کی قدر ومنزلت کے برابر ہوتے ،تو حضور کا اسم شریف بوسیدہ اور فانی ہڈیوں کو زندہ کردیتا،جس وقت کہ حضور کے اسم شریف کا ذکر کیا جاتا ہے۔)

تشریح:(لو) حرف شرط ہے جو اول کے انتفا کے لئے ثانی کے انتفا پر دلالت کرتا ہے۔(المناسبة) کسی ایک شئی یا کئی اشیاء میں شرکت کو کہتے ہیں اور بمعنیٰ زیادتی ونقصان میں شئی کا مقدار کے مطابق ہونا اور یہ لفظ،کمال میں کثیر الاستعمال ہے، خاص طور سے مطلق ہونے کے وقت اسی معنی میں آتا ہے اور یہاں یہ یہی مراد ہے (

قدرہ) یہ (ناسبت) کامفعول بہ ہے، اس کواس کے اہتمام کی وجہ سے فاعل پر مقدم کیا گیا ہے۔ (آیاتہ) یہ "ناسبت" کا فاعل ہے (عظماً) تمییز ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے اور عظم بمعنیٰ عظمت ہے اور تمییز،'' نسبت'' کی اسناد میں ابہام کو رفع کرنے کے لئے ہے اور یہی اولیٰ ہے یا پھر "عظما" نزع خافض کی بنیاد پر منصوب ہے، اور نزع خافض کی بنیاد پر منصوب ہونا سماعی ہے جو مصنفین کے کلام اور اشعار اور قرآن وحدیث میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے، اور شروع میں اس کی مثال قرآن سے گزر چکی ہے اور وہ یہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿واختار موسی قومه سبعين رجلا لميقٰتنا﴾ الآیة۔نزع خافض کا استعمال اتنا کثیر ہے کہ وہ قیاس میں بھی جاری ہو گیا ہے۔مصنف اس شعر کو ایک پوشیدہ اور مضمر دعویٰ پر استدلال کرنے کے لئے لائے ہیں گویا انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ آپ ﷺ کے آیات ومعجزات، عظمت میں آپ کی قدر ومنزلت کے برابر نہیں اور انہوں نے اپنے استدلال میں گویا ایک قیاس استثنائی کی طرف اشارہ کیا، جس کی ترتیب کچھ اس طرح ہے: اگر وہ عظمت و بزرگی میں حضور کی قدر ومنزلت کے برابر ہو تو ضرور حضور کے معجزارت میں سے ہوگا کہ حضور کے اسم شریف کا ذکر فانی اور بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کردے، لیکن حضور کے معجزات میں سے نہیں کہ حضور کے نام مبارک کا ذکر بوسیدہ ہڈیوں کو زندگی بخش دے جس وقت کہ اس کا ذکر وورد کیا جائے تو معلوم یہ ہوا کہ ان کے آیات ومعجزات عظمت میں حضور کی قدر ومنزلت کے مناسب اور مطابق نہیں'' اور یہی مطلوب ہے اس لئے کہ حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کی قدر ومنزلت، آپ کے آیات سے عظیم تر ہے حتی کہ قرآن متلو سے بھی برخلاف قرآن غیر متلو کے! اس بات کے قائل علامہ باجوری ہیں اور علامہ ابن عابدین نے آپ ﷺ کے قرآن سے افضل ہونے کے سلسلے میں توقف کیا اور امام احمد رضا کا اس سلسلے میں وہی موقف ہے جو علامہ باجوری کا ہے۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ مصنف نے شرطیہ تو ذکر کیا لیکن استثنائیہ اور نتیجہ کو حذف کردیا اور شرطیہ میں لزوم کی وجہ یہ ہے کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ احیاء یعنی مردے کو زندہ کرنا یہ ایک بہت بڑی نشانی اور بہت عظیم معجزہ ہے اور اسی سے آیات ومعجزات، آپ ﷺ کی قدر ومنزلت کے مناسب اور مطابق ہوں گے یعنی ان آیات ومعجزات کا مجموعہ،

احیائے مذکور کا ان آیات میں سے ہونے کے ساتھ سب مل کر یہ آپ ﷺ کی قدر شریف کے برابر ہوگا نہ کہ ان آیات و معجزات میں سے ہر فرد، قدر شریف کے مناسب ہوگا!

اس لئے کہ اس زندہ کرنے والی نشانی کو، آیات و معجزات کے مجموعے میں سے کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیات و معجزات میں سے ہر فرد حضور اکرم ﷺ کی قدر و منزلت کے مناسب اور برابر ہو۔

لا یقال: احیاء (یعنی زندہ کرنے کے معجزے) کو حضور اکرم ﷺ کے معجزات میں سے کیوں نہیں کیا گیا، باوجودیکہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے کیا گیا ہے۔

لانا نقول: کلام تو حضور کے اسم شریف کا بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرنے کے سلسلے میں ہے جس وقت کہ اس کا ذکر کیا جائے، اور یہ جیسے حضور اکرم ﷺ کے معجزات میں سے نہیں ہے ویسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات سے بھی نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تو مردوں کو باذن اللہ زندہ کرنا تھا، جیسا کہ علامہ باجوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، (ص ۲۸)

اور شعر میں آیات سے نبوت کی نشانیاں اور علامات مراد ہیں جیسے کہ معجزات اور "احیاء" کا معنیٰ زندگی بخشنا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو حس اور حرکت ارادیہ کو چاہتی ہے اور "اسم" یہ علم کا مترادف ہے یا تسمیہ کے معنیٰ میں ہے یعنی نام کا ذکر اور 'دعا' بمعنیٰ طلب ہے، کہا جاتا ہے 'دعاہ بزید' یعنی اس کو زید نام سے پکارا اور کہا جاتا ہے 'دعا اللہ' بمعنیٰ اللہ سے سوال کرنا، مانگنا اور "درس" کا معنیٰ بوسیدہ ہونا ہے، اور 'الرمم' یہ 'الرمۃ' کی جمع ہے اور بمعنیٰ ہڈی کا بوسیدہ ٹکڑا آتا ہے۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ شعر کا حاصل معنیٰ یہ ہے کہ "اگر حضور کے آیات عظیمہ، حضور کے مقدار کمال کے مطابق ہوتے، تو ضرور اللہ تبارک وتعالیٰ آپ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی آپ کے اسم شریف کی برکت سے بوسیدہ ہڈیوں اور فانی اجسام کو زندہ فرما دیتا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے کمالات کی انتہا کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے آپ کی وفات کے بعد ان ہڈیوں کو زندہ نہیں فرمایا۔ (ص ۹۱)

علامہ باوجوری کا کلام اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضور کے نام مبارک سے پکارنا، گویا اس طرح ہوگا کہ ''اے مردہ لاش، حضرت محمد ﷺ کے اسم کی برکت سے زندہ ہوجا۔'' (ص ۲۸)

حضور علیہ السلام کا مردوں کو زندہ فرمانے کا معجزہ

علامہ خرپوتی نے "دلائل النبوۃ" سے ایک حکایت نقل کی ہے جو ماسبق افادات کی تائید کرتی ہے وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''آپ ﷺ کے زمانے اقدس میں ایک انصاری جوان کا وصال ہوگیا تو لوگوں نے ان کو کفن پہنایا پھر ان فوت شدہ انصاری جوان کی بوڑھی اور نابینا والدہ آئیں تو لوگوں نے ان کو ان کے بیٹے کی وفات کی خبر دی! یہ سن کر وہ بارگاہ الٰہی میں عرض گزار ہوئیں کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے تیرے لئے اور تیرے نبی کے لئے ان کی طرف اس امید پر ہجرت کی کہ تو میری ہر شدت و پریشانی میں اعانت فرمائے گا تو اے میرے مولیٰ اپنے نبی کے صدقہ وتوسل سے تو مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈال! تو اس دعا کے بعد ان ضعیفہ کے فوت شدہ بیٹے زندہ ہوگئے، انہوں نے اپنا چہرہ کھولا پھر کھڑے ہوئے حاضرین کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔''

نیز روایت کی جاتی ہے کہ سیدنا جابر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی اور حضور کے لئے ایک بکری ذبح کی، پھر اتنے میں حضرت جابر کے بڑے صاحب زادے آئے اور انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا کہ والد محترم نے بکری کیسے ذبح کی؟ تو ان کے چھوٹے بھائی نے ان سے کہا کہ میرے پیچھے آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں کیسے ذبح کی، پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پیچھے ہولئے تو ان کے چھوٹے بھائی نے ان کے دونوں ہاتھ پیر باندھ دئے اور چھری لے کر ان کو ذبح کر دیا اور ان کا سر ان کی ماں کے پاس لے گئے یہ دیکھ کر ان کی ماں رونے لگیں! وہ چھوٹا سا بچہ ڈر کر بھاگنے لگا اور جا کر چھت پر چڑھ گیا اور اس مقتول بچے کی ماں اس کے پیچھے دوڑی کہ اتنے میں اس بچے نے چھت سے چھلانگ لگالی اور یہ بھی فوت ہوگیا۔ اب ان دونوں بچوں کی ماؤں نے اس عظیم مصیبت میں صبر سے کام لیا اور ان دونوں بچوں کو کپڑے میں لپیٹ کر گھر میں چھپادیا اور کھانا بنانے میں مصروف ہوگئیں، پھر جب رسول اللہ ﷺ آئے تو صاحب خانہ نے کھانا پیش کیا ہی تھا کہ جبرئیل امین اتر آئے

اور حضور سے فرماتے ہیں کہ حضور! اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ یہ کھانا جابر کے دونوں بچوں کے ساتھ تناول فرمائیں، تو حضور نے حضرت جابر کو پیغام الٰہی سنایا تو وہ اپنی زوجہ کے پاس گئے اور اور بچے مانگیں تو ان کی زوجہ نے کہا کہ بچے گھر میں ہیں نہیں تو پھر حضرت جابر نے آقائے دو عالم ﷺ کے پاس آ کر بتایا کہ یا رسول اللہ بچے گھر پر موجود نہیں ہیں!! لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں پھر بچوں کو لانے کا حکم دیا کے لئے، تو حضرت جابر پھر گئے اور اپنی زوجہ پر زور ڈالا یہاں تک کہ وہ مجبور ہو گئیں اور انہوں نے راز افشا کر دیا، یہ سن کر حضرت جابر حضور علیہ السلام کے پاس روتے ہوئے آئے اور پورا واقعہ بیان کیا، واقعہ سن کر رسول اللہ ﷺ بہت متفکر ہوئے کہ اتنے میں حضرت جبرئیل تشریف لے آئے اور کہتے ہیں کہ حضور! اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ ان دونوں بچوں کے لئے دعا کریں اور رب فرماتا ہے کہ اے حبیب تمہارا کام دعا کرنا ہے اور ہمارا کام قبول کرنا، تو رسول اللہ ان دونوں بچوں کی حیات کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا پھر وہ دونوں کھڑے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھانا تناول کیا۔ (ختم شد ماخوذ از شرح خرپوتی) بتغیر یسیر (ص۹۲)

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ مولانا علی قاری کی تصنیف لطیف "الزبدۃ" جو انتہائی عمدہ منتخبات پر مشتمل ہے اس کے کچھ خوبصورت فوائد یہاں ذکر کئے جانے کے لائق ومناسب ہیں، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شعر کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ کو روشن آیات ومعجزات عطا کئے گئے ہیں جو آپ ﷺ کی رسالت اور نبوت پر دلالت کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے کرامات ومعجزات ایسے روشن ہیں جو آپ کے مرتبے کی بلندی اور آپ کی عظمت کی رفعت پر، اللہ کی قضا، اس کی قدر وحکمت اور اس کے ارادے کے اقتضا کے مطابق دلالت کرتے ہیں۔

اور آپ ﷺ کے جملہ معجزات میں سے مردوں کو زندہ کرنا بھی ہے اور نہ صرف حضور بلکہ حضور کی برکت سے یہ کرامت حضور کی امت کے بعض افراد کے ہاتھوں سے بھی صادر ہوئی ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب کی عظیم ذات اور ان کی روشن معجزات کے درمیان مناسبت تامہ چاہتا تو کسی نشانی سے قطع نظر ضرور اللہ تعالیٰ آپ کے اسم شریف کی برکت سے ہی زندگی بخشتا اور حقیقی ومجازی مردوں کی بوسیدہ ہڈیوں اور

فانی جسموں کو زندہ فرما دیتا جب آپ کا نام مبارک پکارا جاتا یا آپ کے اسماء میں سے کسی اسم کا ذکر کیا جاتا یا آپ کے صفات کے اوصاف میں سے کسی کی وصف بیانی کی جاتی، اس طرح زندہ فرماتا کہ اللہ تعالیٰ یا تو آپ ﷺ کے اسم محمدی کی یا آپ کے وصف احمدی کی یہ خاصیت بنا دیتا کہ جب اس کا ذکر کسی میت حقیقی پہ کیا جاتا تو وہ زندہ اور حاضر ہو جاتا اور جب اس کا ذکر کسی کافر یا غافل پہ کیا جاتا تو وہ ذکر اسے مومن اور اس غافل کو ذاکر بنا دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس درمکنون کے جمال اور اس جوہر مصون کے کمال کو ایک حکمت بالغہ اور ایک نکتۂ سابقہ کی وجہ سے پوشیدہ رکھا!

شاید کہ وہ اس لئے ہے تا کہ ایمان غیبی اور امر تکلیفی رہے شہود عینی اور عیان بدیہی نہ رہے یا پھر اس لئے ہے تا کہ عوام کے قدموں کے لئے پھسلنے کی جگہ نہ ہو۔

اور فرماتے ہیں: کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقام مبالغہ میں " یدعیٰ " کی ضمیر کو آپ ﷺ کے اسم شریف کی طرف لوٹانا اس سے اولیٰ ہے کہ کہا جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ پکارا جائے (یعنی بطور مبالغہ ضمیر کو اسم شریف کی طرف لوٹانا بہتر اور اولیٰ ہے، کلمۂ جلالت کی طرف لوٹانے سے) ملا علی قاری پھر فرماتے ہیں کہ یہ کہیں وارد نہیں کہ قرآن کی بزرگی اور شان رفیع کی وجہ سے اس کا بیان ممکن نہیں اس لئے کہ گفتگو دلالت کی عظمت کے سلسلے میں ہے نہ کہ مقالے کی مقدار کی شرف کے بارے میں، اس لئے کہ اگر قرآن پاک کی دلالت ہمارے عظیم الشان نبی کی عظمت کے مطابق ظاہر ہوتی تو کوئی بھی حضور کی نبوت ورسالت کا منکر نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں اپنے حبیب کی عظمت ظاہر فرما دیتا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ولو ان القرآن سیرت به الجبال او قطعت به الارض او کلم به الموتی بل الله الامر جمیعا﴾

یعنی یہ قرآن ضرور ایسا ہوتا ہے لیکن اسے ان مذکورہ باتوں سے صرف اس وجہ سے پھیر دیا گیا ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا مانع ہے۔(الزبدة ص ٦٠، ٦١)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدداوراس کی نصرت سے ہم قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث سے انیسویں شعر کی شرح کا آغاز کررہے ہیں،تو ہم عرض گزار ہیں:

ربط: شاعرذی فہم اس شعر میں حضوراکرم ﷺ کی اپنی امت کے لئے خیر پہنچانے میں رغبت کی انتہا کو بیان کردینا چاہتے ہیں کہ حضورﷺ اپنی امت کوخیر پہونچانے میں،ان کی دیکھ بھال اوران پر شفقت کرنے کے سلسلے میں کتنے حریص ہیں، نیز ناظم یہ بیان کردینا چاہتے ہیں کہ حضوراس بلندی پر قائم ہیں جس کے قریب بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا اوراس مقام ومرتبے پر فائز ہیں جس کی کوئی برابری نہیں کرسکتا،اور یہ کہ حضوردنیاوی بادشاہوں کی طرح نہیں جواپنی رعایا کا خیال نہیں کرتے ہیں اوران کوایسے امر کا مکلّف کرتے ہیں جوان کے بس میں نہیں۔تواسی مفہوم کوادا کرنے کے لئے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٤٧)لم یمتحنا بما تعی العقول به　　　　حرصا علینا فلم نرتب ولم نهم

(ترجمہ: آپ ﷺ نے ہماراان چیزوں سے امتحان نہیں لیا جس کوسمجھنے سے عقلیں قاصراور عاجز رہتیں اورایسا ہم پر ہماری بہتری کی حرص کرتے ہوئے کیا تا کہ ہم شک ووہم اورتردد میں نہ پڑجائیں۔)

تشریح:(الامتحان) بمعنی آزمانا،امتحان لینا،آزمائش میں ڈالنا،کہا جاتا ہے، امتحن فلانا بمعنی اس نے فلاں کوآزمایا،اس کا امتحان لیا، 'امتحن الشئی' بمعنی غوروفکر کرنا، امتحن الفضة، بمعنی چاندی کوتاؤ دیکرصاف کرنا،اورکہا جاتا ہے' اُمتُحن فلان 'بمعنی آزمائش میں پڑنا!یہ معانی' المعجم الوسیط 'میں ہیں (تعی) عیّ بالامر سے بمعنی عاجز ہونا،راہ راست نہ پانا ہے،لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہے،کہا جاتا ہے " عی فی منطقة " بمعنی کلام میں رک جانا ہےاس میں عاجز ہونا، یہ معنی یعییٰ عیا بکسر العین سے ہے،

اور عیاء بمعنی کلام سے عاجز ہونا اوراس کی مراد کو بیان نہ کرسکنا یعنی غیر مفہوم کلام کہنا، " عی بامره وعی عن حجته، والامر، وبالامر' ان سب سے جاہل ہونے کے معنیٰ میں آتا ہے۔' اعیاالرجل او البعیر فی سیره' بہت تھکنا اور کہا جاتا ہے 'اعیاه السیر وعلیه الامر' بمعنیٰ چلنے سے عاجز کردینا اور وجہ صواب کو نہ پانا اور کہا جاتا ہے' اعیـا الـداء الطبیب' مرض کا طبیب کو عاجز کردینا۔ان تمام مذکورہ مفردات وصلات سے واضح ہوجاتا ہے کہ' الاعیـاء' مصدر حرکت سے عاجز کردینے کے معنیٰ میں اکثر مستعمل ہے اور 'الـعـی' مصدر رائے اور بیان سے عجز کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔

لفظ ''عیّ'' کے متعلق امام النحو علامہ کسائی کا ایک واقعہ

یہاں اس موقعہ پر علامہ کسائی کی ایک حکایت علامہ خرپوتی نے بیان کی ہے کہ علامہ کسائی نے اپنی کبرسنی میں علم نحو کی تعلیم لی اوران کے علم نحو اس عمر میں سیکھنے کی وجہ یہ بنی کہ ایک دن وہ پیدل کہیں چلے جارہے تھے کہ چلتے چلتے وہ تھک گئے تو انہوں نے ایک قوم کے پاس استراحت کے لئے قیام کیا اور کہنے لگے:' عییت " تشدید کے ساتھ بغیر ہمزہ کے (یعنی میں تھک گیا) تو یہ لفظ تشدید کے ساتھ بغیر ہمزہ کے سن کر قوم نے ان سے کہا کہ ہمارے یہاں قیام نہ کرو تم تو اعرابی غلطی کرتے ہو تو علامہ کسائی نے کہا کہ آخر پھر میں اس لفظ کو کیسے بولوں؟ انہوں نے کہا کہ اگر تم تھکنے اور تکلیف میں پڑنے کا معنیٰ ادا کرنا چاہتے ہو تو" اعییت "تخفیف کر کے کہو، یہ سن کر علامہ کسائی فوراً کھڑے ہوئے اور ان سے نحو کے استاذ کے بارے میں پوچھنے لگے، انہوں نے علامہ معاذ کا پتہ بتایا، تو وہ ان کے پاس روانہ ہوگئے اوران سے نحو کی تعلیم حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ وہ ان تمام چیزوں کے ماہر ہوگئے جو ان کے استاذ کے پاس تھیں پھر وہاں سے وہ بصرہ علامہ خلیل ابن احمد کے پاس پہونچے ایسا ہی علامہ حقی نے اپنی تعریفات میں یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔(الخرپوتی ص:۹۳)

اقــوال:۔ اس واقعہ سے قارئین کرام سمجھ گئے ہوں گے کہ عرب کے متقدمین اپنی زبان کی حفاظت اوراعرابی غلطی سے محفوظ رہنے کے لئے کس درجے کا اہتمام کرتے تھے۔

(العقول) یہ عقل کی جمع ہےاور وہ اصل میں، بند کرنا، روکنا، باندھنا، پکڑنا، مضبوط ہونا، وغیرہ معانی کے لئے آتا ہےاوراسی سے 'المعقلة' آیاہے بمعنیٰ دیت یعنی خون بہااور ' المعقل' آیاہے بمعنیٰ 'حصن' یعنی جائے پناہ، محفوظ بلند جگہ اوراسی وجہ سے 'حصن' کہا گیاہےاور عقل کا اطلاق اس قوت پر ہوتا ہے جو کلیات کو ذات سے اور جزئیات کو آلات سے ادراک کرنے کے لئے مہیا اور تیار کی گئی ہو۔ نیز اس ملکہ پر بھی عقل کا اطلاق ہوتا جو انسان کو برائیوں اور رسوائیوں سے بچائے۔

عقل کے معانی

پھر جاننا چاہئے کہ عقل کے کئی معانی ہیں: ان میں سے ایک بمعنیٰ جوہر مجرد ہے جو بدن سے متعلق ہوتا، تدبیر اور تصرف کرتا ہے، علامہ تفتازانی فرماتے ہیں: یہ وہی معنی ہے جو کہا جاتا ہے کہ جو ہر نہ جسم ہےاور نہ جسمانی اور عقل کا ایک معنی وہ قوت نفسانیہ ہے جس سے انسان حقائق کا ادراک کرنے پر قادر ہوتا ہے، اور شاید کہ اس کا معنیٰ وہی ہے جو علماء نے فرمایا کہ عقل، وہ قوت نفس ہے جس سے علوم وادراکات کے لئے مستعد ہوا جاتا ہےاور عقل کا ایک معنیٰ وہ طبعی قوت ہے جو علم کو ضروریات سےاور نفس علم کو اس سے لازم کرتی ہےاور عقل اس قوت ممیّزہ کو بھی کہتے ہیں جو اچھے برے امور کی تمیز کردے اوراس ایک معنیٰ انسان کی ہیئت محمودہ ہےاور عقل کے معانی میں سے یہ ہے کہ عقل وہ قوت نفس ہے جس کے ذریعہ ضروریات سے نظریات کی طرف منتقل ہوا جاتا ہےاور عقل کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ وہ جوہر جو اپنی ذات میں مادے سے خالی ہو لیکن فعل میں مادے سے ملی ہوئی ہواور وہ نفس ناطقہ جس کی طرف ہر ایک 'انا' کہہ کر اشارہ کرتا ہے، پھر عقل کے معنیٰ کے بعد، اس کے محل میں اختلاف ہے تو بعض نے کہا کہ وہ بدن انسانی میں نور ہےاور کچھ نے کہا کہ عقل کا محل سر میں ہےاور ایک قول یہ ہے کہ عقل کا نور، دل میں ہوتا ہےاور کچھ کی رائے یہ ہے کہ محل تو دل میں ہے لیکن اس کا نور دماغ میں ہے۔(الخرپوتی ص:۹۳،۹۴)

ناظم شعر کا قول (حرصاً) بمعنیٰ کسی چیز میں شدید رغبت۔(نرتب) "الارتیاب' مصدر سے بمعنیٰ شک وتردد کرنا ہے (نهم) یاتو 'الوهم' مصدر سے ہے یا 'الهیام' مصدر سے، تو جانب باطل راجح ہو تو 'وهم' فتح کے ساتھ

کہا جاتا ہے۔اور جب کسی معاملہ میں عقل مند متحیر ہوتو 'ھام' کہا جاتا ہے۔

اور وہ ادراک جازم جو واقع کے مطابق ہو اسے 'علم ویقین کہتے ہیں اور اگر راجح ہوتو 'ظن' اور اگر مرجوح ہوتو 'وہم' اور اگر مساوی ہوتو 'شک'

شعر کا معنیٰ جیسا کہ مولانا علی قاری نے بیان کیا یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنے انتہائی رحم وکرم کی وجہ سے ہمارے پاس عقائد اسلام میں سے کچھ ایسی چیز نہ لائے اور نہ ہی ہمیں تکالیف احکام میں سے کسی ایسے حکم کا مکلّف بنایا کہ جس کو عقل سمجھنے سے قاصر رہے اور صاحب عقل اسے ادراک کرنے سے عاجز رہے بلکہ آپ ہمارے پاس روشن دین حنیفہ اور ملت بیضاء لائے، ہم پر ایصال خیر کی حرص اور ہماری طرف کمال التفات کی وجہ سے، تو اسی وجہ سے ہم نے آپ کی رسالت میں ذرہ برابر نہ شک کیا اور نہ آپ کی متابعت میں ہم متحیر ہوئے اور نہ ہی ہم نے آپ ﷺ کی شریعت وحقیقت میں آپ کے طریقۂ جامعہ کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کیا۔(الزبدة ص: ٦١)

ملاعلی قاری کی تصنیف میں لفظ (نوداء) استعمال ہوا اور ایسا ہی ہمارے پیش نظر نسخہ میں ہے حالانکہ یہ کلمہ متغیر ہو گیا ہے! شاید کہ صحیح لفظ" النوضاء' بالضاد ہو" ناض ینوض نوضاً" سے بمعنیٰ چمکنا، روشن ہونا، ایسا ہی 'المعجم' القاموس'، لسان العرب' وغیرہ لغات میں ہے۔(الازہری غفرلہ)

اس شعر میں اللہ تبارک کے اس فرمان کی جانب تلمیح ہے ﴿لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ﴾ الآیة۔ اور اس فرمان باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمین ﴾ ، اور ایما ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی جانب ﴿ویضع عنهم اصرهم والاغلٰل التی کانت علیهم ﴾ ، نیز آقا علیہ السلام کے اس فرمان کی طرف تلویح ہے (بعثت الحنیفة السهلة السمحاء) "یعنی مجھے آسان اور روشن دین حنیف کے ساتھ مبعوث کیا گیا"

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث کی جانب بھی اشارہ ہے (لقد جئتکم بها بیضاء نقیة) "یعنی میں تمہارے پاس خوب روشن اور ستھری شریعت لے کر آیا ہوں"

علامہ باجوری کہتے ہیں کہ اگر اعتراض کیا جائے کہ مصنف کا قول لـم یـمتحنا بما تعیا العقول بہ'یعنی حضور نے ہمیں ایسی چیز سے نہیں آزمایا جس سے عقلیں قاصر رہیں'' کس طرح صحیح ہے جبکہ قرآن کریم میں متشابہات بھی ہیں جن کی تاویل صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے؟

تو اس اعتراض کا جواب ہم یوں دیں گے کہ مراد یہ ہے کہ ہمارا ایسی چیزوں سے امتحان اس میں نہ لیا جس کے ہم مکلّف ہیں تو اس موقعہ پر متشابہات کو نہیں لایا جاسکتا کیوں کہ وہ تکلیف سے متعلق ہی نہیں ﴿ لا یکلف الله نفسا الا وسعها﴾ اور یہ قول اس تحقیق کی بنیاد پر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان ﴿والـرٰسـخـون فی العلم ﴾ پر وقف ہے ورنہ تو ﴿راســخــون فـی الـعـلـم﴾ ان کی تاویل جانتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں۔(حاشیۃ الباجوری ص:۲۸)

یہ(علامہ باجوری کا کلام تھا) مگر علامہ باجوری کے کلام میں ایہام ہے جس سے متنبہ کرنا اور بچنا انتہائی ضروری ہے اور وہ تحرز اس طرح ممکن ہے کہ متشابہات کے سلسلے میں ان کے کلام کو مکلفین بالایمان پر محمول کیا جائے اور اس کے ظاہری معنیٰ سے اسے منزہ رکھا جائے نیز اس کی مراد کو بندوں کے رب کے سپرد کیا جائے اور تمام وجوہ میں سے کسی بھی وجہ کو قطعی متعین نہ کیا جائے تو یہ ایسا عمل ہے جس سے عقلیں عاجز نہیں لہذا معلوم ہوا کہ خیرالانام نے ہمارا ان امور سے امتحان لیا ہی نہیں جن سے عقلیں مقصد کو حاصل کرنے میں عاجز رہ جاتی ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

یہ قصیدہ بردہ کی فصل ثالث کا بیسواں شعر ہے،اس ذات والا کی مدح میں جن کی ثناءخوانی سے تمام واصفین عاجز ہیں۔ناظم فاہم فرماتے ہیں۔

(٤٨)اعییٰ الوری فهم معناه فلیس یری للقرب والبعد منه غیر منفحم

(ترجمہ:حضور کی کمال حقیقت کے ادراک نے تمام مخلوق کو عاجز کر دیا ہے، پس دور ونزدیک میں کوئی بھی اس سے، سوائے عاجز ہونے کے دیکھا نہیں گیا۔)

ربط: مصنف بیان کر چکے کہ زبانیں حضور سید الانس والجن ﷺ کے فضائل کا احاطہ کرنے سے عاجز ہیں، یہ بیان کرنے کے بعد اب انہوں نے اس شعر میں ترقی کی اور تھوڑا آگے بڑھ کر کہا کہ آپ ﷺ اس سے بلند و فائق ہیں جس سے آپ کی وصف بیانی کی جاتی ہے، اس لئے کہ آپ کی بلند و بالا قدر و منزلت کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا اور نا ہی عقلیں حضور ﷺ کے مقام کی رفعت و بلندی کو جان سکتی ہیں، اسی مفہوم کو ناظم یوں ادا کرتے ہیں:

اعییٰ الوری فهم معناه فليس يرى   للقرب والبعد منه غير منفحم

تشریح: (اعییٰ) بمعنیٰ عاجز کرنا، (الوری) بمعنیٰ مخلوق، (معنیٰ) بمعنیٰ مقصود شئی اور کمال انسان۔اور (معناه) میں 'ہ' کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی جانب راجع ہے اور ضمیر کو اشباع کے ساتھ پڑھا جائے گا۔اور (فليس) میں ''فا'' فصیحہ ہے شرط مقدر کو بیان کرنے کے لئے یعنی جب آپ ﷺ کی کمال حقیقت نے مخلوق کو عاجز کر دیا تو نہیں دیکھا گیا تقدیری عبارت یوں ہوگی" اذا اعيى الورى فهم معناه فليس يرى" اور (ليس) جب فعل پر داخل ہوتا ہے تو اس میں ضمیر شان مقدر ہوتی ہے جو مابعد کی تفسیر کرتی ہے۔اور (يرى) مفعول کی بنا پر "ليس" کی خبر ہے۔(للقرب) ایک نسخے میں 'في القرب' آیا ہے، بہرحال 'لام' یہاں بمعنیٰ 'في' اور قرب و بعد یا تو زمانی ہیں یا مکانی یا منزلت کے معنیٰ میں ہیں۔(منه) ایک نسخے میں "فيه" آیا ہے، دونوں صورتوں میں ضمیر کے اشباع کے ساتھ ہوگا، اور یہ "يرى" سے متعلق ہے یا" منفحم' سے اور ایک نسخے میں 'منهم' بھی آیا ہے اور ضمیر 'الورى' کی جانب راجع ہے اور 'فيه' متعلق ہوگا 'منفحم' کے اور اس کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہوگی یا پھر وہ 'معناه' سے متعلق ہوگا۔

(غير منفحم) یہ" يرى" کا نائب فاعل ہے یا حال یا مفعول ثانی ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے۔

اور رویت سے یا تو قلبی رویت مراد ہے یا بصری، بر تقدیر اول آنے والا قول اس کا مفعول، قائم مقام فاعل کے ہوگا

،جس کا بیان گزر چکا اور اگر رویت بصر سے ہے یعنی بر تقدیر ثانی تو مفعول ثانی جاروں میں سے ایک ہے مجرور کے ساتھ۔

(منفحم)، الانفحام مصدر سے بمعنیٰ الزام کو قبول کرنا اور اس کی اصل " فحم " سے ہے اور تشبیہ کے طور پر معنیٰ ہوگا کہ خصم (یعنی فریق مخالف) کا چہرہ الزام کے وقت کوئلے (فحم) کی طرح کالا ہوتا ہے۔ (غیر) یہ لفظی طرح مستعمل ہے: کبھی تو وہ اسم ہوتا ہے " الا " کے معنیٰ میں، اس وقت اسے 'الأ کے بعد واقع ہونے والے اسم کا اعراب دیا جاتا ہے تو استثنا کی بنیاد پر منصوب ہوتا ہے اور کبھی اسم بمعنیٰ "سویٰ' اور بمعنیٰ 'لیس " ہوتا ہے جیسے ' کلامك غیر مفهوم ' میں غیر بمعنیٰ 'لیس ' ہے، معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے کلام کا مفہوم نہیں ہے تو اس صورت میں اسے عوامل کے مطابق اعراب دیا جاتا ہے اور وہ کبھی اسم بمعنیٰ 'لا ' ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فمن اضطر غیر باغ ولا عاد﴾ اور 'غیر' ان سب میں حال ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے۔ اور وہ کبھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ غیر المغضوب علیهم ﴾ اور اس صورت میں اسے موصوف کے مطابق اعراب دیا جائے گا اور 'غیر' مذکورہ آیت میں مجرور ہے اس لئے کہ وہ 'الذین ' کی صفت واقع ہوا ہے جو ملازم اضافت ہے اور اگر اس کا معنیٰ معلوم ہو تو کبھی اس کو قطع کر دیا جاتا ہے اور اس سے پہلے 'لیس ' کو اس کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے جیسے قبضت عشرة لیس غیر یعنی میں نے دس لیئے اس کے سوا کچھ نہیں' اور کہا جاتا ہے 'فعله غیر مرة ' یعنی اس کو کئی مرتبہ کیا، 'عندی غیر کتاب ' یعنی میرے پاک کتاب نہیں اور کہا جاتا ہے جاء ببنات غیر ایسا ہی 'المعجم الوسیط ' میں ہے بہر حال (غیر منفحم) یہاں بمعنیٰ سویٰ ہے یعنی سوائے عاجز کے نہیں دیکھا جاتا ہے'، یا بمعنی 'الا ' یعنی نہیں دیکھا گیا مگر عاجز۔

حاصل معنیٰ: آپ ﷺ کے حسین خفیہ معانی اور روشن کمالات علمیہ کے ادراک نے تمام کائنات اور تمام مخلوقات کو عاجز کر دیا ہے تو ایسا کوئی نظر سے نہیں گزرا بلکہ ایسا کوئی سنا ہی نہیں گیا کہ وہ حضور کے کمالات کے ادراک سے عاجز نہ ہو اور حضور کے معانی کو بتانے سے ساکت نہ ہو اور ایسا کوئی دور و نزدیک میں نہیں سنا گیا کسی

بھی جگہ یا دور ونزدیک میں کسی عہد اور کسی زمانے میں نہیں دیکھا گیا۔ (قرب وبعد سے عہد وعصر اس صورت میں مراد لے سکتے ہیں جب قرب وبعد، آپ ﷺ کے دو زمانوں کا نام ہو)
اور حضور کے کمالات کے ادراک سے عاجز رہنے والے سبھی ہیں اور اس میں سب برابر ہیں عام ازیں کہ وہ حضور کی ملاقات سے مشرف ہونے والے ہوں (اور جس نے حضور کے جلوۂ زیبا کی زیارت کی وہ سعادت مند ہے) یا وہ چاہیں حضور کے طلعت زیبا کا مشاہدہ نہ کر کے حسرت میں رہ جانے والے ہوں یہ کہتے ہوئے "واشوقاہ" کہ ہائے شوق فراواں کتنا بڑا اقرب ہے یا پھر قرب و بعد مرتبہ ومنزلت کے اعتبار سے ہے یعنی آپ ﷺ کے تمام کمالات کا علم نہ ہونے اور آپ ﷺ کی علو ذات اور رفعت صفات میں متحیر رہنے کے سلسلے میں سب برابر ومساوی ہیں، اب وہ چاہیں وہ حضرات ہوں جو حال ومقام کے لحاظ سے آپ کے قریب رہے ہوں جیسے اولوالعزم رسولان کرام، مقرب ملائکہ اور حاملین عرش عظیم کہ جن کو یہ مقام وحال حاصل رہا، یا وہ چاہیں بعد والے عام انسان ہوں۔ (الزبدة ص: ٦٢)
"تذکرة القرطبی" میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا کمال حسن ظاہر نہیں کیا گیا اگر حضور کا تمام حسن ظاہر کر دیا جاتا تو صحابۂ کرام کی آنکھیں حضور کے جلوۂ زیبا کی طرف دیکھنے کی بھی تاب نہ لا سکتی تھیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

ہم بحمد اللہ تعالیٰ قصیدہ بردہ کی فصل ثالث کے اکیسویں شعر کی شرح تک آپہنچے ہیں تو اب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی فتح و نصرت سے اس کی تشریح کرنی چاہیے:

ربط: ناظم فاہم نے چاہا کہ ماسبق میں جو انہوں نے بیان کیا کہ "مخلوق حضور کی حقیقت کے ادراک سے عاجز

ہے''تو اس کی مزید وضاحت کردی جائے اور معقول کو محسوس کی طرف نکالا جائے اس طرح کہ گویا وہ اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں،تو شاعر ذی فہم اس کو یوں ادا کرتے ہیں:

(٤٩)کالشمسی تظهر للعينين من بُعد   صغيرة و تكل الطرف من أمم

(ترجمہ:۔کہ جیسے آفتاب دور سے آنکھوں کو چھوٹا دیکھائی دیتا ہے لیکن مقابل ہونے کے وقت آنکھوں کو تھکا دیتا ہے اور درماندہ کردیتا ہے۔)

تشریح: (كالشمس) یعنی هُوَ كالشمس، معلوم ہوا کہ یہ مبتدأ محذوف (هو) کی خبر ہے، (من بعد) میں 'من' بمعنیٰ 'فی' ہے اور 'بعُد' لغت کے اعتبار سے ''بُعُد'' ہے مثل قُفُل وقُفْل۔ (للعينين) میں (الف لام) برائے استغراق ہے تو حکم اولیاء واصفیا کو شامل ہے بلکہ تمام اہل بصائر، اہل ادراک انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اور تمام بادشاہوں کو عام ہے، اس کی دلیل حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے'' يا ابا بكر لم يعرفني حقيقة غير ربی'' (یعنی اے ابوبکر میرے رب کے سوا میری حقیقت کو کسی نے نہیں جانا)

اور 'للعينين' میں تثنیہ سے، عين البصر اور عين القلب کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔(تكل) 'الاكلال' مصدر سے بمعنی تھکا دینا ہے (الطرف) بمعنیٰ بصر (امم) بمعنیٰ قرب یا مقابلہ اور مشبہ کی نظر میں مقابلہ کرنے کا مطلب ہوگا توجہ کرنا یعنی آپ ﷺ کی جانب آپ کی کمال معرفت حاصل کرنے کے لئے متوجہ ہونا اور قصد و ارادے کو آپ کی حقیقت حال کا احاطہ کرنے کی جانب پھیرنا۔

شعر میں تشبیہ مقلوب

ناظم شعر کا قول (تظهر....صغيرة) یہ وجہ شبہ کو بیان کرنے کے لئے ہے یعنی آفتاب سے تشبیہ اسی معنیٰ میں ہے نہ کہ مطلق طور پر! قارئین کرام اسے تشبیہ مقلوب بنا سکتے ہیں: یعنی اس معنیٰ کے اعتبار سے اسے تشبیہ مقلوب بنایا جاسکتا ہے اگرچہ لفظ کا ظاہری معنیٰ، اس کی تائید نہیں کررہا ہے، تو معنیٰ یہ ہے کہ آفتاب ہمارے نبی مکرم ﷺ کے مشابہ ہے لیکن ہر طرح سے نہیں اس لئے کہ حضور اس سے منزہ ہیں کہ حضور کا کوئی مشابہ ہو، بلکہ آفتاب کی اس وقت

کی صورت کو آپ ﷺ کے حال سے تشبیہ دی گئی ہے جس وقت کہ آفتاب دور سے چھوٹا نظر آتا ہے اور آنکھوں کو اس کے مقابل کرنے کے وقت وہ آنکھوں کو تھکا دیتا ہے کہ آپ ﷺ کا حال بھی ظاہر و باطن میں آنکھوں کے لئے ایسا ہی ہے لیکن حقیقت میں وہ آنکھوں کو مواجہہ کے وقت تھکا دیتا ہے، گویا وہ ان کی طرف نظر کر کے بھی حضور کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں، تو اس صورت میں وہ من حیث المعنیٰ تشبیہ مقلوب میں سے ہے، جیسا کہ کسی شاعر کے اس شعر میں ہے:

بدا الصباح کانّ غرته وجه الخلیفة حین یمتدح

(صبح کے روشن ہونے کے وقت کی سفیدی خلیفہ کے چہرے کے مثل ہے جس وقت چہرے کی مدح کی جائے۔)

ناظم شعر نے یہ تشبیہ تقریب فہم کے لئے ذکر کی ہے یعنی ما سبق میں جو مخلوق کا آپ ﷺ کی حقیقت کی غایت وانتہا کے ادراک سے عجز ذکر کیا گیا ہے، اسے فہم سے قریب کرنے کے لئے یہ تشبیہ لائے ہیں ورنہ تو آپ ﷺ نور میں آفتاب سے بہت بلند ہیں بلکہ آفتاب تو آپ کے در کا محتاج ہے اور آپ ہی سے روشنی کا طلبگار ہے تو اس کی روشنی تو نبوت کے نور کے سبب سے ہے، اور ابونواس نے مشبہ بہ کا ممدوح اور مشبہ کے درجہ سے کم ہونے کی جانب اس طرح اشارہ کیا:

یتیه الشمس والقمر المنیر اذا قلنا کأنهما الامیر

لان الشمس تغرب حین تمسی و ان البدر ینقصه المسیر

(ترجمہ: روشن ومنور آفتاب ومہتاب فخر کرتے ہیں جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ دونوں امیر کی طرح ہیں (یعنی امیر کے مثل کہنے پر آفتاب ومہتاب تفاخر کرتے ہیں کہ ہمیں امیر کے مثل کہا گیا) اس لئے کہ آفتاب شام کے وقت غروب ہو جاتا ہے اور مہتاب کو گردش ایام چھوٹا اور ناقص کر دیتے ہیں (لیکن امیر کے جاہ وجلال کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے چاند کو کوئی چھوٹا کر سکتا ہے)

اور ہمارے نبی کریم ﷺ اس کے بلکہ اس سے اعلیٰ چیز کے زیادہ حق دار ہیں کہ حضور کے لئے تو مثل اعلیٰ ہے۔

شعر کا حاصل معنیٰ: آپ ﷺ اپنے اس وصف کریم میں جس کا ذکر گزر چکا کہ مخلوق آپ کی حقیقت او

رکمال معرفت سے عاجز ہے، آفتاب کی طرح ہیں کہ وہ دور سے دِکھنے میں آنکھوں کے لئے چھوٹا سا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ وہ قریب سے نظر وبصر کو تھکا دیتا ہے اور دیکھنے والے کو درماندہ کردیتا ہے۔

حضور علیہ السلام لوگوں کی نگاہوں میں

حاصل یہ ہے کہ ایک قول کی بنیاد پر آفتاب دنیا سے ایک سو کچھ گنا بڑا ہے، وہ تو محض مسافت بعیدہ کی وجہ سے چھوٹا نظر آتا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کی حقیقت اور اصلیت کو جاننے کے لئے اس کے ذرا سا بھی قریب جانے کی سوچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو حقیر اور عاجز پاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ بھی بادیٔ النظر میں افراد بشر میں سے ایک فرد نظر آتے ہیں لیکن جب انسان آپ کے جمال ذات اور کمال صفات میں غور وفکر کرتا ہے تو وہ عاجز و متحیر ہوجاتا ہے اس شعر میں آقا علیہ السلام کے اس فرمان کی جانب دقیق اشارہ ہے، کہ " اللّٰهم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا " یعنی اے اللہ مجھے میری نگاہ میں تیری عظمت کے مشاہدہ کے لئے چھوٹا دکھا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا، اپنی قدرت کے اظہار کے لئے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿ورفعنا بعضهم درجٰت﴾، مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت پاک میں بعض سے آپ ﷺ کی ذات عظیمہ وصفات مراد ہیں۔

یا پھر شعر کا معنی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اہل غفلت میں سے اغیار کی نظر میں اسرار کی وجہ سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ لیکن اہل بصیرت کی نگاہوں میں اعیان سے خلاصۃ الانسان بڑے نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وترٰهم ینظرون الیك وهم لا یبصرون﴾ یعنی ظاہر وباطن میں۔

علامہ اسماعیل حقی کی "روح البیان" میں اس فرمان باری تعالیٰ (و ترٰهم) کے تحت مذکور ہے کہ یہاں رویت بصری مراد ہے اور خطاب تمام مشرکین کے لئے عام ہے یعنی اے دیکھنے والے تو بتوں کو آنکھ سے دیکھنے والا دیکھتا ہے۔ (ینظرون الیك) یہ جملہ 'هم' مفعول سے حال واقع ہے یعنی وہ تجھے تیری طرف دیکھنے والے کی طرح لگتے ہیں اور تجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں (الی ان قال)۔ اے محمد! آپ مشرکین کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ اپنی نگاہوں سے آپ کو نہیں دیکھ رہے ہیں یعنی ایسا نہیں

دیکھ رہے جیسا کہ آپ ہیں وہ تو حقیقت میں آپ کے سامنے سے غائب ہیں اس لئے کہ اگر وہ آپ کے سامنے ہوتے تو وہ ضرور توحید کا اقرار اور رسالت کی تصدیق کرتے۔

مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا پہلا سطر یہ تھا ' بسم الله الرحمن الرحیم ' دوسری سطر لا اله الا الله تیسری سطر محمد رسول اللہ ﷺ تھا تو جب جبرئیل علیہ السلام نے وہ انگوٹھی ان کی انگلی میں داخل کی تو ان کے اصحاب انہیں دیکھ نہیں پا رہے تھے تو انہوں نے تضرع کیا آپ نے فرمایا لا الـٰـه الا اللـه محمد رسول الله ' کہو، پھر جب انہوں نے کہا تو انہیں دیکھ سکے اور انہیں خوشی ہوئی کہ رعب نے انہیں گھیر لیا پھر جب ان کے اصحاب توحید کے سمندر میں غرق ہو گئے تو ان کو استعداد حاصل ہو گئی۔

حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن سلطان محمود غازی، شیخ ربانی حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہ کی زیارت کے لئے گئے اور ان کے یہاں تھوڑی دیر قیام کرنے کے بعد بولے کہ شیخ آپ حضرت ابو یزید بسطامی کے بارے میں کیا کہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسے انسان ہیں کہ جس کسی نے بھی ان کی زیارت کی وہ راہ راست پا گیا اور ایسی سعادت سے مل گیا جو پوشیدہ نہیں، یہ سن کر محمود غازی کہتے ہیں وہ کیسے ممکن ہے جب کہ حال یہ ہے کہ ابو جہل رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کے بعد بھی سعادت مند نہیں ہوا اور اپنی بد نصیبی سے چھٹکارا نہیں حاصل کر پایا! حضرت شیخ نے پھر اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا بلکہ وہ تو محمد ابن عبد اللہ ابو طالب کے یتیم کو دیکھتا تھا یہاں تک کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو اپنی شقاوت قلبی سے چھٹکارا پا کر نیک بختی میں داخل ہو جاتا ہے، حضرت شیخ نے آگے فرمایا کہ اس کا مصداق، اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے (وترٰهم ینظرون وهم لا یبصرون) تو ماتھوں کی نگاہوں سے دیکھنا اس سعادت کو واجب نہیں کرتا بلکہ پوشیدہ نگاہ باطن اس کا باعث وسبب ہوتی ہے، تو جس نے اس نگاہ سے اور اس دل کی آنکھ سے حضرت ابو یزید کو دیکھا تو وہ سعادت مندی پر فائز ہو جائے گا۔

قال الازهری: ملا علی قاری نے 'الزبدة' میں جو افادہ فرمایا اور جس کی تصریح گزر چکی ہے وہ وجہ زیادہ خوبصورت

وملیح ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ خطاب مشرکین کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ سب کے لئے ہے اور عام ہے! اور جو حکایات 'روح البیان' میں مذکور ہے جس کا ذکر گزر چکا، وہ ہمارے موقف کی تائید کررہی ہے۔ انتھی اور ایک بات یہ کہ سیدنا ابوالحسن خرقانی کا ابوجہل کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اس نے محمد ابن عبداللہ یتیم ابو طالب کو دیکھا تھا'' اس کے اپنے اس زعم کے مطابق تھا۔ تو اس میں لفظ 'یتیم ابو طالب' محل استخفاف میں ہے جو ممنوع ہے، اس کے قائل کی تکفیر کی جاتی ہے۔ ''شفا شریف'' میں یوں تصریح آئی ہے کہ فقہائے اندلس نے ابن حاتم متفقہ طلیطلی کو قتل کرنے اور سولی دینے کا فتویٰ دیا اس لئے کہ اس کے خلاف لوگوں نے گواہی دی کہ اس نے نبیٔ کریم ﷺ کی شان میں تخفیف کی دوران مناظرہ آپ ﷺ کو 'یتیم' اور 'ختن حیدرۃ' کہہ کر پکارا۔ (الشفاء ص: ۴۵)

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ سیدنا اسماعیل حقی نے 'روح البیان' میں امور مہمہ (اہم امور) پر مشتمل کلام بیان کیا ہے، اتمام نفع کے لئے اس کا ذکر کردینا مناسب رہے گا اگرچہ مقام سے کلیۃ مناسب تو نہیں۔ سیدنا اسماعیل حقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تحریر فرماتے ہیں:

حدیث پاک میں آیا ہے " طوبیٰ لمن رآنی ولمن رایٰ من رآنی ، ولمن رأیٰ من رأیٰ من رأنی ولمن رای من رأی من رای من رأنی " یعنی سعادت مند ہے وہ جس نے میری زیارت کی اور میری زیارت کرنے والے کی زیارت کی، اور میرے زیارت کرنے والے کی زیارت کرنے والے کی زیارت کی اور میری زیارت کرنے والے کی زیارت کرنے والے کی زیارت کرنے والے کی زیارت کی)

یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اولیاء عظام کی زیارت بھی فائدے سے خالی نہیں جب کہ آنکھوں سے ہو پھر یہ بھی جاننا چاہئے کہ رویت، خواب میں جو نظر آتا ہے اور جو بیداری میں نظر آتا ہے دونوں کو شامل ہے، بعض لوگوں نے آقا علیہ السلام کے اس فرمان" من رأنی فقد رأی الحق " کے متعلق فرمایا کہ رویت مطلق ہے یعنی رویت عام ہے چاہیں وہ بیداری میں ہو یا عالم رویا میں، جس نے بھی مطلقا ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی حضور کو دیکھا تو بے شک اس نے رسول اللہ ﷺ کو ہی دیکھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

جس نے مجھے (یعنی آقا علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو بے شک اس نے رویۂ صادقہ دیکھی نہ کہ وہ رویا کہ جس میں شیطان اس سے کھیلتا ہے۔

شیخ اکمل " شرح المشارق " میں فرماتے ہیں کہ رویا صادقہ وہ ہوتی ہے جو فرشتہ دکھاتا ہے جو خواب پر مؤکل ہے اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خواب پر ایک فرشتہ مامور فرمارکھا ہے جو حکمت وامثال سے خواب دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو بنی آدم کے قصوں پر مطلع فرمادیا ہے لوح محفوظ سے، پھر بعد میں وہ وہاں سے مٹادئے گئے اور ہر قصے کی مثل بیان کردی تو جب انسان سوتا ہے وہ اشیاء بطریق حکمت اس کے سامنے تصویر بناکے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اس کے لئے یا بشارت ہو یا آگاہی ہو یا بطور عتاب ہوتاکہ وہ اپنے معاملے کو جان لے۔

جاننا چاہئے کہ تمام انبیائے کرام اس سے پاک ومحفوظ ہیں کہ شیطان ان کی شکلوں اور صورتوں پہ ظاہر ہو سکے خواب میں وہ اس لئے کہ حق باطل کے ساتھ مشتبہ نہیں ہوسکتا، فقیر (اصلحه الله القدير) عرض کرتا ہے کہ میں نے اپنے شیخ جو اپنے زمانے میں علم عرفان مین یگانۂ روزگار تھے، سے فرماتے ہوئے سنا کہ شیطان کامل اولیائے عظام کی بھی شکل اختیار نہیں کرسکتا جیسے ہر زمانے کے قطب وجود کی صورت پہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ وہ حضرات ہدایت کے مظہر تام ہوتے ہیں، ان کی خوشی میں نبی مصطفےٰ ﷺ کی خوشی ہوتی ہے، تو عاقل پر لازم ہے کہ وہ قیل و قال کو چھوڑ دے اور اعتراض کو مقام وحال پر چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ ملک متعال کے حکم کا فرماں بردار ہوجائے تاکہ وہ کامل رجال کے مقام کو پہنچ جائے اور شیطان کے مکر سے چھٹکارا حاصل کرے جو عز واجلال کی کناروں سے دور ہے اور مہدی ہونے کے بعد ہادی ہوجائے اگر یہ ہونے والا معاملہ اللہ کی قضا میں ہوتو۔ (روح البیان ۳ ر ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم ، و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے بائیسویں شعر تک ہم آپ پہنچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۰)وکیف یدرک فی الدنیا حقیقتہ قوم نیام تسلوا عنہ بالحلم

(ترجمہ: وہ خوابیدہ قوم کیوں کر حقیقت محمدیہ کو دنیا میں جان سکتی ہے جو آپ کی حقیقت سے بے فکر خواب غفلت میں سورہی ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے جب گزشتہ اشعار میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کے ادراک سے عاجز ہونے کا بیان کردیا تو اب وہ اس عجز کی علت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسی مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں:

وکیف یدرک فی الدنیا حقیقتہ قوم نیام تسلوا عنہ بالحلم

تشریح: (کیف) حال وکیفیت کا سوال کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، اور وہ یہاں برائے استفہام انکاری ہے۔

(یدرک) بمعنیٰ تصور کرنا، حقیقت تک پہنچنا یعنی کیسے تصور کرے، کیسے حقیقت تک پہنچے (فی الدنیا) اس دنیا میں جو ارواح اور اس کے معارف کے درمیان ایک حجاب عظیم ہے، ارواح کا اجسام مظلمہ کے قالبوں میں ڈھل جانے کی وجہ سے۔

(حقیقتہ) آپ ﷺ کی حقیقت کو یعنی آپ کے کمالات ظاہرہ اور باطنہ حقیقت کے ساتھ بطریق تفصیل۔ ناظم شعر کا یہ قول (فی الدنیا) متعلق ہے (یدرک) سے۔

"الذخر و العدۃ" میں بیان کیا گیا ہے کہ عدم ادراک کو دنیا کے ساتھ مقید کرنے میں اس جانب اشارہ ہے کہ آخرت میں مقام محمود اور وسیلۂ عظمیٰ اور درجۂ علیا پہ ادراک ہوگا۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ عدم ادراک کو دنیا کے ساتھ اس لئے مقید کیا گیا کہ حقیقت محمدیہ کا خفا اور کمالات احمدیہ کا پوشیدہ ہونا، دنیا کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے کہ آخرت میں سبھی کے مراتب و درجات ظاہر کر دیئے جائیں گے، یہی وجہ ہے کہ مومنین آخرت میں اپنے رب کو بلا کیف و مکان دیکھیں گے، اسی لئے صاحب الامالی نے فرمایا ''مومنین خدا کا دیدار بلا کیف کریں گے'' اس لئے کہ آخرت میں آنکھیں دوسری حالت میں تبدیل ہو جائیں گی، اسی وجہ سے بعض عارفین نے فرمایا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی رویت کا دنیائے فانی میں ممتنع ہونا اسی وجہ سے ہے کہ باقی کو صرف باقی رہنے والی آنکھوں ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

(قوم) بالرفع، " يدرك "کا فاعل ہے، (نیام) بکسر النون، " نائم " کی جمع ہے اور 'نوم' اصل میں کہتے ہیں شعور کا زائل ہو جانا، اعصاب دماغ کے نرم ہونے کے سبب جوان رطوبات البخریہ (بھانپ نما گرم رطوبات) کی وجہ سے ہوتا ہے جو دماغ پر چھڑتی ہیں لیکن یہاں اس کا لازم معنیٰ مراد ہے یعنی غفلت، مجاز مرسل کے طور پر۔

(تسلوا عنه) یعنی آپ ﷺ کے کمالات کی حقیقت کے ادراک سے قناعت کی انہوں نے (بالحلم) یعنی اس آسان چیز سے جس کو وہ دنیا میں اس سے دیکھتے ہیں یا تو آنکھوں سے یا اس بیان شبیہ سے جس کو سونے والا دیکھتا ہے یا پھر آخرت میں جہاں پہ تمام مخلوق کے لئے آپ ﷺ کی کمال کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ 'حلم' اس کی اصل سکون ہے، لیکن اس پر ضمہ کا ہونا ایک لغت میں ہے جس کا بیان لفظ 'عقم' کی تشریح میں گزر چکا ہے۔

شعر کا حاصل معنیٰ: بے شک غافل قوم آپ کی حقیقت کا دنیا میں ادراک نہیں کر سکتی جو اپنے خیال پر قناعت کی ہوئی ہے اور خواب میں حضور کی صورت دیکھ کر تسلی کیئے ہوئے ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے آپ کی صورت بشریہ اور آپ کے افعال نفسیہ کی رویت اور شواغل حسیہ کی ظلمات پر نظر کو روک رکھا ہے اور ان کی نگاہ اسی پر محدود ہے، انہوں نے بصیرت کی نگاہوں سے آپ کی ذات کے لباس سے آپ کا انسلاخ کلی، اور آپ کی علیحدگی کو نہیں جانا اور نہ ہی انہوں آپ کے صفات کے مقادر کو جانا، آپ کے افعال کا افعالِ حق میں اور آپ کی صفات کا صفاتِ حق میں فنا ہونے کے ساتھ اور نہ ہی انہوں نے روح القرب کی خوشبوؤں کو سونگھنا جانا اور انہوں نے اس کا

ادراک بھی نہ کیا کہ حضور اسرار وحدانیہ کے مشاہدے پر قائم ہو کر کتنا خوش ہیں اور نہ جانا کہ حضور حضرات جبروتیہ کے غیوب کے عبور پر خوش ہیں تو لوگ خواب غفلت میں سوئے ہوئے ہیں موت کے ذریعہ جب وہ ان خوابوں سے بیدار ہوں گے تو ان کی آنکھوں سے تاریکیوں کے پردے اٹھ جائیں گے اوران کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور وہ ناسوتی قیود سے آزاد ہو جائیں گے اور دست ندامت سے، حقیقت لاہوتیہ کے چہرے سے غیریت کے پردے کو اٹھائیں گے اور حضرت احدیہ کے باغوں سے ذات احمدیہ کی وحدانیت کی خوشبوئیں سونگھیں گے یعنی حقائق کی حقیقت کے چہرے سے نقاب نہیں اٹھتا ہے مگر اثنینیت کی تاریکی اور علائق کی قیود کو علیحدہ کر کے، اس لئے کہ اس کند خاطر کے لئے لذت سماع کی تعریف جواس کے ذوق کو نہیں پاسکتا ہو اور زکام زدہ کے لئے خوشبو سونگھنا یہ دونوں چیزیں جملہ محالات میں سے ہیں تو اسی طرح آفتاب کو صرف وہی پہچان سکتا ہے جس نے اسے دیکھا ہو۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے تیئسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۱) فمبلغ العلم فيه انه بشر و انه خير خلق الله كلهم

(ترجمہ: ۔حضور ﷺ کے سلسلے میں ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ حضور بشر ہیں اور یہ کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سب سے افضل ہیں۔)

تشریح: (فمبلغ) بمعنیٰ انتہائے علم یعنی مخلوق کا علم، تو 'العلم' پہ الف لام عہد خارجی کا ہے یعنی مخلوق کا علم حضور کے صفات وکمالات کے بارے میں (فيه) یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی ذات کے بارے میں، اور ظرف یا تو ''

علم'' کی صفت ہے یا اس سے حال واقع ہے۔ (انه) میں ہٗ کی ضمیر سے حضور نبی اکرم ﷺ مراد ہیں۔ (بشر) یعنی انسان اور انسان کو بشر، بشرہ (یعنی کھال) اور جلد کے ظاہر ہونے کی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے۔ (انــه خيـر خلق الله كلهم) یعنی حضور تمام مخلوقات سے افضل ہیں وہ چاہیں انس و جن ہوں یا فرشتے۔ اور یہ جملہ محل خبر میں ہے، 'ان' پر عطف ہے اور اس کے مدخول کے بارے میں بیان گزر چکا۔

'الـذخر والعدة' میں مذکور ہے کہ شعر میں اس جانب اشارہ ہے کہ تمام لوگ بشریت میں مشترک اور مساوی ہیں لیکن معارف اور خصائص جمیلہ میں حضور سب سے ممتاز اور منفرد ہیں تو مصنف نے پہلے مصرع میں اشارہ کیا کہ حضور بشر ہیں اور نوع بشر کے تمام افراد بشریت میں مشترک ہیں، لیکن انہوں نے دوسرے مصرعے میں اجمالاً بیان کیا کہ حضور ﷺ تمام مخلوق میں سب سے بہتر و افضل ہیں۔

شعر کا حاصل معنیٰ : ان خوابوں کی ارتقا اور نبی کریم ﷺ کی معرفت کے مدارج کی انتہا یہ ہے کہ آپ افضل البشر اور خلق الٰہی میں سب سے بہتر ہیں اور تمام مخلوق اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کے قرب کی انتہا کو نہیں جان سکتی اور نہ ہی آپ کی مقام جمع اور رویئت میں آپ کی انفرادیت کا ملاحظہ کرسکتی ہے کہ حدیث میں آیا' بعين الله و سماعه بسماعه' ختم شد

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کے چوبیسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۲) وكل آى اتى الرسل الكرام بها　　　فانما اتصلت من نوره بهم

(ترجمہ: اور وہ تمام معجزات جو دیگر رسولان کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام لے کر تشریف لائے تو وہ تو ان کو ہمارے حضور

کے نور کے وسیلے سے ہی ملیں ہیں۔)

تشریح: (وکل آی) میں "آی" یہ آیت کی جمع ہے بمعنیٰ معجزہ وکرامت (أتی) بمعنیٰ 'جاء' (الرسل) بسکون السین، بطور تخفیف، نہ کہ بطور تشدید رسول کی جمع ہے، اور اس پر الف لام استغراقی ہے۔ (الکرام) یہ 'کریم' کی جمع ہے بمعنیٰ مکرم، اور کرامت کہتے ہیں اس کو جو معجزے کے ذریعہ رسالت کی صحت پر دلالت کرے۔ اور انبیائے کرام کو کرامت سے موصوف کرنے کی وجہ، ان کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں مکرم ہونا ہے اور یہ صفت مادحہ ہے جو برائے تاکید ہے۔ (بھا) یعنی ان معجزات کے ساتھ (یعنی 'ھا' کی ضمیر راجع ہے 'آی' کی جانب)۔ (فانما) برائے افادۂ حصر ہے، اور 'انما' پر 'فا' اس لئے داخل کیا گیا تاکہ مبتدا، معنیٰ شرط کو متضمن ہو۔ (اتصلت) بمعنیٰ ملنا یعنی وہ معجزات ملے۔

اور یہ کرامات ومعجزات تو انوار ہیں جس کے ذریعے مخلوق، کمالات کی طرف رہنمائی حاصل کرتی ہے اور ناظم شعر نے رسولان کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات پر اس لئے اکتفا کیا کیوں کہ رسولان کرام کے معجزات ہی اشرف المخلوقات کے کمالات کی بنیاد ہیں۔

(من) ابتدائیہ ہے۔ (نورہ) میں 'ہ' کی ضمیر سے نبی کریم ﷺ مراد ہیں۔ (بھم) یعنی وہ معجزات رسولان کرام کو آپ ﷺ کے نور سے بطریق استمداد حاصل ہوئے ہیں اور وہ اس لئے کہ آپ ﷺ کے نور کی حضرت آدم صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ سے پہلے بلکہ تمام مخلوقات سے پہلے تخلیق ہو چکی تھی یعنی آسمان اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین اور اس پر جو کچھ ہے وغیرہ ذالك سب سے پہلے حضور کا نور مخلوق تھا، جیسا کہ اس پر اخبار صحیحہ اور نصوص صریحہ دال ہیں اور پھر وہ نور حضرت آدم وحوا کی طرف منتقل ہو گیا اور اسی طرح پاک صلبوں اور پاک ومصفیٰ رحموں میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ حضرت سیدنا عبداللہ اور حضرت سیدہ آمنہ کی جانب منتقل ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم ، و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث سے پچیسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۳)فانہ شمس فضل ھم کواکبھا　　　　یظھرن انوارھا للناس فی الظلم

(ترجمہ:اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ آفتاب فضل وکرم ہیں اور باقی سارے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس آفتاب کے ستارے ہیں جو تاریک رات میں لوگوں کے لئے آفتاب نبوت ورسالت کی روشنیاں ظاہر کرتے ہیں۔)

تشریح:۔ (فانہ) میں 'ہ' کی ضمیر سے رسول اللہ ﷺ مراد ہیں، اور 'فا' سببیہ ہے یا تعلیلیہ (شمس فضل) یعنی آپ ﷺ کے کمالات وفضائل، خوب روشن ومنور کرنے میں مثل آفتاب کے ہیں اور 'شمس' کی اضافت فضل کی جانب، اضافۃ الصفۃ الی موصوفھا' کی قبیل سے، اختصاص میں مبالغہ کے لئے ہے اور موصوف کی اضافت اس کی جانب جس سے وصف مشتق ہوتا ہے، ثبوت میں مبالغہ کے لئے ہوتی ہے اور وہ اس لئے ہے تا کہ اس کی جانب صرف اختصاص اور اشتہاد کے لئے ہی اضافت ہو۔

(ھم) یعنی رسولان کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام۔(کواکبھا) یعنی حضور اکرم ﷺ کے فضل وکرم کے سورج کے ستارے (یظھرن) یعنی وہ ستارے اور وہ نجوم ظاہر کرتے ہیں۔ (انوارھا) یعنی آپ ﷺ کے شمس فضل کی روشنیاں۔(للناس فی الظلم) یعنی لوگوں کے لئے زمانۂ جاہلیت وگمراہی میں جو تاریکی وظلمت کے مشابہ ہے۔

حاصل معنیٰ : رسولان کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار کو ہمارے نبی اکرم ﷺ کے انوار سے ایسی نسبت ہے جیسی تاریک رات کے ستاروں کی روشنی کو یعنی مہتاب وغیرہ کی روشنی کو آفتاب کی روشنی سے نسبت ہوتی ہے،

اس اصول کے سبب اول، ثانی سے استمد اد کرتا ہے اور کواکب کا نور، آفتاب کے نور سے مستفاد ہوتا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ علم ہیئت میں ثابت شدہ اصول کے مطابق کواکب ایسے اجسام ہیں جو بذات خود روشن نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ تو ایسا صاف وشفاف مادہ اور جسم ہوتے ہیں جو غیر کی روشنی کو قبول کرتے ہیں اور جسم آفتاب، جسم دنیا سے بہت بڑا ہوتا ہے تو آفتاب جب زمین کے نیچے غائب ہوجاتا ہے تو اس وقت اس کی روشنی زمین کے چہار جانب پھیل جاتی ہے پھر روشنی بلندی کی جانب بڑھنا چاہتی ہے اپنے نور ہونے کی وجہ سے اور اس کے بعد وہ روشنی ان اجسام نجوم سے مل جاتی ہے جو صاف وشفاف اور اس کے بالمقابل ہوتے ہیں پھر وہ روشنی ان کواب میں ڈھل جاتی ہے اور نقش ہوکر تاریکی وظلمت میں روشنی کرتی ہے اور سورج کی روشنی کو شب تاریک میں بکھیرتی ہے، آفتاب کی روشنی میں کچھ کمی آئے بغیر۔

تو جس طرح سورج تمام کواکب سے افضل ہوتا ہے اسی طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ تمام انبیائے کرام سے افضل ہیں اور اور جس طرح آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو ستاروں میں روشنی باقی نہیں رہ جاتی اسی طرح جب ہمارے نبی کریم ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو کسی بھی رسول کی کوئی شریعت باقی نہیں رہی بلکہ آپ کی شریعت نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا اور آپ کے نور کے سامنے سب کے نور نہ رہے (آپ کے نور کے سامنے سب کے انوار باقی نہ رہے) تو آپ ﷺ ان سب انبیائے کرام کے سلطان اکبر اور رئیس افخر ہیں اور ان کی جنس عالی ہیں۔، تو آپ ﷺ علم الرسالت اور تاج نبوت ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ و الہ وسلم و شرف وکرم۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے چھبیسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٥٤)اکرم بخلق نبی زانه خلق　　　بالحسن مشتمل بالبشر متسم

(ترجمہ: حضور نبیٔ رحمت کا ظاہری جسد مبارک کتنا مکرم اور حسین وجمیل ہے، مزید جس کو خوش اخلاقی اور حسن سیرت نے مزین کررکھا ہے، صورت ظاہری تو حسن پر مشتمل ہے اور حسن سیرت خندہ پیشانی سے متصف ہے۔)

تشریح: (اکرم) صیغۂ تعجب ہے، (بخلق) یعنی صورت، (نبیّ) وہ نبی جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام مخلوق سے افضل واکرم کیا، "نبی" کی تنوین برائے تعظیم ہے، اور "خلق" کی اضافت، "نبی" کی جانب اضافة المصدر الی مفعوله، کی قبیل سے ہے۔ (زانه) 'الزین' مصدر سے بمعنیٰ آراستہ کرنا، 'شین' بمعنیٰ عیب لگانا، کی ضد ہے۔ (خُلقٌ) بالرفع، "زان" کا فاعل ہے اور خُلق سے مراد اوصاف روحانیہ اور اعراض نفسانیہ ہیں، مفرد ذکر کرکے، جمع مراد لینے کے اعتبار سے ہے۔ جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے ﴿وانك لعلی خلق عظيم﴾ یا پھر مفرد ذکر کرکے جنس مراد لینے کے اعتبار سے ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان عالیشان میں ہے ﴿و ان تعدوا نعمه الله لا تحصوها﴾ اور 'زانه خلق' یہ پورا جملہ یا تو خلق کی صفت ہے یا 'نبی' کی۔ بہر دو صورت فائدہ اس میں یہ ہے کہ حضور کے کمال حسن صورت بیان کرنا ہے حسن سیرت کے شمول کے ساتھ، اسی وجہ سے ناظم نے کمال حسن صورت پر، کمال حسن سیرت کو زائد کیا۔

(بالحسن) یہ متعلق ہے "مشتمل" مؤخر سے، حصر کا فائدہ دینے کے لئے اس کو مقدم لائے 'الحسن' میں الف لام استغراقی ہے، معنیٰ یہ ہے کہ حسن کی تمام قسمیں ہمارے نبی کریم ﷺ کی ذات میں منحصر ہیں نہ کہ کسی اور میں (مشتمل) بالجر "نبی" کی صفت ہے یعنی صفت کے بعد صفت ہے یعنی صفت ثانی ہے اور یہ 'الاشتمال' مصدر سے اسم

فاعل کے صیغہ پر بمعنیٰ احاطہ کرنا، اکٹھا ہونا۔
" العمدة " میں مذکور کیا گیا ہے کہ ظرف " مشتمل " سے متعلق ہے اور وہ جر کے ساتھ "نبی" کی صفت ہے ﷺ یا "خلق" کی صفت ہے معنی یہ ہوگا کہ حسن حضور کے لئے مثل لباس کے ہوگیا اور وہ حسن محیط اور مجتمع ہے حضور میں یعنی وہ لباس حسن حضور زیب تن فرمائے ہوئے ہیں۔ نیز اس صورت میں اس جانب اشارہ ہے کہ حسن تمام جہتوں اور سمتوں سے حضور کو عام ہے۔
(بالبشر) ۔ 'بشر' کا معنی ہوتا ہے چہرے کی بشاشت، خندہ پیشانی، مسرتوں سے چہرے پر رونق ہونا اور ظرف متعلق ہے " متسم " سے، جو 'الاتسام' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، بمعنیٰ خوب روئی سے متصف ہونا، اور بمعنیٰ علامت آتا ہے یعنی معلم اور یہ بھی مجرور اور "نبی " کی دوسری صفت ہے۔
حاصل معنیٰ: حضور نبی اکرم ﷺ کی صورت ظاہری کتنی حسین وجمیل ہے کہ حسن سیرت نے مزید اس کو حسین وجمیل کر دیا ہے اور وہ سیرت مبارکہ تو کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے متصف ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٔ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کے ستائیسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۵۵) كزهر فی ترف و البدر فی شرف — والبحر فی كرم و الدهر فی همم

(ترجمہ:۔ حضور مثل پھول ہیں خوبصورتی اور آسائش میں، مثل بدر کامل ہیں شرف و بزرگی میں، مثل بحر بیکراں ہیں کرم و سخاوت میں، اور مثل زمانہ و دہر ہیں حوصلے اور عزم میں۔)

تشریح:۔ (کالزهر) " الزهر " جنس جمعی ہے، اس کا واحد زهرة آتا ہے (بمعنیٰ خوشنما کلی) اور یہ ظرف

محذوف سے متعلق ہوکر" نبی "کی دوسری صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی نرم ونزاکت جسم اور تروتازگی جسم اور اس کی پاکیزہ خوشبو میں (مثل خوشنما کلی کے ہیں)

(البدر) یعنی چودھویں رات کا چاند، اس کا " الزھر " پرعطف ہے۔(فی شرف) یعنی مقام ومرتبے کی بلندی اور رونق وبہار کے حسن وجمال میں (مثل بدر کامل ہیں) اور بدر کامل کی بزرگی رات کے تمام ستاروں پر ایسی ہے جیسے نبیٔ اکرم ﷺ کی تمام رسولان کرام پر بزرگی ہے۔ تو یہ دونوں وصف (یعنی زھر اور بدر) حضور کی ظاہری صورت اور خلق ظاہری کی جانب راجع ہیں جو حسن پر مشتمل ہیں۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: پھر جاننا چاہیۓ کہ 'بدر' حضور علیہ السلام کے اسماء میں سے ہے اور حضور علیہ السلام کو بدر کامل سے اس لئے تشبیہ دی جاتی ہے کہ بدر سے تشبیہ دینا اہل عرب کے نزدیک شمس وقمر سے زیادہ فصیح وبلیغ ہے، قمر سے زیادہ بلیغ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ 'بدر' وہ چاند کے کامل ہونے کا وقت ہے یعنی کامل اور پورے چاند کو 'بدر' کہتے ہیں نہ کہ 'قمر' کو! اور 'شمس' سے ابلغ ہونے کی وجہ بیان کی جاچکی ہے کہ بدر کامل اپنی روشنی سے زمین کو بھر دیتا ہے اور اپنے دیکھنے والے کو مانوس کرتا ہے اور اس کی جانب بآسانی نظر کرسکتے ہیں برخلاف شمس کے کہ وہ نگاہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور رویت کو روک دیتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

كالبدر و الكاف لو انصفت زائدة   فلا تظنن فيه الكاف للشبة

(ترجمہ: حضور مثل بدر کامل ہیں، تو اگر تو منصف ہے تو " کالبدر " کے کاف کو زائد جانے گا، ہرگز تو 'کالبدر' میں کاف کو تشبیہ کا گمان نہ کرنا (بلکہ وہ تو زائدہ ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ علماء نے فرمایا ہے کہ آقا علیہ السلام کے اوصاف مبارکہ کے سلسلے میں وارد تشبیہات تو صرف شعرائے عرب کی عادت کے طور پر ہیں ورنہ تو کوئی شئی ایسی نہیں جو حضور کے صفات خَلقیہ اور خُلقیہ کے برابر ہوسکے۔ انتھیٰ

(البحر) اس کا " الزھر " یا " البدر " پرعطف ہے، (فی کرم) یعنی رسول اللہ ﷺ جود وبخشش اور

منفعت (نافع شئی) عطا کرنے میں بحر ناپیدا کنار کے مثل ہیں اس لئے کہ جس طرح سمندر موتی، مرجان اور بہت سارے جواہرات انسان کو عطا کرتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی عطا فرماتے ہیں، بلکہ احادیث کثیرہ اور اخبار وغیرہ سے حضور اکرم ﷺ کا جود و کرم ثابت شدہ ہے، انہی میں سے حضرت انس کی یہ حدیث مرفوع ہے: " انا اجود بنی آدم " کہ میں بنی آدم میں سب سے بڑھ کر سخی ہوں، اور امام مسلم کی روایت میں یوں آیا ہے " ماسئل رسول الله ﷺ شيئا الا اعطاه فجاء رجل فاعطاه غنما بين جبلين، فرجع الى قومه ، فقال يا قوم اسلموا ، فان محمدا يعطى عطاء من لايخاف الفقر " !یعنی رسول اللہ ﷺ سے جو بھی چیز مانگی جاتی حضور اس کو ضرور عطا فرماتے حتی کہ ایک شخص حاضر بارگاہ ہوا تو حضور نے اس کو دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریاں عطا فرمادیں پھر وہ شخص لوٹ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اے میری قوم کے لوگوں اسلام قبول کر لو اس لئے کہ حضرت محمد (ﷺ) اس معطی کی طرح عطا فرماتے ہیں جسے تنگدستی کا اندیشہ نہیں رہتا! اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت صفوان کو حنین کے دن اونٹوں اور نعمتوں سے بھری ہوئی وادی عطا فرمادی۔ حضرت ابن جابر کی خوبی اللہ ہی کے لئے ہے کہ انہوں نے کتنی اچھی بات کہی:

هذا الذی لا يتقی فقرا اذا يعطی ولوكفرا لانام و داموا
واد من الانعام اعطىٰ آملا فتحيرت لعطاء ه الاوهام

(یہی ہیں وہ کہ جب دینے پہ آتے ہیں تو تنگ دستی کی فکر اور پرواہ نہیں کرتے اگر چہ لوگ ان کو جھٹلاتے ہیں مویشی جانوروں سے مملو گھائی، خواہش مند کو عطا فرمائی کہ ایسی بخشش و عطا پر عقلیں متحیر و پریشان ہو جاتی ہیں)

اور امام بخاری کی روایت میں حضرت انس سے مروی ہے کہ آقا علیہ السلام نے حضرت عباس کو اتنا سونا چاندی عطا فرمایا کہ ان کے پاس اس کو اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔

اور ناظم شعر کا قول (الدهر) یعنی زمانہ بمعنیٰ اہل زمانہ ہے اور (همم) 'همة' کی جمع ہے بمعنی قوت عزم، معنی یہ ہوگا کہ جملہ عزم و ہمت، حضور اکرم ﷺ کی ہمتوں اور حوصلوں سے ہے اہل زمانہ کی ہمتوں کی طرح بلکہ اس سے

بھی بڑھ کر۔

لـــہ هــمــم لا مــنتهــی لـکبــارهــا　　　وهــمتـــه الــصـغری اجل مـن الـدهـر

لـــه راحة لـو ان مـعشـــار جـودهـــا　　　عـلــی البـر کـان البر اندی من البحـر

(حضور کی عظیم ہمتوں کی تو کوئی انتہا ہی نہیں کہ حضور کی چھوٹی اور صغیر ہمت کا عالم یہ ہے کہ زمانے سے بڑھ کر ہے حضور کے جود وکرم فرمانے والے کف مبارک کا عالم یہ ہے کہ اگر ان کے دست مبارک کی جود وبخشش کا دسواں حصہ بھی خشک زمین پر ہو جائے تو یہ سوکھی زمین، سمندروں سے زیادہ تر ہو جائے اور نعمتوں سے مملو ہو جائے۔)

حاصل یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا عزم وحوصلہ اور ہمت تمام حوصلوں اور تمام لوگوں کی ہمتوں سے اعلیٰ اور بڑھ کر ہے۔ اور حضور کی اپنی ہمتوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ حضور نے جنگ حنین کے موقعہ پر کفار کی جانب سے بھیجے ہوئے خچروں کو روک دیا جس وقت کہ لوگ ان سے ڈر کر منتشر ہو رہے تھے یہاں تک کہ حضور نے کنکریاں پھینک پھینک کر کفار کو شکست دی اور حضور یہ فرماتے جاتے کہ انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب.

جیسا کہ مسلم شریف میں بھی ہے کہ امام مسلم نے حضرت براُ سے روایت کی کہ وہ فرماتے ہیں کہ باخدا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس پہونچ کر شدت اور سختی کے زیادہ ہونے کے وقت اپنی حفاظت کرتے تھے اور آپ کی برکت سے مدد ونصرت کے طلب گار ہوتے تھے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نـحـمـدهٔ و نـصـلـی و نسـلـم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث سے اٹھائیسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۵)کـــانـــه وهــو فــرد فی جـلالتـه　　　فــی عسکــر حیـن تـلقـاه وفی حشم

(ترجمہ:۔حضور اکرم ﷺ اکیلے اور تنہا ہونے کی حالت میں بھی اپنے جلال و ہیبت کی وجہ سے ایسے معلوم دیتے ہیں کہ گویا حضور لشکر جرار میں موجود ہیں اور اے مخاطب! جب تم حضور سے ملتے تو تمہیں لگتا ہے کہ حضور تنہا نہیں بلکہ ایک قافلے میں ہیں۔)

ربط: شاعر ذی فہم گزشتہ شعر میں جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشاشت وخندہ پیشانی اور زیادتی جودوکرم کی صفت بیان کر چکے تو اب وہ اس شعر میں حضور کی کمال ہیبت وجلال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کانہ وھو فرد فی جلالتہ فی عسکر حین تلقاہ وفی حشم

تشریح: (کانہ) یعنیٗ ہٗ کی ضمیر سے حضور مراد ہیں یعنی گویا کہ نبیٔ اکرم ﷺ (وھو فرد) یہ جملہ حال واقع ہے مطلب یہ ہے کہ حضور اپنے غلاموں اور فرماں برداروں سے الگ اور تنہا ہونے کی حالت میں۔(فی) سببیہ ہے یا ظرف ہے اور ایک نسخے میں 'فی' کے بجائے "من" آیا ہے جو برائے تعلیل ہے۔(جلالتہ) یعنی اپنی ہیبت وعظمت کی وجہ سے (فی عسکر) یعنی کثیر التعداد، عظیم لشکر جو آپ کے ساتھ خاص ہو۔(حین تلقاہ) مطلب واضح ہے (یعنی اے مخاطب! جب تم حضور سے ملتے)۔(وفی حشم) یعنی آپ کے خاص خدمت گزار۔

حاصل معنیٰ: گویا کہ آپ ﷺ حالت تنہائی اور علیحدگی میں بھی ایسے معلوم دیتے ہیں کہ آپ گویا ایک لشکر جرار اور ایک جیش عظیم کے وسط میں کھڑے ہیں، اپنی کمال ہیبت اور اپنی شان وشوکت کے جمال کی وجہ سے اور اے مخاطب اگر تم حضور کو ملاحظہ کرتے تو تمہیں لگتا کہ حضور ایک قافلے اور کثیر لوگوں کے ہجوم میں موجود ہیں۔

حضور کی کمال شجاعت کی مثال: روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوجہل ایک یتیم بچے کے مال کا نگراں تھا تو وہ یتیم ایک دن برہنہ اپنا مال مانگنے اس کے پاس آیا تو اس بدبخت نے اسے بھگا دیا اور مال نہ دیا! بچہ مایوس ہوا تو اکابر قریش نے اس سے کہا کہ ''تم محمد (ﷺ) سے کہہ دو کہ تمہاری سفارش کر دیں!! اور ان کا مقصد صرف استہزا کرنا تھا! یتیم بچہ یہ بات نہ جان سکا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر ہو کر ملتمس ہوا اور ہمارے حضور ﷺ کا

عالم یہ تھا کہ کسی بھی محتاج اور سائل کو نا امید نہ لوٹاتے تھے تو حضور اس کے ساتھ ابوجہل کے پاس تشریف لے گئے، حضور کو تشریف لاتا دیکھ وہ حضور سے مرعوب ہو کر کھڑا ہو گیا اور فوراً یتیم کا مال لوٹا دیا پھر قریش نے اسے عار دلایا کہ کیا تو نے اپنا دین بدل لیا؟ کہتا ہے نہیں با خدا میں نے اپنا دین و مذہب نہیں بدلا بلکہ ہوا یہ کہ مجھے محمد (ﷺ) کے دائیں بائیں نیزہ بردار نظر آئے تو میں گھبرا گیا کہ اگر میں نے اس یتیم بچے کا مال نہ دیا تو یہ مجھے مار ڈالیں گے۔

اسی طرح ایک اور روایت بیان کی جاتی ہے کہ شہر مکۃ المکرّمہ میں ایک طاقتور شخص رہتا تھا جو فن کشتی میں ماہر تھا، اس کا نام 'رکانہ' تھا لوگ دور دور سے اس سے کشتی سیکھنے آتے تھے اور وہ انہیں کشتی سکھاتا تھا، تو ایک دن مکہ شریف کی کسی گھاٹی پر اس کی ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوگئی، تو حضور نے اس سے فرمایا کہ ''اے رکانہ تو اللہ سے ڈر کر اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کرتا، جس کی طرف میں تجھے بلاتا ہوں'' تو رکانہ بولا اے محمد (ﷺ) کیا تمہارے پاس اس کی صداقت پر کوئی شاہد اور دلیل ہے، تو اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر میں تجھے کشتی میں پچھاڑ دوں تو کیا تو ایمان لے آئے گا، اللہ اور اس کے رسول پر؟ بولا 'ہاں' حضور نے فرمایا کہ پھر کشتی لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، بولا میں تیار ہوں، تو رسول اللہ ﷺ اس سے قریب ہوئے اور اسے پکڑ کر فوراً چت کر دیا، یہ دیکھ کر 'رکانہ' بہت متعجب ہوا اور دوبارہ لڑنے کے لئے کہنے لگا، تو حضور نے اسے دوبارہ اور پھر سہ بارہ پچھاڑ دیا، رکانہ تھوڑی دیر تک سخت متعجب ہو کر ٹھہرا رہا اور پھر یہ کہہ کر چل دیا کہ حضور آپ کی شان عجیب ہے۔!!

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم ، و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

بحمداللہ تعالیٰ ہم قصیدۂ مبارکہ کی فصل ثالث کے انتیسویں شعر تک آ پہنچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۷)کانما اللؤلؤ المکنون فی صدف　　من معدنی منطق منہ و مبتسم

(ترجمہ:۔گویا(حضور کا کلام اور دندان مبارک) صدف یعنی سیپ میں موجود دریتیم کے مثل ہے جو آپ کے قلب مبارک (منطق) اور دہن مبارک (مبتسم) کی دو کانوں اور معدنوں سے حاصل کیا گیا ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم جب حضور اکرم ﷺ کی شجاعت وغیرہ میں انفرادیت اور تمام بہادروں پر حضور کی فضیلت اور امتیاز کو بیان کر آئے ،تو اب وہ عاشقوں کو حضور نبیٔ اکرم ﷺ کی خصوصیات پر آگاہ کرا دینا چاہتے ہیں جیسے حضور کے چہرۂ مبارک کی خندہ پیشانی اور بشاشت کا ہمیشہ رہنا، اور حضور کے تکلم اور تبسم فرماتے وقت چہرۂ مبارک کے منظر کا حسن کیا تھا اور یہ کہ حضور سخت کلامی اور سخت مزاجی سے لوگوں میں سب سے زیادہ دور ہیں اور چہرۂ مبارک کو ہمیشہ پر رونق رکھنے والے ہیں نیز وہ حضور اکرم ﷺ کی بے مثال شجاعت و بہادری اور دلیری کو بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں اسی لئے وہ بارگاہ رسالت میں یوں عرض کرتے ہیں:

کانما اللؤلؤ المکنون فی صدف　　من معدنی منطق منہ و مبتسم

یہ صفت سادسہ ہے نبیٔ اکرم ﷺ کی اس میں ناظم فاہم نے کلام کے اسلوب کو تشبیہ مقلوب پر جاری کرنے کے لئے بدل دیا ہے اور گزشتہ اشعار میں وہ تشبیہات کو ان کے اصل پر اس لئے لائے تھے تاکہ اس پر تنبیہ ہو کہ جو تشبیہات مذکور ہوئیں وہ معنیً تشبیہ مقلوب کی قبیل سے تھیں۔ جیسا کہ یہاں اس شعر میں جو تشبیہ ذکر ہوئی وہ لفظاً صریح مقلوب کی قبیل سے ہے اور تشبیہ مقلوب، اصل تشبیہ سے اس لئے احسن اور ابلغ ہوتی ہے کہ وہ وجہ تشبیہ کی قوت میں فرع کی اصلیت اور خوبی کو بیان کرتی ہے، اسی وجہ سے وہ فرع میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو گویا فرع اصل ہے

اوراصل فرع اورتشبیہ مقلوب جیسا کہ قارئین جان رہے ہوں گے کہ وصف میں زیادہ بلیغ اور دل میں زیادہ اثر انگیز ہے۔

تشریح: (کأنَّ) برائے تشبیہ ہے۔(ما) کافه عن العمل ہے(یعنی عمل نہیں کرتا) (اللؤ لؤ) بمعنیٰ سفید موتی لوئلوئ پر سفید پتھر کا اطلاق اس کے " متــلألأ یعنی روشن اور چمکدار ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ یہ آگے آنے والی خبر کا مبتدا ہے،(مـن معدنی منطق) یعنی (وہ درابیض) کلام کے معدن اورخزانے سے مستخرج اورحاصل کیا گیا ہے۔(الـمـكـنـون) بـالـرفـع " الـلـؤلؤ" کی صفت ہے بمعنیٰ مستور، پوشیدہ،محفوظ۔ (صدف) "اللؤلؤ" کاظرف ہےعلامہ حیاتی نے" شرح التحفة" میں ذکرفرمایا ہے کہ صدف (یعنی سیپ) ایک سمندری جانور ہے جو ملک ہند اور چین کے سمندر میں زیادہ پایا جاتا ہے، جب اپریل کا مہینہ آتا ہے تو سمندر کے اوپر آکر آسمان کی طرف اپنا منہ کھولتا ہے تو اگر اس کے منہ میں بارش کا ایک قطرہ گرے تو وہ قطرہ اس کے پیٹ میں جا کر ایک بہت قیمتی موتی بن جاتا ہے جسے 'در یتیـم' کہا جاتا ہے اور اگر اس کے منہ میں بارش کے دوقطرے گریں تو وہ اس کے پیٹ میں دوموتی بنتے ہیں جنہیں 'اخوان' کہا جاتا ہے لیکن یہ پہلے والے موتی سے کم قیمت کے ہوتے ہیں اور اگر اس کے منہ میں بارش کے تین قطرے گریں گے (تین موتی بنتے ہیں، چار بوندیں گریں تو چار موتی اسی طرح بنتے چلے جاتے ہیں لیکن جتنے قطرات زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کے موتی کی قیمت کم ہوگی۔ پھر یہ کہ صدف یعنی سیپ اولاً تو ایک جانور ہے لیکن جب اس کے منہ سے موتی گر جاتا ہے تو وہ سمندر کی گہرائی میں جا کر پیڑ کی طرح جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح جامد ہو جاتا ہے اور پھر کبھی نہیں ہلتا۔انتهى (معدنی) بکسر دال اور ایسے ہی پڑھنا فصیح ہے۔یعنی معدنیات کی جگہ بمعنیٰ اقامت اور یہاں پر صیغۂ تثنیہ پر ہے،نون تثنیہ کو اضافت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے (الـمـنـطـق) اور (المبتسم) یہ دونوں یا تو مصدر ہیں تو اس صورت میں اضافت لامیہ ہوگی اور کلام یعنی منطق کا معدن دل ہوتا ہے اس لئے کہ کلام جو مقصد پر دلالت کرے وہ دل سے ہی ظاہر ہوتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ کلام زبان میں ہے اور نہ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ دل میں ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کلام کی حقیقت

دل میں ہے نہ کہ زبان میں بلکہ زبان تو کلام پر دلالت کرتی ہے اور اس کا ترجمان ہوتی ہے، جیسا کہ اخطل کے اس قول سے مستفاد ہے:

ان الکلام لفی الفواد انما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

(یعنی کلام تو دلوں میں ہوتا، زبان تو صرف دلوں کی باتوں پر دلالت کرتی ہے)

اور مسرت وانبساط کا معدن منہ ہوتا ہے اس لئے کہ منہ سے ہی دندان اور اگلے دانت ظاہر ہوتے ہیں۔

یا تو پھر دونوں لفظ (منطق اور مبتسم) اسم مکان ہیں، تو اس تقدیر پر اضافت بیانیہ ہوگی کما لا یخفی (اللؤلؤ المکنون) لفظاً مفرد ہے معنی تثنیہ ہے اس پر علامت اور دلیل یہ قول ہے (من معدنی منطق منه و مبتسم) اور ناظم شعر کے اس قول (فی صدف) میں اور اسی طرح اس قول (اللؤلؤ المکنون) میں دو تشبیہ ہیں ایک تو معقول ہے اور وہ حضور اکرم ﷺ کا کلام ہے اور دوسری تشبیہ محسوس ہے اور وہ آپ ﷺ کے اگلے دندان مبارک ہیں اور اس میں استعارہ تصریحہ ہے اس طرح کہ حضور اکرم ﷺ کے جوامع الکلم اور حضور اکرم ﷺ کے دندان مبارک کو در مکنون سے حفظ وصیانت وجہ شبیہ میں تشبیہ دی گئی اور مشبہ کو پوشیدہ رکھا اور مشبہ پر مشبہ بہ کا اطلاق کیا اور پھر مشبہ بہ کی جانب اس چیز سے اشارہ کیا جو اس کے لوازم میں سے ہے اور وہ اس کا صدف یعنی سیپ میں ہونا ہے نیز ناظم کے قول "فی صدف" میں استعارہ کے لئے ترشیح ہے۔

حاصل معنیٰ: آپ ﷺ بلاشبہ بشاشت اور کشادہ روئی اور لطافت کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں حتی کہ آپ کے یہاں سخت مزاجی اور سنگ دلی کا تصور بھی نہیں جیسا کہ شاہد عادل اس پر گواہی دے رہا ہے اور آپ کا کلام شریف اور آپ کے دندان مبارک در مکنون کے مثل ہیں اور آپ ﷺ کا دہن شریف حفظ کلام میں اس صدف کی طرح ہے جو لوگوں میں مقبول ہے۔ صاحب "زبدہ" فرماتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض عارفین نے خواب میں حضرت صدیق اکبر کو دیکھا کہ وہ اس شعر اور اس سے پہلے والے شعر کے ذریعہ حضور کے محاسن بیان کر کے رو رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

ہم تیسویں شعر کی شرح پرآ چکے ہیں جو قصیدہ بردہ شریف کی فصل ثالث کا آخری شعر ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۸)لا طیب یعدل تربــاً ضم اعظمه　　　طوبیٰ لمنتشق منه و ملتثم

(ترجمہ: سارے جہاں میں کوئی بھی خوشبو ایسی نہیں جو اس خاک مبارک کے برابر ہو جو خاک شریف کہ حضورا کرم ﷺ کے جسم مبارک سے ملی ہوئی ہے، خوشخبری اور سعادت مندی ہے اس تربت پاک کو سونگھنے والے کے لئے اور اس کو بوسہ دینے والے کیلئے۔)

ربط: شاعر ذی فہم کی جانب سے حضورا کرم ﷺ کی ان خوبیوں کی مدح سرائی بیان ہو چکی جو حضورا کرم ﷺ کی ذات میں جمع ہیں جیسے آپ ﷺ کا خلق و خُلق میں افضل وممتاز ہونا، نیز حضورا کرم ﷺ کی تعریف وتوصیف میں ان امور کو بھی مختلف طریقوں سے بیان کر چکے جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضورا پنی ذات وصفات میں تمام مخلوق سے افضل واعلیٰ ہیں، یہاں تک کہ ناظم حضور کی مدح سرائی اور وصف بیانی کرتے کرتے ماقبل شعر تک آ پہنچے اوراب وہ اس شعر میں اس بات پر مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ حضور فضل میں اصل ہیں اس طرح کہ جو چیز بھی حضور کی ذات سے متعلق ہوگئی وہ اتنی افضل ہوگئی کہ پھراس کے برابر ومعادل کوئی نہ رہا، مزید یہ بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ حضور کا فضل دنیا سے مفارقت کے بعد بھی کم نہ ہوا بلکہ اس طرح قائم ودائم ہے جس طرح کے پہلے تھا بلکہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿وللآخرة خیر لك من الاولیٰ﴾

تشریح: (لا) برائے نفی جنس۔ (طیب) اس کو کہتے ہیں جس سے خوشبو حاصل کی جائے۔ (یعدل) بمعنی مساوی ہونا، کہا جاتا ہے۔" فلان عدیل فلان" یعنی فلاں، فلاں کے مساوی ہے یہ "یعدل" 'لا' کی خبر ہے اوراس کا اسم " طیب" ہے۔(ترباً) بسکون الراء 'تراب' کی ایک لغت ہے اوراس پر تنوین تعظیم کی ہے۔

(ضمّ) (بمعنیٰ ملنا، مس ہونا اور یہ جملہ صفت ہوگا "تربا" کی۔ (اعظمه) یہ 'عظم' کی جمع ہے بمعنیٰ استخوانہائے مبارک اور یہاں اس سے حضور اکرم ﷺ کا تمام جسد مبارک مراد ہے، جز ذکر کر کے کل مراد لینے کی قبیل سے۔

(طوبی) 'الطیب' سے ہے، اس کی یا کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے اور یہ یا تو مصدر ہے بمعنیٰ تطیب یا جنت کے اس درخت کا نام ہے جس کے سائے میں راکب سو سال چلنے کے بعد بھی اسے قطع نہیں کرے پائے گا، بہر حال برتقدیر اول وہ لفظ سے اپنے فعل کا بدل ہے اور وہ فعل 'طاب' ہے تو اصل میں ہوگا " طاب المنتشق والملتثم" لیکن اس کے فعل کو حذف کر کے مصدر لے آئے اس کے تلفظ سے بدل کے طور پر اور پھر فاعل کو ظاہر کرنے کے لئے 'لام' کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور برتقدیر ثانی یعنی طوبیٰ سے اسم شجر جنت مراد لینے کی صورت میں 'طوبیٰ' اپنی خبر مابعد کا مبتدا ہے، لیکن بہر دو صورت وہ اخبار و دعا کے معنیٰ کا احتمال رکھتا ہے۔

(منتشق) 'الانتشاق' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنیٰ سونگھنا یعنی سعادت مند ہے وہ جس نے خاک مبارک کو سونگھا۔ (منه) یہ "منتشق" سے متعلق ہے، اس کی ضمیر کو اشباع کے ساتھ پڑھا جائے گا اور اس کی ضمیر حضور کی تربت شریف کی جانب راجع ہے۔ (ملتثم) کا" منتشق" پر عطف ہے اور یہ" الالتثام" مصدر سے بمعنیٰ چومنا، بوسہ دینا ہے، قارئین کے ذہن سے یہ بات دور نہ ہو جائے کہ " منتشق" سے مراد مسافر ہے اور 'ملتثم' سے مراد مجاور مقیم ہے نیز یہ کہ جب لفظ طیب دو طرح مستعمل ہوتا ہے کبھی سونگھنے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی خوشبو لگانے کے معنیٰ میں تو ناظم نے پہلے والے معنیٰ کی طرف 'منتشق' کہہ کر اشارہ کیا اور دوسرے کی جانب 'ملتثم' کہہ کر۔

حاصل معنیٰ: کوئی بھی خوشبو اس خاک اقدس کے برابر نہیں ہو سکتی جو خاک کہ جسد شریف سے مس ہے اور وہ خاک حضور اکرم ﷺ کے قبر منیف کی تراب ہے، بہتری اور سعادت مندی ہے یا جنت کا درخت ہے اس کو سونگھنے والے کے لئے اور اس کو بوسہ دینے والے کے لئے لفظ طوبیٰ کی دونوں ماسبق تفسیروں کی بنیاد پر۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہٖ و صحبہٖ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین

الفصل الرابع

فی مولدہ صلی اللہ علیہ وسلم

بحمد اللہ تعالیٰ ہم قصیدہ بردہ کی فصل ثالث کے تمام اشعار کی شرح سے فارغ ہو لیئے اور اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی فتح و نصرت سے اسی قصیدۂ مبارک کی فصل رابع کے اشعار کی تشریح کا آغاز کیا جارہا ہے، اس فصل کا پہلا شعر یہ ہے جو ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۵۹) ابان مولدہٗ عن طیب عنصرہ یا طیب مبتدا منہ و مختتم

(ترجمہ:۔آپ ﷺ کی ولادت نے آپ کے عنصر کی عمدگی کو ظاہر کر دیا، تو اے عاقلو! دیکھو حضور کی ابتدا و انتہا کتنی بہتر ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم اس شعر میں جشن میلاد النبی ﷺ منا رہے ہیں اسی وجہ سے وہ بہت ہی عمدہ اور نرالے طریقے سے جشن میلاد النبی منانے کی مشروعیت پر تنبیہ کر رہے ہیں کہ وہ ایسی سنت جمیلہ ہے کہ مسلمانوں نے اسے اپنے آبا وٴاجداد سے ورثے میں پایا ہے اور ہر زمانے وعصر میں نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں جاری وساری رہی ہے۔لہذا قارئین کرام کے لئے امام بوصیری جیسی شخصیت بحیثیت امام ومقتدا کافی ہے کہ ان کی بات مانی جائے۔

!! جیسا کہ اس سے قبل ناظم نے حضور کے نسب شریف کی شرف و بزرگی اور شرک کی نجاست سے اس کے پاکی و طہارت پر تنبیہ کی تھی! تو حضور کے آبا وٴاجداد اور امہات میں حضرت آدم وحوّا سے لے کر حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک کوئی بھی مشرک نہ تھا بلکہ سب موحد تھے اور پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی

اکرم ﷺ پر مزید فضل پر فضل فرمایا کہ اس نے آپ کے والدین کریمین کو دوبارہ زندہ فرمایا اور پھر وہ آپ ﷺ پر ایمان لائے تو انہیں توحید کی فضیلت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ پر ایمان لانے کی بھی فضیلت نصیب ہوئی، جد کریم امام ہمام شیخ احمد رضا قدس سرہ کا اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ہے جس کا نام " شمول الاسلام لاصول الرسول الکرام " ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اس کی تعریب وتحقیق اور اس پر اہم تقریرات کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، فالحمد لله علی ذالك۔

تشریح: (ابان) 'الابانة' مصدر سے فعل ماضی ہے بمعنی ظاہر کرنا کھولنا، بذات خود بھی متعدی ہے اور "عن" صلہ کے ذریعے بھی متعدی ہوتا ہے۔ (مولدہ) مصدر میمی ہے بمعنی ولادت یا ظرف مکان ہے یا پھر ظرف زمان اور "ہ" کی ضمیر آپ ﷺ کی جانب راجع ہے، "مولد" کی جانب "ابانة" کی اسناد مجازی ہے۔ بہر حال معنی یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ظاہر فرمایا آپ کی ولادت کی وجہ سے یا جس وقت آپ کی ولادت ہوئی یا جہاں اور جس جگہ آپ کی ولادت ہوئی، وہاں اور اس وقت ایسے عجائب اور معجزات ظاہر فرمائے کہ جن کا شمار متعذر ہے اور " عــــن " افادۂ سبب کے لئے ہے یعنی آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے سبب۔ (طیــب) طاہر و پاک ہونا اس سے جو آپ کی ذات کے مناسب نہیں۔ (عنصر) بمعنیٰ اصل (یا طیب مبتداء) منادیٰ مضاف اضافت کی وجہ سے منصوب ہے، یہ برائے تعجب ہے عرب کی عادت کے مطابق، اس لئے کہ وہ ندا کا صیغہ اس کے لئے استعمال کرتے ہیں جسے وہ معظم ومکرم جانتے ہیں اور یہاں من حیث المعنیٰ مقصود تمام ذوی العقول کو ندا دینا ہے یعنی معنیٰ یہ ہے " یا ایها العقلاء تعجبوا من طیب مبتدا منه و مختتم " یعنی اے عاقلو! حضور کی ابتدا و انتہا کی طہارت و پاکی پر تعجب کرو اور ایک نسخے میں "مبتدا" مصدر بمعنیٰ بدایت آیا ہے اور اسی طرح " مفتتح " آیا ہے۔

ناظم نے دو کناروں کو ذکر کیا یعنی ایک کنارہ ابتدا کا اور ایک کنارہ انتہا کا تاکہ ان دونوں کناروں اور طرفوں کے درمیان میں جو زمانہ ہے اس کو محیط ہونے پر دلالت کرے اور آپ ﷺ کے لئے عمدگی کے دوام واستمرار کو ثابت کرنا بطور عرف ہے جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (و سبحوه بكرة و اصيلا) یعنی ہمیشہ۔

علامہ ملا علی قاری 'زبدۃ' میں فرماتے ہیں کہ اس شعر میں حضور کے حسن ابتداء اور حسن انتہا کی جانب اشارہ ہے نیز اس آغاز اور ابتداء کی سعادت کی بلندی کا بیان ہے جو انجام اور انتہا کی بنیاد ہوتی ہے، اسی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی جبین ناز کا بوسہ لیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ حضور آپ کا آغاز و انجام کتنا اچھا ہے'' جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

فی المهد ینطق عن سعادة جده　　　　اثر النجابة ساطع البرهان

(ترجمہ: مہد میں اثر نجابت مضبوط دلیل کے ساتھ آپ کی نہایت خوش بختی کو بیان کرتا ہے۔)

(منه) میں 'ہ' کی ضمیر کو اشباع کے ساتھ پڑھا جائے گا، یہ "مبتداء" کے متعلق ہے، دوسرے والے سے 'منه' کو محذوف کرلیا گیا یعنی" مختتم" سے جار مجرور یعنی 'منه' کو حذف کر دیا اول کا اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے اور "منه" میں ضمیر" عنصره" کی جانب راجع ہے، علامہ باجوری کے کہنے کے مطابق، ان کے نزدیک وہ متعین ہے، اس پر ان کا یہ کہنا دلیل ہے کہ فرماتے ہیں (مفتتح، مبتدا سے مراد وہ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے ہیں یعنی حضور نبیٔ اکرم ﷺ اھ) یا پھر اس کی ضمیر " طیب عنصره" کی جانب راجع ہے یا نبیٔ اکرم ﷺ کی طرف۔

حضور کے زمانۂ ولادت کے متعلق روایات

پھر جاننا چاہئے کہ زمانۂ ولادت باسعادت اور حضور کی ابتدائی زمانے کے عجائب وفضائل کے بارے میں اتنی کثیر مرویات ہیں کہ جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا، کچھ مرویات کتب احادیث میں یوں مذکور ہیں کہ حضور کا نطفۂ زکیہ جب قرار پذیر ہوگیا اور در محمدیہ جب صدف آمنہ میں آگیا تو عالم ملکوت و جبروت میں منادی کی گئی کہ تمام عالم قدس کو معطر کردیا جائے اور جہات شرف اعلیٰ کو خوشبو دار کردیا جائے ملائکہ مقربین اور اہل صدق وصفا کی صفوف میں عبادات کے مصلے بچھادئے جائیں اس لئے کہ آج نور محمدی رحم آمنہ میں منتقل ہو چکا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب ماہ رجب، لیلۂ جمعہ میں حضرت محمد ﷺ کو بطن آمنہ میں پیدا فرمانا چاہا تو اس رات جنتوں کے خازن کو حکم ہوا کہ وہ جنت کا دروازہ کھول دے اور منادی

آسمانوں اور زمین میں آواز لگانے لگا کہ وہ نور مخزون جس سے نور نبی ہادی ظاہر ہونا تھا وہ اس رات شکم مادر میں مستقر ہوگیا ہے جس میں ان کے خلق ظاہری کی تکمیل ہوگی۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام

ایک روایت میں آیا ہے کہ اس سال قریش سخت قحط سالی اور شدید تنگی میں تھے کہ اچانک غیر متوقع زمین سر سبز و شاداب ہوگئی اور درخت پھل دار ہوگئے حتیٰ کہ اس سال کو فتح و کامیابی اور خوشی کا سال کہا جانے لگا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ پھر مجھے دردزہ محسوس ہونے لگا اور کسی مرد و عورت کو میری خبر نہ تھی کہ میں اس وقت گھر میں تنہا تھی، عبدالمطلب طواف کعبہ میں مشغول تھے کہ اچانک میں نے ایک دہشت ناک آواز سنی جس نے میرے دل کو دہلا دیا،

پھر میں نے دیکھا کہ سفید پرندے کے بازو کے مثل کسی چیز نے میرے دل پر مسح کیا جس سے میرا ڈر جاتا رہا اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے پاس کوئی سفید پینے کی چیز ہے، وہ میں نے پی لی تو پیتے ہی میرے ارد گرد نور بلند ہوا آگے کہتی ہیں پھر میں نے ہوا میں لٹکے ہوئے کچھ لوگ دیکھے جن کے ہاتھوں میں چاندی کے لوٹے تھے پھر اللہ نے میری آنکھوں پر سے پردے ہٹادئے کہ میں نے مشارق و مغارب ارض کا مشاہدہ کیا اور میں نے تین جھنڈے گڑے ہوئے دیکھے ایک مشرق میں ایک مغرب میں اور ایک علم کعبے کی چھت پھر مجھے دردزہ شروع ہوگیا اور مجھ سے حضرت محمد ﷺ جلوہ آرائے دنیا ہوئے! اور جب میں نے ان کی طرف نظر کی تو میں نے انہیں اپنے رب کے حضور حالت سجدہ میں دیکھا کہ وہ ایک عابد متضرع کی طرح آسمان کی جانب انگشت شہادت اٹھائے ہوئے ہیں۔

پھر میں نے ایک سفید بادل کے ٹکڑے کو آسمان کی جانب سے اترتا ہوا دیکھا جس نے مجھے گھیر لیا، پھر میں نے کسی پکارنے والے کو یہ آواز دیتے ہوئے سنا کہ انہیں (یعنی سبب وجود کائنات کو) مشارق و مغارب ارض کی سیر کراؤ اور سمندروں میں لے جاؤ تا کہ وہ آپ کو آپ کی نعت و صورت سے جان لیں۔

حضور کی ولادت باسعادت کے یہ واقعات بہت طویل ہیں، عقلیں ان سے متحیر ہوجاتی ہیں، حتیٰ کہ بعض فضلائے کرام نے میلاد النبی علیہ السلام کے واقعات میں حسن نظام کے ساتھ مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، تفصیل کے

طالب کوان کتابوں کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

الحمدلله و الصلوٰة و السلام علی رسول الله و آله و صحبه و من و الاهٗ

ربط: تو بیت ماسبق کے مفہوم میں جب اس جانب اشارہ ہوا کہ حضور کی ولادت نے طرح طرح کے عجائب و غرائب ظاہر کئے یعنی یہ معنیٰ ناظم فاہم کے گزشتہ کلام میں پوشیدہ تھا اور وہ اجمال تفصیل کو چاہتا ہے تو اسی وجہ سے شاعر ذی فہم اب ماقبل شعر کے اجمال کی گویا تفصیل کرر ہے ہیں، فرماتے ہیں:

(٦٠) یوم تفرس فیه الفرس انهم ——— قد انذروا بحلول البؤس و النقم

(ترجمہ: یہ وہ دن ہے کہ جس میں اہل فارس نے اپنی فراست سے جان لیا کہ وہ نزول شدت اور عذاب سے ڈرائے جانے والے ہیں)

تشریح:۔ (یوم) یعنیٰ 'هو یوم' تو یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگا اور مبتدا محذوف کی ضمیر راجع ہے حضور اکرم ﷺ کے مولد کی جانب اور اس سے مطلق زمانہ مراد ہے جو آپ ﷺ کے زمانۂ قبل ولادت اور بعد ولادت دونوں زمانوں پر صادق آتا ہے لیکن علامہ خرپوتی نے اس کا انکار کیا ہے، انہوں نے "یوم" سے خاص طور پر آپ ﷺ کی ولادت کا دن مراد لیا ہے!

(لیکن میرے حساب سے) پہلا والا معنیٰ بہتر رہے گا کیوں کہ وہ معنیٰ آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے قبل جو واقعات عجیبہ عالم میں پیش آئے ان کو بھی شامل ہے جیسا کہ گزشتہ اوراق میں کچھ بیان گزر چکا ہے اور مزید آئندہ اوراق میں ربیعہ بن نصر، شق اور سطح کے واقعات آئیں گے جو قبل ولادت نبی کے ہیں۔ (تفرس) بمعنیٰ غور سے دیکھنا اور فراست سے جاننا اور 'فراست' بالکسر (عربی میں) اس قوت کو کہتے ہیں جس سے انسان معانی باطنہ کو علامات ظاہرہ سے جان لیتا ہے برخلاف 'فراست' بالفتح کے، اس لئے کہ وہ گھوڑ سواری اور شہسواری میں ماہر ہونے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

اہل فارس کے متعلق کلام

(الفُرس) ضم فاء وسکون راء: اہل مملکت فارس کو کہتے ہیں جو مجوسی تھے اور کتاب کے اٹھ جانے کے بعد آگ کو پوجنے لگے جب انہوں نے کتاب میں تحریف وتبدیل کردی اور ان کو فارس اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے باپ کو دس سے کچھ زائد اولاد تھیں اور سب کے سب بہادر اور مرد میدان یعنی ''فارس'' تھے، اسی وجہ سے انہیں ''فرس'' یعنی بہادر کہا جانے لگا۔

اہل فارس کی مدح میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث آئی ہے حضور نے فرمایا " ان الله اختار من بين خلقه من العرب قريشاً و من العجم فارسا" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں سے عرب میں قریش کا انتخاب فرمایا اور عجم میں فارس کو چنا'' اور دوسری حدیث میں آیا ہے " ابعد الناس عن الاسلام الروم ولو كان الاسلام معلقا بثريا لتناوله رجال من فارس" اور ایک روایت میں'' لو كان العلم معلقا بالثريا لتناوله قوم من ابناء فارس" یعنی اسلام سے سب سے زیادہ دور اہل روم ہیں اور اگر اسلام ثریا پر لٹکا ہو تب بھی فارسیوں کی ایک قوم اسے وہاں سے بھی اچک لے آئے گی اور ان احادیث کا مصداق امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صورت میں ظاہر ہوا (جو کہ فارسی تھے)

(انهم) اشباع کے ساتھ پڑھا جائیگا" ان" اپنی اسم وخبر کے ساتھ " تفرس" کا مفعول ہے اور 'هم' ضمیر 'فُرس' کی ہے۔ (قد) برائے تحقیق ہے۔ (انذروا) 'الانذار' مصدر سے فعل ماضی مجہول ہے بمعنی سختی کے ساتھ ڈرانا،۔ (بحلول) یہ متعلق ہے" انذروا" سے اور " الحلول" یہ" حل يحل" باب ضرب يضرب اور 'خل يخل" باب نصر ينصر سے ہے اور دونوں باب سے کئی معانی کے لئے آتا ہے۔" المعجم الوسيط" میں ہے " حل الشئی يحل حلالا" بمعنیٰ مباح ہونا۔

اور" المرأة" کے ساتھ جب یہ فعل آئے تو نکاح جائز ہونے کے معنیٰ میں ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔﴿فان طلقها فلا تحل له من بعد حتىٰ تنكح زوجاً غيره﴾ اور جب" المحرم' فاعل

ہوتو وہ چیزیں جائز ہونا جو حالت احرام میں نہ جائز تھیں کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور بمعنیٰ حرم سے تجاوز کرنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے﴿ واذا حللتم فاصطادوا﴾ اور جب اس کا فاعل " الدین " ہوتو قرض کی ادائیگی واجب ہونے کا معنی دیتا ہے، نیز لوگوں پر اللہ کا غضب ہونا کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، اللہ فرماتا ہے ﴿ فیحل علیکم غضبی ومن یحلل علیه غضبی فقد هوىٰ﴾ اور 'العقدة' لفظ کے ساتھ بمعنیٰ گرہ کھولنا ہے کہا جاتا ہے " حل المشکلةُ" بمعنیٰ مشکل کو سلجھانا، حل کرنا، اور " الجامد" مفعول کے ساتھ بمعنیٰ پگھلانا اور ' الکلا م المنظوم' مفعول کے ساتھ بمعنیٰ منظوم کلام کو نثر کرنا، اور 'المکان' کے ساتھ بمعنیٰ مقیم ہونا، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے﴿او تحل قریبا من دارهم﴾ کہا جاتا ہے 'حللت القوم' یعنی میں قوم میں اترا اور " البیت" کے ساتھ بمعنیٰ رہنا۔ اسم فاعل 'حال' اور جمع حلول، حلال، حلل آتی ہے۔(المعجم الوسیط)

مفہوم بیت یہ ہے کہ حضور کی ولادت کا زمانہ فراست ودانائی کا زمانہ تھا یعنی ظاہری علامات سے جان لینے کا زمانہ تھا تو فارسیوں نے جان لیا کہ وہ ڈرائے گئے ہیں اور سختیوں اور عقوبات کے نزول سے آگاہ کئے گئے ہیں۔ حلول بمعنیٰ نزول، " بؤس "، بمعنیٰ شدت وسختی، اور " نقم " بمعنی سزا۔

اہل فارس کے واقعات

اب ہم " سیرت ابن هشام " اور علامہ سہیلی کی شرح " الروض الانف " وغیرہ کتب سے کچھ واقعات ضرور ذکر کرنا چاہیں گے جیسے ربیعہ بن نصر کے خواب کا قصہ جس نے اسے گھبراہٹ میں ڈال دیا تھا اور شاہ فارس کے خواب کا واقعہ نیز شق اور سطیح کا عجیب باتوں کی پیشن گوئی کرنے کا قصہ اور حضور نبیٔ آخر الزماں ﷺ کی بعثت کی بشارت کی خبر دینے کا قصہ وغیرہ۔ تو اب ہم بیان کرتے ہیں:

علامہ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق نے فرمایا کہ ربیعہ بن نصر، شاہان تبابعہ کے کمزور ہونے کے بعد ملک یمن کا والی ہوا تھا، تو ایک دن اس نے ایک ایسا خواب دیکھا جس نے اسے دہشت میں ڈال دیا اور اس خواب سے وہ بے حد گھبرا اٹھا، تو اس نے اپنی مملکت کے سبھی کاہنوں، جادوگروں، نجومیوں، ساحروں، کو جمع کر کے کہا کہ میں نے

ایک بہت پریشان کن خواب دیکھا ہے، تم لوگ اس کی تعبیر بتاؤ وہ بولے کہ بادشاہ پہلے خواب تو بیان کریں تبھی تو ہم اس کی تعبیر بتائیں گے، تو کہنے لگا کہ اگر میں تم لوگوں کو خود اپنا خواب بیان کر دوں گا تو میں تم لوگوں کی تعبیرات سے مطمئن نہیں ہوسکوں گا، اس لئے اس کی تعبیر وہی جان سکتا ہے جو بغیر میرے بتائے خواب کو جان لے، تو ان میں ایک نجومی کہتا ہے کہ بادشاہ اگر یہی چاہتا ہے تو شق اور سطیح کو بلوالیں اس لئے کہ ان دونوں اشخاص سے زیادہ جانکار اور ماہر نجومی تو کوئی ہے ہی نہیں اور بادشاہ جو جاننا چاہتا ہے ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

ابن اسحاق آگے فرماتے ہیں: تو بادشاہ نے دونوں کے پاس حاضر بارگاہ ہونے کا پیغام بھیجا، تو شق سے پہلے سطیح حاضر بارگاہ ہوا، تو بادشاہ نے اس سے سارا ماجرا سنانا شروع کیا کہ میں نے ایک سخت پریشان کن اور گھبرا دینے والا خواب دیکھا ہے، تو تمہارا پہلا کام تو یہ ہے کہ سب سے پہلے تو تم میرا خواب بیان کرو کہ کیا ہے؟ اس لئے کہ اگر تم بغیر میرے بتائے اس خواب پر مطلع ہوسکو گے تو تم اس کی تعبیر بھی ضرور جان لو گے، سطیح نے کہا ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں، پھر کہنے لگا کہ بادشاہ سلامت آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک جلتا ہوا انگارہ تاریکی سے نکلا اور سرزمین تہمہ میں آکر گرا اور پھر اس نے سبھی سروں کو کھالیا، خواب سن کر بادشاہ نے تصدیق کی کہ سطیح! تم سے ذرا بھی غلطی نہ ہوئی، اب یہ بتاؤ کہ اس خواب کی آخر کیا تعبیر ہے تمہارے پاس؟ تب سطیح! ان الفاظ میں تعبیر رویا بتانا شروع کرتا ہے کہ میں حنش کی آگ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری جبش کی زمین میں ایک قوم داخل ہونے والی ہے اور سرزمین ابین سے لے کر سرزمین جرش تک تمام بلا د وامصار پر قابض ہو جائے گی، یہ سن کر بادشاہ اس سے کہنے لگتا ہے کہ اے سطیح کیا واقعی میں ایسا ہوگا؟ یہ خبر تو بہت تکلیف دہ اور الم ناک ہے، آخر ایسا کب ہوگا؟ یعنی کیا میرے زمانے میں ہوگا یا میرے بعد؟ اس نے بتایا کہ نہیں بلکہ آپ کے زمانۂ سلطنت کے ساٹھ یا ستر سال گزر جانے کے بعد ایسا ہوگا، بادشاہ پوچھتا ہے کہ وہ ملک کیا ان کی حکومت میں ہمیشہ رہے گا یا نکل جائے گا؟ بولا ہمیشہ نہیں بلکہ ستر سے کچھ زائد سالوں میں ان کے قبضے سے بھی نکل جائے گا اور اس مدت کے بعد انہیں بھی قتل کیا جائے گا اور شکست خوردہ انہیں بھی یہاں سے بھگایا جائے گا بولا ان لوگوں کون مار کر نکالے گا؟ بتایا کہ ارم "یـزن"

کا رہنے والا ان کا حاکم ہوگا، ان پر ملک عدن سے خروج کرے گا اوران میں سے یمن کی سرزمین پر کسی کو باقی نہیں چھوڑے گا، پھر پوچھا کہ یہ ملک کیا پھراس کی سلطنت میں ہمیشہ رہے گا یااس کی سلطنت بھی منقطع ہوجائے گی؟ بولا اس کی حکومت بھی ختم ہوجائے گی؟ پوچھا کہ کون ختم کرے گا؟ سطیح نے بتایا کہ پھر اس کی حکومت کوایک طیب و طاہر نبی ختم فرمائیں گے جن پر اللہ کی جانب سے وحی آتی ہوگی، تو پوچھتا ہے کہ یہ نبی کس قوم سے ہوں گے، بتایا کہ یہ نبی برحق غالب بن فہر بن مالک بن نضر کی اولاد میں ہوں گے، ان کی امت میں یہ ملک آخری زمانے تک یعنی ہمیشہ رہے گا بولا کہ آخر زمانے کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے؟ بولا ہاں زمانے کی انتہا وہ آخرت کا دن ہے جس میں اولین اورآخرین کو جمع کیا جائے گا، اس دن محسنین کامیاب ہوں گےاور بدکار خائب وخاسر ہوں گے۔

بادشاہ کہتا ہے کہ جوتم نے خبر دی کیا واقعی حق ہے، بولا قسم ہے شفق کی اور تاریک رات کی اور قسم ہے صبح کی جب روشن ہوجائے کہ جوخبر میں نے تمہیں ابھی سنائی بالکل حق وصداقت پرمبنی ہے۔

پھر پیغام سن کر شق بھی بارگاہ میں حاضر ہوگیا، تو بادشاہ نے اس سے بھی وہی بات پوچھی جو سطیح سے پوچھی تھی اور سطیح کی بتائی ہوئی تاویل کو پوشیدہ رکھا تا کہ جان سکے کہ دونوں کی بات ایک ہی ہے یا مختلف!! تو اب شق اس کا خواب بیان کرنا شروع کرتا ہے کہ ہاں بادشاہ آپ نے ایک جلتے ہوئے انگارے کوتاریکی سے نکلتے ہوئے دیکھا جوسرزمین روضہ اوراکمۃ کے درمیان کسی جگہ گرا اوراس نے ہر ذی روح کو کھالیا، تو جب شق نے خواب بیان کردیا تو بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ یہ دونوں سچ بول رہے ہیں اور دونوں کی بات ایک ہی ہے مگر صرف اتنا کہ سطیح نے خواب بیان کرنے میں یہ الفاظ اختیار کئے تھے کہ وہ آگ ارض تہمہ میں آکر گری اور ہر سر والے کو کھالیا لیکن شق نے خواب کو یوں بیان کیا کہ وہ جلتا ہوا انگارہ (شعلہ جوالہ) روضہ اوراکمہ کے درمیان آکر گرا اور پھراس نے سبھی کو کھالیا، بہرحال بادشاہ نے اس سے کہا کہ شق تم سے خواب بیان کرنے میں بالکل خطا نہ ہوئی، تو اس کی تعبیر تمہارے پاس کیا ہے؟ بولا کہ قسم ہے آگ کی (سایہ دار آگ کی) کہ ضرور تمہاری سرزمین سودان میں ایک جماعت اترےگی اور بنان کا کوئی بچہ بھی ایسا باقی نہ رہے گا جس پر وہ غالب نہ آجائے اور زمین ابین سے لے کر نجران تک سبھی زمین ان

کے قبضے میں ہوگی۔

بادشاہ اس سے کہنے لگا کہ شق کیا سچ کہہ رہے ہو اس لئے کہ یہ تو بہت تکلیف دہ خبر ہے، آخر یہ حادثہ کب پیش آنے والا ہے؟ کیا میرے زمانے میں یا میرے زمانے کے بعد؟ بولا آپ کے بعد، اس ملک کو آپ لوگوں سے ایک عظیم الشان شخص لے لیگا اور انہیں سخت رسوائی کا عذاب چکھائے گا، پوچھا کہ یہ عظیم الشان شخص کون ہوگا، بتایا کہ غلام ہوگا لیکن دنائت وخساست والا نہیں، جوان پر ذویزن کے علاقے سے خروج کرے گا، پھر یمن میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گا، پوچھا کہ کیا اس کی سلطنت ہمیشہ قائم رہے گی یہاں یا ختم ہوجائے گی؟ بتایا گیا کہ نہیں بلکہ ان رسول برحق سے ختم ہوجائے گی جو عدل وانصاف کے ساتھ بھیجے جائیں گے اور پھر یہ ملک ان کے غلاموں میں یوم فصل تک باقی رہے گا۔ پوچھا کہ یہ یوم فصل کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں تمام حاکموں اور والیوں کا فیصلہ ہوگا، اس دن آسمان سے آواز دی جائے گی جسے مردے، زندہ سب سنیں گے اور سن کر وقت مقررہ پر جمع ہوں گے، اس دن کامیابی اور خیر اس کے لئے ہوگی جو متقی ومومن ہوگا، بادشاہ نے پوچھا کیا سچ کہہ رہے ہو؟ بولا قسم ہے اس خدا کی جو آسمان وزمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پالنے والا ہے کہ میں نے تمہیں جو کچھ بھی بتایا سب حق ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں۔

علامہ ابن ہشام فرماتے ہیں کہ روایت میں جو لفظ ' امض ' ذکر ہوا اس کا معنیٰ لغت حمیر میں شک ہے اور ابو عمر کہتے ہیں کہ " أمض" کا معنیٰ باطل ہوتا ہے۔

تو اب شق اور سطیح کی پیشین گوئی کی صداقت ربیعہ بن نصر کے دل میں گھر کر چکی تھی، اسی وجہ سے اس نے اپنی اولادوں اور گھر والوں کو عراق کی جانب تیار کیا تا کہ وہ وہاں محفوظ رہیں اور فارس کے ایک بادشاہ کے پاس ان کے متعلق ایک خط لکھا کہ وہ ان لوگوں کو حیرہ میں مقیم کردے۔

" الروض الانف " میں ہے کہ سطیح ملے ہوئے جسم کا تھا یعنی اس کے اعضا نہ تھے، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اور وہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ کہ جب وہ غصے میں ہوتا اس کے تو جوارح پھٹ جاتے تو بیٹھ پاتا اور شق کے بارے میں

بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان تھا جس کے پاس انسانی اعضاء آدھے تھے!! یعنی صرف ایک ہاتھ تھا، صرف ایک پیر تھا صرف ایک آنکھ تھی۔

وھب ابن منبہ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے کہ جب سطیح سے پوچھا گیا کہ تمہیں یہ علم کہاں سے حاصل ہوا؟ تو کہتا ہے میرا ایک جن دوست ہے جس نے طور سینا سے آسمان کی خبریں سن لیں تھیں جس وقت کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا تھا، تو وہ جن مجھے وہ خبریں پہنچا دیتا ہے جو اس تک پہنچتی ہیں۔

روایت میں وارد الفاظ غریبہ کی تشریح:

خواب کے بیان میں یہ جملہ استعمال ہوا" اکلت منها کل ذات جمجمة وکل ذات نسمة" اس میں لفظ 'کل' کو منصوب پڑھنا اصح ہے روایت میں بھی اور معنیٰ کے اعتبار سے بھی، اس لئے کہ لفظ 'حمم' کا معنیٰ آگ ہوتا ہے اور آگ اشیاء کو کھالیتی ہے، آگ کو نہیں کھایا جاتا، یہ اس وجہ سے بیان کردیا کہ ایک شیخ کی روایت میں 'کل' بالرفع آیا ہے، حالاں کہ اس رفع کی بھی ایک صورت اور وجہ بیان کی جاسکتی ہے لیکن کتاب کے حاشیہ میں صراحت موجود ہے کہ برقی نسخے میں 'کل ذات' منصوب ہی ہے، جو علامہ ابن ہشام کے مطالعہ میں تھا۔

اور قصہ میں یہ الفاظ آئے: (خرجت من ظلمة) یعنی آگ تاریکی سے نکلی اور وہ اس لئے کہ " الحممة" آگ کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں، اور اس کا تاریکی سے نکلنا، حبشہ کے لشکر کا ملک سودان سے نکلنے کے مشابہ ہے،'' حممة" کا معنیٰ ہوتا ہے کوئلہ اور کبھی جلتے ہوئے انگارے کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہوتا ہے، جیسا کہ یہاں پر اس جملے میں جلتے ہوئے انگارہ کے معنیٰ ہی ہے، تو اس صورت میں یہ لفظ" حميم' سے ہوگا نیز 'حمی' سے بھی ہوسکتا ہے اس کے جلنے کی وجہ سے اور کوئلہ کبھی بجھا ہوا ہوتا ہے تو وہ اس صورت میں 'الحمة' سے ہوگا جس کا معنیٰ کالا ہوتا ہے اسی وجہ سے جب چہرہ کالا ہوجاتا ہے تو کہا جاتا ہے 'حممت وجهه' بہرحال لفظ 'حممة' میں یہاں دونوں ہی معنیٰ موجود ہیں۔

(بين روضه واكمة) اس لئے کہ وہ جلتا ہوا انگارہ ملک صنعاء اور اس کی سرحدوں کے درمیان میں آکر گرا تھا۔

(فی ارض تهمة) یعنی پست زمین، اوریہیں سے اس کو"تهامه" کہتے ہیں۔

اور یہ الفاظ آئے (اكلت منها كل ذات جمجمة) یعنی اس آگ نے پھر ہر کھوپڑی کو کھالیا حالانکہ یہ نہیں کہا کہ آگ نے ہر کھوپڑی والے کو کھالیا یعنی" كل ذات ذی جمجمة" نہیں کہا اس لئے کہ وہ اس فرمان باری تعالیٰ کے باب سے ہے ﴿ ولا تزر وازرة وزرة اخرىٰ وان تدع مثقلة الى حملها لا يحمل منه شیء﴾ (فاطر: ۱۸)

اس لئے کہ مقصود یہ ہے کہ آگ نے ہر جاندار اور ہر نفس کو کھالیا ہے، تو معلوم ہوا کہ وہ سب کو عام اور شامل ہے، اس میں تمام ذی روح داخل ہیں اور اگر 'جمجمة' کو مذکر 'جمجم' لائے ہوتے تو وہ یا تو انسانوں کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے یا ہر ذی روح اور جماد کو عام ہوتا، اسی قبیل سے حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے۔ (تفحّ عنی، فان كل بائلة تفيخ) یعنی مجھ سے دور رہو اس لئے کہ ہر ذی روح پیشاب کرنے والا، ریاح بھی خارج کرتا ہے، یعنی اس سے ہوا خارج ہوتی ہے اور وہ حدیث ہے۔ علامہ نحاس فرماتے ہیں کہ وہ صفت اور خلقت کی تانیث ہے۔

(ليهبطون ارضكم الحبش) یہ حبش والے حبش بن کوس بن حام بن نوح کی اولادوں میں سے ہیں اسی لئے انہیں حبشہ کہا جاتا ہے۔

(مابين ابين الى جرش) سیبویہ نے 'ابین' کو ہمزہ کے کسرے کے ساتھ، اصبح کے مثل پڑھا ہے اور اس میں فتح کو بھی درست کہا ہے اور اس کتاب میں بھی اسی طرح اعراب لگایا گیا ہے اس پر۔

ابن ماکولا نے کہا کہ ابين بن زهير بن ايمن الهميسع حمیر سے ہے یا ابن حمیر سے اس کے نام پر شہر کا نام رکھا گیا، اور علامہ طبری کا قول تو گزر ہی چکا کہ" ابین اور عدن یہ دونوں عدن کے بیٹے ہیں"، ان کے نام سے دو شہروں کا نام رکھا گیا۔

(بغلام لادنی و لامدن) 'الدنی' (خسیس) کا معنیٰ معلوم ہے اور رہا 'مدن' تو اس کو کہتے ہیں جس میں

دناًت وخساست کے ساتھ ساتھ کمزوری بھی ہو، صاحب 'العین' کے کہنے کے مطابق۔

(لحق مافيه امض) یعنی وہ ضرور حق وصحیح ہے اس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ سطیح اس واقعہ کے بعد ایک طویل زمانے تک زندہ رہا، یہاں تک کہ اس نے نبی آخرالزماں ﷺ کی ولادت کا زمانہ پایا تو کسری نوشرواں بن قباذ بن فیروز نے دیکھا کہ محل میں زلزلہ آ گیا ہے، آتش فارس بجھ گئی جو ایک ہزار سال سے جل رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں بجھی تھی اور اس کے محل سے چودہ کنگرے گر پڑے اور موٗذبان نے آ کر اسے خبر دی، موذبان کا معنیٰ ان کی لغت میں قاضی یا مفتی ہوتا ہے، اس نے یہ خبر دی کہ اس نے ایک خواب دیکھا کہ سرکش اور بے لگام اونٹ عربی گھوڑوں کو ہانک رہے ہیں اور وہ تمام بلادوامصار میں پھیل گئے ہیں! تو یہ خواب سن کر کسریٰ نے عبدالمسیح بن عمرو بن حیان بن نفیلۃ غسانی کو سطیح کے پاس بھیجا اور حال یہ تھا کہ سطیح عبدالمسیح کے ماموں میں سے تھا علامہ قرطبی کے ذکر کرنے کے مطابق، اسی وجہ سے کسریٰ نے عبدالمسیح کا ہی انتخاب کیا تا کہ وہ جا کر اس سے قاضی کے خواب کی تعبیر معلوم کرے، تو وہ جب سطیح کے پاس پہنچا تو سطیح موت کے قریب ہو چکا تھا، بہرحال قاصد نے اس کو سلام کیا لیکن سطیح نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا، تو یہ بے رخی دیکھ کر عبدالمسیح یہ اشعار پڑھنے لگا:

أصم أم يسمع غطريف اليمن؟ أم فـاد؛ فـازلـمّ بـه شـأو العنن

(یعنی سردار یمن میری بات سن رہا ہے یا بہرا ہو چکا ہے یا مر گیا ہے کہ میعاد کی لگام نے اسے پکڑ لیا۔)

يا فاصل الخطة اعيت من ومن اتـاك شيـخ الـحـى مـن آل سنن

(اے فیصلہ کرنے والے تو نے مجھے عاجز کر دیا ہے حالاں کہ جو تیرے پاس آیا ہے وہ قبیلہ آل سنن کا سردار ہے

رسول قبل العجم يسرى للوسن لا يـرهـب الـرعـد ولا ريـب الزمن

شاہ عجم کی جانب سے ایک فرستادہ اپنی حاجت وضرورت کے لئے راتوں رات چل کر تیرے پاس آیا ہے جو نہ بجلی کی کڑک سے گھبراتا ہے اور نہ زمانوں کے شکوک سے۔)

تجوب بی الارض علنداة شزن ترفعنی و جناو تهوی بی وجر
(سخت پتھریلی زمین علقداہ کو طے کر کے میں آیا ہوں، اس زمین کا حال یہ تھا کہ وہ مجھے اٹھا اٹھا کر پٹکتی تھی او
پتھریلی زمین مجھ کو گراتی چڑھاتی تھی)

حتی اتی عاری الجآجی و القطن تلفه فی الریح بوغاء الدمن
(یہاں تک کہ تمہارے پاس وہ شخص اس حال میں آیا ہے کہ وہ سواری سے عاری اور غریب الوطن ہے اور غبار را
نے اس کو ہوا کی وجہ سے گرد آلود اور لت پت کر دیا ہے۔)

کانما حثحث من حضنی ثکن
(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے پہاڑ کی جڑ سے نکالا گیا ہے)

'ثکن' ایک پہاڑ کا نام ہے۔تو سطیح یہ اشعار سن کر متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ 'عبدالمسیح تو تیز رفتار اونٹ پر سوار ہو کر سطیح کے پاس اس وقت آیا ہے جب اسے بس قبر میں دفنایا جا رہا ہے!! تجھے بنی ساسان کے بادشاہ نے محل کے زلزلے اور آتش فارس کے بجھ جانے اور قاضی کے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے میرے پاس بھیجا ہے کہ اس نے خواب میں بے لگام اونٹوں کو دیکھا اور دیکھا کہ عربی گھوڑے ہانکے جا رہے ہیں اور دریائے دجلہ کو پار کر کے سارے شہر میں پھیل گئے ہیں۔

مزید پھر کہتا ہے کہ اے عبدالمسیح سن لے کہ جب تلاوت زیادہ ہونے لگے اور صاحب ہراوت (یعنی صاحب عصا) ظاہر ہو جائیں، فارس کی آگ بجھ جائے اور نہر سادہ کا پانی زمین میں سوکھ جائے نیز وادی سماوہ بھی سوکھ جائے تو جان لینا کہ اب یہ ملک شام سطیح کا شام نہ رہا، اب بادشاہان زمانہ اس پر راج کریں گے کنگرے کی تعداد کے جتنے یعنی جتنی فصیلیں ہیں اتنے بادشاہ ہوں گے اور وہ جو آنے والا ہے آکر رہے گا!

پھر سطیح نے اپنی جگہ خالی کر دی۔

تشریح الفاظ اشعار: (فازلم) بمعنیٰ قبض کرنا، ثعلب کے کہنے کے مطابق۔(شأو العنن) مراد موت

ہے اور وہ علامات جو موت سے ظاہر ہوتی ہیں، خطابی کے قول کے بنیاد پر۔ (فاد) بمعنیٰ مرنا، کہا جاتا ہے 'فاد یفود اور رہا یفید تو وہ بمعنیٰ خوش رفتاری سے چلنا۔ (ابن هشام مع شرحه 'الروض الانف ۱/ ۵۸ الی ٦٧ ملتقطا)

مذکورہ بالا واقعات میں بشیر ونذیر نبی ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت ہے اور تسلسل کے ساتھ اہل فارس کا ڈرنا اور کاہنوں کا خواب کی تعبیر میں متفق ہونا بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کا چرچہ حضور کی ولادت سے پہلے ہی سارے عالم میں پھیل چکا تھا اور حضور اکرم ﷺ کی نبوت پر علامات وآثار کی کثرت تھی۔ اور علم نجوم کے ذریعہ حضور کا حلیہ شریف بیان کیا گیا ہے اور اس علم کا مدار جنات کے آسمانی خبریں بتانے پر ہوتا ہے جو انبیاء پر آتی ہیں، اس کی تصدیق قرآن پاک میں موجود ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ حکایۃ عن الجن فرماتا ہے ﴿ و انا لمسنا السماء فوجدنٰها ملئت حرس شديدا و شهبا و انا كنا نقعد منها مقٰعد للسمع فمن يستمع الآن يجد له شهابا رصدا﴾ (الجن: ۸، ۹)

حالانکہ مغیاب پر مطلع ہونا یہ انبیاء کی اصل ہے عليهم ازكى الصلوات و اطيب التسليمات) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ عٰلم الغيب فلا يظهر على غيبه احدا الا من ارتضىٰ من رسول﴾

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کاہنوں اور نجومیوں کی زبان سے حضور کی ولادت کی بشارت سنوائی اور حضور کی مدح سرائی کرائی دین محمدی ﷺ کے ظہور کی وجہ سے اور ان سے یہ اعلان کروایا کہ ان کے اصحاب غالب آئیں گے اور تمام بلاد وامصار میں پھیل جائیں گے، تاکہ نجومیوں کی بشارت ان پر خوب تکلیف دہ ثابت ہو جو علم نجوم کو دل سے مانتے ہیں، اس کی صداقت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کاہنوں کے بتائے ہوئے پر عمل کرتے ہیں اور پھر جب حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو علم کہانت (یعنی علم نجوم) کو باطل کردیا گیا اور وہ اس لئے کہ کاہن ونجومی جو سنتے تھے اس میں سو جھوٹ ملادیتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں وارد ہوا ہے مزید یہ کہ حضور اکرم ﷺ کا علم نجوم کو باطل کرنا، حضور کی نبوت پر ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے نیز حضور کا ممتاز ہونا ہے تمام غیر انبیاء سے علم

غیب جاننے میں تو عقل کبھی خبر کے جھوٹ جاننے میں مستقل نہیں ہوتی اسی وجہ سے علم نجوم کی تکذیب سے حضور کے بتانے پر ایمان لانے کے سلسلے میں چارۂ کار نہیں جو کہ غیب کی خبریں ہیں اور حضور پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہیں، تو بڑی عجیب بات ہے ان لوگوں کی جو حضور کے بتانے سے علم نجوم کے بطلان کو تو مانتے ہیں مگر (معاذ اللہ) حضور کے غیب داں ہونے کو نہیں مانتے بلکہ انکار کرتے ہیں، واللہ الھادی وھو الموفق ،اللہ ہی ہدایت وتوفیق عطا کرنے والا ہے۔

مذکورہ ابیات اور روایات میں وارد الفاظ غریبہ کی تشریح:

'الوسن' بمعنیٰ حاجت وضرورت، کہا جاتا ہے 'ماھو من ھمی ولا من وسنی" جمع اوسان آتی ہے، کہا جاتا ہے" فضلت الابل اوسانھا من الماء" یعنی اونٹوں نے پانی سے اپنی ضرورت اور حاجت پوری کرلی۔

" الشزن" بمعنیٰ زمین کی سختی اور مخلوق کی سختی اور کسی شئی کے بارے میں ہو تو بمعنیٰ جانب اور دوری ہوتا ہے، جمع "شزن و شزون آتی ہے۔

" الوجن" الواجن بمعنیٰ پتھریلی زمین۔"الجاحی" جمع ہے' جؤ حؤ' کی بمعنیٰ سینے کی اگلی ہڈیوں کا مجمع اور بمعنیٰ کشتی کا اگلا حصہ۔ حضرت علی کی حدیث میں ہے" کانی انظرالی مسجدھا کجؤ جؤ سفینة" یعنی میں اس کی مسجد کو ایسے دیکھ رہا ہوں جیسے کشتی کا اگلا حصہ۔

" القطن" بمعنیٰ پرندے کی دم کی جڑ اور بمعنی انسان کی پیٹ کا نچلا حصہ۔ کہا جاتا ہے 'قطن النار' بمعنیٰ مجوس کی آگ کو جلانے پر مامور خدام۔

'بوغا' بمعنیٰ عام مٹی اور بمعنیٰ وہ مٹی جو انتہائی باریک ہونے کی وجہ سے چھوتے ہی اڑے اور لوگوں میں 'بوغا' ان کو کہا جاتا ہے جو ان میں نچلے طبقے کے اور بیوقوف لوگ ہوتے ہیں۔

'من الطیب بمعنیٰ خوشبو۔

'حثحث العرق،' بمعنیٰ مضطرب ہونا اور کسی چیز کو ہلانا اور کسی آدمی کو کسی کام پر آمادہ کرنا، ابھارنا، برانگیختہ کرنا،۔

'الغطریف' بمعنیٰ سید وسردار' المشیح 'بمعنیٰ تیز رفتار۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع کے تیسرے شعر کی شرح کی جارہی ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦١) وبات ایوان کسریٰ وهو منصدع   کشمل اصحاب کسریٰ غیر ملتئم

(ترجمہ:۔ایوان کسریٰ وہ (شب ولادت حضور علیہ السلام) پھٹ گیا جیسے کسریٰ کے لشکر کی جمعیت پھٹ کر منتشر ہوگئی۔)

تشریح:۔ (وبات) کا" تفرس " پرعطف ہے، اور لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے گویا یوں ہے 'بات فیه' یعنی وہ شب گزارنے کے وقت میں ہوا، اور یہاں وہ شب مبارک مراد ہے جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی،

(ایــــوان) بالکسر یہ چھت دار عمارت کا اسم معرب ہے جس کے اگلے حصہ میں دیوار نہیں ہوتی اور اس کا ہمزہ اصلیہ ہے، اس لئے کہ اگر زائدہ ہوتا تو 'واو' ضرور 'یـــاء' سے بدل دی جاتی، جیسا کہ لفظ 'ایام' میں بدل دی گئی ہے، جبکہ ''ان کی اصل 'اووان' اور 'دووانٔ' ہے! لیکن واواول کو ماقبل کسرہ ہونے کی وجہ سے 'یا' سے بدل دیا، اس لئے کہ 'واؤ ماقبل کسرہ دشوار ہے۔

ایوان کسریٰ

بیان کیا جاتا ہے کہ بنی ساسان نے اس محل کو نوے سال میں تعمیر کیا تھا اور اسے سونے کے پانی سے ملمع کرکے، اس میں زبرجد موتی اور طرح طرح کے بیش قیمتی جواہر نقش کئے تھے، لیکن جب حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کی

رات آئی تو وہ محل لرزنے لگا اور پھٹ گیا جس کی وجہ سے اس محل کے کنگروں سے چودہ کنگرے (یعنی روشن دان) گر پڑے اور صرف نو کنگرے باقی رہے تو صرف چودہ کنگرے گرنے میں اس جانب ایک اشارہ تھا کہ اب اس کے بعد اس ملک کے باقی ماندہ کنگروں کی تعداد جتنے بادشاہ ہوں گے۔ (خرپوتی ص:۱۱۴)

علامہ امام علی ابن برھان الدین حلبی اپنی کتاب " انسان العیون فی سیرة الأمین والمامون" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی ولادت کی رات خانہ کعبہ ہلنے اور کانپنے لگا اور یہی وہ حضور کی ولادت مبارکہ کی پہلی علامت ونشانی تھی جس کو قریش نے ملاحظہ کیا تھا اور اسی طرح ایوان کسریٰ کی عمارت کے ہلنے کے ساتھ آواز سنائی دی یعنی کسریٰ نوشرواں کا محل کانپنے لگا اور پھٹ گیا جبکہ اس کے محل کی عمارت انتہائی مضبوط اور بڑے بڑے پتھروں سے اور چونے سے تعمیر کی گئی تھی کہ بھاری بھاری ہتھوڑے اس پر ذرا بھی کام نہ آتے؟ اس محل کی تعمیر میں بیس سال سے زیادہ انتظار کرنا پڑا تھا اور اس کے پھٹنے کے وقت ایک بہت ہی زیادہ ہولناک آواز سنائی دی گئی، جس کی وجہ سے وہ چودہ کنگرے محل سے گر پڑے، حالانکہ یہ گرنا ایوان کی تعمیر میں کسی طرح کی خرابی یا کمی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا کہ وہ اس کے نبی ﷺ کا ایک ایسا معجزہ ہو جو روئے زمین پر باقی رہے۔

(السیرة الحلبیة: ۱/ ۱۱۷) (باجوری)(زبدة)

علامہ باجوری اور علامہ حلبی نے بیان کیا اور علامہ حلبی نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ رشید نے اپنے وزیر یحیٰ بن خالد کو کسریٰ کے ایوان کو ڈھا دینے کا حکم دیا اس لئے کہ اس تک یہ خبر پہنچی تھی کہ اس محل کے نیچے کثیر خزانہ ہے؛ علامہ باجوری نے بھی اس بات کو ذکر کیا ہے۔

بعینہ علامہ حلبی کے الفاظ نقل کر دیتے ہیں (علامہ حلبی کے الفاظ یہ ہیں کہ) رشید نے پھر یحیٰ سے کہا کہ تم ایسی عمارت ڈھانے جا رہے ہو جو اپنے بنانے والے کی عظمت وفخامت شان پر دلیل ہے۔ وزیر بولا بے شک، پھر رشید نے دوبارہ اسے منہدم کرنے کا حکم دیا تو اس نے اس کو ڈھانے پر بجٹ تیار کیا، جس کو اس نے بہت زیادہ سمجھا، تو اپنے وزیر سے کہنے لگا کہ تمہارے لئے یہ بات اچھی نہیں ہے کہ تم ایک ایسی عمارت نہیں ڈھا پا رہے ہو جو تم لوگوں کے

علاوہ کسی دوسری قوم نے بنائی ہے! تو اس نے اپنے عزم کو سرانجام دینے کی کوشش کی اور س کو ڈھانا چاہا لیکن اس کو منہدم کرنے سے عاجز رہے، جیسا کہ علامہ باجوری نے بھی ایسا ہی ذکر کیا ہے۔

علامہ حلبی اس کے بعد آگے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ایک بات ہوگئی، اور دوسری بات یہ کہ میں نے کسی کتاب میں یہ لکھا دیکھا کہ منصور نے جب بغداد کو آباد کیا تو اس نے ایوان کو ڈھانا چاہا تھا اس وجہ سے کہ اس کے اور کسریٰ کے محل کے درمیان ایک مسافت تھی۔

تو اس نے خالد بن برمکہ سے مشورہ کیا تو اس نے اسے اس سے منع کیا اور کہا کہ وہ اسلام کی ایک نشانی ہے اور جو بھی اسے دیکھتا ہے اسے اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ اس محل کی عمارت اسی وجہ سے قائم ہے کہ وہ اسلام کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی نشانی مٹنے والی نہیں، نیز وہ حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم کے نماز پڑھنے کی جگہ بھی ہے اور اس کو منہدم کرنے میں خرچ کرنا اس پر لاگت لگانے سے کہیں زیادہ ہے۔ (السیرۃ الحلبیۃ: ۱/ ۱۱۷ (الباجوری ص: ۳۵)

علامہ ملا علی قاری، "زبدۃ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ شعر میں مذکور دوسرے کسریٰ سے مراد پہلے والا کسریٰ نہیں ہے اور وہ اضمار کی جگہ میں باب اظہار سے نہیں ہے، اس لئے کہ شعر میں جو پہلا کسریٰ ہے وہ نوشیرواں بن قباذ العادل ہے اور یہ حدیث کہ "میں بادشاہ عادل کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں" اس کی کوئی اصل وحقیقت نہیں ہے۔ جیسا کہ امام بخاری نے فرمایا ہے اور دوسرے کسریٰ سے مراد پرویز بن ہرمز بن مزدجرد بن نوشیرواں ہے اور "شرح المنظومۃ" میں ہے کہ یہی دوسرا والا کسریٰ یعنی پرویز، امام اعظم ابوحنیفہ کے والد کا چچا تھا اور آپ کے شاگرد رشید امام محمد کا بھی سلسلۂ نسب طاؤس تک جاکر امام اعظم سے مل جاتا ہے، ان کا نسب یوں ہے امام محمد بن حسن بن عبد اللہ بن طاؤس۔

"کسریٰ" شاہان فارس کا اسم جنس ہے، اس کی جمع 'اکاسرہ' علی خلاف القیاس آتی ہے، جیسے "قیصر" شاہان روم کو کہتے ہیں، "نجاشی" شاہان حبشہ کو "خاقان" شاہان ترک کو، "فرعون" شاہان مصر کو اور 'تبع' شاہان یمن کو کہتے

ہیں۔

ناظم شعر کا قول (وھو منصدع) یہ ''بات'' کی خبر ہے، اس میں 'واو' زائدہ ہے، خبر کے بیان کی تاکید کے لئے ہے اسم کے ساتھ اور ''کشمل'' یہ حال واقع ہوگا شیخ زادہ کے کہنے کے مطابق، انہوں نے آگے کہا کہ ''کشمل' کو ''بات'' کی خبر بھی بنا سکتے ہیں اور ''وھو منصدع'' کو حال۔ انتھی، (شیخ زادہ ص ۱۱۵)

(کشمل اصحاب کسریٰ) میں 'شمل'، قوم کا مجتمع ہونا اور قوم کے معاملے کا متفرق ہونا دونوں ہی معنوں میں مستعمل ہے۔تو ''شمل'' کے دونوں معنیٰ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔کہا جاتا ہے ''فرق اللہ شملھم'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی جمیعت کو متفرق کردیا۔اور کہا جاتا ہے ''جمع اللہ شملھم'' یعنی ان کی جمیعت متفرق نہ ہو، تو وہ اضداد میں سے ہے۔اور ''کشمل'' یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی یوں بھی ہوسکتا ہے' انصداعا کشمل'

اور یہ قول (کشمل اصحاب کسریٰ) علامہ خرپوتی کے کہنے کے مطابق احتراس ہے اور وہ یہ کہ خلاف مقصود کا وہم دینے والے کلام میں وہ معنیٰ لایا جائے جو وہم کو دفع کرنے والا ہو۔تو اس صورت میں معنیٰ ہوگا کہ ایوان کسریٰ کا پھٹنا یہ کسریٰ کے لشکر کے مشابہ ہے ہمیشہ افتراق وانتشار میں یعنی جیسے اس کا شگاف پُر نہیں ہوسکتا اسی طرح اس کے لشکر منتشر ہونے کے بعد جمع نہیں ہوسکتا۔

قارئین کرام، معنیٰ ''کشمل'' کے متعلق جو بیان ہوا اس سے آگاہ ہوگئے ہوں گے کہ اس لفظ کا معنیٰ اضداد میں سے ہے یعنی 'کشمل' میں خلاف مقصود کا ایہام ہے، اس لئے کہ 'شمل' کبھی بمعنیٰ مجتمع ہوتا ہے اور اسی طرح کبھی بمعنیٰ متفرق ہوتا ہے اور وہ جو اس وہم کو دفع کرتا ہے وہ ناظم کا یہ قول ہے'' غیر ملتئم'' تو اس تقدیر پر محل احتراس' ان کے قول'' غیر ملتئم'' میں ہے نہ کہ ''کشمل'' میں۔

کسریٰ کا واقعہ

مناسب معلوم دیتا ہے کہ اس موقعہ پر کسریٰ کے واقعہ کو بیان کردیا جائے، تو ہم شیخ زادہ اور علامہ خرپوتی سے قصہ نقل

کریں گے، شیخ زادہ بیان کرتے ہیں کہ مروی ہے کہ اس وقت کسریٰ یزدجرد بن شہریار تھا جو آخری کسریٰ تھا اور ملک فارس کا بادشاہ ہوا اور اس کے لئے معاملہ درست ہوا اور اس نے رستم بن فرخ زاد کو سپہ سالار منتخب کر کے کہا کہ یہ تمہارے سامنے خزانیں ہیں اس میں سے تم جو چاہو ہتھیار سونا و چاندی لے لو لیکن بس مجھے ان عربوں سے مطمئن کر دو جو ہمارے ملک میں گھس آئے ہیں! تو رستم خراسان کے راستے سے ہوتا ہوا دو لاکھ افراد کے لشکر میں وادی عراق کی طرف نکلا اور دہقانیوں نے ذمیوں کا عہد توڑ دیا اور مسلمانوں پر ہر جانب سے دفعۃً ٹوٹ پڑے، تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکروں کو پھیر دیا اور حضرت سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالار منتخب فرمایا اور حضرت جریر بن عبداللہ اور حضرت مثنیٰ بن حارثہ کو ان کی اتباع و اطاعت کرنے کا حکم دیا اور یہ دونوں حضرات اس وقت جیش کثیر کے ساتھ عراق میں تھے تو جب حضرت سعد نے ان دونوں کو پالیا تو سب نے مل کر جنگ کے لئے رستم پر خروج کیا اور رستم کا حال یہ تھا کہ وہ ایک کاہن اور نجومی تھا اور عربوں سے جنگ لڑنے کو پسند نہیں کرتا تھا! اور اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ جیسے کسی بادشاہ نے اہل فارس کے تمام اسلحے اکٹھا کر کے نبی اکرم ﷺ کو دے دیئے ہوں اور پھر نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر کو دے دیئے، تو یہ خواب دیکھ کر رستم کا رنج و غم اور اس کی بزدلی اور بڑھ گئی تھی مگر اس نے یزدجرد کے حکم کی تعمیل سے کوئی چھٹکارا نہ پایا جبکہ اس کی فوج میں پانچ ہزار ایسے معزز افراد تھے جو جنگ و جدال کے عادی اور اسلحوں سے لیث بارعب تھے، ان کا حال یہ تھا کہ جنگ کی چکی انہیں کے اوپر گھومتی تھی نیز یزدجرد نے رستم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کی فوج بھی بھیجی تھی، بعض نے کہا نہیں بلکہ دو لاکھ کا لشکر تھا، تو جب دونوں فوجیں میدان میں صف بستہ ہوئیں تو حضرت ہلال بن علقمہ یتمی نے رستم کو نظر میں رکھ لیا اور اس کی طرف قصد کئے رہے تو رستم نے اپنی کمان سے ان کی طرف تیر پھینکا جس کے لگنے سے رکاب نیچے آ گئی اور حضرت ہلال اس پر چڑھ گئے اور اسے قتل کر دیا، اسی وجہ سے تو حضرت سعد نے اس کا تمام مال انہیں کو دے دیا، تو اس کے مال مسلوبہ کی قیمت ستر ہزار کی مالیت کو پہنچی، اس کی ٹوپی کو چھوڑ کر، اس لئے کہ اس کی ٹوپی کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی، اور سپہ سالار کا قتل ہونا ہی تھا کہ اہل فارس کے قدم لڑکھڑا گئے اور انہیں شکست ہوئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص

نے ان کا تعاقب کیا اوران کی جمعیت اور فوج کو منتشر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، اور پھر جب کچھ فوج شکست خوردہ یزدجرد کے پاس آئی اور اسے رستم کے قتل اور قتل گاہ کی خبر دی تو اس نے خزانوں میں سے جتنا ہوسکا مال لے لیا اور مقام نہاوند جانے کا ارادہ کرلیا جو پہاڑوں کی زمین ہے، اور اس کے بعد پھراس کی فوج اور اس کے اصحاب کا لشکر کبھی جمع نہ ہوسکا! باقی قصہ بھی ہمیں پورا کر دینا چاہئے۔ اب علامہ خرپوتی بیان کرتے ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو بہت کثیر مال غنیمت حاصل ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ مجاہدین اسلام نے کفار کے علم سمیت تمام مال غنیمت حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجوادیا، پھر آپ نے اس مال کو مسلمانوں میں تقسیم فرمادیا تو مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے حصہ میں ایک عطیہ آیا جس کو آپ نے دس ہزار دینار میں فروخت کیا۔ (شیخ زادہ ۱۱۵، ۱۱۶) (خرپوتی ص: ۱۱۵)

مذکورہ واقع کا خلاصہ پیش کر دیتے ہیں تا کہ یاد کرنا آسان ہوجائے! تو اب ہم علامہ ملا علی قاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف لطیف 'زبدۃ' سے اس کو بیان کریں گے، آپ یوں تصریح فرماتے ہیں کہ بیان کیا گیا ہے کہ کسریٰ کا ایوان جب ہلنے اور کانپنے لگا تو وہ اور اس کے درباری بہت گھبرا گئے، اس وجہ سے کہ چودہ کنگرے محل سے گر پڑے تھے، تو اس نے ایک قاصد کو نعمان بن منذر عرب کے ایک حاکم کے پاس، اس حادثے کے سربستہ راز کو جاننے کے لئے بھیجا!! تو اس نے خبر کو سطیح تک بڑھادیا حالانکہ کہ سطیح اس وقت تک موت کے قریب ہو چکا تھا! اور اس کا حال یہ تھا کہ وہ ایک عربی کاہن تھا جس کے پورے بدن میں اصلاً کوئی ہڈی ہی نہیں تھی سوائے سر کے تو خبر سن کر وہ کہنے لگا کہ عنقریب اس کے ٹوٹنے اور لرزنے کے مختلف اسباب وعلل ہوں گے لیکن یہ بات طے ہے کہ اس ملک کے عنقریب کنگرے کی تعداد جتنے بادشاہ مریں گے۔ پس اس کے کہنے کے مطابق ہی دس ان میں سے تو چار سال میں ہی مرگئے اور باقی کے چار امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعن کل الصحابۃ کے زمانۂ خلافت میں ہلاک ہوئے۔ (الزبدۃ ص: ۷۰)

گزشتہ اوراق میں ایک فائدے کی طرف اشارہ گزرا کہ کاہنوں اور علم نجوم کا راز زمانۂ فترت میں ظاہر ہوا اور یہ کہ

جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپ نے علم کہانت یعنی علم نجوم کو باطل فرما دیا اور نبی اکرم ﷺ کے ظہور کے وقت، اس کو باطل کرنے میں کیا حکمت تھی؟ مزید اس کا بیان میں کر دینا چاہوں گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اَعْلَم ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ آسمان کی خبر خالص ہو جائے اور وہ کذب اور جھوٹ کی ملاوٹ سے پاک ہو نیز یہ کہ یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ غیب پر مطلع ہونا بہ نبی اکرم ﷺ کے لئے اصل ہے اور حضور ہی پناہ گاہ اور نفوذ امر کا مقام ہیں اور خیر کا سرچشمہ ہیں۔ تو سب کے سب حضور تک ہی منتہی ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کی ذات سے ہی، تمام خیر و برکت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

نیز اس میں یہ حکمت ہے کہ، اللہ کے حکم سے انسان کی قدر و منزلت بلند و بالا ہو کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اس سے جو اس سے کم تر ہیں یعنی جنات وغیرہ اور یہ کہ سب کے سب آپ ﷺ کی جانب بالکلیہ مائل ہوں۔ آپ کے توسل کے طلب گار ہوں اور دنیا و آخرت میں جو ان کے لئے بہتر ہو وہ اس میں اپنے آپ کو آپ کا محتاج سمجھیں۔

زمانۂ ولادت مبارکہ کے بعض عجائب

اب ہم اپنے کلام کا اختتام ان بعض عجائب کے ذکر پر کریں گے جو حضور اکرم ﷺ کی ولادت کے سال ظاہر ہوئے تھے اور ان عجائب پر جو حضور کی شب ولادت ظہور پذیر ہوئے اور وہ خبریں جو خود حضور نے اپنے بارے میں اور اپنے ابتدائی زمانے کے بارے میں عطا فرمائیں۔

علامہ حلبی اپنی کتاب ''انسان العیون'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ سال جس میں رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اسے ''فتح و ابتھاج'' کا سال کہا جاتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش اس سال سے قبل سخت قحط سالی اور پریشانی میں مبتلا تھے کہ اچانک زمین سرسبز و شاداب ہو گئی اور درخت پھلدار ہو گئے اور اس سال، ان کے پاس ہر جانب سے خوشحالی اور آسائش چلی آئی نیز حدیث پاک میں آیا ہے ''قد اذن اللـه تلك السنة لنساء الدنیا ان یحملن ذکورا'' یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور کی ولادت کے سال روئے زمین کی تمام عورتوں کے لئے اولاد نرینہ ہی سے حاملہ ہونا مقدر فرما دیا، اور یہ صرف رسول اللہ ﷺ کی تکریم کے لئے تھا، اور بیان کیا

گیا ہے کہ قریش کی ایک جماعت نے جس میں ورقاء بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل اور عبداللہ بن جحش بھی تھے، بت کے پاس اجتماع کیا، اتنے دن کہ وہ اس رات میں داخل ہو گئے جس شب میں کہ حضور کی ولادت باسعادت ہوئی تھی، تو اچانک انہوں نے دیکھا کہ بت سر کے بل اوندھا پڑا ہے، یہ بات ان کو بالکل پسند نہ آئی تو انہوں نے اس کو اٹھا کر پھر اسی حال پر لوٹا دیا تو وہ پھر سے گر پڑا، انہوں نے پھر اس کو کھڑا کیا وہ پھر گر گیا، تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا، تو یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ یہ تو بہت عجیب بات ہے پھر بعض لوگ اشعار کہنے لگے جس میں وہ بت سے خطاب کرتے اور تعجب کرتے اور اس میں اس بت سے اس کے سرنگوں ہونے کا سبب دریافت کرتے کہ اچانک انہوں نے بت کے اندر سے ہاتف غیبی کو صوت جہیر یعنی بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

تردی لمولود اضاء ت بنوره جمیع فجاج الارض بالشرق و الغرب

(ترجمہ:۔ ہلاک ہوئے بت اس پاک طینت مولود کے باعث جن کے نور سے مشرق و مغرب کے تمام راستے روشن ہیں ﷺ۔)

علامہ حلبی شداد بن اوس کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اسی اثنا میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر خدمت تھے کہ قبیلہ بنی عامر کا ایک شیخ کبیر جو اپنی قوم میں صاحب فضل تھا یعنی ان میں اکرم و افضل تھا، عصا پر ٹیک لگاتے ہوئے آیا اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا، پھر اس نے حضور ﷺ کو آپ کے جد کریم کی طرف منسوب کر کے یوں خطاب کیا، یا ابن عبدالمطلب' مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں عام لوگوں تک، آپ کے پاس اللہ وہ وحی بھیجتا ہے جو حضرت ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے پاس بھیجی تھی، مگر یہ کہ آپنے یہ بہت بڑی بات کہی ہے حالانکہ تمام انبیائے کرام اور خلفاء یعنی معظمین، بنی اسرائیل ہی کے دو خاندانوں میں سے ہوئے ہیں۔ اور آپ تو ان میں سے ہیں جو پتھروں اور بتوں کو پوجتے تھے تو آپ کی اور آپ کی نبوت کی کیا حقیقت ہے؟ حالانکہ ہر حق بات کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے تو آپ مجھے اپنی بات اور اپنی حالت کی حقیقت بیان فرمائیں، تو حضور نبی کریم ﷺ کو اس کا یہ سوال پسند آیا، پھر حضور

نے فرمایا، اے قبیلہ نبی عامر کے باشندے! بے شک یہ بات جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے اس کے لئے ایک مجلس درکار ہے'' تو تم پہلے بیٹھ جاؤ تو وہ اپنے پیر موڑ کر اونٹ کے بیٹھنے کی طرح بیٹھ گیا، تب نبی اکرم ﷺ اس سے مخاطب ہوئے کہ اے بنی عامر میرے دعوے اور معاملے کی حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ بے شک میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہوں کہ انہوں نے بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کی تھی ﴿ ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم اٰيتك ويعلمهم الكتٰب والحكمة ويزكيهم انك انت العزيز الحكيم﴾ (البقرہ: ۱۲۹) اور اس وقت حضرت ابراہیم سے کہا گیا کہ اے ابراہیم بے شک تمہاری دعا قبول ہوئی وہ رسول آخری زمانے میں تشریف لانے والے ہیں، علامہ حلبی نے 'ینبوع الحياة'' سے نقل کیا کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ وہ رسول جن کا ذکر آیت پاک میں ہوا وہ حضرت سیدنا محمد ﷺ ہیں۔ (السيرة الحلبية)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع کے چوتھے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٢) و النار خامدة الانفاس من اسف عليه والنهر ساهی العين من سدم

(ترجمہ: آتش فارس کسری پرغم وافسوس کر کے بجھ گئی اور ندی اپنا راستہ رنج والم کی وجہ سے بھول گئی۔)

ربط: شاعر ذی فہم وہ آیات وعلامات بیان کر چکے جو آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت ظاہر ہوئیں، نیز وہ حوادثات و واقعات بھی بیان کر چکے جو اس موقع پر واقع ہوئے تھے جیسے نظام عالم میں عجیب وغریب اور خرق عادت تغیرات وتبدلیاں، تو اب وہ یہ کہتے ہوئے گویا ہوئے:

والنار خامدة الانفاس من اسف　　　عليه والنهر ساهی العين من سدم

تشریح: (والنار خامدة الانفاس) یہ ابتداء اور خبر کی بنیاد پر مرفوع ہے اور یہ جملہ، سابقہ جملے پر معطوف ہے تو یہ عطف جمل کی قبیل سے ہے، اور " ایوان " پر معطوف ہونے کی تقدیر پر بھی " النار " کا مرفوع ہونا درست ہے۔ اور لفظ ثانی یعنی " خامدة " کا حال واقع ہونے کی تقدیر پر منصوب ہونا بھی صحیح ہے اور (ساهی العين) کے متعلق بھی یہی قول ہے۔

اور لفظ " ساهی " کا اعراب ان کی لغت کے مطابق ہے جو اسم منقوص کو حالت نصبی میں بھی حالت رفعی و جری جیسا اعراب دیتے ہیں (یعنی تقدیری اعراب) اور یہاں عطف، عطف مفردات کی قبیل سے ہے۔

اور شعر میں 'نار' سے مراد آتش اہل فارس ہے اس لئے کہ وہی لوگ اس کو پوجا کرتے تھے اور اس کو جلائے رکھنے کے لئے خدام مقرر کر رکھے تھے تو وہ آگ ایک ہزار سال سے مستقل جل رہی تھی، کبھی نہیں بجھی مگر صرف اسی شب بجھ گئی جس شب میں نور محمدی ﷺ اس دنیا میں ظہور پذیر ہوا حالانکہ اہل فارس کی یہ آگ بہت بڑی تھی لیکن حضور کی ولادت کی شب ایک ہی لمحے میں سرد پڑ گئی جس نے ان کو خوف زدہ کر دیا اور پھر انہوں نے اپنی فہم و فراست سے جان لیا کہ یہ حادثہ عالم میں کسی بہت ہی عظیم امر کے واقع ہونے کی وجہ سے پیش آیا ہے اور حقیقت میں ہوا بھی ایسا ہی تھا (کہ حضور ﷺ تشریف لائے تھے) اور یہی ان کی حکومت و سلطنت کے زوال اور ان کی بری طرح بربادی کا سبب بنا۔

(خامدة) اسم فاعل کا صیغہ ہے " خمدت النار يخمد خمدا و خمودا " سے بمعنیٰ بجھ جانا یعنی آگ کی چنگاری کے باقی رہتے ہوئے آگ کی لپٹوں کا بجھ جانا۔ اور ' همود ' کا معنیٰ آگ کے لپٹوں کا چنگاری اور انگارے کے ساتھ بجھ جانا، تو اس تقدیر پر شعر میں آگ کے بجھ جانے سے مراد آگ کی لپٹوں کا بجھ جانا ہے۔ اور علامہ علی قاری یوں فرماتے ہیں " خمدت و همدت عند ظهور و لادته " ﷺ یعنی بوقت ظہور ولادت نبی ﷺ آتش فارس بجھ گئی، سرد پڑ گئی' اور " والنار خامدة " اس جملے کو حالیہ بھی بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ اس میں جملہ حالیہ ہے

"لقیتك و الجیش قادم"

(الانفاس) یہ نفس بفتح 'فا' کی جمع ہے۔اور یہاں اس سے مراد آگ کی لپٹ اورلو ہے،اوراسی وجہ سے اس میں ''استعارہ مصرحہ'' ہے،آگ کی لپٹوں کو" انفاس' سے تشبیہ دی اور مشبہ کوذکر نہ کر کے صرف مشبہ بہ ذکر کیا اور اس سے مشبہ کو مراد لیا جو آگ کی لپٹ ہے،اور مشبہ کی جانب اس چیز سے اشارہ کیا جو اس کے لوازم میں سے ہے یعنی بجھنا،(یعنی لفظ" خامدۃ "مشبہ کے لوازم میں سے ہے،اوراسی سے لپٹ یعنی مشبہ بہ کی جانب اشارہ کیا۔)

نیز 'الانفاس" کو تخیلیہ بھی بنایا جاسکتا ہے اور 'النار' میں استعارہ بالکنایہ کہا جاسکتا ہے اور یہی بات' النھر' اور 'العین' دونوں لفظ میں کہی جاسکتی ہے تو' عین' تخیل ہے اور 'نھر' میں استعارہ مکنیہ ہے۔

(من اسف) یعنی شدت رنج وغم کی وجہ سے،تو پتہ چلا کہ " من" تعلیلیہ ہے اور 'من اسف' یہ" خامدۃ" کے متعلق ہے اور 'اسف' کا معنی شدت حزن ہے (علیہ) یہ متعلق ہے" اسف" سے اور ضمیر قول اظہر پر' ایوان' کی جانب راجع ہے اور کچھ لوگوں نے ضمیر کا مرجع نبی اکرم ﷺ کو بنانا جائز کہا ہے اور توجیہ یہ بیان کی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہی آتش پرستی چھوڑنے کا سبب ہے، یہ وجہ حسن تعلیل میں سے ہے اور حسن تعلیل کہتے ہیں کہ کسی حکم کا علت مناسبہ کی وجہ سے دعویٰ کیا جائے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ومـا نـزل الـغیـث الالـکـی یـقبـل بیـن یـدیك الثـری

(بارش نہیں برستی ہے مگر صرف اسی لئے کہ اے ممدوح تمہارے قدموں کے آگے پڑی مٹی کو بوسہ دے)

شیخ زادہ نے ضمیر کا مرجع اہل فارس یا اہل کفر کو قرار دیا سیاق وسباق کا اس پر دال ہونے کی وجہ سے جیسا کہ اس قول'' لابویه" میں ضمیر کا مرجع "مولود" ہے۔

"النھر" سے مراد نہر کا پانی ہے،اس کا 'النار' پر عطف ہے۔" ساھی العین" بمعنیٰ غافل العین " من سدم" بمعنیٰ ندامت یعنی تحیر کی وجہ سے راستہ گم کر دینا،اس لئے کہ کوئی بھی نادم کسی نہ کسی طریقے کے تحیر و پریشانی سے عاری نہیں ہوتا اور حیرت،عجائب کے ظہور کی وجہ سے ہوتی ہے،ناظم نے اس شعر اور اس سے پہلے والے شعر کے

معنیٰ کی جانب اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں یوں اشارہ کیا ہے:

وغدا کل بیت نار وفیہ کربۃ من خمودھا وبلاء

(ترجمہ: ہر آگ والا گھر اس حال میں ہو گیا کہ آگ بجھنے سے اس میں غم واندوہ اور پریشانی ہے)

وعیون للفرس غارت فھل کان لنیرانھم بھا اطفاء

(ترجمہ: اہل فارس کے چشموں کے پانی سوکھ گئے، تو کیا آتش فارس اپنے چشموں اور نہروں کے پانی سے بجھی تھی۔)

تو اب شعر کے کلمات کی شرح کے بعد مفہوم بیت واضح ہے کہ آتش فارس کی سانسیں رک گئیں اور اس کی لپٹیں بجھ گئیں اور اہل فارس کے چشمیں اور نہریں سوکھ گئیں اور اس میں پانی بہنا بند ہو گیا اور یہ معنیٰ نہر سے جنس نہر مراد لینے کی صورت میں ہے اور اسی طرف ناظم فاہم کا مذکورہ ذیل شعر نظروں کو پھیر رہا ہے، قصیدہ ہمزیہ میں فرماتے ہیں:

وعیون للفرس غارت فھل کان لنیرانھم بھا اطفاء

(ملک فارس کی نہریں سوکھ گئیں کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی آگ اپنی نہروں کے پانی سے بجھائی گئی ہو۔ (تو آگ بھی بجھ گئی اور نہروں کا پانی بھی سوکھ گیا)

ہم چاہتے ہیں کہ علامہ ابن حجر مکی کی تصنیف لطیف 'افضل القریٰ' سے اس واقعہ کو مفصل بیان کر دیں اور نہر طبریہ کے متعلق جو وارد ہوا اسے بھی بیان کر دیں، نیز علامہ حلبی نے 'انسان العیون' میں جو ذکر کیا ہے، ہم یہاں اسے مختصر ذکر کریں گے، اور کچھ بیان کردہ باتوں کو شعر کی مناسبت کی وجہ سے دوبارہ بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ تکرار یاد کرنے میں معاون ہوتی ہے۔

ہم علامہ ابن حجر مکی کے نسخے سے اپنے کلام کا آغاز کرتے ہیں، آپ قصیدہ ہمزیہ کے اس شعر کے تحت فرماتے ہیں کہ نہریں زمین میں دھنس گئیں یعنی سوکھ گئیں حتیٰ کہ ان میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا، انہیں سوکھنے والی نہروں

میں نہر طبریہ بھی تھی جس میں بہت زیادہ پانی رہا کرتا تھا اور وہ اتنی وسیع اور کشادہ تھی کہ عقل وعادت اس کے سوکھ جانے کو محال جانتی اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس کا طول وعرض چھ میل کا تھا اور اس کو نہر ساوہ کہا جاتا تھا، ایک مشہور شہر کی وجہ سے، اس کے اور شہر "ریّ" کے درمیان بائیس فرسخ کا فاصلہ تھا اور کہا گیا ہے کہ وہ ملک شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ (شرح الهمزيه ص ١٢١)

علامہ حلبی فرماتے ہیں شب ولادت نبی اکرم ﷺ میں ظاہر ہونے والے عجائب میں، اہل فارس کے چشموں اور نہروں کا سوکھ جانا بھی ہے یہاں تک کہ ان میں ایک قطرہ بھی پانی کا باقی نہ رہا، تو ناظم نے قصیدۂ ہمزیہ کے اپنے شعر میں اس وقت یہ سوال کیا یعنی شاعر ذی فہم نے لوگوں سے زجراً وتوبیخاً یہ کہتے ہوئے پوچھا کہ "بتاؤ آخر وہ پانی جو نہروں میں سوکھ گیا تھا کیا اسی پانی سے اس آگ کو بجھایا گیا تھا؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس پانی سے آگ نہیں بجھائی گئی ہے بلکہ آتش فارس کا بجھنا تو صرف حضور نبی اکرم ﷺ کے وجود اور ظہور کے سبب ہوا۔

(اور انہی عجائب میں سے موبذان کا خواب ہے) موبذان نے دیکھا۔ اور موذبان کہتے ہیں اسے جو بڑا قاضی ہو، بڑی آگ کا خادم ہو اور ان کے حکام کا رئیس ہو اور اس سے اہل فارس اپنے دینی و مذہبی سوالات دریافت کرتے ہوں، تو اس نے اپنے خواب میں سرکش اونٹوں کو عربی گھوڑے کھینچتے ہوئے دیکھا۔ اور وہ سواری گھوڑے تھے بار برداری کے گھوڑے نہ تھے۔ دیکھا کہ وہ گھوڑے بغداد کی نہر دجلہ کو پار کر کے اس کے ملک میں پھیل گئے ہیں۔

اور اونٹ جو خواب میں دیکھا، اس سے اشارہ ہے لوگوں کی طرف کہ وہ گھوڑوں کو ہانکیں گے، نیز کسریٰ نے بھی اس شب وہ چیز ملاحظہ کی جس نے اسے گھبراہٹ اور جزع وفزع میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ ایوان کا لرزنا اور کنگروں کا گرنا تھا، تو پھر جب صبح ہوئی تو اس نے دلیری سے کام لیتے ہوئے صبر وسکون ظاہر کیا یعنی وہ چیز جو اس نے دیکھی تھی اس سے گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ تکلیف وہ معاملہ اس کے سرداروں اور بہادروں سے پوشیدہ ہے۔

تو اس نے اپنی مملکت کے بڑے بڑے سپہ سالاروں اور رؤسا کو جمع کیا اور تاج سر پہ رکھ کر اپنے تخت پہ براجمان

ہو گیا، پھر اس نے ان رؤسا کے پاس حاضر بارگاہ ہونے کا پیغام بھجوایا، تو جب وہ سب اس کے پاس جمع ہو گئے تو کہتا ہے کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟ بولے نہیں مگر جو بادشاہ ہمیں بتائے، تو اسی اثناء کہ تمام رؤسا وہاں موجود تھے کہ ان کے سامنے ایک خط، آتش کے بجھ جانے کے متعلق لایا گیا اور ایلیا کے حاکم کی جانب سے ایک خط پیش کیا گیا جس میں نہر ساوہ کے اس رات سوکھ جانے کی خبر تھی پھر، شام کے حاکم کی جانب سے ایک مکتوب لایا گیا ہے جو اس بات کی خبر دے رہا تھا کہ وادی سماوہ اس رات ختم ہو گئی اور طریہ کے حاکم کی جانب سے بھی ایک تحریر لائی گئی جو بتا رہی تھی کہ نہر طبریہ میں پانی نہیں بہہ رہا ہے، تو یہ خبریں سن کر شاہ فارس کا رنج و الم اور بڑھ گیا، اور پھر ان کی باتیں سن کر کسریٰ نے بھی ان کو اس حادثے کی خبر دی جو اس نے مشاہدہ کی اور جس نے اسے ڈرا دیا تھا یعنی محل کا لرزنا اور اس کے کنگروں کا گرنا!!

پھر موبذان بھی بول بڑا کہ خدا ہمارے ملک کو سلامت رکھے، میں نے بھی اس رات ایک عجیب خواب دیکھا تھا اور پھر اس نے وہی اونٹوں کے ہانکنے والا خواب بیان کیا، بادشاہ نے پوچھا کہ اے موبذان! کون سی چیز ہو گی یہ؟ بولا یہ واقعہ عرب کے کسی علاقے میں پیش آیا ہے تو آپ شہر حیرہ کے اپنے گورنر کو پیغام بھیجیں کہ وہ وہاں کے کسی عالم اور جانکار شخص کی رہنمائی کرے اس لئے کے وہاں کہ لوگ زمانے کی سختیوں کے بارے میں اچھی جانکاری رکھتے ہیں!

تو کسریٰ نے اس کے پاس یوں خط لکھا: کسریٰ شاہ شاہاں کی جانب سے نعمان بن منذر کے نام، تحیت وسلام کے بعد حکم یہ ہے کہ تم میرے پاس ایک ایسا عالم اور دانشمند بھیج دو تا کہ میں اس سے کچھ امور دریافت کر سکوں'' تو اس نے عبدالمسیح غسانی کو بھیجا جو چند معمر لوگوں میں سے ایک تھا، ایک سو پچاس سال با حیات رہا۔

بہر حال تو جب وہ حاضر بارگاہ ہوا تو شاہ فارس نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس اس بات کا علم ہو گا جو میں پوچھنا چاہتا ہوں؟

بولا، بادشاہ جو چاہے پوچھ لے، اگر میرے پاس اس بارے میں علم ہو گا، تو میں بتا دوں گا ورنہ تو جو جانتا ہو گا، اس سے دریافت کر لوں گا۔

تب بادشاہ نے اسے ان واقعات وحوادثات کی خبر دی جس کی وجہ سے وہ بلایا گیا تھا، تو وہ سن کر کہنے لگا کہ اس کا علم تو میرے ماموں کو ہوگا (جو مشارف شام یعنی ملک شام میں اونچی اور بلند علاقے میں رہتا ہےاور وہ مشہور ومعروف شہر جابیہ ہے) اس کا نام سطیح ہے، بادشاہ بولا، ٹھیک ہے تم اس کے پاس جا کر اس بارے میں پوچھ آؤ جو میں نے تم سے پوچھا ہےاور اس کا مطلب معلوم کر آؤ تو عبدالمسیح فوراً نکل پڑا یہاں تک کہ سطیح کے پاس پہنچ گیا، حالانکہ سطیح اس وقت موت کے بالکل قریب ہو چکا تھا۔

اس کی عمر اس وقت تین سو سال تھی، ایک قول یہ ہے کہ سات سو سال تھی اور اس کی حالت یہ تھی کہ وہ ملے ہوئے جسم کا تھا، اس کے پورے جسم میں سر کے علاوہ کہیں ہڈی ہی نہیں تھی یعنی اس کے جسم میں نہ ہڈیاں تھیں اور نہ پٹھے، صرف سر اور ہتھیلیاں تھیں، اس کے جسم میں صرف زبان ہل سکتی تھی، اور سطیح کے پاس کھجور کی لکڑی اور پتوں سے بنا ہوا ایک تخت تھا، جب کہیں جانا چاہتا تھا تو اپنے پیروں سے ہنسلی کی ہڈی یعنی گردن کے نیچے کی ہڈی کی طرف موڑتا تھا یعنی اپنے سر تک موڑتا تھا جیسے کپڑا لپیٹا جاتا ہے، تو وہ اس کو تخت پر رکھ دیتا تھا پھر جہاں چاہے جاپاتا تھا، اور جب اس سے کچھ پوچھا جاتا تاکہ وہ اس کے بارے میں مغیبات کا علم دے تو اسے ہلانا پڑتا تھا جیسا دودھ پلانے والی کا پستان ہلایا جاتا ہے تو وہ پھول کر بھر جاتا اور سانس غالب آجاتی ہے، تب اس سے پوچھا جاتا اور وہ ان کی خبریں دیتا تھا!

بہر حال تو عبدالمسیح اس کے پاس پہنچ کر اسے سلام کرتا ہےاور اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن سطیح اس کے سلام کا جواب نہیں دیتا، تب عبدالمسیح وہی اشعار پڑھنے لگتا ہے:

اصم ام یسمع غطریف الیمن آخری ابیات تک جو گزشتہ اوراق میں مذکور ہوئے۔

تو جب سطیح نے عبدالمسیح کے اشعار سنے تو اپنا سر اٹھایا اور سر اٹھاتے اٹھاتے کہتا ہے کہ عبدالمسیح تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سطیح کے پاس آیا، حالانکہ سطیح تو مرنے والا ہےاور قبر میں پہنچ چکا ہے پورے واقعہ تک جو گزر چکا (السیرۃ الحلبیہ ۱/ ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲)

ملاعلی قاری نے اس شعر کی شرح میں ایک عمدہ بات کہی ہے، جو ذکر کر دینے کے لائق ہے، علامہ علی قاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں تصریح فرماتے ہیں کہ اس شعر میں اس جانب اشارہ ہے کہ حادث اور فانی، مستحق عبادت نہیں، بلکہ حیّ جو لا یموت ہے صرف وہی مستحق ربوبیت وعبادت ہے۔

ناظم نے کہا(النھر) مطلب یہ ہے کہ اس مبارک شب اور اس ساعت عظیم میں نہر فرات کا چشمہ، اپنے بہنے اور جاری ہونے کے مقام کو بھول گیا، اور راستہ گم ہونے کی وجہ سے ارض ساوہ میں داخل ہو گیا اور 'ساوہ' دمشق و عراق کے درمیان ایک صحرا کا نام ہے، اور اگر" عین " سے مراد آنکھ ہو تو معنیٰ ہوگا کہ نہر فرات کی آنکھیں مصیبتوں کے اچانک آپڑنے کی وجہ سے راستہ کو یاد نہ رکھ سکیں اور آنکھوں پر اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے راستہ گم کر بیٹھیں۔اسی طرح معنیٰ بیان کیا گیا ہے۔ (الزبدة ص: ۸۰،۸۱)

اقول: ملاعلی قاری کا یہ کہنا کہ"اسی طرح بیان کیا گیا"میں، اس کلام ومعانی کے دقائق وغموض کی طرف اشارہ ہے۔

ملاعلی قاری آگے فرماتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ کی اس ندی کے اوپر ایک بہت بڑا بند باندھا گیا تھا اور اس بند کی تعمیر میں دنیا کی ایک کثیر رقم خرچ کی گئی تھی، بنی آدم نے اس بند کے مثل کبھی دیکھا نہ تھا، اس رات اس ندی کا چشمہ سوکھ گیا، اس سنگ دل انسان کے مثل جس کی آنکھیں قدرت الٰہیہ میں تحیر اور خشیت الٰہی میں بہتی نہیں ہیں(بلکہ خشک ہو گئیں ہیں)

اسی شعر میں اس جانب اشارہ ہے کہ مغیر ومؤثر ربانی وصمدانی کے تبدیل کرنے اور تاثیر کرنے سے جمادات میں تغیرات وتاثیرات واقع ہوتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے﴿ وان الحجارة لما یتفجر منه الانھار و ان منھا لما یشقق فیخرج منه الماء و ان منھا لما یھبط من خشیة الله﴾ اور فرماتا ہے ﴿قلنا ینار کونی بردا و سلاما علٰی ابرٰھیم﴾

اللہ عزوجل فرماتا ہے﴿ تد مر کل شیء بامر ربھا﴾ ،نیز فرماتا ہے﴿ فخسفنا به و بداره الارض﴾

ان تمام باتوں میں اس طبیعت کا رد ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو نیز اس میں اس جانب اشارہ بھی ہے کہ علوم عقلیہ کی نہر جو دقائق فلسفیہ پر مشتمل ہو، اس کا علوم شرعیہ کے سمندر اور معارف حقیقیہ کے چشمے کے سامنے کوئی وجود نہیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٔ و نصلی و نسلم علی رسوله الکريم ، و آله و صحبه الکرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع سے پانچویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٣)وساء ساوة ان غاضت بحيرتها ورد واردها بالغيظ حين ظمی

(ترجمہ:۔اہل ساوہ اپنی ندی کے خشک ہو جانے سے انتہائی رنج والم میں مبتلا ہو گئے تھے اور پانی پینے کے لئے آنے والوں کو غیظ وغضب میں لوٹائے جانے سے بہت غم میں تھے۔)

تشریح:۔ (ساء) بمعنیٰ غم وحزن، اس صورت میں وہ فعل لازم ہے یعنی اہل ساوہ غم وحزن میں مبتلا ہو گئے یا پھر یہ غمگین کرنے کے معنیٰ میں ہے یعنی ''اہل ساوہ کو نہر کے پانی کے سوکھ جانے نے رنج وتکلیف پہنچائی تو اس صورت میں "ساء"فعل متعدی ہوگا۔

(ساوة) برتقدیر اول " ساء" کا فاعل ہے اور (ان غاضت بحيرتها) یہ پورا جملہ 'با' کی تقدیر کے ساتھ محل جر میں ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی، " بان غاضت بحيرتها" اور برتقدیر ثانی (ساوة) مفعول ہوگا " ساء" کا اور (ان غاضت بحيرتها) محل رفع میں اس کا فاعل واقع ہوگا۔ اور " ساوة " سے مراد اہل ساوۃ ہیں جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (وسئل القرية) یعنی اهل قريه ،تو یہ مجاز مرسل ہے، محل ذکر کر کے حال مراد لینے کی قبیل سے ہے یا وہ بحذفِ مضاف مجاز ہے۔

(غاضت) فعل لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہے اور اسی فعل سے یہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ (وغيض

الماء) اور یہ بمعنیٰ " غارت " آتا ہے یعنی پانی کا خشک ہوجانا اور ایک قول یہ ہے کہ " غاصت " ہے جس کا معنی ہوتا ہے پانی کا زمین کی تہ میں پہنچ جانا اور اپنی قدرتی بہنے والی عام سطح سے نیچے اتر آنا۔ اور کہا گیا ہے " غـاظـت " ہے، علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ ناظم شعر کے یہ اس قول (ان غـاضت بحيرتها) کا معنی یہ ہے کہ اس ندی کا پانی پستی میں چلا گیا تھا یعنی بالکل ختم نہیں ہوگیا تھا حتی کہ آگ کی لپٹیں اس کی گہرائی اور تہ سے نکلتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس ندی کی زمین پک رہی ہو، جبکہ وہ ندی بہت وسیع وعریض تھی اس میں ان شہروں کی کشتیاں چلتی تھیں جو ساحل پر آباد تھے اور اس کی لمبائی چھ میل، اس کی چوڑائی کے مثل تھی اور کچھ لوگوں نے کہا اس کا طول وعرض چھ فرسخ کا تھا اور علامہ بکری کہتے ہیں اس ندی کی لمبائی دس میل اور چوڑائی چھ میل تھی اور اس کے اردگرد ان کی عبادت گاہیں اور گرجے تعمیر تھے جو برباد ہوگئے تھے۔ تو اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شعر میں 'بـحـر' کی تصغیر بحیرۃ' تحقیر کے لئے نہیں ہے! (حاشية الباجوری ص ۳)

(رد واردها) معطوف ہے " غـاضت " پر، اور یہ جملہ تاویل مصدر میں ہے اس لئے کہ وہ ا 'ان' مدخول پر معطوفہ ہے یعنی یوں ہے " وان رد واردهـا " یا پھر یہ معطوف ہے " سـاء " پر لیکن قول اول معنیً اقرب ہے اگرچہ اس کا " ساء " پر معطوف ہونا بھی درست ہے اور یہ خیال کرنا کہ " ساء " پر اس کا عطف نہیں ہوسکتاہ، مناسب نہیں۔

اور اس کے منع پر استدلال یہ ہے کہ پھر تو لازم آئے گا کہ ناظم کا قول " رد " وقت ولادت نبی کریم ﷺ کی ایک مستقل علامت کا بیان ہو اور مصرعۂ اولیٰ کا خاتمہ وتتمہ نہ ہو! حالانکہ یہ استدلال باطل ہے۔ جیسا کہ علامہ خرپوتی نے محل منع میں فرمایا ہے۔

اور " ورد " کی 'واؤ' حالیہ بھی ہوسکتی ہے تو اس صورت میں جملہ محل نصب میں حال واقع ہوگا۔ (بـالـغيظ) یہ متعلق ہے " رد " سے اور 'با' یا تو ملابست کا ہے یا مصاحبت کے لئے ہے یعنی غیظ وغضب سے مملو ہوکر یا غیظ وغضب کے ساتھ۔ اور ان کا قول " حين " یہ " واردها " کا ظرف ہے۔ (ظمئ) مہموز لام ہے باب فَـرِح يَفْـرَح سے ' يظما ظما و ظمها وظماء ۃ بمعنیٰ پیاسا ہونا یا سخت پیاسا ہونا اور اس کے ہمزہ کو 'یا' سے بدل دیا گیا ہے اس لئے

کہ حالت وقف وسکون میں ہمزہ ثقیل اور حالت واقف میں ہمزہ کا 'یـــا' سے بدلنا ذائع وشائع ہے تو ضرورت شعری کا دعویٰ کرنے کی حاجت نہیں رہ جائے گی۔

(واردھـــا) یعنی پانی پینے کے لئے پانی کے قریب آنے والا یا پیش آنے والا سابق، بہرحال معنی ثانی پانی کے بالکلیہ ختم ہوجانے اور ان کے غیظ وغضب میں مبتلا ہونے کے معنی کو زیادہ مفید ہے۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں: "ســاوـۃ" نام کے شہر والوں کو دو چیزوں نے انتہائی رنج والم میں مبتلا کیا: ایک تو نہر کے پانی کا سوکھ جانا اور دوسرا پانی پینے کے لئے آنے والے کا غیظ وغضب کے ساتھ پیاسا لوٹنا۔(الباجوری ۳٦)

ان اشعار میں حضور اکرم ﷺ کی عظیم تعریف وتوصیف اور آپ ﷺ کی نبوت پر ظاہر و باہر علامت ہے جو شب ولادت مبارکہ ظاہر ہوئی اور وہ شب مبارکہ مختلف ممالک کے اطراف واکناف میں عظیم تغیرات کے پیدا ہونے کا سبب بنی نیز ان اشعار میں اس پر روشن وواضح دلالت ہے کہ حضور کفر کو مٹانے کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں، اسی وجہ سے (حضور کے تشریف لانے سے) وہ حوادثات پیش آئے جن کا ذکر گزرا یعنی مثلاً آتش فارس کا بجھ جانا، ندی کے پانی کا خشک ہوجانا، پانی پینے کے لئے آنے والے کا پانی پر سے پیاسا لوٹنا اور اپنے آپ پر غصہ ہونا وغیرہ، مزید یہ کہ اس میں اس پر نصیحت اور تنبیہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ ہرگز اپنے بندوں سے کفر وعصیاں پر راضی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مقدر فرمادیا بتوں کا سرنگوں ہونا اور آتش فارس کا بجھ جانا۔

ملا علی قاری، 'زبـدـۃ' میں فرماتے ہیں کہ اس شعر میں اس جانب اشارہ ہے کہ دوزخیوں اور اہل عذاب کا سمندر تو صرف مثل سراب ہوگا کہ پیاسا دور سے اسے پانی خیال کرے گا، برخلاف کوثر کہ جو خیر البشر ﷺ کو عطا کیا گیا ہے، اس لئے کہ جو بھی اس کا ایک گھونٹ پی لے گا تو پھر وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ اور قصیدہ بردہ کے ایک نسخے میں "غـاضت" کے بجائے "غـارت" ہے لیکن "غـاضت" ہی معنیٰ اظہر اور مدعا پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے۔ اور ناظم شعر کے "رد واردھا" کہنے سے نقصان کا وہم رفع ہوجاتا ہے، اور "وارد" کا معنیٰ سابق ہے، (مطلب

کہ جب سابق کو پانی نہیں مل رہا تو لاحق کو کیسے ملے گا۔) نیز پانی کے انقطاع اور ختم ہو جانے کے معنیٰ کو شاعر ذی فہم مزید، آئندہ شعر سے مؤکد کر دیا، کہ فرماتے ہیں:

کأن بالنار ما بالماء من بلل حزنا و بالماء ما بالنار من ضرم

☆☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٤)کأن بالنار ما بالماء من بلل حزناً و بالماء ما بالنارمن ضرم

(ترجمہ:۔ایسا معلوم دے رہا ہے کہ جیسے آگ نے غم کی وجہ سے پانی سے نمی حاصل کر لی ہو اور پانی نے آگ سے حرارت حاصل کر لی ہو۔)

ربط: شاعر ذی فہم کا یہ قول (کأن بالنار ما بالماء من بلل حزناً)، گزشتہ شعر کے مصرعۂ ثانی کی طرف متوجہ کر رہا ہے اور وہ مصرعہ یہ ہے" ورد واردها بالغيظ حين ظمي" اور ناظم کا اس شعر میں یہ قول (وبالماء ما بالنار من ضرم) ، بیت سابق کے مصرعۂ اولیٰ کی طرف رخ پھیر رہا ہے اور وہ مصرعہ یہ ہے" وساء ساوة ان غاضت بحيرتها"

ناظم شعر نے (من برد) نہیں کہا بلکہ کہا (من بلل)! تاکہ وہ آگ کے فنا ہونے پر زیادہ دلالت کرے، آگ بجھنے میں مبالغہ کے لئے۔حلانکہ اگر وہ (من برد) کہتے تو اس معنیٰ پر، اس کی دلالت تام نہ ہوتی اور نہ ہی مبالغہ حاصل ہوتا، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿ينار كونى برداو سلاما على ابراهيم﴾

ناظم نے دوسرے مصرعے میں (من ضرم) کہا!! تاکہ وہ پانی کا، جلتی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہو جانے کے معنیٰ کو

مشعر ہو، اور اسی وجہ سے انہوں نے "من ضرم" کہا، "من حرارة" نہ کہا، اس لئے کہ حرارت پانی کے انقطاع کو مستلزم نہیں ہوتی۔

اور (كَاَنّ) یہ حروف مشبہ بالفعل سے ہے اور اس میں معنیٰ ظن ہوتا ہے۔ (بالنار) یہ ظرف مستقر محل رفع میں، خبر مقدم ہے۔ (مابالماء) اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ محل نصب میں "كَاَنّ" کا اسم مؤخر ہے۔ اور (بالماء) کے متعلق بھی وہی قول ہے جو "بالنار" کے متعلق گزرا اور (من بلل) یہ "ما" کا بیان ہے۔ (حزنا) یعنی بوجہ غم و حزن منصوب ہے اور اس میں عامل مقدر ہے اور وہ ظن ہے جس پر "كـــان" دلالت کر رہا ہے۔ یا پھر حاصل ہوا ہے اس سے جس سے جار مجرور متعلق ہے۔

بہر حال معنیٰ یہ ہوگا کہ اہل ساوہ، اپنے نہر کے سوکھ جانے اور نہر پر پانی پینے کے لئے آنے والے کا پیاسا لوٹ جانے کی وجہ سے انتہائی رنج و غم میں مبتلا تھے یہاں تک کہ وہ یہ گمان کرنے لگے کہ گویا آگ نے آتش غم میں پانی سے نمی حاصل کر لی اور پانی نے آگ سے حرارت حاصل کر لی۔ (بالماء) معطوف محل رفع میں خبر مقدم ہے۔ (مابالنار) اس کا "كانّ" کے اسم پر عطف ہے اور محل نصب میں ہے۔ (من ضرم) یہ "ما" کا بیان ہے۔ اور (وبالماء) میں 'واو' عاطفہ ہے اور 'بالماء' معطوف ہے "بالنار" پر (پہلے مصرعہ میں) اور "بالنار" کا عطف ہے "بالماء" پر۔ تو یہ عطف شيئين بحرف واحد على معمولى عامل و احد" کی قبیل سے ہے، یعنی دو شئی کا، ایک حرف کے ذریعہ، ایک عامل کے دو معمول پر عطف کرنا۔ اور وہ عامل واحد "كَاَنّ" ہے۔

فائدہ: علامہ خرپوتی نے اس کا ذکر کیا ہے کہ "تفسير روح البيان" میں بیان کیا گیا ہے کہ آگ کی پرستش روئے زمین پر سب سے پہلے قابیل نے کی، اس طرح کہ جب اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے سرزمین یمن کی طرف بھگا دیا، تو وہ اپنی بہن کے ساتھ اس جانب نکل پڑا، تب شیطان اس کے پاس آ کر کہتا ہے کہ آگ نے ہابیل کا صدقہ اس لئے قبول کیا تھا کہ وہ آگ کو پوجا کرتا تھا تو تم

بھی ایسا ہی کرو اور آگ کو پوجنا شروع کر دو تو اس نے آگ تیار کر کے اس کی پرستش شروع کر دی، پس اسی طرح قیامت تک اس کی اولاد در اولاد سے کچھ لوگوں نے اس کی پیروی کی۔ (الخرپوتی ص ۱۱۸)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع کے ساتویں شعر تک ہم آ پہنچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٥) والجن تهتف و الانوار ساطعة و الحق يظهر من معنىً و من كلم

(ترجمہ: اور جنات چلا چلا کر خبریں دینے لگے اور روشنیاں پھیلنے لگی اور دین حق معنی (قرآن) اور کلموں (حدیث) سے ظاہر و باہر ہو رہا تھا۔)

ربط: شاعر ذی فہم، آپ ﷺ کی ولادت کے وقت ظاہر ہونے والے عجائب و غرائب کا تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے ذکر کر رہے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے اس شعر میں اس کا چھٹا ذکر اپنے اس قول سے کیا کہ " و الجن تهتف" اور اس کے بعد ساتویں کا ذکر یوں کیا "والانوار ساطعة" یعنی جنات اس طرح چیخنے اور چلانے لگے کہ ان کی آواز سننے میں آ رہی تھی لیکن ان کی صورتیں دکھائی نہیں پڑ رہی تھیں، تو اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ کہ کلام فعل کی تقدیر پر ہے اور جملہ فعلیہ کا جملہ فعلیہ پر عطف ہے، اور وہ فعل مقدر "بات" ہے اھ حال ہے، تو اس تقدیر پر (الجن) بالرفع فعل محذوف (یعنی بات) کا فاعل ہوگا اور (تهتف) محل نصب میں حال ہوگا، یا پھر پورا جملہ محل نصب میں بشارات سے حال واقع ہوگا۔

(والانوار ساطعة) یعنی انوار اتنا بلند ہوئے کہ تمام مکانات روشنی سے پُر ہو گئے اور تمام جوانب و جہات میں پھیل گئے۔ ناظم فاہم نے اسی مفہوم کی طرف اپنے قصیدہ ہمزیہ میں یوں اشارہ کیا:

وتـوالــت بشــرى الهـواتف ان قـد ولــد الــمــصــطــفــیٰ و حـق الهـنـاء

(یعنی ہاتف غیبی پے در پے بشارتیں دیتے رہے کہ مصطفیٰ جان رحمت تشریف لے آئے ہیں اور خوشیاں برآئیں ہیں)

اور پھر ناظم نے نور نبی ﷺ پھیلنے کے سلسلے میں جو کچھ بھی اجمال تھا، اس کی تفصیل کی اور اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں اس اجمال کی کچھ تفصیل کی طرف یوں اشارہ کیا:

وتـرأت قــصــور قـيـصـر بـالـروم يــراهـــا مـــن دارهـــا البـطــحـــاء

(یعنی نور اتنا بلند ہوا کہ قیصر روم کے محل نظر آنے لگے کہ مکہ معظّمہ میں اپنے گھروں سے انہیں دیکھا گیا۔)

(الجن) کئی طرح مستعمل ہے، ایک معنیٰ یہ ہے کہ یہ اسم جمع ہے، اور 'انـــــس' کی ضد ہے اس کا واحد ''جنی'' اور مؤنث 'تا' کے ساتھ آتی ہے۔ " الجن من كل شيء" بمعنیٰ شئ کا اول، اور اس کی تازگی اور اس کی شدت، کہا جاتا ہے 'جن الشباب' بمعنیٰ آغاز وعنفوان جوانی" جن النبات" بمعنیٰ پھول کلی۔

ان اشعار (یعنی میلاد مصطفیٰ ﷺ کے متعلق ابیات) کی شرح سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ صوفیائے کرام صاف وشفاف مشرب کے ذریعہ صحابۂ کرام کے مشرب و مذہب کا قصد کرتے ہیں وہ مذہب ومشرب جو کہ قرآن و سنت سے مستمد ومستفاد ہے اور یہ کہ اہل سنت و جماعت تو صحابۂ کرام کے ہی مسلک پر جاری ہیں، اللہ ورسول پر ایمان لانے کے سلسلے میں، عزوجل وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

علامہ حلبی نے تین روایتیں (حضور اکرم ﷺ کے وقت ولادت سے متعلق) بیان کی ہیں:

اس میں سے کچھ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے حمل کے شروع میں اور ولادت سے کچھ پہلے ایک نور دیکھا، طوالت کے خوف سے روایت کو مختصرا بیان کیا گیا ہے۔ اور روایت کا ایک حصہ یہ ہے کہ وضع حمل کے وقت بھی نور دیکھا گیا، مزید اس میں ہے کہ آپ ﷺ کا نور پاک پھر ملک شام کے تمام بلاد کی طرف بڑھ گیا اور آپ کا نور تمام بلاد کو اتنا روشن وعام تھا کہ عورتوں نے اونٹوں کی گردنوں تک کو دیکھ لیا۔

واقعۂ جن

اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم وہ حدیث پانے میں کامیاب ہوگئے جس میں سیدنا سواد بن قارب نے اپنے اسلام لانے کی داستان بیان کی ہے، نیز اس خبر میں اس واقعہ کا بیان ہے اور وہ اشعار بھی ہیں جن کے ذریعہ حضرت سواد بن قارب نے حضور نبی اکرم ﷺ کی مدح کی لہذا ہم امام حلبی کی " انسان العیون " سے قصہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ" حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سواد بن قارب سے فرمایا کہ سواد اپنے اسلام لانے کی خبر دو، تم کیسے اسلام لائے؟ بولے جی امیر المومنین، ایک رات میں سونے اور جاگنے کے درمیان تھا کہ اچانک میرا آقا جن میرے پاس آیا اور مجھے لات مار کر کہتا ہے، سواد اٹھ جا اور میری بات سن اور اگر سمجھ سکتا ہے تو سمجھ کہ بے شک اللہ کے رسول ﷺ لؤی بن غالب کی نسل سے مبعوث ہو چکے ہیں، جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور عبادت الٰہی کی دعوت دیتے ہیں، پھر وہ یہ اشعار پڑھنے لگا:

عجبت للجن و تطلابها   و شدها العیس بأ قتابها

تهوی الی مکة تبغی الهدی   ما صادق الجن ککذابها

فارحل الی الصفوة من هاشم   لیس قد ماها کاذنابها

حضرت سواد کہتے ہیں کہ پھر میں نے اس سے کہا کہ مجھے سونے دو اس لئے کہ مجھے نیند آرہی ہے!

پھر جب دوسری رات ہوئی تو وہ پھر میرے پاس آیا اور مجھے لات مار کر کہتا ہے، سواد بن قارب اٹھ جا اور میری بات سن اور سمجھنے کی کوشش کر کہ بے شک لؤی بن غالب کی اولاد سے ایک رسول تشریف لا چکے ہیں جو اللہ عزوجل کی طرف اور اس کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں اور پھر وہی اشعار پڑھنے لگا:

عجبت للجن و تخبارها   و شدها العیس بأ کوارها

تهوی الی مکة تبغی الهدی   ما مؤمن الجن لکفارها

فارحل الی الصفوة من هاشم   بین روابیها واحجارها

تو میں نے پھر وہی کہا کہ مجھے سونے دو، مجھے نیند آ رہی ہے!

اور پھر جب تیسری رات ہوئی تو وہ پھر میرے پاس آیا اور مجھے لات مار کر وہی کہنے لگا کہ سواد بن قارب اٹھ کر میری بات سن اور سمجھنے کی کوشش کر کہ بنی لوی بن غالب سے ایک رسول مبعوث ہو چکا ہے جو اللہ کے دین اور عبادت الٰہی کی دعوت دیتا ہے، پھر وہی اشعار سنانے لگا:

عجبت للجن و تحساسها | و شدها العيس بأحلاسها
تهوى الى مكة تبغى الهدى | ماخير الجن كانحاسها
فارحل الى الصفوة من هاشم | وارم بعينيك الى راسها

تو اب تیسری بار میں اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے دل کا امتحان لیا ہے تو میں نے کوچ کرنے کے لئے اونٹ کو تیار کیا، پھر میں مدینہ پہنچ گیا اور ایک روایت میں ہے کہ یہاں تک کہ میں مکہ مکرمہ آ گیا اور یہ جیسا کہ امام بیہقی نے کہا اول کے بالمقابل صحت سے زیادہ قریب ہے یعنی اس لئے کہ صرف جن مکہ معظّمہ میں آپ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے آئے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ موجود ہیں اور آپ کے اصحاب آپ کے اردگرد موجود ہیں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ لوگ اردگرد موجود تھے اور ایک روایت میں ہے کہ لوگ حضور کے اردگرد گھوڑے کے ایالی (گھوڑے کی گردن کے لمبے لمبے بال) کی طرح موجود تھے تو جب حضور کی نگاہ ناز مجھ پر پڑی تو فرمایا کہ 'خوش آمدید سواد بن قارب! ہم جانتے ہیں تم کیا لے کر آئے ہو، بولے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے کچھ اشعار کہے ہیں، تا کہ یا رسول اللہ آپ میرے اشعار سماعت فرمالیں، حضور نے ارشاد فرمایا لاؤ، سناؤ تو میں یہ اشعار پڑھنے لگا:

اتانى نجيى بعد هدء ورقدة

اور ایک روایت میں ہے۔

اتانى رئيى بعد ليل وهجعة | ولم يك فيما قد تلوت بكاذب

(میرے پاس میرا سردار ابتدائی رات میں تھوڑی سی نیند کے بعد آیا اور اس کی جو خبر میں نے بعد والے اشعار میں ذکر کی ہے، وہ اس میں وہ جھوٹا نہیں ہے۔

اتـــاك رسـول مـن لـؤی بـن غـالـب ثـــلاث ليـــال قــولـــه كـل ليـلـة

(وہ میرے پاس تین رات مسلسل آیا اور ہر رات ایک ہی بات کہی لوی بن غالب کی اولاد میں سے ایک رسول تمہارے پاس تشریف لا چکے ہیں۔)

فشـــمـــرت مـــن ذيـــل الازار وو سطت بی الذعلب الوجناء بين السباسب

(تو یہ خبر سن کر میں نے روانہ ہونے کے لئے اپنا تہ بند نیچے سے اٹھالیا (یعنی فوراً کوچ کرنے کے لئے بالکل تیار ہوگیا) پھر تیز رفتار سخت اونٹنی مجھے بیابانوں میں سے لے کر آئی۔)

فـــاشهـــد ان الـلـــه لا رب غيـره و انك مـــامـون عـلـــى كـل غـائـب

(تو اب میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی پالنہار نہیں اور بے شک آپ ہر غائب پر مامون ہیں۔

وانك ادنـــىٰ الـمـرسـليـن وسيلة الى الـلـه يـا ابـن الاكرمين الاطـايب

(اور اے ابن الاکرمین والاطیبین آپ تمام انبیاء ومرسلین میں اللہ کی بارگاہ تک پہنچنے کا سب سے قریب تر وسیلہ ہیں۔)

وكـن لـی شـفيـعـا يوم لا ذو شفـاعة سـواك بـمغـن عـن سـواد بـن قـارب

(تو آپ قیامت کے دن میری شفاعت فرمادیں کہ جس دن آپ کے سوا کوئی سواد بن قارب کا شفیع نہ ہوگا۔)

اور ایک روایت میں یہ شعر یوں ہے:

وكـن لـی شـفيـعـا يـوم لا ذو قـرابة بـمـغـن فتيلا عـن سـواد بـن قـارب

آگے فرماتے ہیں کہ میرے یہ اشعار سن کر نبئ کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب بہت خوش ہوئے یہاں تک کہ ان کے چہروں پر مسرت کے آثار نمایاں تھے یعنی رسول اللہ ﷺ اس قدر مسکرائے کہ آپ کے دندان مبارک نظر آ گئے

اور پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ ''سواد تم کامیاب ہو'' (حضرت سواد آگے فرماتے ہیں کہ) پھر میں نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ آپ نے ان کو چمٹایا اور فرمایا کہ سواد! مجھے تم سے یہ حدیث سننے کی بڑی خواہش تھی، اچھا یہ بتاؤ کہ راز دار دوست (یعنی جن) اس دن (ایمان لانے) کے بعد پھر کبھی تمہارے پاس آیا؟ بولے قرآن پاک پڑھنا شروع کرنے کے بعد سے تو نہیں آیا۔ اور کتنا اچھا بدلہ اور عوض ملا ایک جن سے، اللہ کی کتاب نیز یہ کہ سیاق کلام بتا رہا ہے کہ حضرت سیدنا عمر اس وقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر نہیں تھے جب حضرت سواد نے ان کو خبر دی۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع سے اب آٹھویں اور نویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٦) عموا وصموا فاعلان البشائر لم تسمع و بارقة الانذار لم تشم

(ترجمہ: (وہ جن کی قسمت میں کفر تھا) اندھے اور بہرے ہوگئے، اسی وجہ سے حضور علیہ السلام کی بعثت کی بشارتوں کے اعلان کو نہ سن سکے اور نہ ہی ڈرانے والی بجلیوں کی طرف نظر کر سکے۔)

(٦٧) من بعد ما اخبر الاقوام كا هنهم بان دينهم المعوج لم يقم

(ترجمہ:۔ باوجودیکہ مختلف قوموں کے کاہنوں اور نجومیوں نے اپنی اپنی قوموں کو آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کجی والا جھوٹا دین اب قائم نہیں رہ سکے گا۔)

ربط: شاعر ذی فہم ایک سوال کا جواب دے رہے ہیں جو قائم ہو رہا تھا ماسبق میں اس شعر پر:

والجن تهتف والانوار ساطعة و الحق يظهر من معنى ومن كلم

گویا کوئی شخص اعتراض کررہا ہے کہ آخر پھر لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ بشارتیں سننے کے بعد اور روشن و واضح دلائل کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی انکار میں مصر ہیں اور کفر کررہے ہیں؟ تو شاعر ذی فہم معترض کو یوں جواب دیتے ہیں کہ کفار کا انکار کرنا ان کے بغض وعناد کی وجہ سے ہے اور اس وجہ سے ہے کہ منکرین نے اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتوں پر عمل نہ کیا تو گویا وہ اندھے اور بہرے ہیں، تو اسی مفہوم کو ناظم شعر یوں بیان کرتے ہیں:۔

عموا وصموا فاعلان ابشائر لم　　　تسمع و بارقةالانذار لم تشم

من بعد ما اخبر الاقوام کاهنهم　　　بان دینهم المعوج لم یقم

تشریح: (عموا و صموا) یہ جملہ مستانفہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے جس کا بیان ابھی اوپر گزرا اور اس میں استعارہ تصریحیہ تبعیہ ہے جو پہلے مصدر میں جاری ہوا، پھر مصدر سے فعل مشتق ہوا اور مشبہ بہ کا ذکر کرکے مشبہ مراد لیا اور مشبہ، کفار کا عدم التفات اور انوار و اخبار کے انتفاع سے اعراض کرنا ہے یا پھر اس میں استعارہ تمثیلیہ ہے جس کا بیان کئی مرتبہ گزر چکا ہے۔ اور (الاعلان) بمعنی اظہار ہے یہ مصدر مفعول بہ کی طرف مضاف ہے، (البشائر) "بشیر" کی جمع ہے اور وہ بمعنیٰ "مبشر" ہے یعنی خوش خبری دینے والا' اور کبھی خبر کو مجازاً اس سے موصوف کردیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "البشائر" 'بشیرۃ' بمعنیٰ مسرت کی جمع ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ 'بشارت' کی جمع ہے اور بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جو چہرے کی رونق کا سبب ہو۔ بہرحال معنی یہ ہوگا کہ گویا کفار و منکرین اندھے اور بہرے ہوگئے تبھی تو انہوں نے حضور آقائے نامدار ﷺ کی تشریف آوری کے بارے مین مخبرین کی خوش خبریوں اور بشارتوں کے اعلان کو نہ سنا اور نہ قبول کیا یعنی سماعت قبول سے نہ سنا) جیسا کہ سماعت قبول سے سننا اس قول میں ہے: (سمع الله لمن حمده) یعنی یہاں سماعت بمعنیٰ قبول کرنا ہے، یا معنیٰ یہ ہے کہ جب انہوں نے اس کے مقتضا کے مطابق عمل نہیں کیا تو وہ بہروں کی طرح ہیں اور گویا انہوں نے سنا ہی نہیں۔

اور لفظ "اعلان" کے ہمزہ پر فتحہ پڑھنا بھی اس صورت میں درست ہوسکتا ہے کہ وہ 'علن' بمعنیٰ علانیہ کی جمع ہو،

'زبدۃ' سے یہی مستفاد ہے اور" اعلان" کو صفت بھی بنایا جا سکتا جو" البشائر" کی جانب مضاف ہے۔ تو معنیٰ ہوگا کہ بشارات ظاہرہ نہیں سنی گئیں اور انذارات کی بجلیاں نہیں دیکھی گئیں (بــــارقة) یعنی چمک ،مصدر ہے بمعنیٰ برق، بجلی جیسے "كـاذبة" بمعنیٰ کذب ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ﴿ليـس لـو قـعتهـا كـاذبة﴾ نیز نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی اس کی تائید کر رہا ہے" كـفـى ببـارقة السيـوف على راسه فتنة"، 'بارقۃ' بریق السلاح کے معنی میں بھی آتا ہے۔

(انذار) ایسی خبر دینا جس میں انجام سے ڈرانا ہو، (لم تشم) یہ" شام البرق" سے بمعنیٰ بجلی کی طرف نظر کرنا، (من بعد ما اخبر الاقوام كاهنهم) یہ جملہ متعلق ہے" صموا" سے یا "لم تسمع" سے یا پھر"عموا و صموا" سے ایک ساتھ متعلق ہے اور اس میں تنازع فعلان ہے، وہ دو فعل جو ما قبل میں مذکور ہوئے (یعنی عموا وصـمـوا)۔ (الـمـعـوج) الاعوجـاج' مصدر سے بمعنیٰ ٹیڑھا یعنی محسوس ومشاہدے میں سیدھا نہ ہونا لیکن (اعـوجـاج) کا معنیٰ یہاں یہ ہے کہ) شئی کا (محسوس نہیں بلکہ) معقول میں اس طریقے پر ہونا جو مناسب نہیں، اور اعوجاج یہاں اسی معنیٰ میں" دينهم" کی صفت ہے۔

(دين) کہتے ہیں وہ طریقہ اور راستہ جس کو اہل دین اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے تابع رہتے ہیں۔ (لـم يـقم) بمعنی قائم ودائم نہ رہنا: " قـام يـقـوم قوما وقيامة وقومة" سے کھڑا ہونے کے معنیٰ میں ہے، اور جب گرم بازاری ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ "قامت السوق"

(كـاهـنهم) بالرفع "اخبر" کا فاعل ہے، اور كاهن اسے کہتے ہیں جو اس بات کی خبر بتاتا ہے جو جن اس کی جانب القا کرتا ہے، جیسا کہ اس طرف ماسبق میں اشارہ ہو چکا ہے یا وہ ہوتا ہے جو ستاروں کی تاثیرات سے پیشین گوئی کرتا ہے اور اس کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے کہ کـاهن وہ ہوتا ہے جو بغیر وحی کے ذریعہ انوکھی اور عجیب بات کی پیشین گوئی کرتا ہے یعنی مغیبات کے بارے میں اس کی خبر کسی رسول ﷺ پر موقوف نہیں ہوتی ہے۔ اور " المفردات" میں ہے کہ کاھن وہ ہوتا ہے جو گزرے ہوئے زمانوں کی پوشیدہ باتوں کی ظنی خبریں دیتا ہے، جیسے

کہ 'عرّاف' وہ ہوتا ہے کہ جو آنے والے زمانے کی خبر دیتا ہے۔ وغیرہ ذالك

یہ دونوں پیشے اس ظن پر مبنی ہوتے ہیں جو خطا و صواب کا احتمال رکھتا ہے، آقا علیہ السلام نے فرمایا" من اتی عرافا و کاھنا فصدقه بماقال فقد کفر بما انزل الله علی محمد" یعنی جو کاہنوں اور نجومیوں کے پاس جا کر اس کی خبر کی تصدیق کرے تو بے شک اس نے محمد ﷺ پر اتری ہوئی وحی الٰہی کا انکار کیا' اس حدیث پاک کے تحت علما فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس کے حق میں ہے جو نجومیوں اور کاہنوں کے صدق کا اعتقاد رکھے مگر جس نے ان سے استہزاء یا ان کی تکذیب کرنے کے لئے کچھ پوچھ لیا تو وہ حدیث پاک کے اس حکم میں داخل نہیں۔

قلت: یا کسی اور غرض کے لئے پوچھ لیا ہے لیکن کاہن کی خبر پر اعتماد نہیں کیا اور نہ اس کو سچ جانا اور نہ ہی اس کی یقینی طور پر تصدیق کی (تو وہ بھی اس حکم میں داخل نہیں) دوسری حدیث پاک کے قرینے سے اس کے خلاف کا احتمال باقی نہیں رہ جاتا وہ دوسری حدیث یہ ہے " من صدق کاھنا لم تقبل منه صلوٰۃ اربعین یوما و لیلة" یعنی جس نے کاہن کی تصدیق کی تو اس سے چالیس دن رات ک نمازیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

علامہ ابن مالک فرماتے ہیں کہ میرے لئے توفیق الٰہی میں یہ بات روشن ہوئی کہ کاہن کی تصدیق کرنے والا اگر یہ اعتقاد رکھے اور تصدیق کرے کہ" کاہن غیب داں ہے" (۱) تو وہ کافر ہو گیا۔

اور اگر وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ خبر کاہن کو من جانب اللہ الہام ہوئی یا" جن" بتاتا ہے جو وہ ملائکہ سے سنتا ہے اور اس نے اسکی تصدیق کر دی! تو اس صورت مں وہ کافر نہیں ہوگا۔ انتھی

ایسا ہی علامہ خرپوتی کی شرح میں مذکور ہے۔ ہماری جانب سے درمیان کلام میں مختصر سی تبدیلی کے ساتھ (الخرپوتی ص۱۲۱)

(۱) حاشیہ: مثلاً اس طرح اس کے غیب داں ہونے کا اعتقاد رکھے جس طرح ایک نبی کے لئے علم غیب اصل ہوتا ہے یا اسے مستقل بعلم الغیب مانے بغیر اللہ کے بتائے (تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اس تاویل پر قرینہ ان کا مابعد والا یہ قول ہے (ما اذا اعتقد------)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

بعون اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم قصیدہ بردہ شریف کی فصل رابع کے آٹھویں اورنویں شعر کی شرح سے فارغ ہولئے اور اب اسی فصل کے دسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہاہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٨)وبعد ما عاینوا فی الافق من شهب منقضة وفق مافی الارض من صنم

(ترجمہ:۔مزیداس کے باوجود (کفارومنکرین حق دیکھنے سننے سے اندھے بہرے ہوگئے کہ)انہوں نے آسمان کے اطراف میں تاروں کواس طرح گرتے ہوئے دیکھا جس طرح زمین میں اصنام گررہے تھے)

تشریح:(وبعد ماعاینوا) کاعطف ہے "من بعد ما" پرجومجرورہے 'من' سےاور " من"عطف کے طورپرہے " من بعد ما اخبر الاقوام کاهنهم'پراورمعطوف علیہ کامحل،نصب ہے۔اور"ما" موصولہ ہے (عاینوا) " المعاینیة" مصدرسے بمعنیٰ انکشاف تام اورکسی شئی پربلاکسی شبہ کےمطلع ہونااس کامفعول ضمیر محذوف ہے،تقدیری عبارت یوں ہوگی" بعد ما عاینوهٗ " (فی الافق) یہ متعلق ہے "عاینوا" سے" الافق" 'فا' کےسکون کےساتھ ایک لغت ہے " الافُق "میں اوراس سےمرادآسمان کےاطراف ہیں استغراق جنس پربنا کرتے ہوئے۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہاں آسمان ہے نہ کہ اس کا حقیقی معنیٰ یعنی آسمان کے وہ اطراف جو زمین سے ملے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے کہ اس کے اصل معنی یعنی آسمان کے اطراف ہیں کواکب کا وجودنہیں ہوتا(ص۳۸)

(من شُهُب) یہ'ما'موصولہ کابیان ہے۔ (الشهب) بضمتین "شہاب" کی جمع ہے بمعنیٰ روشن ستارے نیز بمعنیٰ اورآگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ اوراصح یہ ہے کہ وہ ستاروں کی آگ اورروشنی کا نام ہے نہ کہ نفس کواکب کا اس لئے

کہ ستاروں کی روشنی تو آسمان میں اپنی جگہ پر قائم وثابت رہتی ہے اور وہ تو صرف آگ کے شعلیں ہیں، اسی وجہ سے گرنے اور ٹوٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ وہ تو وہ آسمان میں قائم اور اپنے حال پر مستقر ہیں۔

(وفق) بفتح الواو، وسکون الفاءٔ و فق الشئی سے بمعنیٰ قدر ومطابقت اور یہ اسم جمع ہے 'متوافق' کے معنیٰ میں اور نزع خافض کی بنیاد پر منصوب ہے یعنی یوں ہے 'علی وفق' یا وہ مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی تقدیر ایسے ہوگی، انقضاضا مثل انقضاضٍ یا تمییز ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے۔

(منقضة) بمعنیٰ ساقط اور اعراب کی تینوں وجہوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، یعنی اس پر مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے رفع بھی جائز ہے۔ حال ہونے کی وجہ سے نصب بھی اور ''شهب'' کی صفت ہونے کی وجہ سے خبر بھی جائز ہے۔

(فی الارض) ظرف مستقر اور تقدیر یوں ہے" مثل ماکان فی الارض من صنم" یعنی جس طرح آسمان میں ستارے گرے اسی طرح زمین میں بت گرے''

(من صنم) یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ اور 'صنم' کا معنیٰ ''وثن'' ہے تو یہ دونوں مترادفین ہیں یا 'صنم' کہتے ہیں بغیر جسم کی صورت کو اور 'وثن' اس مورتی کو کہتے ہیں جس کا لکڑی یا پتھر وغیرہ کا جسم ہو۔

بالجملہ ان تمام مذکورہ باتوں کی تائید امام رازی کی تفسیر میں مذکور ان کے یہ اقوال کررہے ہیں: حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھالینے کے بعد سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک تارے نہیں ٹوٹے مگر پھر بعثت کے بعد تارے گرائے جانے لگے، اسی وجہ سے قریش نے بعد بعثت ایسی عجیب چیز دیکھی جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی (الی ان قال) اور درستگی کے زیادہ قریب یہ قول ہے کہ "شهب" حضور کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھے مگر بعثت کے بعد ان کو زیادہ کردیا گیا اور ان کی روشنیوں کو اکمل اور پہلے سے زیادہ قوی کردیا گیا یہی وہ وجہ ہے جس پر قرآن پاک کے الفاظ دال ہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے (فوجدنها ملئت) یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حادث وہ ملیٔ وکثرت ہے (یعنی جو ہوا وہ ملء وکثرت

ہے)اوراسی طرح یہ فرمان باری تعالیٰ بھی اس پر دال ہے ﴿نقعد منھا مقاعد﴾ یعنی ہم نے اس میں بعض جگہوں کوسیاروں اور ستارون سے خالی پایا اور پھر بعد میں ان خالی جگہوں کو پُر کر دیا گیا۔

مزید اس کی تائید 'سیرت حلبیہ' بھی کر رہی ہے، علامہ حلبی فرماتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جائے گا کہ شیاطین بعثت سے پہلے کبھی ستاروں سے نہیں مارے گئے بلکہ وہ تو صرف وقت ولادت حضور ﷺ ہوا!! اس لئے کہ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بعد بعثت شیاطین جتنا رجم کئے گئے اتنا پہلے نہیں کئے گئے تھے۔ (۳۳۶/۱)

نیز سیرت حلبیہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت موجود ہے، فرماتے ہیں کہ (حضور کی بعثت سے بہت پہلے) شیاطین آسمانوں میں داخل ہونے سے نہیں روکے گئے تھے بلکہ وہ اس میں داخل ہوکر، وہ خبریں لے آتے جو دنیا میں عنقریب ہونے والا ہوتا اور پھر وہ خبریں کاہنوں پر القا کر دیتے تھے، تو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو وہ تین آسمانوں سے روک دیئے گئے اور حضرت وھب سے ہے کہ چار آسمانوں سے روک دیئے گئے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی تو وہ سبھی شیطان جب خبر چوری کرنے کے لئے آسمان کی طرف بڑھتے تو وہ ستاروں سے مارے جاتے۔ (السیرة الحلبیة ۱/ ۱۱۲)

قلت: علامہ باجوری کے کلام کا مفاد یہ ہے کہ شیاطین کو تاروں سے کئی دفعہ مارا گیا ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ کی ولادت کی شب اور دوسری مرتبہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت، تو علامہ رازی نے اپنی تفسیر میں اسی دوسری دفعہ والی وجہ پر اختصار کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

یہ قصیدہ بردہ کی فصل رابع کا گیارہواں شعر ہے، اس کی شرح کی جارہی ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(٦٩) حتی غدا عن طریق الوحی منهزم   من الشیاطین یقفوا اثر منهزم

(ترجمہ:۔ حتیٰ کہ شیاطین وحی کے نزول کے راستے سے ایک کے پیچھے ایک بھاگ کھڑے ہوئے۔)

تشریح: گزشتہ شعر میں مذکورہ شہاب اور ستاروں کے ٹوٹنے پر جو معنیٰ مرتب ہوتا ہے، یہ شعر اسی معنیٰ کا بیان ہے، اور وہ شیاطین کا زمین پر اترنا، گر پڑنا ہے جس وقت کہ انہیں ستاروں سے رجم کیا گیا اور ان کا وحی کے آنے کے راستوں سے دور ہو جانا یعنی آسمان کے ان دروازوں سے ان کا دور کر دیا جانا جن سے وحی آتی ہے، اور 'وحی' کے کئی معانی ہیں: لکھنا، اشارہ کرنا، پیغام بھیجنا، پوشیدہ باتیں کہنا، اور ہر وہ خبر جو تم کسی دوسرے کو بتاؤ تاکہ وہ اسے جان لے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نبیوں پر جو غیب کی خبریں القا کرتا ہے، اور لوگوں کے درمیان جو آواز ہوتی ہے مکتوب، کتاب خط وغیرہ معانی میں مستعمل ہے اور یہاں وہ انبائے غیبیہ مراد ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے نبی اکرم ﷺ تک آتی ہیں۔

(حتی) عاطفہ ہے، یا ابتدائیہ یا بمعنیٰ ''الی'' ہے تو اس صورت میں صرف جارہ ہوگا، معنیٰ اول کی تقدیر پر 'غدا' معطوف ہوگا ''منقضة'' پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کے طور پر (فالق الاصباح و جعل اللیل سکنا) یعنی دراصل یوں عطف ہے "وجاعل اللیل سکنا"

اس کی بھی تقدیری عبارت اس طرح ہوگی" بعد ما عاینوا من شهب منقضة و ذاهب من الشیاطین هارب" معنیٰ یہ ہوگا بعد اس کے کہ انہوں نے ٹوٹتے ہوئے تاروں کو دیکھا اور شیاطین کو بھاگ کھڑے ہوتے۔ تو معلوم ہوا کہ "حتی غدا" محل جر میں ہے اور اسی طرح تیسری والی صورت میں بھی (یعنی بمعنیٰ ''الی'') محل جر

میں ہوگا، لیکن 'حتی' کو جب ابتدائیہ مانا جائے گا تو جملہ مستانفہ ہوگا اور " غدا " کبھی بمعنیٰ ذھب اور انطلق ، کبھی بمعنیٰ '' بکر '' اور کبھی بمعنیٰ '' صار '' آتا ہے۔ اور یہاں پہ '' ذھب '' یا 'انطلق' یا 'صار' کے معنیٰ میں ہوسکتا ہے۔ (منھزم) 'غدا' کا فاعل ہوگا، پہلے والے معنیٰ (یعنی ذھب) کی تقدیر پر یا پھر اس کا اسم ہوگا، دوسرے والے معنیٰ (یعنی صار) کی تقدیر پر۔ (یقفو) حال ہے یا " غدا " کی خبر بیان کردہ تفسیر کی بنیاد پر۔

(عن طریق الوحی) متعلق ہے " غدا " سے یا " منھزم " سے اور " منھزم " کا معنیٰ '' ھارب '' یعنی بھاگنے والا (من الشیاطین) صفت اور بیان ہے " منھزم " کا: اور معنیٰ تبعیض سے متصل ہے اور (یقفو)، " قفا یقفو " سے بمعنیٰ اتباع و پیروی کرنا ہے اور یہ ترکیب میں حال ہے یا خبر اور اس میں ضمیر مستتر راجع ہے '' منھزم '' کی جانب اور (اثر) بمعنیٰ پیچھے، مفعول ہے " یقفو کا۔

حاصل معنی: نبی کریم ﷺ کے نور کے ظاہر ہونے والے ایام میں اور آپ ﷺ کی ولادت کے وقت ستارے کثرت روشنی کے ساتھ پہ در پہ ٹوٹنے لگے اور کافروں کے لئے اس طرح کا کوئی زمانہ اس سے پہلے کبھی نہ گزرا تھا اگرچہ فی الجملہ شیاطین کے لئے مار کے طور پر زمانہ، کافروں کے لئے پہلے بھی تھا، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿ ولقد زینا السماء الدنیا بمصٰبیح و جعلنٰھا رجوما للشیٰطین ﴾، اس لئے کہ یہ آیت پاک ستاروں کے آلۂ رجم ہونے پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ شیاطین کو ستاروں سے مارنا، حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی تھا اور بعثت سے پہلے کا زمانہ، حضور ﷺ کی ولادت کے وقت کو بھی شامل ہے اور رہا اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکایة عن الجن یہ فرمانا (وانا لمسنا السماء فوجدنھا ملئت حرسا شدیدا و شھبا و انا کنا نقعد منھا مقٰعد للسمع فمن یستمع الان یجد له شھابا رصدا) ، تو اس آیت پاک سے مراد حضور کی بعثت کے بعد کا زمانہ ہے۔ ایسا ہی ملا علی قاری نے 'محلی' سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے، (ہم نے ملا علی قاری کے کلام کے درمیان میں کچھ باتیں زائد کر کے ان کے کلام میں ہلکا سا تغیر کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی فصل رابع سے بارھویں اور تیرھویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۰) کانهم هربا ابطال ابرهة او عسکر بالحصیٰ من راحتیه رمی

(ترجمہ:۔ گویا شیاطین کی جماعت بھاگ کھڑا ہونے میں ابرہہ کے فوجیوں کی طرح ہے یا اس لشکر کے مثل ہے جو حضور کے دست مبارک کی کنکریوں سے مارا گیا)

(۷۱) نبذا به بعد تسبیح ببطنهما نبذ المسبح من احشاء ملتقم

(ترجمہ: حضور نے تسبیح پڑھنے کے بعد اپنے کف دست میں سے کنکریاں اس طرح پھینکی جس طرح تسبیح کرنے والے (یعنی حضرت یونس علیہ السلام) مچھلی کے پیٹ سے باہر لائے گئے۔)

تشریح: (کان) حرف مشبہ بالفعل ہے، اور اس میں متصل ضمیر "کان" کا اسم ہے جو 'شیاطین' کی جانب راجع ہے۔ (هربا) بالنصب حال ہے یا رفع ابہام کے لئے تمیز اور وجہ تشبیہ کے لئے ابداء ہے (ابطال) بطل کی جمع ہے بمعنیٰ قوی بہادر اور لفظ بطل سے اس معنیٰ کو موسوم اس لئے کیا گیا کہ بہادروں کی ہمتیں مدّ مقابل کو باطل کردیتی ہیں۔

(ابطال) یہ "کان" کی خبر ہے۔ (ابرهة) یمن کے ایک بادشاہ کا نام تھا، علمیت اور عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہے اور ضرورت شعری کی وجہ سے کبھی جر اور تنوین کے ذریعہ منصرف ہوجاتا ہے۔ (او) حرف عطف ہے برائے تردید، (عسکر) معطوف ہے" ابطال" پر۔ (الحصیٰ) بمعنیٰ چھوٹے سخت پتھر۔ (الراحة) بمعنیٰ ہتھیلی کا پیٹ۔

اور (بالحصیٰ) اور (من راحته) میں سے ہر ایک جار مجرور متعلق ہے،" رمی" سے۔ اور ' الراحۃ' کو تثنیہ

لانے کی وجہ یہ ہے کہ کنکری کا پھینکنا، آپ ﷺ کے دست مبارک سے دو مرتبہ واقع ہوا: ایک دفعہ جنگ بدر میں اور دوسری دفعہ حنین میں

اور فعل مجہول سے تعبیر کر کے " رمـــــی " کہنے میں اس جانب ایک اشارہ ہے کہ رامی اور کنکریوں کو پھینکنے والا در حقیقت تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے اور آپ ﷺ کی جانب کنکری پھینکنے کی اسناد بطور مجاز ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی) اور جب آپ ﷺ نے دشمنوں کے چہروں پر مٹی پھینکی تو ان میں کوئی بھی ایسا باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں مٹی نہ پہنچ گئی ہو اور پھر سب، بھاگ کھڑے ہوئے! پھر مسلمانوں نے ان کا تعاقب کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (حنین میں)

اصحاب فیل کے قصے کا حاصل اور خلاصہ: ابرہہ نے ایام حج میں لوگوں کو حج کی تیاری کرتے دیکھا تو ان سے کہنے لگا کہ تم لوگ کہاں جانے کی تیاری کرر ہے ہو؟ اسے بتایا گیا کہ بیت اللہ کا حج کرنے کے لئے مکہ میں، بولا کہ بیت اللہ کیسا ہے؟ بتایا کہ وہ پتھر کا ہے، یہ سن کر ابرھہ بولا کہ قسم ہے حضرت مسیح کی کہ میں تم لوگوں کے لئے اس سے بھی بہتر گھر تعمیر کروں گا چنانچہ اس نے لال، پیلے اور کالے پتھروں کا ایک گرجا ان کے لئے تعمیر کروا دیا اور اسے سونے چاندی اور قسم قسم کے قیمتی پتھروں سے آراستہ کر کے چاہا کہ لوگ اس تعمیر کی جانب حج کرنے کے لئے پھر جائیں اور چاہا کہ حج بیت اللہ یہاں منتقل ہو جائے اور اس نے لوگوں پر مکہ جانے کی پابندی لگا دی۔

تو جب یہ خبر عرب کے درمیان پھیل گئی تو بنی کنانہ کا ایک شخص انتہائی غیظ وغضب کے عالم میں نکلا اور جا کر ابرھہ کے بنائے ہوئے گرجا میں نجاست کر دی اور ان کے قبلہ کو نجاست سے لت پت کر کے اپنے ملک آ گیا۔

اس عمل نے ابرھہ کو انتہائی چراغ پا کر دیا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ کعبے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اور اس نے نجاشی کو اس بات کی خبر پہنچانے کے لئے خط لکھا اور اس سے ہاتھی بھیجنے کے لئے کہا تو جب اس کے پاس ہاتھی پہنچ گئے تو وہ ساٹھ ہزار کے لشکر میں روانہ ہوا اور جب وہ "مغمس" پہنچ گیا تو ابرہہ نے ایک شخص کو مکہ پر غارت گری اور لوٹ پاٹ کرنے کا حکم دیا، حکم پا کر اس نے مکہ پہنچ کر قریش کے اونٹوں اور مویشیوں کو لوٹ لیا پھر انہوں نے اس

سے لڑنا چاہا! مگر انہوں نے دیکھا کہ وہ ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے اسی لئے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

پھر جب ابرہہ نے مکہ میں داخل ہونے کی تیاری کی تو ہاتھی بیٹھ گیا، یہ لوگ اسے کھڑا کرنے کے لئے اس کے سر پہ مارتے تو وہ حکم کی تعمیل نہیں کرتا اور جب اس کو مکہ کے علاوہ کسی اور سمت موڑتے تو فوراً کھڑے ہوکر دوڑنے لگتا لیکن جب اس کو مکہ کی جانب موڑتے تو وہ بیٹھ جاتا۔ اسی اثنا میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پرندوں کی فوج کو بھیج دیا ہر پرندے کے پاس تین پتھر ہوتے ایک پتھر ان کی چونچ میں اور باقی دو ان کے پیروں میں تو وہ ہر راستے سے گرتے پڑتے بھاگنے لگے اور کنکر ان لوگوں کے سر میں داخل ہوکر ان کے پیچھے دبر کے راستے سے اور ان کی سواری کے نیچے سے نکل جاتا تھا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسی قصہ کی جانب اس آیت پاک میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿الم تر كيف فعل ربك باصحاب الفيل الم يجعل كيدهم فى تضليل و ارسل عليهم طيرا ابابيل ترميهم بحجارة من سجيل فجعلهم كعصف ماكول﴾

تشريح بيت ثانى: (نبذاً) فعل محذوف کا مفعول مطلق ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی" نبذه ﷺ نبذا" جیسا کہ اس قول میں ہے (قعدت جلوسا)

(به) میں 'با' زائدہ ہے مصدر کے عمل کی تقویت کے لئے اور اس میں ضمیر راجع ہے" الحصیٰ" کی جانب اور مذکر اس لئے لائے کہ وہ اسم جنس ہے اور (ببطنهما) میں ضمیر" راحيته" کی ہے اور اس میں 'با' بمعنیٰ "فی" ہے۔

(نبذ المسبح) صفت ہے" نبذا" کی بحذف مضاف یعنی یوں ہے" نبذا مثل نبذ المسبح" یا اس سے بدل ہے اور 'نبذ' مضاف ہے مفعول کی جانب، تقدیری عبارت اس طرح ہے " نبذ الله تعالىٰ المسبح" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تسبیح کرنے والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام کو (مچھلی کے پیٹ سے) باہر نکالا۔

(احشاء) یہ جمع ہے" حشا" کی بمعنیٰ پیٹ کے اندر کی چیزیں، " مافى البطن"(ملتقم) بمعنیٰ مچھلی۔

شاعر ذی فہم نے پہلے والے شعر میں اصحاب فیل کے قصہ کی جانب اشارہ کیا اور اسی مفہوم کو اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں

یوں ذکر کیا ہے:

کم رأینا ما لیس یعقل　　　　قد الھم ما لیس یلھم العقلا

(بار ہا ہم نے ایسا دیکھا کہ غیر ذوی العقول کے دل میں وہ بات ڈال دی گئی جو ذوی العقول کے سمجھ میں نہ آئی)

اذ ابی الفیل ما اتی صاحب　　　　الفیل ولم ینفع الحجا والذکاء

(کہ جب ہاتھی نے اصحاب فیل کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور عقل وخرد نے انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا)

ناظم فاہم نے ان اشعار کو بطور" استتباع" بیان کیا ہے جو محسنات شعر میں سے ہے،اور" استتباع" کی تعریف یہ ہے کہ ' ایسے معنیٰ پر مشتمل ہونا جس کے لئے دوسرا کلام لایا گیا ہو' تو یہاں پہ آپ ﷺ کے کف مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنے کا معنیٰ ،مصرعۂ ثانی میں مذکور دوسرے معنیٰ کو متضمن ہے، ناظم نے اس دوسرے معنیٰ کو اس پہلے والے معنیٰ کا تابع کیا ہے جس کے لئے کلام لایا گیا ہے اور وہ پہلا معنیٰ کنکریوں کا تسبیح پڑھنا ہے اور اس کے پیچھے دوسرا معنیٰ یعنی " نبذ المسبح ''لائے (یعنی حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مچھلی کے پیٹ سے باہر کیا جانا) جیسا کہ انہوں نے ان قصوں کی یاد دلائی جو آپ ﷺ کی قدر ومنزلت کی عظمت وجلالت کو واضح کرتے ہیں اور اچھے انداز میں واقعات کو اس طرح ذکر کیا کہ گویا انہیں آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔

علامہ ابن حجر مکی قصۂ فیل میں حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس واقعہ کو سورۂ فیل میں بیان فرمایا اور ابتدا یوں فرمائی (الم تر) باوجودیکہ یہ قصہ آپ ﷺ کی بعثت بلکہ ولادت سے بھی پہلے کا ہے!! تو اس میں وجہ اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہاں یہ رویت سے مراد علم وتذکر ہے اور چوں کہ اس قصے کے بارے میں خبر متواتر تھی اسی وجہ سے اس کا علم ضروری اور بدیہی ہو گیا جو رویت بصری سے حاصل ہونے والے علم کے برابر ہے۔

اور یہ قصۂ فیل ہمارے نبی اکرم ﷺ کی غایت درجہ عظمت وبزرگی پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ بلاشبہ آپ کی نبوت کی ارہاص اور تاسیس ہے اور زمانۂ نبوت پر معجزے کا مقدم ہونا بنیادی طور پر جائز ہے، جیسا کہ بادلوں، پیڑوں او

رفرشتوں کا سایہ افگن ہونے کے بارے میں بیان گزرا (کہ یہ معجزات بھی زمانۂ نبوت سے پہلے کے ہیں) بلکہ احادیث میں آیا ہے کہ زمانۂ بعثت کے قریب کوئی شجر وحجر ایسا نہ تھا کہ حضور اس کے پاس سے گزرے ہوں اور اس نے آپ کو سلام نہ کیا ہو اور حضور نے اسے سماعت نہ فرمایا ہو نیز یہ قصہ، حضور کی قوم کی شرف و بزرگی اور اللہ کی ان کے ساتھ حمایت ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے کہ عرب نے دین اسلام اختیار کرلیا، اپنے شرف اور اس بارے میں پہلے سے علم کی وجہ سے کہ تمام اہل عرب ابرھہ سے لڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے لیکن جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابرھہ پر ان کی مدد فرمائی تو یہ اس پر دال ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ان پر عظیم رحمت ہے۔ (شرح الھمزیہ ص ۱۸۷)

اور قارئین کرام کے ذہن سے یہ بات نہ نکل جائے کہ آیت پاک میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کا حضرت یونس علیہ السلام کو صفت (ملیم) سے موصوف کرنا آیا ہے نیز حضرت سیدنا یونس کا اپنے بارے میں یہ کہنا کہ (کنت من الظٰلمین) جو آیا ہے وہ متشابہات میں سے ہے کہ ایک بزگزیدہ نبی علیہ السلام کو اس کے ظاہری معنی سے منزہ رکھنا واجب ہے اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انبیائے کرام، نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی تمام صغائر وکبائر سے معصوم ہوتے ہیں، لہذا معنیٰ حقیقی میں انہیں" ملیم "اور ظالمین میں سے ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

☆☆☆☆☆

الفصل الخامس

فی معجزاته صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی پانچویں فصل سے پہلے اور دوسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۲) جاء ت لدعوته الاشجار ساجدة تمشی الیه علی ساق بلا قدم

(ترجمہ: اشجار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر اس طرح مطیع وفرماں بردار ہوکر حاضر خدمت ہوتے کہ بغیر قدم کے (صرف) تنے کے بل چل کر آتے۔)

(۷۳) کانما سطرت سطرا لما کتبت فروعها من بدیع الخط فی اللقم

(ترجمہ: گویا ان اشجار نے (چل کر آنے میں) ایک خوبصورت خط راستے کے درمیان میں اپنی شاخوں سے لکھ دیا۔)

ربط: کنکریوں کا دست حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تسبیح پڑھنے کا معنیٰ جب یہ بتلا رہا ہے کہ جمادات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں، تو اسی وجہ سے شاعر ذی فہم نے چاہا کہ اس معنیٰ کی کچھ تفصیل کردی جائے، اس سے ملتے جلتے معنیٰ میں اور اس انداز سے کی جائے کہ اذہان وقلوب اور زبان و بیان اس سے واقف نہ ہوں تو وہ پیڑوں کا چل کر آنا، ان کا مطیع وفرماں بردار ہونا، حضور کا حکم ماننا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہونے وغیرہ کے معانی کو بیان کررہے ہیں۔

جاء ت لدعوته الاشجار ساجدة تمشی الیه علی ساق بلا قدم

کانما سطرت سطرا لما کتبت فروعها من بدیع الخط فی اللقم

اسی مفہوم کوناظم شعر نے اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں یوں ادا کیا ہے:

والجمادات افصحت بالذی اخرس عنہ لا حمد الفصحاء

جمادات کا حضور اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کا بیان

اس شعر کے الفاظ غریبہ کی شرح کرنے اور وجوہ اعراب کو بیان کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ناظم کے قصیدۂ ہمزیہ کے مذکورہ بالا اس عمدہ شعر کی شرح سے اس طرح آغاز کروں کہ وہ اس شعر کی بھی شرح ہو جائے جس کی طرف ناظم فاہم نے قصیدہ بردہ میں اشارہ کیا ہے اور اس معنیٰ کی تفصیل ہو جائے جس کو شعر متضمن ہے یعنی تاکہ قصہٗ درخت کے معنیٰ کی تفصیل ہو، نیز اسی موقعہ پر اس کے علاوہ ان قصص وواقعات کا بھی بیان ہو جائے جو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے شواہد و علامات میں سے ہیں تو ہم علامہ ابن حجر مکی کی ''شرح ہمزیہ'' سے بیان کریں گے اور فوائد و منفعت کی کثرت کی وجہ سے ان کا مکمل کلام درج کریں گے، تو اب سماعت کریں علامہ ابن حجر مکی قصیدہ ہمزیہ کے مذکورہ شعر کے تحت فرماتے ہیں:

میدان فصاحت و بلاغت کے شہسوار ہونے کے باوجود بھی اہل عرب قریش وغیرہ کی زبانیں، آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی رسالت کی شہادت دینے سے باز رہیں، حالانکہ حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی بے زبان جمادات تک فصیح و بلیغ زبان و بیان میں دے رہے تھے تو انہی شہادت میں سے، کنکریوں کا آپ ﷺ کے دست اقدس میں تسبیح پڑھنا ہے، پھر حضرت ابوبکر صدیق کے دست اکرم میں اور پھر حضرت عمر فاروق اعظم کے دست مبارک میں اور ان کا تسبیح پڑھنا ان سبھوں نے سنا جو حلقے میں اردگرد تھے، اس حدیث کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث مشہور ہے لیکن اس کی سند میں ضعف ہے۔

نیز حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث صحیح مروی ہے کہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا تناول کرتے تھے اور ہم سنا کرتے تھے اپنے کانوں سے کہ کھانا تسبیح پڑھ رہا ہے، اور صحابۂ کرام کے تسبیح

سننے میں،ان کی انتہائی عظمت ہے۔

مزید حدیث صحیح ہے: حضور نے فرمایا''یقیناً میں مکہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور بلاشبہ میں اسے ابھی بھی پہچانتا ہوں'' کہا گیا ہے کہ وہ پتھر حجر اسود ہے۔اور ایک قول یہ ہے کہ وہ مرفق کی گلی میں حجر بارز ہے اس لئے کہ وہ حضرت خدیجہ کے گھر سے مسجد تک،حضورﷺ کی گزرگاہ میں تھا،اور اسی قول پر اہل مکہ ہیں سبھی سلف وخلف اور حضرت علی کرم اللہ وجھہ الکریم سے مروی ہے کہ میں نبی اکرمﷺ کے ساتھ مکہ میں چلا کرتا تھا تو ایک دن ہم مکہ کے کسی علاقے میں جانے کے لئے نکلے تو ہمارے سامنے کوئی شجر وحجر ایسا نہ آتا جو یہ نہ کہتا ہو کہ السلام علیك یا رسول اللہ ۔

اور حضرت بزار اور ابو نعیم نے روایت کی کہ''جبرئیل جب میرے پاس وحی لے کر آنے لگے تو میں نہیں گزرتا تھا کسی بھی شجر وحجر کے پاس سے مگر یہ کہ وہ کہتا" السلام علیك یا رسول اللہ ۔

امام بیہقی اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ آپﷺ نے حضرت عباس اور ان کی اولادوں کو اپنی چادر مبارک میں ڈھانپ لیا اور پھر عرض کیا''اے میرے رب یہ میرے چچا،میرے والد کے حقیقی بھائی ہیں،اور یہ سب میرے اہل بیت ہیں تو مولیٰ تعالیٰ تو ان کو جہنم کی آگ سے اس طرح محفوظ فرمادے جس طرح میں نے انہیں اپنی اس چادر سے ڈھانپا ہوا ہے'' تو (حضور کے یہ دعا فرمانے پر) دروازے کی چوکھٹ اور گھر کی دیواریں امین امین امین کہنے لگیں۔

اور حدیث صحیح ہے کہ آپﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر اور حضرت عثمان احد پہاڑ پر تھے اور ایک روایت صحیح میں یہ بھی ہے کہ جبل''حرا'' پر تھے کہ وہ اچانک ہلنے لگا تو حضور نے اپنے قدم مبارک سے اسے مارتے ہوئے فرمایا ٹھہر جا، تیرے اوپر نہیں ہے مگر ایک نبی،ایک صدیق اور دو شہید(۱)

نیز حدیث صحیح میں ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ایک شخص سے ایمان لانے کو کہا تو وہ کہنے لگے کہ آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے(نبوت ورسالت پر)؟ تو حضور نے فرمایا(ہاں یہ درخت ہے، پھر حضورﷺ نے اس درخت کو بلایا

حالانکہ کہ وہ وادی کے کنارے پر تھا، (مگر حضور کا فرمان سن کر فوراً) زمین کو کھودتے ہوئے حاضر بارگاہ ہوا یعنی زمین کو پھاڑتے ہوئے اور آ کر حضور کے سامنے قائم ہو گیا پھر حضور نے اس سے تین مرتبہ گواہی دینے کو کہا تو اس نے گواہی دی اور پھر واپس اپنے مقام (جڑ) پر لوٹ گیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے کہا ''اس درخت سے کہو کہ اللہ کے رسول تجھے بلا رہے ہیں'' تو وہ درخت دائیں بائیں اور اپنے آگے پیچھے مائل ہوا اور پھر اس کی جڑیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور وہ زمین کو پھاڑتا ہوا اپنی جڑیں کے کھینچتا اور گرد اڑاتا ہوا آیا یہاں تک کہ حضور کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا السلام علیك یا رسول اللہ ،اعرابی بولے حضور اسے حکم دیں کہ وہ واپس اپنی جڑ پہ چلا جائے تو وہ واپس لوٹ گیا،اس کی جڑوں نے اس جگہ راستہ بنایا اور پھر وہ وہاں مستقر اور ثابت ہو گیا! یہ دیکھ کر اعرابی حضور سے عرض کرنے لگے کہ حضور مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو سجدہ کروں، حضور نے فرمایا (نہیں) اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو ضرور عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے'' تو پھر وہ اعرابی بولے، تو حضور قدمین شریفین اور دست مبارک کو بوسہ دینے کی ہی اجازت عطا فرما دیں، تو حضور نے انہیں اجازت دے دی۔(۲)

مزید حدیث صحیح میں ہے کہ ایک اعرابی نے حضور سے کہا کہ میں کیسے جانوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؟ سرکار نے فرمایا اس درخت خرما کی شاخ کو بلاؤ یہ گواہی دیگا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تو انہوں نے اس کو بلایا تو وہ حضور کے آگے جھک گیا پھر فرمایا لوٹ جا تو وہ لوٹ گیا، پھر وہ اعرابی اسلام لے آئے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت پر بعض دلائل و شواہد

امام ابن حجر مکی مزید یہ کہتے ہیں ہوئے اضافہ فرماتے ہیں: تنبیہ آپ ﷺ کے میلاد اور میلاد کے مابعد پر ناظم شعر کے کلام سے یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کے دلائل و شواہد میں سے کچھ یہ ہیں: کتب اللہ (سماوی) میں حضور کی نعت اور حضور کے سر زمین عرب میں تشریف لانے کا ذکر موجود ہونا، وہ عجائب و غرائب جو آپ کی ولادت اور بعثت کے وقت ظاہر ہوئے جو کفر کی حکومت کو باطل کرتے ہیں اور عرب کی عظمت و بزرگی کو

مزید بلند کرتے ہیں مثلاً قصۂ فیل اور وہ جو اصحاب فیل پر نازل کیا گیا، اور جیسے اہل فارس کی آگ کا بجھنا اور وہ جو اس کے ساتھ ذکر ہوا اور ہواتف غیبیہ کا بلند آواز سے حضور ﷺ کے اوصاف بیان کرنا، اور بتوں کا اپنی جگہ سے بغیر کسی گرانے والے کے گرائے سر کے بل اوندھ جانا، باوجودیکہ وہ اصنام اپنی اپنی جگہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم اور ثابت تھے اور بعض وہ عجائب جو ایام رضاعت اور اسکے بعد سے لے کر آپ ﷺ کے زمانۂ بعثت تک ظاہر ہوئے اور خلق خدا کا آپ کی اتباع کرنا باوجودیکہ آپ کے پاس کوئی مال و دولت نہ تھی کہ لوگوں کو اس میں طمع ہوتی اور نہ کوئی ایسی قوت تھی کہ جس کی وجہ سے لوگوں پر غالب ہوتے مزید یہ کہ ان لوگوں کے دلوں میں بتوں کی محبت رچی بسی ہوئی تھی اور وہ ان کی حفاظت میں جنگ و جدال اور قتل و غارت گری میں حد سے بڑھے ہوئے تھے دین کی الفت و محبت ان کو جمع نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خوف آخرت اور لومۃ لائم ان کو ان کے برے کاموں سے روک سکتی تھی مگر آپ ﷺ نے ان کے دلوں کو متحد فرما دیا اور ان کے کلمے کو ایک کر دیا یہاں تک کہ تمام آراء متفق ہو گئیں، قلوب مجتمع ہو گئے اور وہ اغیار کے بالمقابل دست واحد اور ایک جان ہو گئے اور انہوں نے صرف حضور ﷺ کی محبت میں اپنے وطنوں اور اہل وعیال کو چھوڑ کر ہجرت کی، اور دین کی حمایت و فتح یابی میں اپنی جانیں لڑا دیں اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے اپنے آپ کو تلواریں اٹھانے پر آمادہ کیا اور یہ سب بغیر کسی دنیاوی لالچ کے تھا یعنی ایسا نہ تھا کہ یہ کرنے کی وجہ سے ان پر دنیاوی نعمتوں کی بہتات کر دی جاتی فوراً اور نہ ہی وقت مقررہ پر انہیں عزت وعظمت ملنے کی لالچ تھی کہ وہ اس عزت کو و طاقت کو دین و ایمان پر ترجیح دیتے یا اس کو پہلا درجہ دیتے۔

بلکہ وہ تو آپ ﷺ کی شان ہے کہ چاہیں تو غنی کو فقیر کر دیں اور معزز و مکرم کو ذلیل و خسیس۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طریقے کے امور اختیار عقلی یا تدبیری فکری کے قبیل سے میسر آ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے حضور ﷺ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا! کہ بلاشبہ یہ تمام امور صرف اور صرف امر الٰہی اور تائید سماوی ہیں کہ انسان کی طاقت اس مقام و مرتبے تک پہنچنے سے عاجز ہے اور ان امور کو صرف وہی سرانجام دے سکتا ہے کہ ساری مخلوق جس کی ہو اور امر بھی اسی کا ہو۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ جو رب العالمین ہے۔ (یہاں پر علامہ ابن حجر کا

کلام بلیغ اختتام پذیر ہوتا ہے ہماری جانب سے مختصر سے تغیر کے ساتھ) (ص ۱۸۸۔۱۸۹،۱۹۰)

اوراب ہم شعر کے کلمات غریبہ کی شرح اور وجوہ اعراب کے بیان کا آغاز کرتے ہیں:

(جاء ت لدعوته) یعنی حضور کے بلانے پر وہ چلے آئے یا بلانے کے وقت (وقت طلب) چلے آئے تو دعوت بمعنیٰ طلب ہے اور اس پہ ''لام'' یا تو برائے تعلیل ہے یا برائے توقیت (جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے)(الاشجار) شجرۃ کی جمع ہے''جاء ت'' کا فاعل ہے۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں:'' اخوان الصفاء'' میں مذکور ہے کہ شجر و نبات اور نجم میں فرق یہ ہے کہ شجر وہ ہوتا ہے کہ جو اپنے تنے پر قائم ہوتا ہے ہوا میں بلند ہوتا،موسم گرما میں پتے دار ہوتا ہے اور موسم سرما میں اس کے پتے گرنے لگتے ہیں اور پھل دیتا ہے اگر چہ پھل کھائے جانے والے نہ ہوں۔

اور نبات اس کو کہتے ہیں جو بیج اور کسی دانے سے اگتا ہے اور 'نجم' وہ ہوتا ہے جو بیج کے بغیر اگتا ہے اور زمین کے اوپر پھیل جاتا ہے جیسے گھاس اور خس وخاشاک اور یہ سب (شجر و نبات و نجم) رنگ وبو اور مزہ والے ہوتے ہیں۔

(ساجدة) یہاں بمعنیٰ تابع وفرماں بردار ہے اور اس سے مراد سجود کا حقیقی معنیٰ لینے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہے بلکہ کچھ روایتوں کا سیاق کلام اسی پر دلالت کرتا ہے اور اسی طرح شاعر ذی فہم کا (علی ساق بلا قدم) کہنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

(تمشی) یا تو'' الاشجار' سے حال مترادفہ ہے یا پھر''ساجدة'' میں پوشیدہ ضمیر سے حال واقع ہے،اور اس کو حال متداخل کہتے ہیں۔(علی ساق) یہ متعلق ہے''جاء ت'' سے (بلا قدم) جار مجرور ظرف مستقر ہے جو صفت ہے ''ساق'' کی۔

شرح بیت ثانی: (کانما سطرت) میں'کأنّ'' حرف تشبیہ ہے اور''ما'' کافہ ہے اور جملہ مستانفہ ہے جو کیفیت مشی کے سوال کے جواب میں واقع ہوا ہے۔(سطرت) بمعنیٰ لکھنا،اور (سطرا) مفعول مطلق ہے

اور (لما) جار مجرور متعلق ہے "سطرت" سے اور اس میں "لام" تعلیلیہ ہے اور "ما" موصولہ اور (کتبت) میں ضمیر "کتبت" کا مفعول ہے یعنی یوں ہے "کتبته" اور وہ ضمیر راجع ہے "ما" موصولہ کی جانب۔(فروعها) جمع ہے فرع کی بمعنی شاخ اور ٹہنی۔ فروعها یعنی اغصانها وافنانها ،یعنی اس کی شاخیں اور اس کی ٹہنیاں۔یہ فاعل ہے "سطرت" کا، یا "کتبت"

(من بديع الخط) یعنی خوبصورت خط، "اضافة الصفة الى الموصوف" کی قبیل سے ہے۔اور (اللقم) کہتے ہیں راستے کے درمیان کو۔

حاصل معنیٰ : درختوں نے صفحۂ طریق پر اپنی شاخوں اور ٹہنیوں سے گویا ایک خوبصورت تحریر لکھ دی اور راستے کی سطح پر ایک خط کھینچ دیا کہ اس میں غور کرنے سے معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے نبی ہیں اور آپ ﷺ اپنی تمام خبروں میں بلاشبہ صادق ہیں۔

اور دوسری بات یہ کہ شعر میں استعارہ تمثیلہ ہے اس لئے کہ اشجار ٹہنیوں، کتابت اور بیچ راستے میں پیڑوں کی شاخوں کے خوبصورت خط کھینچنے کی ہیئت منتزعہ کو حقیقی کاتب اور اس کا کاغذ پر خوبصورت تحریر لکھنے کی ہیئت منتزعہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔اور ان دونوں اشعار میں اشارہ ہے کہ مسلمان احکام کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، اس طرح کہ وہ عبودیت اور اطاعت کے قدموں پر قائم ہوں اس لئے کہ اشجار (غیر ذوی العقول ہو کر کے) جب حضور کے مطیع وفرماں بردار ہو سکتے ہیں تو آپ کی امت تو اس کی زیادہ حقدار ہے۔

حاشیہ (۱) یہ حدیث پاک اس بارے میں خبر دینے کو شامل ہے جو علوم خمسہ میں سے ہے (یعنی انسان کب، کہاں اور کیسے مرے گا) جد کریم امام احمد رضا قدس سرہٗ نے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے اپنی تصنیف لطیف "الدولة المكية بالمادة الغيبية" میں (تاج الشریعہ) (۲) قول یہ اخیر والی روایت جس کو امام ابن حجر نے بیان کیا ہے تعدد قصہ کو بتا رہی ہے اور یہ کہ حضور علیہ السلام سے گواہ طلب کرنا مکرر ہوا اور یہ اعرابی جو حضور سے دلیل و گواہ کا مطالبہ کر رہے تھے، پہلے والے اعرابی کے علاوہ کوئی دوسرے ہیں۔ (تاج الشریعہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی پانچویں فصل کے تیسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۴)مثل الغمامة انی سار سائرة تقیه حرو طیس للهجیر حمی

(ترجمہ:۔وہ اشجار ان بادلوں کے مثل ہیں کہ جہاں حضورﷺ تشریف لے جاتے وہاں یہ بھی جاتے تا کہ حضور کو آفتاب کی تپش سے سخت دوپہر میں محفوظ رکھیں۔)

ربط: اس شعر میں شاعر ذی فہم کی جانب سے حضور ﷺ کے دوسرے معجزے کی جانب منتقل ہونا ہے جو پہلے والے معجزے کے مثل ہے اور یہ ان امور میں باہم مشابہ ہیں حضور اکرمﷺ کا معجزہ ہونے میں حضور ﷺ پر سایہ فگن ہو کر حضورﷺ کا مطیع و فرماں بردار ہونے میں، آفتاب کی گرمی سے حضور اکرمﷺ کو محفوظ رکھنے میں اور چلنے اور رکنے میں ہر جگہ حضور اکرمﷺ کے ساتھ رہنے میں، تو یہ ابر حضور نبی کریمﷺ کے ساتھ چلتے جہاں حضور تشریف لے جاتے وہاں یہ بھی ساتھ جاتے اور چاہیں جیسے تشریف لے جاتے یعنی پیدل جاتے یا سوار ہو کر، تیزی سے جاتے یا دھیرے بہر حال ذرا بھی حضور اکرمﷺ سے جدا نہ ہوتے تھے اور یہ حضور کا ایک بہت بڑا معجزہ جو بحیریٰ راہب کے ایمان لانے کا سبب ہوا۔ نیز حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آپﷺ پر ایمان لانے میں سبقت لے جانے کی وجہ بنا اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

شرح کلمات غریبہ و بیان وجوہ اعراب: (مثل الغمامة) بالرفع مبتدا محذوف کی خبر ہے جو"هی" ہے اور یہ ضمیر راجع ہے"الاشجار" کی جانب، معنیٰ یہ ہے کہ اشجار مشابہ ہیں بادلوں کے۔

(انی سار) محل نصب میں ہے اور ظرف مقدم ہے"سار" پر (انی) بمعنیٰ "من این" ہے یا بمعنیٰ "کیف"

یعنی ابر حضور کے ساتھ چلتے ہیں جہاں سے حضور چلتے ہیں اور جس جگہ میں حضور ﷺ چلتے ہیں یا معنیٰ ہوگا وہ آپ کے ساتھ چلتے ہیں جیسے آپ ﷺ چلتے ہیں یعنی پا پیادہ یا سوار ہوکر تیز تیز یا دھیرے دھیرے، (یعنی جس طرح بھی آپ چلتے ہیں یہ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں چاہیں جس طرح آپ ﷺ چلیں)

(سائرۃ) بالرفع یہ بادلوں کے حال کا بیان ہے یا مبتدا محذوف کی خبر کے بعد خبر ہے یا پھر بالنصب "غمامه" (یعنی بادل) سے حال واقع ہے۔

(تقیه) "الوقایة" مصدر سے بمعنیٰ منع کرنا ہے، اور اس میں متصل ضمیر آپ ﷺ کی جانب راجع ہے جو مفعول اول ہے اور "غمامه" کے حال کا بیان بھی ہے۔

(حر وطیس) یہ حذف وایصال کے طور پر مفعول ثانی ہے معنیٰ یہ ہے کہ ابر حضور ﷺ کو سورج کی گرمی اور تپش سے محفوظ رکھتے تھے۔ (و طیـــــس) بمعنیٰ تندور، اور یہاں اس سے بطور تشبیہ شمس مراد ہے تو اس میں استعارہ تصریحیہ ہے کہ مشبہ بہ یعنی تنور (وطیس) کا ذکر کر کے مشبہ یعنی سورج مراد لیا ہے۔

(للهجیر) میں "لام" اختصاص کے لئے ہے یا 'عند' کے معنی میں ہے۔ اور هجیر وهاجره "کا معنیٰ سخت گرم دوپہر ہے اور اس میں صنعت تجرید ہے کہ غرض صرف "حر" (یعنی گرمی) سے ہے جس کی تصریح "حر و طیس" میں کی گئی، تو اس سے مطلق نصف نہار مراد ہے۔

(حمی) فعل ماضی ہے اور اس کی "یا" کا ساکن ہونا وقف کے عارض ہونے کی وجہ سے ہے، یہ "وطیس" کی صفت ہے جو محل جر میں ہے یا یہ اسم منقوص ہے کہا جاتا ہے "حمی الوطیس" بمعنیٰ جنگ کی آگ بھڑکنا۔

حاصل معنیٰ: وہ اشجار جو حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوکر آتے ہیں وہ ان بادلوں کے مثل ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلتے ہیں جہاں تک حضور تشریف لے جاتے ہیں اور وہ ابر وقت زوال گرمی کی شدت میں حضور ﷺ کو محفوظ رکھتے۔

بحیری راہب کے ایمان لانے کا واقعہ اور حضور اکرم ﷺ کے معجزے کا بیان

اور اس شعر میں بحیری راہب کے قصہ کی جانب اشارہ ہے اور یہ قصہ کئی طرح بیان کیا گیا ہے نیز نبی کریم ﷺ کا قریش کے ایک قافلے کے ساتھ تجارت کے سلسلے میں شام تشریف لے جانے والی حدیث مکرر بیان کی گئی ہے تو حدیث میں یوں ہے کہ آپ (ﷺ) ایک دفعہ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ تشریف لے گئے اور دوسری دفعہ حضرت خدیجۃ الکبری کے تجارت کے سلسلے میں ان کے غلام میسرہ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ بہر حال ناظم فاہم نے بادلوں اور درختوں کے سایہ فگن ہونے والے قصے کو اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں یوں جمع کیا ہے فرماتے ہیں:

واتـــاھـــا ان الـغـمـــامۃ و السـرح　　　　اظـــلتــــہ مـــنھـــمـــا افیـــاء

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم موقع اور مقام کی کچھ مناسبت وموافقت کی وجہ سے اس قصہ کی تفصیل کر دیں اور حضور کے دیگر معجزات بھی ذکر کر دیں، تو علامہ ابن حجر " افضل القریٰ " میں تحریر فرماتے ہیں: بادلوں کا حضور اکرم ﷺ کے لئے سایہ فگن ہونے کے بارے میں کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ صحیح حدیث وہ ہے جس کو محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور وہ ''حدیث صحیح'' کے تمام شرائط پر پوری اترتی ہے مگر اس کی روایت میں غرابت ہے۔ وہ حدیث اس طرح ہے'' ابو طالب حضور ﷺ کو لے کر قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی جماعت میں ملک شام کی جانب روانہ ہوئے، تو ان لوگوں کا گزر بحیریٰ راہب کے پاس سے ہوا اور بحیریٰ راہب خلاف معمول ان لوگوں کی طرف نکلا اور ان سے ملنے لگا یہاں تک کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک تھام لیا اور کہنے لگا کہ یہ سید العالمین ہیں امام بیہقی نے اس میں اضافہ فرمایا ہے (اور انہوں نے کہا کہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ) یہ رسول رب العالمین ہیں، ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام عالم کی رحمت بنا کر بھیجا ہے یہ سن کر قریش بولے کہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگا کہ جب آپ لوگ پہاڑ سے اتر رہے تھے تو کوئی شجر وحجر ایسا باقی نہ تھا کہ جو سجدے میں نہ گرا ہوا اور یہ جمادات صرف نبی کے لئے ہی جھکتے ہیں اور یقیناً میں انہیں نبوت کی مہر سے پہچان لوں گا جو کندھے شریف کی نرم ہڈی کے نیچے ہوگی، پھر وہ لوٹ گیا اور ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا اور پھر ان کے پاس

جب کھانا لے کر آیا تو اس وقت سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام اونٹوں کے دیکھنے چرانے میں تھے، وہ کہنے لگا کہ ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیج دو، تو حضور اس حال میں تشریف لائے کہ حضور کے اوپر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن تھا، یہاں تک کہ حضور جب قوم کے پاس آ گئے تو دیکھا کہ سب نے درختوں کے سائے کو پہلے سے ہی لے لیا ہے پھر جب حضور اکرم ﷺ تشریف فرما ہو گئے تو درخت کا سایہ حضور کے اوپر جھک گیا تو بحیریٰ راہب بولا کہ درخت کے سائے کو دیکھو حضور کی طرف جھک گیا ہے، یہ حدیث پاک حضرت ابو موسیٰ اشعری نے روایت کی ہے، اب یہ روایت یا تو ان کو (بلا واسطہ) حضور نبی کریم ﷺ سے ملی ہے جو سب سے ابلغ ہے، یا بعض اکابر صحابہ سے ان تک پہنچی ہے یا پھر یہ بات انتہائی مشہور تھی اور حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اسے بطریق استفاضہ لے لیا۔

(بحیریٰ) پہلے فتح پھر کسرۂ مقصورہ، ایک جماعت نے انہیں صحابۂ کرام سے شمار کیا ہے بشرطیکہ انہوں نے آپ ﷺ کی زیارت کی ہو اور آپ پر ایمان لائے ہوں اگر چہ بعثت سے پہلے نیز حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ سات رومی حضور کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تو بحیرا نے انہیں منع کر دیا اور پھر ابو طالب نے حضور ﷺ کو واپس بھیج دیا اور آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر نے حضرت بلال کو بھیجا۔ تو اس حدیث کے یہ کلمات کہ ”حضرت ابو بکر نے حضرت بلال کو حضور ﷺ کے ساتھ بھیجا تھا“ یہ کسی راوی کا وہم ہے اس لئے کہ اس وقت تک حضرت ابو بکر سمجھدار نہ ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے حضرت بلال کو خریدا تھا۔

مزید حضرت ابو نعیم اور ابن عساکر نے روایت کیا کہ حضور ﷺ کی (رضاعی) بہن شیما بنت حلیمہ نے ایک دن دوپہر میں ایک بادل کا ٹکڑا دیکھا جو حضور پر سایہ کئے ہوئے تھا، جب حضور رکتے تھے تو وہ بھی رک جاتا تھا اور جب حضور چلتے تو وہ بھی چلتا اور جب حضور کی عمر شریف اٹھارہ برس ہو گئی تو حضور نے ایک دفعہ اور تجارت کی غرض سے ملک شام کا سفر کیا، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا لیکن ضعیف سند کے ساتھ، تو اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابو بکر (اس سفر میں) حضور کے ساتھ تھے اور اسی میں ہے کہ بحیریٰ راہب نے کہا تھا کہ باخدا یہ اللہ کے نبی ہیں اور یہی واقعہ حضرت ابو بکر کے سب سے پہلے ایمان لانے کا سبب ہوا۔

امام ابن اسحاق معضلا اور امام بیہقی "الدلائل" میں موصولا روایت کرتے ہیں کہ قریش جب بحیریٰ راہب کے گرجے کے قریب آئے تو اس نے ان کے لئے کافی کھانا بنایا اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اس نے ان کے قافلے میں رسول اللہ کو پہچان لیا تھا جب یہ قافلہ آرہا تھا تو بادل لوگوں کے درمیان صرف حضور پر سایہ کررہا تھا پھر جب یہ قافلہ آگیا تو لوگ پیڑ کے سایہ میں بحیریٰ راہب کے قریب اترے تو اس نے بادلوں کو دیکھا جب وہ درخت حضور ﷺ پر سایہ فگن ہوگیا اور جب ان لوگوں نے پیڑ کے نیچے سایہ لینا چاہا تو پیڑ کی ٹہنیاں رسول اللہ ﷺ کی طرف جھک گئیں۔ (قصہ)

علامہ ابن حجر یہ کہتے ہوئے اضافہ فرماتے ہیں کہ حضور پچیس سال کی عمر شریف میں تیسری دفعہ حضرت خدیجہ کی تجارت کے سلسلے میں (شام) روانہ ہوئے اور حضور کے ساتھ حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ تھے تو وہ غلام پیڑ کے سائے میں اترے مگر پیڑ نے حضور پر سایہ کردیا۔ اھ

نیز حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت حلیمہ نے بادل کا ٹکڑا دیکھا جو حضور ﷺ پر سایہ فگن رہتا جن ایام میں حضور ﷺ ان کے یہاں تھے! یہ حدیث حضور ﷺ کے رضاعی بھائی سے بھی مروی ہے۔

اور کئی ایک نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ بادلوں کا حضور ﷺ پر سایہ فگن ہونا، اعلان نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی نبوت کی تاسیس اور استحکام کے لئے تھا جیسا کہ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔

اور وہ روایات جو اس عظیم معجزے کے انقطاع اور نفی پر دلالت کرتی ہیں، یہ ہیں کہ:

(۱) حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لارہے تھے تب حضرت ابوبکر آپ ﷺ پر سایہ کیئے ہوئے تھے یعنی جب حضور پر سورج کی دھوپ پڑتی تو وہ اپنی چادر سے حضور پر سایہ کردیتے۔

(۲) اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب رمیٔ جمار کررہے تھے (شیطان کو کنکری ماررہے تھے) تو اس موقع پر انہوں نے حضور اکرم ﷺ پر اپنے کپڑے سے سایہ کیا تھا نیز ایک دفعہ اور حضور ﷺ پر سایہ کیا تھا جب کہ آپ ﷺ "جعرانہ" میں تھے۔

(۳)اوران میں سے تیسری بات یہ ہے کہ)صحابۂ کرام جب اپنے اس سفر میں کسی سایہ دار پیڑ کے پاس آتے تو وہ اس پیڑ کو خود سایہ لینے کے بجائے حضور کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔مگر یہ کہ کہا جائے کہ بعض وقت وہ صورت حال تھی اور بعض وقت وہ صورت حال (مترجم)(ص ۱۲۹۔۱۷۰)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی پانچویں فصل کے چوتھے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے،ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۵)اقسمت بالقمر المنشق ان له　　　من قلبه نسبة مبرورة القسم

(ترجمہ:میں شق ہونے والے چاند کی سچی قسم کھاتا ہوں کہ بے شک اس شق قمر کو آپ ﷺ کے قلب شریف سے ایک مشابہت ومناسبت ہے)

ربط: گزشتہ شعر میں بادلوں کے معجزے کو بیان کرنے کے بعد شاعر ذی فہم اب حضور کے دوسرے معجزے کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور یہ اسی معجزے کی طرح سماوی ہے اور آپ کی رسالت کے عموم پر دلالت کرنے میں سب سے اعلیٰ واجلی ہے اور اسکا بادلوں والے معجزے کی طرح ہونا ہمارے نبی کریم ﷺ کا خاصہ ہے نا کہ تمام انبیائے کرام کا علیهم الصلوٰة والسلام تو اسی لئے ناظم فاہم نے فرمایا۔

اقسمت بالقمر المنشق ان له　　　من قلبه نسبة مبرورة القسم

تشریح: (اقسمت) فعل ماضی ہے تکلم کے صیغے پر بمعنیٰ حلف ،نہ کہ "الاقسام" مصدر اس لئے کہ یہ مصدر مستعمل نہیں ہے،اور مضارع کے بجائے ماضی سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس امر کا اعتقاد اس پر اس کے سمجھنے کے وقت سے جاری ہوگا،ایسا ہی علامہ باجوری نے فرمایا ہے۔

اقول: یہ مذکورہ بات اس صورت میں ہوگی جب جملہ کوخبر یہ بنایا جائے لیکن جملے کوانشائیہ بنانے کی صورت میں ایسا نہیں اور دلالت حال سے ظاہر یہی ہے کہ جملہ انشائیہ ہے(کیونکہ جملہ قسمیہ، انشاء ہی پر دلالت کرتا ہے)، نیز یہ کہ فعل ماضی کووزن شعری کی وجہ سے بھی ترجیح دی گئی ہےاوراس لئے بھی کہ فعل ماضی تحقق وثبوت اور فعل کے انشاء فی الحال ہونے پرزیادہ دلالت کرتا ہے۔جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

(بالقمر) یہ مقسم بہ ہےاور متعلق ہے" اقسمت " سے۔اور 'قمر' کا اطلاق اس ستارے پر ہوتا ہے جو تین راتوں کے گزرجانے کے بعد رات میں چمکتا ہےلیکن تین راتوں سے پہلے اسی کو ہلال کہا جاتا ہے۔

(المنشق) بالکسر" القمر" کی صفت ہےاور" الانشقاق" مصدر سےاسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنیٰ پھٹنا اوروہ جو علامہ خرپوتی نے کہا کہ یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے؟ تو سبقت قلم سے واقع ہوگیا یا کاتب کی غلطی سے۔

(ان له) جواب قسم ہےاور" له" ظرف مستقر خبر ہے" ان "کی اور خبر کواہتمام کی وجہ سے مقدم کیا۔اور (له) میں ضمیر راجع ہے 'قمر' کی جانب۔

(من قلبه) متعلق ہے" نسبة" سےاور" قلبه" میں 'ہٗ' کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی ہےاور "من "بمعنیٰ "با' یہ اور "نسبة" سے مراد مناسبت اور مشابہت ہےاور یہی 'ان' کا اسم ہے۔اور (مبرورة القسم) صفت ہے ''ان'' کےاسم کی یعنی" نسبة" کی۔اور" مبرورة القسم" کا معنی یہ ہے کہ قمر کا آپ ﷺ کے قلب منور سے مشابہ ہونے پرقسم کھانے والا یقیناً سچی قسم کھانے والا ہے یعنی بلا شبہ وہ اس قسم اٹھانے میں صادق ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ شق قمر کوآپ ﷺ کے شق صدر سے مناسبت ہےاور آپ کے قلب شریف سے مشابہت ہےتو وہ یقیناً سچی قسم کھانے والا صادق ہے۔

اور وجوہ شبہ جو(قمراور قلب منور) میں جامع ہیں متعدد ہیں: وہ شبہ یا تو لطافت ونظافت، پاکی وصفائی اور مستنیر ہونا ہے، یا مشابہت اذہان کوروشن کرنے اور گمراہی وتاریکی سے ہدایت ونجات عطا کرنے میں ہے یا پھر مناسبت اپنے سے اعلیٰ سے مستفیض ہوکر، اپنے سے ادنیٰ پراس کا فیضان کرنے میں ہے (یعنی جس طرح قمر میں لطافت و

نظافت ہے اور وہ نور ہوتا ہے، اسی طرح قلب شریف بھی لطیف اور منبع انوار ہے، جس طرح قمر تاریکی سے نجات دیتا ہے اسی طرح قلب شریف بھی گمراہی سے ہدایت عطا کرتا ہے اور جس طرح قمر اپنے سے اعلیٰ یعنی نور شمس سے مستنیر و مستفیض ہو کر تاریک رات میں نور ریزی کرتا ہے اسی طرح حضور کا قلب شریف بھی اپنے سے اعلیٰ مبدأ فیض سے استفادہ کر کے دلہائے تاریک کو روشن کرتا ہے۔)

غیر اللہ کی قسم کھانا جائز یا ناجائز؟

تنبیہ: ناظم کے فرمان" اقسمت بالقمر المنشق" سے مستفاد ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے اس لئے کہ شاعر ذی فہم ان اکابر علمائے کرام میں سے ہیں جو حضور صادق الامین ﷺ کے طریق کے ہدایت یافتہ ہیں اور حضور نبی امین و مامون علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سے متمسک رہتے ہیں اوامر ونواہی میں اور اپنے افعال و اقوال میں۔!!

اور" هنديه" میں ہے کہ صرف متدین عالم ہی کے افعال سے تمسک کیا جا سکتا ہے! اور یہ قسم جو امام شرف الدین بوصیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے صادر ہوئی بتا رہی ہے کہ مؤمن سے جب، اللہ تبارک وتعالیٰ کے شعائر اور نشانیوں کی تعظیم واجلال کے طور پر جب قسم صادر ہو، مشرکوں کے طریقے اور بے تکی باتیں کرنے والوں سے بچتے ہوئے اور تفاخر ممنوع سے دور رہتے ہوئے؟ تو یہ قسم اس قسم میں سے نہیں جو ہر طرح ممنوع ہے، اور اس طرح قسم کھانا کیوں کر ممنوع ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے (و من يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب) اور فرماتا ہے (ومن يعظم حرمٰت الله)، تو ان شعائر کی تعظیم رب تعالیٰ کی تعظیم ہے۔

تو تعظیم کے طور پر بعض شعائر اللہ کی قسم کھانے کا مرجع، اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی قسم کھانا ہے تو اب مضاف کے محذوف ہونے کا دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی (کہ کہا جائے کہ 'رب' مضاف محذوف ہے یعنی قسم دراصل یوں ہے کہ میں قمر منشق کے رب کی قسم کھاتا ہوں) اس لئے کہ ایک مومن کے حال اور اس کے عقیدے سے کہ جس عقیدے پر اس کا دل مضبوط ہے اس سے یہ علی وجہ الیقین معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے کی قسم

سے اس کا مقصد مشرکوں کی طرح غیر اللہ کی تعظیم کرنا نہیں ہے بلکہ وہ تو اس چیز کی تعظیم کر رہا ہے جس کی تعظیم کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ از خود اس موقف پر قائم ہے جس پر شریعت اسے قائم رکھنا چاہتی ہے، مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں کعبہ کی قسم کھانا شائع و ذائع تھی نیز نبی اکرم ﷺ کی قسم کھانا اور حضور کا واسطہ دینا مسلمانوں کی اور خاص طور پر معظم اور اکابر ائمہ دین کی عادت رہی ہے۔

اور ''دلائل الخیرات شریف'' جس کو اکابر اور عامۂ پیشوایان دین نے زمانۂ قدیم ہی سے قبولیت عظیم کا منصب و مرتبہ دے رکھا ہے اور وہ حضرات ہر جگہ اور ہر مقام پر اور مختلف اعصار و امصار میں اسے پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں، تو اسی ''دلائل الخیرات شریف'' میں ہے " مبتهلا يدعو ربه يقسم عليه بالنبى ﷺ ، و نقسم به عليك اذهو اعظم من اقسم بحقه عليك! ''یعنی گڑگڑا گڑگڑا کر تضرع کرنے والا ایک شخص اپنے رب سے دعا کرتا ہے جس میں رب تعالیٰ کو حضور نبی کریم ﷺ کی قسم دیتا ہے اور اے رب، ہم تجھے اسی حبیب کی قسم دیتے ہیں اس لئے کہ وہ حبیب سب سے عظیم ہیں جن کے حق کی قسم تجھے دی جاتی ہے!

اور اس طرح کی قسم تاکید کے طور پر شرعاً جائز ہے، قارئین کرام کے لئے اس پر بطور دلیل آقائے دو عالم ﷺ کا فرمان کافی ہوگا جو آپ ﷺ نے ان اعرابی سے فرمایا تھا جن کو آپ نے شرائع اسلام کی تعلیم دی تھی پھر وہ قبول کر کے چلے گئے، تب حضور نے فرمایا تھا" افلح او بيه ان صدق" قسم ہے اس کے باپ کی وہ کامیاب ہے اگر سچا ہے (الحديث الصحيح)

تو ان چند سطور سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان " من حلف بغير الله فقد اشرك " کہ ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا'' اپنے اطلاق پر نہیں ہے اور اس کا جواب بھی ظاہر ہو گیا جو ملا علی قاری نے 'الزبدۃ' میں فرمایا: کہا گیا ہے کہ غیر اللہ کی قسم عادت کے طور پر ہے ورنہ تو شرع نے اسے شرک شمار کیا ہے اور اسی وجہ سے اس طرح کی قسموں میں مضاف کو مقدر مانا جاتا ہے یعنی لفظ ''رب'' (پروردگار) کو مقدر مانا جاتا ہے۔اھ اور اس نے اپنے آپ کو تنہا کیا یہ کہنے میں کہ: ممکن ہے کہ وہ قسم کلام اللہ کی حکایت کے طور پر ہو۔الخ (ملا علی قاری)

اور ہماری تقریر سے یہ بھی روشن ہوگیا کہ علامہ علی قاری نے علامہ عصام کی جو گرفت کی ہے، اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں: علامہ عصام اپنے اس قول میں تنہا ہیں ''کہ وہ قسم جس میں حکم کی تاکید مراد ہوتی ہے وہ ممنوع نہیں ہے اور اسی وجہ سے محاورات میں چاند وغیرہ کی قسم کھائی جاتی ہے'' (الی ان قال) اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء کے علاوہ کی قسم کھانا مکروہ ہے اور اس حکم میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ، کعبہ شریف، اور امام، حیات وروح وغیرہ سب برابر ہیں۔

علامہ باجوری کے حوالے سے قارئین کرام کی بارگاہ میں شق قمر والی حدیث پیش کی جارہی ہے، وہ تصریح فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے حضور ﷺ سے معجزہ طلب کیا جس کے نتیجہ میں حضور نے انہیں چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیئے، ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے نیچے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اب تم گواہی دو'' تو کفار قریش کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے اوپر سحر کر دیا، تو اب ایسا کرو کہ شہر کے اردگرد رہنے والوں کے پاس قاصد بھیجو تا کہ معلوم ہو کہ کیا انہوں نے بھی شق قمر ہوتے دیکھا ہے؟ تو اطراف واکناف شہر میں رہنے والوں نے انہیں بتایا کہ انہوں نے بھی شق قمر ہوتے دیکھا، یہ سن کر کفار قریش بولے کہ یہ سحر ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے جاری ومستمر ہے، تو یہی اس آیت مبارکہ کا شان نزول ہے: ﴿اقتربت الساعة و انشق القمر (۱) و ان یروا ایة یعرضوا و یقولوا سحر مستمر﴾

شق صدر مبارك : اور رہا حضور علیہ السلام کے قلب شریف کا انشقاق تو وہ چار مرتبہ ہوا، کسی شاعر نے ان چاروں کو شعر میں یوں جمع کیا ہے:

و شق صدر المصطفیٰ و هو فی   دار بنی سعد بلا مریة

کشقه و هو ابن عشر ثم فی   لیلة معراج و عند البعثة

(ترجمہ: مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا پہلی دفعہ شق صدر اس وقت ہوا جب آپ بنی سعد کے گھر میں تھے، جیسا کہ شق صدر ہوا تھا جب آپ ﷺ دس برس کے تھے، پھر معراج کی رات ہوا اور چوتھی مرتبہ بعثت کے وقت۔)

پانچویں دفعہ شق صدر ہونے کا بھی اضافہ کیا گیا ہے مگر وہ ثابت نہیں (۱) (حاشیۃ الباجوری ۴۲)

(۱) میں یہاں پر فضیلۃ الشیخ علامہ باجوری سے اجازت چاہوں گا یہ اشعار پیش کرنے کی:

قد شق صدر المصطفیٰ باربع ‏ وهو ابن خمس عند خير موضع

ثم ابن عشر، ثم للمعراج ‏ ثم اوان بعثه المشفع

كذا الذی بلوغه العشرينا ‏ لكنه قول بغير مقنع

(عبدالجلیل العطا الکبری)

(مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا شق صدر چار دفعہ ہوا ہے، ایک تو اس وقت جب آپ کی عمر شریف پانچ برس تھی (حضرت حلیمہ کے گھر) جو سب سے افضل گھر ہے، پھر اس وقت ہوا جب آپ کی عمر دس برس کی تھی، اور ایک دفعہ شق صدر معراج پر تشریف لے جانے کے لئے ہوا اور ایک مرتبہ شق صدر آپ شفیع و مشفع ﷺ کی بعثت کے وقت ہوا، اور اسی طرح ایک قول ہے کہ وقت بلوغ جب آپ بیس سال کے تھے ہوا مگر یہ قول بغیر دلیل کے ہے۔)

حدیث شق القمر: علامہ خرپوتی نے شق قمر کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس میں غرابت ہے لیکن مقام کی مناسبت کی وجہ سے ان کی روایت پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے ہم اسے یہاں بیان کیئے دیتے ہیں قارئین کرام کے پیش نظر وہ قصہ من وعن ویسا ہی پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ علامہ خرپوتی نے بیان کیا ہے: مشکاۃ میں ہے، روایت بیان کی جاتی ہے کہ ابوجہل (لعنة الله عليه) اور اس کے متبعین جب ہمارے نبی کریم ﷺ سے معارضہ کرنے سے عاجز آ گئے اور دن بدن حضور کی شریعت کا سورج بلند ہونے لگا اور کثرت کے ساتھ لوگ حضور پر ایمان لانے لگے تو ان لوگوں نے حبیب بن مالک امیر شام کے پاس ایک خط بھیجا۔ جس میں یوں تحریر کیا: امام بعد! یقیناً بادشاہ جانتا ہوگا کہ ہمارے مابین (معاذ اللہ) ایک ساحر و کذاب شخص ظاہر ہو گیا ہے جو مدعیٔ توحید اور نئے دین کا موجد ہے اور ہمارے معبودوں کو گالی دیتا ہے، اور جب جب ہم دلائل سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہم پر غالب آ جاتا ہے تو ایک دن تمہارا اور تمہارے آبا و اجداد کا دین کمزور ہو جائے گا لہذا اس کا

دین پھیل جانے سے پہلے تم اس سے ملاقات کرو!!

تو حبیب بن مالک بارہ گھوڑسواروں میں سوار ہوکر نکل پڑااور مقام ابطح میں آکر اترا، ابوجہل وغیرہ عظمائے مکہ تحفہ تحائف لے کراس کے استقبال کے لئے گئے، حبیب نے ابوجہل کو بیٹھایا اور پھر حضرت محمدﷺ کے احوال کے بارے میں دریافت کیا! ابوجہل نے کہا آپ بنی ہاشم سے پوچھ لیں تو اس نے جب ان سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگے کہ ہم ان کو بچپن میں صدق سے پہنچانتے تھے لیکن جب وہ چالیس سال کے ہوگئے تو ہمارے معبودوں کو برا کہنے لگے اور ایسا دین پیش کرنے لگے جو ہمارے آباواجداد کے دین کے خلاف ہے۔

حبیب نے کہا (حضرت) محمدﷺ کو بلاؤ تو انہوں نے حضور کو بلانے کے لئے دربان کو بھیجا تب پھر حضرت ابوبکر صدیق حضور کی خدمت میں سرخ لباس اور کالا عمامہ لے کرآئے اور حضورا سے زیب تن فرما کر حبیب کے یہاں تشریف لائے، حضرت ابوبکر حضور کے دائیں جانب اور حضرت خدیجہ حضور کے پیچھے تھیں! حبیب نے جب حضور کو آتے دیکھا تو فوراً اکرام کے لئے کھڑا ہوگیا اور پھر حضور تشریف فرما ہوئے تو عالم یہ تھا کہ حضور کے روئے زیبا میں نور چمک رہا تھا جس کی وجہ سے سب زبانیں خاموش تھیں کہ لوگوں کے دلوں پر حضور کی ہیبت طاری ہوگئی تھی۔تو حبیب نے گفتگو شروع کی کہ محمد!ﷺ آپ جانتے ہوں گے کہ ہر نبی کے پاس کوئی نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے، کیا آپ کے پاس بھی کوئی معجزہ ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کیا چاہتے ہو؟

حبیب کہنے لگا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سورج کو غائب کر کے چاند نکال دیں اور چاند کو زمین کی طرف اتاریں اور چاند کے دوٹکڑے کردیں اور پھر وہ واپس آسمان میں روشن مہتاب ہوکر لوٹ جائے۔تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر میں ایسا کردوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ کہا، ہاں مگر اس شرط پر کہ آپ میرے دل کی بات بتائیں گے، اب رسول اللہﷺ جبل ابوقبیس پر چڑھ گئے اور آپ نے دورکعت نماز پڑھ کے اپنے رب سے دعا کی۔اتنے میں جبرئیل علیہ السلام اتر آئے اور کہنے لگے: یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے لئے شمس وقمر اور لیل و نہار کو کام پہ لگایا ہے مسخر فرما دیا ہے اور حبیب بن مالک کی ایک اپاہج بیٹی ہے قعاد کی بیماری والی اس کے نہ ہاتھ پیر

ہیں اور نہ آنکھیں تو آپ اسے بتا دینا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بیٹی کے اعضاء وجوارح لوٹا دیئے ہیں۔

پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ پہاڑ سے اترے اور حال یہ تھا کہ حضرت جبرئیل ہوا میں تھے، ملائکہ صف بستہ ہو گئے تھے کہ اتنے میں آقا علیہ السلام نے سورج کی طرف اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا ہی تھا کہ سورج بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ پوشیدہ ہو گیا اور تاریکی چھا گئی اور بدر منیر طلوع ہو گیا پھر حضور نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ کیا تو چاند دوڑنے لگا یہاں تک کہ زمین کی طرف اترا اور دو ٹکڑے ہو گیا پھر قمر منیر ہو کر واپس لوٹ گیا اور پھر سورج بھی لوٹ آیا جیسا کہ پہلے تھا۔

پھر حبیب نے کہا آپ پر ابھی ایک شرط باقی ہے!! تو نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ (اے حبیب بن مالک) تیری ایک اپاہج بیٹی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اعضا لوٹا دیئے ہیں۔ تو اب حبیب کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ اے مکہ والوں (سن لو) میں کفر نہ کروں گا ایمان لانے کے بعد! ارے جان لو میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے کوئی معبود اللہ کے سوا اور محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

یہ دیکھ کر ابوجہل کہتا ہے کہ کیا تو اس ساحر پر ایمان لے آیا؟ پھر حبیب بن مالک مسلمان ہو کر شام لوٹ جاتے ہیں اور جیسے ہی اپنے محل میں داخل ہوتے ہیں، ان کی بیٹی یہ کہتے ہوئے ان کا استقبال کرتی ہے" اشهد ان لا اله الاالله وان محمدا عبده ورسوله" وہ اپنی بیٹی سے پوچھتے ہیں کہ یہ کلمات تم نے کہاں سے سیکھے؟

وہ کہتی ہے عالم رویا میں کوئی میرے پاس آیا اور مجھ سے کہتا ہے کہ تمہارے باپ مسلمان ہو چکے ہیں اور اگر تم اسلام قبول کرتی ہو تو ہم تمہارے اعضائے سلیمہ لوٹا دیں گے تو میں نے خواب میں اسلام قبول کر لیا تو میں نے صبح کی اس حالت میں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ (الخرپوتی: ص۱۳۳، ۱۳۴)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

بحمدہ تعالیٰ ہم قصیدہ بردہ کی فصل خامس کے پانچویں شعر تک آپہنچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۶) وما حوی الغار من خیر ومن کرم   وکل طرف من الکفار عنه عمی

(ترجمہ:۔سراپا خیر (یعنی افضل الاولین والآخرین) اور سراپا کرم (یعنی اکرم الامت حضرت صدیق) کو غار نے اپنے اندر جمع کیا اور حال یہ تھا کہ کفار ہر طرف سے انہیں دیکھنے سے اندھے ہوگئے۔)

ربط: شاعر ذی فہم حسن ترتیب اور نئے نئے انداز واسلوب کے ذریعہ مسلسل ایک قصے سے دوسرے قصے کی طرف منتقل ہورہے ہیں، انہوں نے اپنے کلام کا آغاز ان عجائب سے کیا تھا جو حضور اکرم ﷺ کی ولادت سے پہلے اور ولادت کے وقت ظاہر ہوئے اور پھر انہوں نے بعض وہ دلائل وارہاصات بیان کیئے جو آپ ﷺ کی بعثت کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئے، یہاں تک کہ وہ ذکر کرتے کرتے، واقعات ہجرت کے ابتدائی احوال اوران خوارق عادات قصوں تک آپہنچے جو غار میں داخل ہونے کے وقت پیش آئے، تو اس شعر میں شاعر ذی فہم نے اس مکہ مکرمہ وطن عزیز سے ہجرت کے ابتدائی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جو وطن کہ اللہ ورسول کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور مقام، وطن عزیز سے خروج کرنے کے اسباب کی تفصیل چاہتا ہے، لہذا ہم قارئین کرام کی خدمت میں وہ قصہ بیان کریں گے جو بعد بعثت آپ ﷺ کے تبلیغ ودعوت دین کی کیفیت کے بیان پر مشتمل ہوگا اور بیان کیا جائے گا کہ کس طرح دین محمد ﷺ پھیلا کہ آپ کو اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا اور کس طرح آپ کے ہم وطنوں نے آپ کو ایذا پہنچائی تو وہ اہل شہر ہی حضور اکرم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کی وجہ بنے۔ اور درمیان قصہ ہم شاعر ذی فہم کے قصیدۂ ہمزیہ سے کچھ اشعار پیش کرنا چاہیں گے جس میں انہوں نے ان سبھی واقعات کی طرف اشارہ کردیا ہے، امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ قصیدۂ ہمزیہ میں فرماتے ہیں:

وسلوه وحن جذع اليه   وقلوه ووده الغرباء

(کفار قریش نے (صاحبان عقل وخرد ہوکر) حضور کو فراموش کر دیا، (حالانکہ ایک بے جان کھجور کے درخت کی) لکڑی حضور کی بے حد مشتاق تھی، انہوں نے ان سے نفرت کی حالانکہ غرباء ان کے عاشق زار تھے۔)

اخرجوه منها و آواه غار   وحمته حمامة ورقاء

(کفار نے ان کو وطن عزیز سے نکال دیا یہاں تک کہ سراپا صدق وصدیق غار میں پناہ گزیں ہوئے اور پھر چت کبرا رنگ کبوتر نے آپ کو کفار سے محفوظ رکھا۔)

وكفته بنسجها عنكبوت   ماكفته الحمامة الحصداء

(مکڑی کے جالے نے انہیں محفوظ اور مستغنی کھا جس طرح گھنے بالوں والا کبوتر انہیں کافی ہوا۔)

واختفى منهم على قرب مرآه   ومن شدة الظهور الخفاء

(وہ ان کی نگاہوں سے بہت قریب ہوکر ابھی ان سے پوشیدہ تھے، اور شدت ظہور سے پوشیدگی اور خفا پیدا ہوگئی تھی۔)

امام بن حجر مکی " افضل القریٰ " میں ان اشعار کے تحت فرماتے ہیں: (سَلَوہ) یعنی اہل مکہ حضور سے متنفر ہوگئے یہاں تک کہ انہوں نے حضور کو نکال دیا باوجودیکہ حضور انہیں میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے وہ حضور کا منزہ ہونا اور حضور کے انتہائی کمال کو جانتے تھے۔ (حن جذع اليه) یعنی وہ درخت خرما کا تنہ مشتاق تھا جیسا کہ متعدد طرق صحیحہ وغیرہ سے ثابت ہے جن کا مجموعہ مفید تواتر معنوی ہے جو موجب یقین وقطعی الوقوع ہوتا ہے اور علامہ تاج سبکی کا یہ قول تواتر معنوی ہی پر محمول ہے کہ فرماتے ہیں ''میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس کے مشتاق ہونے کا ثبوت متواتر ہے''، اور اسی وجہ سے قاضی عیاض نے اسے پیش کیا ہے اور اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ منبر شریف بننے سے پہلے آپ ﷺ درخت خرما کے تنے پر ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے اور اسی کھجور کے درخت کی لکڑی سے مسجد کی چھت لگائی گئی تھی اور پھر جب حضور کے لئے تین سیڑھیوں کا منبر تیار کر دیا گیا اور اسے مسجد میں اس درخت خرما کے تنے کی جگہ پر رکھ دیا پھر جمعہ کے دن حضور اس تنے کو پھاند گئے تا کہ خطبہ اب اس منبر پر دیں تو اچانک وہ کھجور کے

درخت کا تنہ چیخ پڑا یہاں تک کہ اس کی چیخ تمام حاضرین مسجد نے سنی۔۔۔(قصہ)
(ورقاء) وہ رنگ جس میں سفیدی سیاہی سے ملی ہوئی ہو(چتکبرا)(الحمامة الحصداء) ناظم نے اس معنیٰ کو ''شجرة حصداء'' (بمعنیٰ گھنا درخت) سے لیا ہے یعنی زیادہ پتوں والا درخت پھر اس کو کبوتر کے لئے استعارہ کرلیا، اس کے بالوں کے کثیر اور گھنے ہونے کی وجہ سے۔

قبیلہ اوس وخزرج کے ایمان لانے کی تفصیل

علامہ ابن حجر مکی قصیدہ ہمزیہ میں ناظم کے اس قول (ودّہ الغرباء) کے تحت فرماتے ہیں یعنی وہ لوگ آپ ﷺ سے محبت کرنے لگے جو نہ آپ کے قبیلے کے تھے اور نہ آپ کی قوم سے اور نہ ہی وہ غرباء حضور کے وہ عظیم کمالات جانتے تھے جو قریش جانتے تھے، ان کی مثال میں انصار، اوس وخزرج وغیرہ قبائل ہیں اور یہ قبائل اس طرح ایمان لائے کہ آپ ﷺ ہر سال حج کے موقعہ پر تشریف لے جاتے جس میں آپ حجاج سے ملاقات کرتے قبائل عرب سے اپنی نبوت کا اظہار فرماتے جیسا کہ آپ ہر سال حج کے موقعہ پر کیا کرتے تھے، تو گھاٹی کے قریب حضور کی ملاقات بعض اہل خزرج سے ہوئی حضور نے ان سے دریافت فرمایا کہ آپ لوگ کہاں سے ہیں؟ بولے خزرج سے، حضور نے فرمایا آیئے بیٹھ کے کچھ گفتگو کرتے ہیں، وہ بیٹھ گئے، تو حضور نے انہیں دین اسلام کی دعوت دی اوران پر قرآن پاک کی تلاوت فرمائی، جبکہ وہ پہلے سے نبیٔ آخرالزماں کے بارے میں کچھ جانتے تھے اسی وجہ سے وہ حضور خاتم النبین کے اوصاف پہچان گئے اس لئے کہ مدینہ کے یہود ان سے کہا کرتے تھے کہ جلد ہی ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں ہم ان کی پیروی کرکے ان کی معیت میں تمہیں قتل کریں گے، یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے دین اسلام قبول کرلیا تاکہ یہود سبقت نہ لے جائیں لہذا ان میں چھ افراد ایمان لے آئے، پھر حضور نے ان سے فرمایا کہ آپ لوگوں نے میری مدد کی یہاں تک کہ میں نے اپنے رب کا پیغام آپ تک پہنچا دیا، تو وہ کہنے لگے کہ ہم اپنی قوم کو بھی اس کی دعوت دیں گے جس کی آپ نے ہمیں دعوت دی ہے تو اگر وہ قبول کرتے ہیں تو آپ سے زیادہ معزز ومکرم کوئی نہیں اور آپ سے ملنے کا وقت موعود آئندہ حج کا سال ہے، پھر جب یہ افراد مدینہ منورہ پہنچے تو

مدینہ میں کوئی بھی گھر ایسا باقی نہ رہا جس میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔

پھر آئندہ سال حضور سے بارہ لوگوں نے ملاقات کی یعنی پہلے ایمان لانے والے ان چھ قبیلوں میں سے تو پانچ چھ نے اور باقی قبیلۂ خزرج کے تمام باقی ماندہ خاندان نے بھی حضور سے ملاقات کی (یہ کل بارہ ہوئے) سوائے ان میں دو لوگوں کے اور پھر ان کے بعد قبیلۂ اوس کے لوگوں نے ملاقات کی۔ اور یہ عقبہ ثانیہ ہے۔

آگے علامہ ابن حجر یہ کہتے ہیں "پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے دلوں میں دین اسلام راسخ فرمادیا" پھر وہ عقبۂ ثالثہ کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "حضرت جابر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ (اعلان نبوت کے بعد) دس سال تک (مکہ مکرمہ) میں قیام فرمارہے، اس مدت میں آپ ﷺ منیٰ میں لوگوں کے پاس ان کی قیام گاہوں پر جا جا کر فرمایا کرتے" من ینصرنی حتی ابلغ رسالة ربی۔۔وله الجنة" یعنی کون ہے جو میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچادوں اور اس کے لئے جنت کی بشارت ہے، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کی حمایت کے لئے اہل یثرب کو بھیج دیا، اور ایک حدیث ذکر کی گئی ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے اس پر بیعت لی کہ تم میری مدد کرنا جب میں تمہارے پاس یثرب آؤں اور ان چیزوں سے میری حمایت کرنا جس سے اپنے آپ کی اور اپنے اہل وعیال کی مدد کرتے ہو۔ اور ایسا کرنے پر تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

ہجرت کے احوال وواقعات

اور حضرت عباس اس بیعت میں حاضر تھے پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو تاکید فرمائی اور اپنے ساتھ باقی ماندہ اصحاب کو مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دیا تو وہ گروہ در گروہ ایک ایک کرکے روانہ ہونے لگے مگر حضور اذن کے انتظار میں قیام فرمارہے اور حضرت ابوبکر حضور سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کرتے تو ارشاد ہوتا کہ " لاتفعل، لعل الله یجعل لك صاحبا" یعنی جلدی نہ کرو شاید کہ اللہ تعالیٰ کسی کو تمہارا شریک سفر بنادے، تب حضرت ابوبکر کو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہجرت کرنے کی آرزو ہوئی۔

اور جب قریش کو یہ خبر پہنچی کہ آپ ﷺ (نکلنے کا) عہد کرچکے ہیں اور آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دے دیا ہے

کہ وہ آپ سے مدینہ منورہ میں ملیں اور جب یہ ہجرت کا راز افشا ہو گیا تو انہوں نے دار الندوہ میں مشاورت کی! اوراس میں یہ باتیں طے پائیں کہ یا تو انہیں بند کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے یا پھر نکال دیا جائے، اتنے میں ان کے مابین ابلیس ایک خوبصورت آدمی کی شکل میں آیا اور ظاہر کیا کہ وہ ان کو مشورہ دینا چاہتا ہے تو اس نے ان سے ان کی آرا پیش کرنے کے لئے کہا تاکہ وہ ان میں سے نافع تر رائے کو چن لے تو اسے بتایا گیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ انہیں قید کر دیں تو کہنے لگا کہ اس سے تمہارے درمیان نزاع پیدا ہو جائے گا، پھر اس سے کہا گیا کہ تو پھر ہم چاہتے ہیں کہ انہیں شہر سے نکال دیں تو بولا کہ پھر تو وہ تمہارے پاس وہ لے کر لوٹیں گے جس کی تمہیں طاقت نہ ہوگی، اتنے میں ابوجہل بول پڑا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ ہر قبیلے سے ایک قوی جوان کا انتخاب کرو اور پھر انہیں تیز تلواریں تھما دو حدیث میں اسی طرح آیا ہے، پھر ان لوگوں میں سے سبھی وار کریں تاکہ ان کا خون مختلف قبائل میں متفرق ہو جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے اہل قاتلین کے قوم سے جنگ نہ کر سکیں گے اور محض خون بہا لینے پر مجبور ہو جائیں گے، اس پر ابلیس بولا بہت اچھی سوچ ہے! یہی رائے درست ہے پھر سب اسی پر متفق ہو گئے، اسی اثنا میں حضرت جبرئیل حضور کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ آج کی رات آپ اپنے بستر پر نہ گزاریں حالانکہ وہ کفار قریش اس رات حضور کے دروازے پر اکٹھا ہو کر حضور کے سونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ دفعتہً ان پر ٹوٹ سکیں، ادھر حضور ﷺ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی جگہ سونے کا حکم دے کر باہر نکلے ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سبھی کی بصارت چھین لی اور وہ حضور کو نہ دیکھ سکے تھے اور آپ نے سبھی کے سر پر وہ مٹی جو آپ کے دست مبارک میں تھی یہ تلاوت کرتے ہوئے بکھیر دی ﴿ يٰسٓ (1)وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ (2)إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (3) عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (4)تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (5)لِتُنذِرَ قَوْماً مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ (6)لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (7)إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالاً فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ (8)وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدّاً وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدّاً فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (9)

اور حدیث صحیح میں ہے کہ ان میں سے جس کو بھی مٹی لگی وہ حالت کفر ہی میں قتل کیا گیا، (آگے واقعہ یوں ہے کہ)

پھر انہیں اپنے مقصد کے فوت ہوجانے کا علم ہوا، اور جب انہوں نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا تو سبھی نے مٹی پائی، اور اسی واقعہ کے متعلق ہی یہ فرمان باری تعالیٰ نازل ہوا﴿ و اذ یمکر بك الذین کفروا یثبتوك او یقتلوك﴾ (الانفال: ۳۰) ، پھر اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اذن ہجرت عطا فرمایا۔

مزید علامہ ابن حجر مکی قصے کے بیان میں آگے چل کر فرماتے ہیں: پھر آپ ﷺ نے حضرت علی کو قائم مقام کیا تا کہ حضور کے ذمہ جو امانتیں تھیں انہیں وہ ادا کردیں، حضور انہیں قائم مقام بنا کر حضرت ابوبکر صدیق کے گھر ظہر کے وقت تشریف لائے، آ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک اب مجھے اجازت مل گئی ہے نکلنے کی، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں شریک سفر ہوسکتا ہوں؟ ارشاد ہوتا ہے: ہاں! اجازت ہے پھر حضرت ابوبکر صدیق عرض کرتے ہیں حضور میرے دو ناقوں میں سے کوئی ایک پسند فرمالیں، حضور ارشاد فرماتے ہیں، ہاں لیکن عوض کے بدلے لوں گا تا کہ ہجرت صرف بوجہ اللہ رہے اور کسی غیر کا اس میں احسان نہ رہے، پھر راتوں رات آپ دونوں حضرات جبل ثور کے غار کی طرف روانہ ہوگئے اور اس میں چھپ گئے اور ادھر قریش نے جب آپ کو مکہ مکرمہ میں نہ پایا تو مکہ مکرمہ کے اوپر نیچے ہر جگہ آپ کی تلاش شروع کردی اور حضور کے تعاقب میں ہر سمت ایک ایک دستہ بھیجا، تو وہ دستہ جو جبل ثور کے سمت روانہ ہوا تھا اس نے وہاں حضور کے گزرنے کے نشانات پائے، وہ نشانات کے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ وہ نشانات ختم ہوگئے جب وہ جبل ثور تک پہنچے اور ان کفار کا حال یہ تھا کہ حضور کا نکل جانا ان پر انتہائی شاق گزرا تھا اور وہ حضور کو پانے کے لئے بیتاب تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضور کو واپس لانے والے کے لئے سو اونٹوں کا انعام مقرر کردیا تھا۔

مختلف روایات سے قصۂ غار کی تفصیل

پھر جب وہ کفار غار میں داخل ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ غار میں داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے غار کے سرے پر "ام غیلان" کا پیڑ اگا دیا تھا جس کی وجہ سے غار ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئی تھی اور

اللہ تعالیٰ نے دو کبوتر بھیج دیئے تو وہ غار کے منہ پر آ کر بیٹھ گئے جیسا کہ شاعر ذی فہم نے (قصیدہ ہمزیہ میں) کہا: "حمته حمامة ورقاء" تو شعر میں ان دونوں کا حضور کی حمایت وحفاظت کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ قریش کے جوان جب ہر جانب سے اسلحے اور ہتھیار لے کر پہنچے اور کچھ لوگ غار میں ڈھونڈنے لگے تو انہوں نے وہاں صرف دو کبوتر اور دو مکڑیاں دیکھیں تو انہیں لگا کہ غار میں کوئی نہیں ہے، تو وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس لوٹ آئے، تو ساتھیوں نے پوچھا کیا ہوا؟ وہ شخص بولا میں نے وہاں دو کبوتر اور مکڑی دیکھی تو مجھے لگا کہ اس میں کوئی نہیں۔
تو دوسرا شخص کہتا ہے کہ غار میں گھس کے دیکھو اتنے میں لعین امیہ بن خلف کہتا ہے کہ غار میں تمہیں کیا پڑی ہے؟ ارے اس میں ایک مکڑی ہے جو حضرت محمد ﷺ کی ولادت سے پہلے کی ہے۔
'مسند بزار، میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مکڑی کو حکم دیا تو اس نے غار کے منہ پر جالا بن دیا۔
مروی ہے کہ کبوتروں نے غار کے نیچے انڈے دیئے اور مکڑی نے غار کے اوپری حصے میں جالا بنا تھا تو یہ دیکھ کر کفار کہنے لگے کہ اگر وہ دونوں غار میں داخل ہوئے ہوتے تو انڈے ٹوٹ جاتے اور جالا پھٹ جاتا۔
ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ یہ معجزہ اعجاز میں قوم کا لشکر کے ذریعہ مقابلہ کرنے سے زیادہ بلیغ ہے۔
روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی ''اللھم اعم ابصارھم " کہ اے اللہ تو ان کو اندھا کر دے تو وہ حضور کے داخل ہونے کی جگہ سے اندھے ہو گئے، تو وہ غار کے اردگرد ادھر ادھر اس گمان میں دیکھنے لگے کہ اگر اس میں کوئی ہوتا تو کبوتر نہ منڈلاتے اور مکڑی ان پر جالا نہ بنتی، اس لئے کہ عادت وطبیعت بھی یہی ہے کہ وہ وحشی جانور اور اس طرح کے وحشی جانور جب بھی کسی انسان کی موجودگی محسوس کرتے ہیں تو فوراً بھاگ لیتے ہیں لیکن باوجود اس کے، ان کفار نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی مخلوق میں اسے کام پہ لگا دیتا ہے اور اپنے بندوں میں جس کے لئے چاہتا ہے مسخر فرما دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ جس چیز سے چاہے اپنے بندے کو محفوظ رکھے اور اللہ کی یہ حفاظت اسے اسلحوں اور قلعوں کے ذریعہ اپنی حفاظت کرنے سے مستغنی کر دیتی ہے۔
حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان میں سے کوئی بھی اگر

اپنے قدموں کی طرف نظر کرلے تو وہ ضرور ہمیں دیکھ لے گا تب سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر! تمہارا کیا خیال ہے ان دو کے بارے میں، جن میں تیسرا اللہ ہے؟ (یعنی جنگی مدد خود اللہ فرمارہا ہو۔)

مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے غار میں حضور علیہ السلام کے قدمین شریفین کو دیکھا کہ ان سے خون بہہ رہا ہے اس لئے کہ سخت زمین پر چلنے کی حضور کی عادت نہیں تھی! تو وہ رونے لگے، پھر وہ حضور سے پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ جولگنا ہے انہیں لگے، تو انہوں نے اس میں ایک سوراخ دیکھا تو انہوں نے اپنی ایڑی کو اس میں داخل کردیا تو سانپ ان کی ایڑی پر ٹھوکر مارنے لگا اور انہیں ڈسنے لگا، جس کی وجہ سے ان کے آنسو بہہ نکلے۔

امام رزین کے نزدیک ایک روایت میں ہے کہ ان کے بعد آپ ﷺ غار میں داخل ہوئے اور اپنے سر مبارک کو ان کی گود میں رکھ کر سو گئے، تب حضرت ابوبکر کو سانپ نے پیر میں ڈنسا تھا لیکن انہوں نے گود کو جنبش نہ دی تو ہوا یہ کہ ان کا آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ زیبا پر گرا جس کی وجہ سے حضور بے دار ہو گئے، اور فرماتے ہیں کیا ہوا؟ عرض کرتے ہیں حضور مجھے سانپ نے ڈنس لیا، تو حضور اپنا لعاب دہن اس پر لگاتے ہیں تو ان کی تکلیف جاتی رہتی ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب دستہ کفار دیکھا تو ان کا حزن وغم بڑھ گیا اور کہنے لگے کہ اگر میرا قتل ہوا تو محض ایک انسان کا قتل ہوگا لیکن اگر حضور کو شہید کردیا تو پوری امت ہلاک ہو جائے گی، تو آپ ﷺ نے فرمایا (لا تحزن ان الله معنا) یعنی اے ابوبکر غم نہ کرو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے یعنی اللہ کی مدد ونصرت (فانزل الله سكينته عليه) یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر پر سکینہ نازل فرمایا اس لئے کہ وہی گھبرائے تھے اور یہ وہ امن ہے کہ اس کے ساتھ قلوب سکون واطمینان پاتے ہیں (و ايده) یعنی سکینہ ان پر نازل کیا اور اپنے رسول کی تائید فرمائی (بجنود لم تروها) یعنی ملائکہ کے لشکر سے کہ کفار کی آنکھیں اسے دیکھنے سے اندھی ہو گئیں۔

ابن حجر یہ کہتے ہوئے اضافہ فرماتے ہیں کہ حضور سید المرسلین ﷺ کے اس فرمان (ان الله معنا) اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان (كلا ان معی ربی سيهدين) کے درمیان اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ آپ دونوں کے مقام و مرتبے میں فرق ہے اس لئے کہ یہاں کمال امداد حضور کے اتباع کے لئے بھی ہے، صرف ہمارے نبی کریم ہی کے لئے نہیں کہ معیت کے شہود میں حضرت ابوبکر کی بھی امداد فرمائی، جبکہ حضرت موسیٰ نے صرف اپنے آپ پر اقتصار فرمایا نیز الوہیت کی معیت اور ربوبیت کی معیت کے درمیان فرق ہے۔

مشہور یہی ہے کہ حضور نے غار میں تین رات قیام فرمایا، حضرت عبداللہ ابن ابوبکر اپنی صغرسنی کے باوجود ان کے پاس راتوں رات کفار قریش کی خبر لے کر آتے تھے اور پھر رات کے آخری حصے میں پو پھٹنے سے پہلے ان کے پاس سے چل دیتے تھے اور مکہ میں اس طرح صبح کرتے کہ جیسے انہوں نے رات مکہ ہی میں گزاری ہو۔

اور عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلام) ان کے پاس ہر رات دودھ وغیرہ کھانے کی اشیاء لے کر آتے اور پھر انہوں نے عبداللہ بن اریقط کو راستہ بتانے کے لئے کرائے پر لے لیا اور ان کا حال یہ تھا کہ وہ ابھی دین اسلام سے متعارف نہ ہوئے تھے تو آپ حضرات نے اپنی اونٹنیوں کو انہیں سونپ دیا اور تین رات کے بعد انہوں نے غار ثور کو چھوڑ دیا تو عبداللہ بن اریقط ان کے پاس آئے وران کے ساتھ عامر بن فہیرہ بھی تھے پھر اس نے آپ دونوں حضرات کو ساتھ لے کر طریق بحر لیا۔ (علامہ ابن حجر مکی کا کلام یہاں اختتام پذیر ہوتا ہے ہماری جانب سے تغیر وتصرف یسیر کے ساتھ)(الهمزيه و شرحه ص: ۱۹۳ تا ۲۰۲)

اقول: نبی کریم ﷺ سے مدینہ شریف کو یثرب کہنے پر نہی وارد ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا " من سمى المدينة 'يثرب' فليستغفر الله، هى طيبة وهى طابة " کہ جو مدینہ منورہ کو یثرب کہہ بیٹھے تو اس کو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنا چاہئے، وہ طیبہ ہے طیب وطاہر ہے "لہذا علامہ ابن حجر کے کلام میں روایت بیان کرتے وقت جو کلمۂ یثرب واقع ہو گیا ہے؟ وہ قبل نہی پر محمول ہے۔

شرح کلمات غریبہ وبیان وجوہ اعراب: (وما حوى) ایسا مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے یعنی یوں ہے کہ آپ ﷺ کے جملہ معجزات میں سے ایک معجزہ یہ ہے کہ غار نے جمع واحاطہ کیا۔ (ما) اسم موصول ہے۔ (من) بیانیہ

ہے۔ (الغار) پہاڑ میں کھوہ۔(خیر) وہ جس کے لئے اچھا اور بہتر انجام ہو اور ''خیر'' یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے خلاف قیاس اور (خیر) اور (کرم) کی تنوین یا تو تعظیم کی ہے یا مضاف الیہ کا عوض ہے یعنی یوں ہوگا'' خیر البشر وکرمه'' کہ حضور ﷺ کی نفس وذات کو محض خیر وکرم بنایا گیا ہے۔ (کل طرف) یہ مبتدا ہے (عمی) اس کی خبر ہے۔صیغۂ ماضی ہو یا صفت (عنه) اس سے متعلق ہے اور اسکی ضمیر راجع ہے نبی کریم ﷺ کی جانب۔ (من الکفار) صفت ہے (طرف) کی اور جملہ محل حال میں ہے۔(شیخ زادہ ص ۱۳۵)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

بحمدہ تعالیٰ ہم قصیدہ بردہ کی فصل خامس سے اب چھٹے ساتویں اور آٹھویں شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۷۷)فالصدق فی الغار و الصدیق لم یرما وهم یقولون ما بالغار من ارم

(ترجمہ:۔تو سراپا صدق اور صدیق غار میں غضب ناک نہ ہوئے (بلکہ راضی برضائے الٰہی رہے) حالانکہ کفار بک رہے تھے کہ غار میں کوئی نہیں۔)

(۷۸)ظنوا الحمام و ظنوا العنکبوت علی خیر البریة لم تنسج ولم تحم

(ترجمہ:ان کافروں کو یہ گمان ہوا کہ مکڑی خیرالبریہ پر جالا نہ بنتی اور نہ کبوتر انڈے دیتا۔)

(۷۹)وقایة الله اغنت عن مضاعفة من الدروع و عن عال من الاطم

(ترجمہ:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمایت وحفاظت نے آپ کو کئی مضبوط زرہوں اور بلند قلعوں سے مستغنی کر دیا۔)

ربط: مذکورہ اشعار، جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرما رہے ہیں ایک دوسرے سے مرتبط اور ملے ہوئے ہیں نیز

تفصیل وتعلیل کے لحاظ سے ان اشعار کا گزشتہ شعر سے بھی ربط ہے، لہذا شاعر ذی فہم کا یہ قول (فالصدق) تفصیل ہے ان کے سابقہ اس قول ''و ما حوی الغار'' کی۔

(الصدق) یہ مصدر ہے بمعنیٰ اسم فاعل یعنی بمعنی صادق یا اسم مفعول ہے بمعنیٰ مصدوق اور اس سے مراد ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں جو اپنی خبر میں یقیناً ذوالصدق والمنن ہیں، لہذا حضور کی خبر واقع سے متخلف نہیں بلکہ واقع کے مطابق ہے اور حضور ایسے مصدوق ہیں کہ ان کے رب نے ان کی لائی ہوئی چیزوں میں ان کی تصدیق کی اور ان کی تصدیق کرنے کے لئے بندے پیدا فرمائے بلکہ جمادات ونباتات اور حیوانات کو سیدالاکوان علیہ السلام کے صدق کا گواہ بنایا تو حضور ہر نامناسب چیز سے معصوم ہیں اور وعدے کے پکے اور عہد ووفا کو پورا کرنے والے ہیں لہذا حضور اکرم ﷺ اپنی خبر، اپنے وعدے اور اپنے تمام امور واحوال میں صادق ہیں بلکہ آپ ﷺ لفظ صدق کے ہر معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے عین الصدق ہیں، اسی معنیٰ کو بتانے کے لئے ناظم شعر صدق مصدر لائے اور اسی وجہ سے حضور علیہ السلام کو صدق سے موسوم کیا، مزید اس میں فرمان باری تعالیٰ کی جانب اشارہ ہے: ﴿ والذی جآء بالصدق و صدق به ﴾ الآیة

(الصدِّیق) بروزن فِعِّیل صدق مصدر سے مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنیٰ کثیر الصدق، لقب ہے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (فی الغار) مبتدا کی خبر ہے اور (الصدیق) مبتدا ہے اور اس میں دوسرے مبتدا سے خبر کو محذوف کرلیا گیا ہے، پہلے کی خبر کا اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے یعنی یوں ہے'' الصدق فی الغار و الصدیق کذالك'' یعنی سراپا صدق غار میں موجود ہیں اور صدیق بھی اسی طرح غار میں موجود ہیں۔

(لم یرما) بالنصب حال ہے اور یہ مضارع تثنیہ کا صیغہ '' الورم ''(سوجنا) مصدر سے بمعنیٰ عدم انتفاخ، اس لفظ سے اس کا غیر مدلول یعنی غصہ نہ کرنا مراد ہے یعنی جن آزمائش میں وہ مبتلا ہوئے اس پر غضب ناک نہ ہوئے اس لئے کہ غضب ناک شخص کا چہرہ غصہ کی وجہ سے پھول جاتا ہے اور متورم ہوجاتا ہے۔

اسی وجہ سے '' لم یرما '' کا یہاں معنیٰ ہوگا ''لم یغضبا'' یعنی سراپا صدق وصدیق اکبر آزمائش پر ناراض نہ ہوئے بلکہ

قضائے الٰہی پر راضی وشا کر رہے اور خوف کو محسوس کر کے وہ اپنے حال سے متغیر نہ ہوئے، کمال تمکین اور صدق تعین کی وجہ سے یا پھر " لم یرما" کنایہ ہے اس غار میں ان کو عدم وصول ضرر و تکلیف سے جو غار کہ سانپوں کا ٹھکانہ تھا۔

اور ایک قول یہ ہے کہ " لـم یرما" اصل میں "لـم یرمن " نون خفیفہ برائے تاکید کے ساتھ تھا، تو اس صورت میں ضمیر راجع ہو گی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب کہ جن سے سانپ کے ڈسنے کی تکلیف دور ہو گئی تھی اور ان کے قدم مبارک سے ورم جاتا رہا تھا جب آپ ﷺ نے اپنا لعاب دہن لگایا تھا۔ اور یہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے کثیر معجزات میں سے ایک معجزۂ عظیم ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کرامت عظیم ہے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ " روم "مصدر سے بنائے مجہول کے ساتھ " لـم یرما " پڑھا جائے تو معنیٰ ہوگا کہ جب غار کے پاس آ کر قدمین شریفین کے نشان ختم ہو گئے تب آپ دونوں کو غار میں نہیں تلاشا گیا اور کفار کو یہ خیال ہوا کہ غار میں ان دونوں حضرات کی حمایت وصیانت اور محفوظ رکھنے کے لئے کوئی آنے جانے والا نہیں تو آپ دونوں حضرات محض قدرت جبار کی بدولت نگاہ کفار سے محجوب رہے (وھـم یقولون) واو حالیہ ہے اور ضمیر 'ھم' کا مرجع کفار ہیں دلالت مقام کی وجہ سے (یـقـولـون) یعنی انہوں نے فیصلہ کیا۔ (ما) نافیہ ہے (بـالـغـار) خبر مقدم۔ (مـن ارم) محل رفع میں مبتدا مؤخر ہے (مـن) زائدہ ہے برائے تاکید۔ (ارم و اریـم) ایک معنیٰ میں ہے مطلب یہ ہے کہ حال یہ تھا کہ کفار کہہ رہے تھے کہ غار میں کوئی بھی نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے انہیں یہ کہنے پر آمادہ کیا کہ غار میں کوئی نہیں؟ تو ناظم اس کا جواب اپنے شعر سے یوں دیتے ہیں:

ظنـوا الـحـمـام و ظـنـوا الـعنكبوت على   خيـر الـبـرية لـم تــنسـج ولـم تـحـم

تو یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے جو ایک سوال مقدر کے جواب میں واقع ہوا ہے۔

(الظن) متعدد معانی کے لئے آتا ہے (۱) علم جازم (۲) ظن غالب جو رائے سے راجح ہو (۳) وہم، کہا گیا ہے کہ یہاں وجہ ثالث مراد ہے اور وجہ ثانی مراد لینے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہے بلکہ وجہ اول مراد لینے میں بھی کوئی شئ مانع نہیں ہے، جیسا کہ پوشیدہ نہیں (الـحـمـام) بالنصب معطوف علیہ ہے اور (الـعـنـكبوت) معطوف ہے پہلے

والے پر۔

(ولم تنسج) بضم السین و کسرھا محل نصب میں مفعول ثانی ہے اور (ولم تحم) کے بارے میں بھی یہی قول ہے۔

(علی خیر البریہ) جار مجرور متعلق ہے "لم تنسج" سے (لم تحم)، حام یحوم سے بمعنیٰ گھومنا منڈلانا یعنی نہیں اڑا اور نہ چکر لگایا کبوتر نے، شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ "لم تحم" اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس کی ضمیر مکڑی (عنکبوت) کے لئے ہو، تو اس تقدیر پر پہلے والے "ظنوا" کا مفعول ثانی محذوف ہوگا، اس جملے کی طرح کہ کہا جاتا ہے " علفتھا تبنا و مآء باردا" (یعنی میں نے جانور کو چارہ دیا اور ٹھنڈا پانی) معنی یہ ہوگا کہ کفار کو یہ وہم ہوا کہ کبوتر اس غار کے دروازے کے پاس نہ منڈلاتے نہ اس پہ انڈے دیتے جس میں خیر البریہ ہوتے اور پھر یا تو وہ لف ونشر غیر مرتب کے طور پر پہلے والے "ظنوا" کا ہی مفعول ثانی ہے۔ (شیخ زادہ ص ۱۳۷)

تذکرۂ غار انتہائی معروف ومشہور ہے اور سیر کی تمام کتابوں میں مندرج ومذکور ہے اور اس قصے کا ایک مناسب حصہ ماسبق میں بیان بھی ہوا، اب شاعر ذی فہم اس کو بیان کرنے کے بعد بزبان فصیح اس سب حقیقی کو بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ تمام واقعات رونما ہوئے یعنی غار میں پناہ لینا، کبوتر کا انڈے دینا، مکڑی کا جالا بننا، کفار کو گمان گزرنا اور ان کا وہم میں پڑنا، اور قدموں کے آثار وعلامات کو مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کافروں کا غار میں داخل ہونے سے باز رہنا وغیرہ واقعات کا سبب حقیقی بیان کرنے کے لئے ناظم فاہم یوں گویا ہوتے ہیں۔

وقایة اللہ اغنت عن مضاعفة   من الدروع و عن عال من الاطم

تشریح:۔ (الوقایة) مصدر ہے "وقاہ یقیہ" سے بمعنیٰ حفاظت کرنا اور یہاں اپنے فاعل کی جانب مضاف ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے، تقدیری عبارت یوں ہے " وقایة اللہ نبیہ علیہ الصلوٰة و السلام" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے نبی علیہ السلام کی حفاظت کرنا انہیں مضبوط زرہوں اور بلند قلعوں سے بے پرواو بے نیاز کر دیتا ہے۔

(المضاعفة) ضاعف يضاعف" سے بمعنیٰ ایک شئی کو دوسری شئی سے ملانا (دوگنا کرنا) (من الدروع) یہ بیان ہے 'مضاعفۃ' کا اور 'الـدروع' جمع ہے 'درع' کی بمعنیٰ وہ چیز جو جنگ کے دوران پہنی جاتی ہے (یعنی زرہ) اور "المضاعفة فی الدروع" کا معنیٰ ہوگا جنگ میں محفوظ رہنے کے لئے زرہ پہ زرہ پہننا۔

(وعن عال) اس کا "مضاعفة" پر عطف ہے اس کا معنیٰ مکان مرتفع بلند جگہ ہے (الاطم) بضمتین 'اطمعة' کی جمع ہے بمعنیٰ قلعہ، اب معنیٰ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ملک جبار نے اپنے نبی مختار ﷺ کو محفوظ فرما دیا اور انہیں زرہوں اور متعدد طرح کے اسلحوں سے اور بلند و بالا مضبوط قلعوں سے مستغنی فرما دیا پھر اس نے اپنی قدرت سے غار کو حضور کے لئے مثل مضبوط قلعہ کر دیا اور مکڑی کے جالے کو قوی زرہ کے منزل میں کر دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت کی جایا کرتی تھی یہاں تک کہ یہ آیت پاک نازل ہوگئی: (و الله يعصمك من الناس) تب آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک قبہ سے نکال کر فرمایا" ایھا الـنـاس انـصـرفـوا فـقد عصمنی ربی" یعنی اے لوگوں چلے جاؤ یقیناً میرا رب میرا محافظ ہے، اور میرے رب نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی حفاظت من جانب اللہ ہی تھی مگر پہلے بواسطۂ حجاب تھی لیکن جب حجاب اٹھا لیا گیا تب آپ ﷺ کی حفاظت بلا واسطہ رب الارباب کے ذمۂ کرم پر رہی، اس شعر میں اس فرمان باری تعالیٰ کی جانب اشارہ ہے: ﴿ وما النصر الا من عند الله العزيز الحكيم ﴾ نیز اس فرمان باری عزوجل کی طرف بھی اشارہ ہے: (تنصروه فقد نصره الله) الاية

(یہ کلام ملا علی قاری کی تصنیف لطیف 'الزبدة' سے نقل کیا گیا ہے تصرف یسیر کے ساتھ)

ہجرت میں حکمت

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں کہ ناظم شعر کا طرز تعبیر، آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ہجرت میں حکمت کو بیان کر رہا ہے تو اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مدینہ منورہ تک ہجرت کرنے میں اور وہاں پر وصال شریف تک قیام پذیر رہنے میں آخر کیا حکمت ہے؟

تو اس کی حکمت کو ہم یوں بیان کریں گے کہ آپ ﷺ کی نسبت سے ہی تمام اشیاء معظم و مشرف ہوتی ہیں تو اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وصال شریف تک مکہ مکرمہ میں ہی قیام فرما رہتے تو اس سے یہ وہم گزر سکتا تھا کہ حضور علیہ السلام کو مکہ مکرمہ کی وجہ سے شرف و بزرگی نصیب ہوئی ہے کہ مکہ معظّمہ حضرت خلیل واسماعیل علیہما الصلوٰۃ و السلام کی نسبت سے پہلے سے ہی مشرف و مکرم تھا، اسی وجہ سے اللہ رب العزت نے اپنے حبیب کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم دیا اور پھر جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ ہجرت کر آئے تو حضور کی نسبت سے مدینہ معظّمہ مکرم و مشرف ہو گیا یہاں تک کہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ جگہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعضائے کریمہ سے ضم ہے، تمام روئے زمین سے افضل ہے۔

علامہ خرپوتی مزید فرماتے ہیں: پھر جاننا چاہئے کہ اس شعر کا روحانی فائدہ اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جنگلی جانوروں سے غیر مامون جگہ میں ہو، تو اسے چاہئے کہ اس شعر کو سات یا نو مرتبہ پڑھ کر اپنے ارد گرد ایک دائرہ کھینچ لے، (انشاء اللہ) پھر وہ جنگلی جانور اسے تکلیف نہ پہنچائیں گے اور اس گول دائرے کے اندر داخل بھی نہ ہو سکیں گے۔

استاذ گرامی (اللہ تعالیٰ ان کی عمر کو طویل فرمائے اور ان کی انتہا کو ان کی ابتدا سے بہتر فرمائے) نے فرمایا کہ میں نے کئی دفعہ اس کا تجربہ کیا تو میں نے اس بات کو سچ پایا۔ (الخرپوتی ص ۱۳۹)

کبوتر اور مکڑی کے متعلق کلام

ضمیمہ: اس خاتمے میں حمام اور عنکبوت کے متعلق کلام ہے، علامہ خرپوتی فرماتے ہیں "اخوان الصفا" میں مذکور ہے کہ حمام یعنی کبوتر کی خاصیت خطوں کو ایک شہر سے دوسرے شہر حمل کرنا ہے اور وہ اڑتے اڑتے یہ کہتا جاتا ہے "یاوحشتنا من فرقۃ الاخوان، یا طول الاشواق الی الخلان، یا رب ارشدنا الی الاوطان" یعنی تو نے مجھے میرے احباب کی فرقت سے وحشت میں ڈال دیا، اے امیدوں تم مجھے احباب کی طرف لے چلو اور اے میرے رب مجھے وطن عزیز کا راستہ دکھلا دے۔

"حلبة الكميات" میں ہے کہ لوگوں کا کبوتر کی آواز کے سلسلے میں اختلاف ہے کہ اس کی آواز کیا آہ و بکا ہے یا کچھ اور؟ تو بعض لوگوں نے اسے آہ و بکا قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچے پر روتی ہے کہ جس کو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں کسی صیاد نے شکار کر لیا تھا تو اس وجہ سے سبھی کبوتر قیامت تک اسی پر روتے رہیں گے۔

قلت: وہ جو اس فقیر پر ظاہر ہوا و الله اعلم یہ ہے کہ اس آواز کی حقیقت، سماعتوں کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خلوت گزیں جب اس کی آواز کو سنتا ہے تو خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور اس کو گانا کہتا ہے اور جب ایک عاشق زار سنتا ہے تو غم و اندوہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی آواز کو آہ بکا کہتا ہے۔انتھیٰ۔

(العنکبوت) ایسا کیڑا ہے جو ہوا میں جالے بنتا ہے، اس کی جمع عناکب اور تذکیر 'عنکب' آتی ہے۔ یہ بہت نرم و نازک اور اپنے شکار پر بہت حریص ہوتا ہے، یہ انڈے دیتا ہے اور اسے حیض آتے ہیں پہلے وہ چھوٹا سا کیڑا جنتا ہے پھر وہ کیڑا بعد میں بدل کر مکڑی ہو جاتا ہے، اس کی صورت تین دن میں پوری ہوتی ہے۔

مکڑی کے جالے کو اگر بدن کے ظاہری حصے کے تازہ زخم پر لگایا جائے تو اسے سوجھنے اور خون بہنے سے محفوظ رکھے گا اور اگر چاندی کو مکڑی کے جالے سے رگڑا جائے تو چاندی کی چمک آ جائے گی۔ نیز خلاؤں میں جالا بننے والی مکڑی کو اگر بخار زدہ پر ملا جائے تو وہ باذن اللہ صحیح و بری ہو جائے گا اور اگر کسی کپڑے میں لپیٹ کر چوتھیا بخار والے پر لگایا جائے تو شفا نصیب ہو۔انتھیٰ۔

"الجامع الصغير" میں ہے کہ آقا علیہ السلام نے فرمایا" العنكبوت شيطان مسخه الله فاقتلوه" یعنی مکڑی ایسا شیطان ہے جس کی صورت کو اللہ تعالیٰ نے مسخ فرما دیا ہے تو اس کو مار دیا کرو۔

امام ثعلبی، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "طهروا بيوتكم من نسج العنكبوت، فان تركه فى البيوت يورث الفقر" یعنی اپنے گھروں کو مکڑی کے جالوں سے پاک رکھو اس لئے کہ گھروں میں اسے باقی چھوڑنا تنگدستی پیدا کرتا ہے۔

"الحلية" میں ہے کہ مکڑی نے نبیوں پر دو مرتبہ جالا بنا، ایک دفعہ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جب جالوت

آ پکوڈھونڈ رہاتھااورایک دفعہ ہمارے نبی کریم ﷺ پر غار میں۔

دیلمی نے" مسند الفردوس" میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ سے مسخ شدہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ تیرہ ۱۳ ہیں (۱) ہاتھی (۲) ریچھ (۳) خنزیر (۴) بندر (۵) جریث (مارماہی، ایک قسم کی مچھلی) (۶) گوہ (۷) چمگادڑ (۸) بچھو (۹) پانی کا سیاہ کیڑا، کرم آبی (۱۰) مکڑی (۱۱) خرگوش (۱۲) سُہیل (ستارہ مخصوص) (۱۳) زہرہ (ستارہ مخصوص) الحدیث (۱)

"زبـــــدة" میں ہے کہ آپ ﷺ نے حرم میں رہنے والے کبوتر اور مکڑیوں کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔

(الخرپوتی ص ۱۳۷، ۱۳۸)

حاشیہ: (۱) شیخ جلیل سے میں یہاں اجازت چاہتا ہوں تا کہ ان کو جو شعر کی لڑیوں میں پرو دیا گیا ہے اسے پیش کردوں، لہذا میں ان سے معافی کا طلبگار رہوں۔ وہ شعر یہ ہے:

هـى الـقـرد و الـخـنـزيـر و الـدُّبُّ فيـلُـهُ ثَـلاثَـا و عَشَـرا فيهِـنَّ رَبّـى يـؤدبُ

و جـريـث و الــزهـرة سهيـل و ارنـب كـذا الـضـب يـرفـعـه علـى يـقـرب

عبدالجلیل عطا (البکری)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلى و نسلم على رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل خامس سے نویں اور دسویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۰) ماسا منى الدهر ضيما و استجرت به الا ونلت جوارا منه لم يضم

(ترجمہ:۔ اہل زمانہ نے مجھے کبھی ضرر و تکلیف نہ دی اس حال میں کہ میں نے حضور کی بارگاہ میں التجا کی ہو مگر یہ کہ

(میں نے جب بھی پناہ مانگی تو) میں نے جوار رحمت میں پناہ پائی اور کبھی دھتکارہ نہ گیا۔)

(۸۱)ولا التمست غنی الدارین من یده　　الا استلمت الندی من خیر مستلم

(ترجمہ:۔اور میں نے ان کی ذات کریم سے دنیاوآخرت کی تونگری نہ مانگی مگر یہ کہ میں نے خیر مستلم نبی محترم سے عطاو بخشش کولیا۔)

ربط: اس شعر میں جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرمارہے ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہے اور آپ ﷺ کے ارفع واعلیٰ مقام ومرتبے کی جانب اشارہ ہے بشمول اس حالت ومرتبت کے جوآپ ﷺ کے لئے ابتدائے اسلام اور آغاز امر میں ظاہر ہوئی تھی اور وہ حالت قائم ودائم رہی اور بلند ہوتی رہی یہاں تک کہ آپ ﷺ کے لئے ثبات ودوام پر ایک نیا مقام حاصل ہوا تو آپ ﷺ بدایت امر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے بالواسطہ محفوظ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے جس واسطے سے چاہا آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا اور اس نے اپنے بعض بندوں کو آپ ﷺ کے لئے کام پہ لگایا تا کہ وہ آپ کی حفاظت کریں لیکن پھر بعد میں رب تعالیٰ نے حضور کی حفاظت بلاواسطہ اپنے ذمۂ کرم پر لے لی کہ فرماتا ہے (واللہ یعصمك من الناس) (المآئدہ: ٦٧) لہذا آپ ﷺ (معصوم عن الخطا و الذنوب) بھی ہیں اور محفوظ (عن الاعدا) بھی ہیں اور ایک ہی وقت میں، مخلوق کے محافظ اور ان پر اللہ کی نعمتوں کا فیضان فرمانے والے ہیں اور آپ ہی کی ذات ان کے لئے شدائد میں ماویٰ وملجاً ہے۔

شاعر ذی فہم نے اسی بات کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ " ماسامنی الدھر...الخ "اور ایک نسخے میں " ماضا منی " ہے اور دوسرے میں " ضیما " کی جگہ " یوما " آیا ہوا ہے۔

(ماسامنی) "سام یسوم" سے بمعنیٰ قصد کرنا، چکھانا۔(ضیم) بمعنیٰ ظلم ہے۔ (ضیما) یا تو "ضامنی" سے مفعول مطلق ہے یا پھر "سامنی" کا مفعول ثانی ہے یا پھر اپنے لفظ کے علاوہ سے مفعول مطلق ہے۔

(الـدهر) فعل ماضی کا فاعل ہے اور مضاف کے حذف پر ہے یعنی مجازاً اهل الـدهر ہے، محل ذکر کر کے حال مراد لینے کی قبیل سے اور وہ اس لئے کہ یہ ایسا کلام ہے جو ایک مُوَحِّد سے صادر ہوا ہے اور یہی مجاز مراد لینے پر قرینہ ہے، جس طرح ہر اس چیز میں حال ہوتا ہے جس کی اسناد غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے، جیسے اگانا، پیدا کرنا، صحت دینا ایجاد کرنا وغیرہ ذالک مثل اس قول کے "انبت الـربيـع البقل" اور جیسے حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نبی اکرم ﷺ کے نواسے حضرت امام حسن سے یہ فرمانا" هل انبت الشعر فی الرؤوس الانتم!!!

''اور جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حـكـاية عن سيدنا عيسىٰ على نبينا عليه الصلوٰة و السلام فرماتا ہے (وابری الاكمه والا برص و احی الموتی) (الاية آل عمران: ۴۹)

مجاز کی ضرورت

اور دوسری بات یہ کہ مجاز کی حقیقت کا انکار کرنا، خلط عظیم اور خبط جسیم کی جانب لے جائے گا کہ اس کا انکار کر کے پھر کتاب وسنت کی عام باتوں پر ایمان لانا باقی نہیں رہ جائے گا اور اس سے اہل زبان کے محاورات باطل ہو جائیں گے، اس لئے کہ مجاز ایسے وسائل وذرائع پیدا کرتا ہے جس سے اکوان عالم قائم رہے، (لیکن اگر مجاز کا انکار کیا گیا تو) قرآن وسنت کی ظاہری تشبیہ وتمثیل سے جو تجسیم پیدا ہوتی ہے، اس سے معاملہ (معـاذ الله) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کے انکار تک لوٹے گا اور ایسا اس صورت میں ہوگا جب قرآن وسنت کے ظواہر کو اس کے غیر موضوع لہ معنی کے بجائے ان کے ان ظاہری معانی ومفاہیم پر محمول کیا جائے جو منافیٔ تنزیہ تعالیٰ ہیں، جس طرح کہ مجاز کا انکار شرک کا نیا معنی پیدا کرنے تک پہنچاتا ہے اور نبی وولی اور تمام مخلوق سے فریاد کرنے سے اختلاف و انتشار پیدا کرتا ہے یعنی مجاز کا انکار شرک کا نیا معنیٰ پیدا کرنے تک پہنچاتا اور انبیاء واولیاء سے استغاثہ کرنے کو شرک بتاتا ہے۔

جیسا کہ ہر اس شخص پر واضح ہے جس نے جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ کی ان تصانیف کا مطالعہ کیا ہے " قـوارع الـقهـار" ،" الامـن الـعلی لنا عتی المصطفیٰ بدافع البلاء" ، "برکات الامداد" اور جس نے ان

کتابوں کا مطالعہ کیا: شیخ علامہ عیسیٰ مانع حمیری دبی کی" الاجھاز علی منکری المجاز" اور دمشق شام کے عالم دین، شیخ ابراہیم بن نضال آلہ رشی کی" رفع الغاشية عن المجاز و التاويل و حديث الجارية"

مذکورہ باتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد مزید یہ کہ بعض علماء نے "اھل" کے بجائے "خالق" مضاف مقدر مان کر) "خالق الدهر" کی تقدیر بیان کی ہے، بایں ہمہ علامہ باجوری تقدیر اول یعنی" اهل الدهر" پرہی اقتصار کرتے ہیں اور میرے نزدیک بھی وہی اوجہ اور بہتر ہے اس لئے کہ تقدیر ثانی ایہام سے خالی نہیں کہ " ضیم" کا معنیٰ ظلم ہوتا ہے۔

(واستجرت به) " الاستجارة " مصدر سے ہے عرب بولتے ہیں" استجار فلان من فلان " بمعنیٰ نجات اور چھٹکارا چاہنا، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ہے (و ان احد من المشركين استجارك فاجره) اور کہا گیا کہ وہ بمعنیٰ التجا کرنا، فریاد کرنا، پناہ لینا، نجات طلب کرنا بھی ہے۔

اور اس میں "واو" حالیہ ہے اور جملہ محل نصب میں حال واقع ہے۔ (به) میں 'با' یا توسببیہ ہے یا استعانت کے لئے ہے اور اس کی ضمیر راجع ہے آپ ﷺ کی جانب۔

(الا) استثنائے مفرغ، مستثنیٰ منہ محذوف ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی" ماسامنی الدهر ضيما فی حال من الاحوال او فی يوم من الايام" یعنی اہل زمانہ نے مجھے کسی حال میں تکلیف نہ دی یا کسی دن تکلیف نہ دی!!! اس لئے کہ وہ بمعنیٰ وقت ہے۔

(نلت) بکسر نون " نال ينال " سے بمعنیٰ مراد کو پہنچنا، آرزو اور مقصد کو پالینا۔ (منه) اس میں ضمیر راجع ہے" ضیم" کی جانب جو مفہوم ہے" ضيام" سے، اور یہ اس صورت میں ہے جب" جوار" سے نجات مراد ہو، ورنہ تو وہ ضمیر خیر البریہ ﷺ کی ہوگی اگر اس سے پناہ گاہ چاہنا مراد ہو یعنی جائے پناہ۔ اور (ونلت) میں "واو" حالیہ ہے تو جملہ ترکیب میں حال واقع ہوگا۔ یا پھر یہ 'واؤ' برائے تاکید ہے صفت کو موصوف سے الگ کرنے کے لئے، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿ وما اهلكنا من قرية الا ولها كتاب معلوم ﴾ (الحجر: ٤)

(جواراً) 'جیم' کے کسر وضم کے ساتھ بمعنیٰ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے حفاظت وحمایت۔ (لم یضم) صیغۂ مجہول کے ساتھ بمعنیٰ "لم یحتقر" یعنی اسے ذلیل وحقیر نہ سمجھا گیا بلکہ اس کا احترام کیا گیا۔

شعر کا حاصل معنیٰ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے دنیا کے کسی بھی معاملے میں کبھی بھی ضرر وتکلیف کا مزہ نہ چکھایا اس حال میں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں التجا واستغاثہ کیا ہو مگر یہ کہ اس حال میں میں نے دنیا کے شدائد وپریشانیوں سے نجات حاصل کر لی اور بے شک مجھے رسول اللہ ﷺ کے دامن کرم میں پناہ نصیب ہوئی، نہ مجھ پر زبردستی کی گئی اور نہ ہی ظلم۔

شرح بیت ثانی: (ولا التمست) 'واؤ' عاطفہ ہے، جملہ ماسبق اس جملے (ماسامنی الدھر) پر معطوف ہے، اور نفی کی تکرار برائے تاکید ہے۔ "التمست" التماس مصدر سے ہے اور اصل میں بمعنیٰ مساوی کو مساوی سے طلب کرنا، لیکن صرف بمعنیٰ طلب کرنا ہے تجرید کے طور پر (غنی الدارین) یعنی دنیا وآخرت کی تونگری، دنیا کی تونگری مال، طاقت وقدرت اور قناعت سے ہے اور آخرت کی تونگری عذاب سے محفوظ ومامون ہونے سے ہے۔

(من یدہ) جار مجرور متعلق ہے "التمست" سے اور یہاں 'ید' یعنی ہاتھ سے ذات مراد ہے، کل پر جز کے اطلاق کے طور پر۔ بہر حال تو معنیٰ ہوگا آپ ﷺ کی شفاعت وتوسل اور برکت سے (الا استلمت الندی) مستثنیٰ، استثنائے مفرغ ہے جیسا کہ بیان گزرا اور مستثنیٰ منہ محذوف ہے، (استلمت) بمعنیٰ استسلام (مطیع ہونا) ہے اور یہاں ''استلام'' سے مراد ''لینا'' ہے۔ "الندیٰ" بمعنیٰ عطا ہے، یہ "استلمت" کا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ (من خیر مستلم) یا تو الندیٰ کی صفت ہے یا متعلق ہے "استلمت" سے "مستلم" یعنی وہ جن سے لیا جائے اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔

حاصل معنیٰ: میں نے آپ ﷺ کے احسان وانعام سے یا آپ کی ذات کریم سے یا آپ کی طرف سے کبھی دنیا کی تونگری اور غنیٰ کفایت وقناعت مانگ کر طلب نہ کی اور نہ آخرت کی تونگری سلامتی مانگ کر طلب کی مگر

یہ کہ میں نے عطا وبخشش پائی اور سب سے بہتر دینے والے، خیر مستلم، نبی محترم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مطلوب و مقصود کواور آرزو کو پالیا! لہذا میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سبب دنیا میں آفات سے آزاد ہوگیا اور آخرت میں بلیات سے ناجی ہوگیا۔

علامہ باجوری فرماتے ہیں کہ اس شعر میں اور اس سے پہلے والے شعر میں 'براءۃ الطلب' ہے اور وہ جیسا کہ علامہ زنجانی نے اپنی کتاب 'المعیار' میں تحریر فرمایا یہ ہے کہ، طلب کا ایسے میٹھے الفاظ سے اشارہ کرنا جو نقص فاحش سے عاری وخالی ہوں اور ممدوح کی تعظیم پر مشتمل ہوں تو ایسے الفاظ دل کی پوشیدہ بات بتاتے ہیں نہ کہ واضح اور عیاں کو۔ (حاشية الباجوری ص ٤٥)

شعر کے روحانی فوائد

ان دوشعروں کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قید ہو یا سلطان سے خائف ہو تو اسے ان دونوں شعروں کو ہر نماز کے بعد سترہ مرتبہ پڑھنے پر مداومت کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے (انشاءاللہ) اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے رنج وغم کو دور فرمادیگا اور اس کی آزادی کا کوئی انتظام فرمادیگا۔

علامہ خرپوتی پہلے والے شعر کی خاصیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں پھر جاننا چاہئے کہ اس شعر کی خاصیت یہ ہے کہ سفر کا ارادہ رکھنے والا کوئی بھی شخص اگر اس شعر کو لکھ لے اور اس طرح لکھے کہ مصرعۂ اولیٰ کو گھر میں اہل وعیال کے پاس چھوڑے اور مصرعۂ ثانی کو اپنے ساتھ سفر میں رکھے تو وہ انشاءاللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اہل وعیال سے آفات سے سالم ہوکر ملے گا۔ (الخرپوتی ص ۱۴۰، ۱۴۱)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل خامس کے گیارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۲) لا تنکر الوحی من رؤیاہ ان له — قلبا اذا نامت العینان لم ینم

(ترجمہ: خوابوں کے ذریعے آنے والی وحی کا تو ہرگز انکار نہ کرنا، اس لئے کہ حضور (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو ایسا قلب شریف عطا ہوا ہے کہ چشمہائے مبارک جب سوجاتی ہیں، وہ نہیں سوتا۔)

ربط: یہ شعر جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں مقصود کو ظاہر و واضح کرتا ہے اور آپ ﷺ کے آغاز و ابتدا تک ان احوال و امور کا ذکر کر کے پہنچتا ہے جو آپ کو ہدایت امر میں پیش آئے یہاں تک کہ آپ نے اعلان نبوت فرمایا اور یہ ان احوال میں سے ہیں جو امر نبوت کی تمہید اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی تاکید تھے اور یہ وہ احوال ہیں جو آپ ﷺ کے بذات خود بتانے اور اعلان حق کرنے سے پہلے ہی آپ کے اللہ رب العزت کی جانب سے مرسل ہونے پر دلیل تھے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

لو لم تکن فیه آیات منزلة — کانت بدیهته تاتیك بالخبر

(ترجمہ: اگر (بالفرض) اس قرآن میں آیات ونشانیوں کا نزول نہ ہوا ہوتا، تب بھی ان کے ابتدائی احوال، ان کی نبوت کی خبر دے رہے تھے۔)

بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ شاعر ذی فہم نے انوکھے انداز واسلوب میں اس مدلول کو ظاہر کیا جس پر رسول اللہ ﷺ کے احوال دال تھے، تو انہوں نے دلیل کے بعد مدلول ذکر کیا، لہذا وضعیت، ترتیب میں طبیعت کے موافق ہی ہے، تو ناظم یوں آغاز فرماتے ہیں" لا تنکر الوحی من رویاہ ان ---الخ'

(لا تنکر) 'الانکار' مصدر سے نہی حاضر کا صیغہ ہے اور یہ خطاب ہر اس شخص کے لئے عام ہے جو مخاطب کیا

جاسکتا ہے اور مخاطب کیئے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم ہرگز ان سے وحی کا انکار نہ کرنا جوان صفات ونعوت سے، متصف ہیں کہ وہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ان صفات کے اہل ہیں کہ وہ بارگاہ ایزدی میں دائم الشہود ہیں اور ہمیشہ بارگاہ احدیہ میں اس قلب سے مشاہد ہیں کہ جس قلب منور کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے تجلیات ربانی قبول کرنے کی قدرت دی گئی ہے اور وہ ہمیشہ اور ہر وقت اللہ سے استمداد کرتا رہتا ہے، لہذا حضور کا قلب شریف صبح وشام کسی بھی لمحے اپنے رب کے شہود سے جدا نہیں، اگرچہ آپ کے چشمہائے مبارک سوتے ہوں اور کیوں کر قلب شریف شہود رب سے کسی لمحہ الگ ہو کہ آپ کے قلب کو کوئی مرتبہ تجلیات ربانی وصول کرانے کے لئے شق کیا گیا خاص طور پر غار حرا میں حضرت جبرئیل کے آپ کے لئے وحی لانے کے وقت علامہ ابن حجر مکی شرح ہمزیہ میں تصریح فرماتے ہیں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کا شق صدر شریف ثابت ہے جس وقت حضرت جبرئیل آپ کے لئے وحی لائے تھے اور آپ غار حرا میں تھے۔ جن حضرات نے اس حدیث کو روایت کیا ان میں طیالسی اور حارثی ہیں اپنی اپنی مسند میں اور اسی طرح ابونعیم نے روایت کی ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت جبرئیل ومیکائیل نے آپ ﷺ کا شق صدر فرمایا اور قلب شریف کو غسل دیا پھر کہا:

﴿ اقرا باسم ربك الذى خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرا وربك الاكرم الذى علم بالقلم۔ علم الانسان مالم يعلم﴾

شق صدر مبارک میں حکمت

اور شق صدر میں حکمت یہ تھی کہ جو قول ثقیل آپ ﷺ پر نازل کیا جانا تھا، اس پر قلب قوی کے ذریعے آپ کی کمال قدرت اور مضبوطی ہو سب سے اکمل حالت تطہیر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شق صدر ہونا دوسری دفعہ شب معراج میں ثابت ہے، اس لئے کہ بخاری وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کا اس رات قلب شریف شق کیا گیا اس حال میں کہ آپ مسجد میں تھے، اپنی سواری براق تک جانے سے پہلے، تو آپ کے سینے شریف کے اگلے حصے سے ناف کے نیچے حصے تک شق کیا گیا، پھر آپ کے قلب منور کو نکال کر سونے کے طشت میں دھویا گیا جو ایمان

وحکمت سے مملوٴ تھا پھر اسے اندر رکھ دیا گیا۔

اس شق صدر میں حکمت یہ تھی کہ ملائے اعلیٰ اور آسمانوں کی طرف عروج کرنے پر (آپ ﷺ کو) آسانی ہو نیز وہ تجلیات وانکشافات جو آپ کو اس رات مشاہدہ فرمانے ہیں اس پر آپ کو قدرت وقابو ہو سکے، (یہی وجہ تھی کہ) جب اس طرح کا شق صدر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے واقع نہ ہوا تو آپ رویت باری تعالیٰ نہ کرسکے۔ (شرح الہمزیہ ص ۱۴۹)

وحی کے اقسام

(لا تنکر الوحی) میں 'وحی' کا معنیٰ معروف ہے، اس کا معنیٰ بیان ہو بھی چکا، علامہ ابن حجر شرح ہمزیہ میں فرماتے ہیں وہ وحی جو آپ ﷺ پر نازل ہوتی ہے، اس کی چند قسمیں ہیں:

(۱) رویائے صادقہ، تو حضور جب بھی کوئی خواب دیکھتے تو اس کی تعبیر روز روشن کی طرح سامنے آجاتی تھی۔

(۲) وہ الہام ووحی جو فرشتہ آپ ﷺ کے دل ودماغ پر ڈالتا، بغیر نظر آئے، حدیث صحیح کے مطابق کہ حضور نے فرمایا کہ یقیناً روح قدس میرے دل پر یہ القا کرتا ہے کہ کوئی جاندار اس وقت تک نہ مرے گا جب تک کہ وہ اپنے رزق کو مکمل نہ کرلے لہذا تم لوگ اللہ سے ڈرو اور طلب رزق حلال میں اعتدال سے کام لو۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ لباس بشر میں ملبوس ہو کر آپ ﷺ سے خطاب کرتا، حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ فرشتہ حضور کی بارگاہ میں حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں حاضر آتا، اس لئے کہ حضرت دحیہ کلبی بے حد حسین وجمیل تھے کہ جب وہ تجارت کے سلسلے میں جاتے تو عورتیں ان کو دیکھنے کے لئے نکل پڑتی تھیں۔

اور ایک سوال یہ کہ حضرت جبرئیل کا بشر کی صورت اختیار کرنا اور اس کی صورت میں متشکل ہو جانا باوجودیکہ وہ بہت عظیم وضع وجسم والے تھے کہ ان کے چھ سو پر تھے جو آسمان کے کنارے کو روکتے تو یہ کیسے ممکن ہے؟ بہرحال تو یہ ان سے بعید نہیں اس لئے اجسام نورانیہ انضمام ومل جانے کو قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی عظیم وجسیم صورت کو بہت زیادہ چھوٹی بھی کرسکتے ہیں، جس طرح کہ روئی دبائے جانے کو قبول کرتی ہے کہ اس کا بڑا وعظیم حجم وصورت

بھی دبانے سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔

(۴) چوتھی صورت وہ وحی جو آپ پر گھنٹے کی جھنکار کی طرح نازل ہوتی اور یہ آپ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی اتنی کہ اس کی وجہ سے آپ کی اونٹنی بیٹھ جایا کرتی نیز ایک مرتبہ اسی حالت میں آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت زید بن ثابت کی گود میں تھا، تو وحی کے بوجھ اور بہت ثقیل ہونے کی وجہ سے قریب تھا کہ ان کی ران ٹوٹ جاتی، یہاں تک کہ پھر وہ کہا کرتے تھے کہ میں اس دن کے بعد سے کبھی اپنے اس پیر سے چل نہ سکا۔

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ فرشتہ اپنی اصل صورت میں آپ کی بارگاہ میں حاضر آتا اور ایسا صرف دو مرتبہ ہوا جیسا کہ سورۂ نجم' میں ہے۔

اور حضور اکرم ﷺ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام بلا واسطہ بھی ہوا، حضرت موسیٰ کی طرح لیکن حضرت موسیٰ لقب کلیمؑ سے اس لئے مختص ہیں کہ ان کے ساتھ کلام رب زمین میں ہوا اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس وقت ہوا جب آپ دو قوسین یا اس سے بھی زیادہ قریب تھے یعنی " قاب قوسین او ادنیٰ " کی منزل میں تھے۔

حضرت امام شعبی سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہلے حضرت اسرافیل کو رکھا گیا جو حضور کی خدمت پر تین سال مامور رہے اور اس مدت میں وہ وحی وغیرہ کے کلمات لاتے رہے مگر پھر حضرت جبریل کو خدمت میں لگا دیا گیا تو وہ قرآن لایا کرتے۔ (شرح الہمزیہ ص ۱۶۴۔۱۶۵)

(رویا) کہتے ہیں ان مناظر کو جن کو شخص اپنے خواب میں دیکھتا ہے۔

حضور ﷺ کے نیند کی کیفیت کا بیان

اس شعر کا معنیٰ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان عالی شان سے ماخوذ ہے" تنام عیناى ولا ینام قلبى" یعنی ہماری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی نیند غیر نبی کسی بھی عام بشر کی طرح نہیں، بلکہ وہ تو صرف ہلکی سی اونگھ ہے جیسا کہ ناظم فاہم نے قصیدہ ہمزیہ میں تصریح فرمائی ہے۔

سید، ضحکه التبسم، و المشی   الهوینا و نومه الاغفاء

(سیدالاولین الآخرین کی ضحک تو صرف تبسم ہے اور چال نرم وآہستہ (سکون وقار کے ساتھ)اوران کی نیند تو صرف اونگھ ہے)

علامہ ابن حجر اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (سید) یعنی، اولین وآخرین تمام عالمین کے سردار۔ (ضحکہ) یعنی وہ جس سے حضور کی خوشی اور سرور ظاہر ہو وہ محض تبسم ہے، جیسا کہ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ فرماتی ہیں" ماراتیہ مستجمعا قط ضاحکا" یعنی میں حضور کو ہنسی پر بالکلیہ متوجہ ہوتے نہ دیکھا بلکہ حضور تو صرف تبسم فرمایا کرتے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی چال کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں کہ آپ ﷺ چلنے میں اطمینان وسکون اختیار فرمایا کرتے اور اس حالت میں آپ ﷺ سے چلنے میں جلدی اور تیزی واضح نہ ہوتی تھی اور ناظم شعر کی مراد بھی یہی ہے، اپنے اس قول سے" المشی " کہ حضور کی چال نرم وآہستہ ہوتی، (الھوینا) یہ "ھون" کی تصغیر ہے بمعنیٰ سکون ووقار۔

اور رہی حضور ﷺ کی نیند تو وہ صرف "اغفاء" ہے یعنی بہت ہلکی نیند کہ اس میں مستغرق نہ ہوتے اس لئے کہ گہری نیند، دل کے سوجانے اور غافل ہوجانے سے ہی آتی ہے اور ایسی نیند بہت زیادہ شکم سیری سے پیدا ہوتی ہے مگر آپ ﷺ تمام انبیائے کرام کی طرح ہیں کہ آپ کی آنکھیں سوتی ہیں قلب مبارک نہیں سوتا، جیسا کہ آپ ﷺ سے ثابت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کا وضو سونے سے نہیں ٹوٹتا۔

(آپ ﷺ کے محض چشمہائے مبارک کے سونے اور قلب مبارک کے نہ سونے میں) پوشیدہ حکمت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے قلب شریف کے لئے کمال حیات و بیداری رہے تاکہ آپ اپنے رب کی بارگاہ میں دائم الشہود رہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ جب سوتے تو آپ کا قلب شریف بے دار نہیں کرتا اس لئے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے رب کے شہود میں کس حال میں ہے (رہا یہ سوال کہ آپ ﷺ ایک موقعہ پر) صحرا میں سورج طلوع ہونے تک نماز فجر سے غافل رہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ سورج کو دیکھنا آنکھوں کا کام ہے تو گویا آپ کو وقت طویل گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا (الی ان قال) اس وجہ سے کہ آپ اپنے رب

کے شہود میں مستغرق تھے اور معارف الٰہی کے فیضان میں مستغرق تھے۔

درشرح کلمات غریبہ اور بیان وجوہ اعراب

(الوحی) مفعول بہ ہے (من رویاہ) یہ محل نصب میں حال واقع ہے یا محلا مجرور صفت ہے اور اس میں " من " ابتدائیہ ہے یعنی وہ وحی جس کا آغاز رویائے صادقہ سے ہوا یا " مـــن " بیانیہ ہے تو معنیٰ ہوگا کہ بے شک آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رویا وحی ہیں۔

(رویا) جیسا کہ علامہ مازری فرماتے ہیں کہ اہل سنت کے مذہب کے مطابق اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سونے والے کے دل میں اعتقادات پیدا فرمائے ہیں جس طرح کہ جاگنے اور بے دار رہنے والے کے دل میں پیدا کئے ہیں اور وہ صرف اللہ ہی ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کو نہ نیند روک سکتی ہے نہ بیداری تو ان اعتقاد کو سونے والے کے دل میں پیدا فرمایا مگر اس کا علم ان دوسرے معاملات پر رکھا جو ان سے دوسرے حال میں ملیں گے جیسے کہ ابر کو بارش پر علامت بنایا گیا۔

لفظ " رویا " الف مقصورہ کے ساتھ اور لفظ " رویت " یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں مگر یہ کہ اگر وہ خواب کے ساتھ مخصوص ہو تو یقینی طور پر اس پر الف تانیث لاحق ہوگی۔

ناظم شعر کا قول (ان له قلبا) یعنی اس لئے کہ حضور کا ایسا قلب منور ہے جو تقدیر یوں ہوگی " لان له قلبا " تو اس تقدیر سے معلوم ہوا کہ جملہ مستانفہ، گزشتہ اس قول " لا تـنـكـر الوحی " کی علت بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے اور " قلبا " کی تنوین برائے تفخیم و تعظیم ہے۔

ناظم شعر کا قول (اذا نـــامـــت الـعـيـنـــان) یعنی چشمہائے مبارک جب رطوبات انجر یہ کے اعصاب دماغ پر چڑھنے کے سبب سو جائیں، اس لئے کہ جب وہ چڑھتی ہیں تو انہیں کھول دیتی ہیں جس کی وجہ سے انسان سو جاتا ہے۔

اور " العینان " میں 'الف لام' مضاف الیہ کے عوض کے طور پر ہے، دراصل یوں ہے " عیناہٗ "

(لــم یــنــم) یعنی آپ کا قلب مبارک نہیں سوتا ہےاس لئے کہ اسے شق کیا گیا ہے جیسا کہ اس کا مفصل بیان گزرا اس وجہ سے کہ غیر اللہ کے تعلق سے اسے پاک کیا گیا اور حکمت وایمان سے مملو کیا گیا ہے تو ہمیشہ بےدار رہنا آپ ﷺ کی صفت ہے تا کہ آپ ﷺ سے خطاب باری اچھی طرح ہو سکے اور قلب شریف وحی کو بآسانی قبول کر سکے نہ کہ ان قلوب کی طرح کہ جو سو جاتے ہیں جب آنکھیں سوتی ہیں۔

اور رہی یہ بات کہ آپ ﷺ اپنے کسی سفر مین نماز سے طلوع شمس تک غافل رہے؟؟

تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ طلوع شمس کا مشاہدہ کرنا آنکھوں کا کام ہے اور وہ آنکھیں سورہی تھیں (نہ کہ دل)؟ جیسا کہ علام ابن حجر رحمۃ اللہ کے کلام میں گزرا۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی یوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل خامس کے بارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۳)و ذالك حيـن بـلـوغ مـن نبـوتــه   فلـيــس ينـكــر فيـه حـال محتلم

(ترجمہ:۔ یہ حال تو عمر نبوت تک پہنچنے کا ہے لہذا زمانۂ نبوت میں تو نبی محترم کے رویائے صادقہ کا انکار ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔)

ربــط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ شعر میں، آپ ﷺ کے رویا کا انکار نہ کرنے کی وجہ اور منع انکار کی علت جب ان الفاظ میں بیان کی: " ان لـه قـلـبـا" اور اس میں انہوں نے آپ ﷺ کے قلب شریف کی صفت جملے سے بیان کی جو" ان" کے اسم کی خبر کی قوت میں ہے (اور وہ جملہ جو قلب شریف کی صفت واقع ہے یہ ہے " اذنامت العينان لـم يـنـم ") تو وہ جملہ اسمیہ ثبوت ودوام اور استمرار کو مفید ہے لہذا وہ جملہ اس پر دال ہوا کہ عالم اجسام میں چالیس

سال کے آغاز پر اعلان نبوت فرمانے کے بعد، آپ ﷺ کے تمام رویا، وحی کی قبیل سے ہیں تو زمانۂ نبوت سے پہلے آپ نے جو خبریں دیں، آپ ان تمام خبروں میں مامون ہیں، تو اے مخاطب (جب اعلان نبوت سے پہلے حضور کا یہ عالم ہے تو) آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد کے سلسلے میں تیرا کیا خیال ہے؟ لہذا اس زمانے میں (زمانۂ نبوت میں) اس "محتلم" کے حال کا کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے کہ (شعر میں) اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں!! لہذا شاعر ذی فہم کا گزشتہ شعر کے معنیٰ کی اپنے مذکورہ ذیل شعر سے تاکید کرنا بہت عمدہ ہے کہ فرمایا:

و ذالك حين بلوغ من نبوته فليس ينكر فيه حال محتلم

اور یہ تاکید علت کے بعد علت لا کر ہوئی ہے اور قارئین کرام جانتے ہیں کہ بیان کردہ تقدیر مقام کے خوب مناسب ہے اور کلام کے لئے اقوم ہے۔۔۔اور یہ ان افادات میں سے ہے جن کو بعض شارحین نے اس موقعہ پر یوں بیان کیا ہے: کہ شاعر ذی فہم کے کلام سے جب سامع کو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ حضور علیہ السلام کے پاس وحی ہمیشہ نیند میں آتی تھی تو انہوں نے اس وہم کو اپنے اس شعر سے دفع کیا:

و ذالك حين بلوغ من نبوته فليس ينكر فيه حال محتلم

حالانکہ بعض شارحین اس افادے اور اس قول کے قائل نہیں کہ ان کو یہ وہم ہوا کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے تمام رویا اگر وحی ہیں تو آپ کے وہ رویا اور وہ خواب جو آپ نے اعلان نبوت سے پہلے دیکھے وہ بھی ضرور وحی ہوں گے، جب کہ ایسا نہیں؟ اس لئے کہ یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ ناظم یہ بتانے کے خواہاں اور در پے ہیں کہ آپ ﷺ کے تمام رویا اسی طرح حق ہیں جس طرح آپ کی ہر بتائی ہوئی بات حق ہے، ناظم کے کہنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہر وحی جو آپ کی طرف کی جاتی ہے وہ خواب کے راستے سے ہی آتی ہے اور نہ ہی ان کا مقصد یہ دعویٰ کرنا ہے کہ آپ ﷺ کے تمام رویا وحی ہیں بلکہ ان کی مراد اور ان کا مقصد محض یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے رویا کا انکار نہ کیا جائے خاص طور پر اعلان نبوت کے بعد کے خوابوں کا اس لئے کہ یقیناً وہ وحی الٰہی ہیں اور جب وہ اللہ کی جانب سے وحی ہوئے تو کیوں کر اس کا انکار کیا جا سکتا ہے حالانکہ قبل اعلان نبوت بھی آپ کی کسی خبر کا انکار نہیں کیا گیا (تو

بعد اعلان نبوت کیسے کیا جا سکتا ہے)

مزید یہ کہ آپ ﷺ کے سبب آپ کے علاوہ دوسروں کو بھی جو خواب نظر آئے ، ان رویائے صادقہ کو بھی اس میں ضم کر دیا گیا ہے خصوصا آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا خواب جو انہوں نے وقت حمل مشاہدہ کیا تھا، اور یہ ان امور میں سے ہے جو ابتداً آپ ﷺ کی نبوت کی تاسیس تھے، جن میں سے بھی کسی شئی کا انکار نہیں کیا جا سکتا ، تو پھر کیسے صادق و مصدوق نبی مامون و امین ﷺ کے رویا کا کوئی انکار کر سکتا ہے نیز اس میں کوئی چیز مانع نہیں کہ آپ ﷺ کے تمام خواب وحی ہوں اگر چہ وہ اعلان نبوت سے پہلے کے ہوں اس لئے کہ آپ ﷺ کے پہلے سے ہی نبی ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے اور کیوں کر ہو کہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے" کنت نبیا و ان آدم لمنجدل فی طینه" کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جس وقت کہ حضرت آدم اپنی مٹی میں گندھ رہے تھے !؟ اور ایک روایت میں یوں آیا ہے " کنت نبیا و آدم بین الروح الجسد " کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدم روح و جسم کے درمیان تھے ۔ اور حدیث کے معنی کی تائید اس فرمان باری تعالیٰ سے ہوتی ہے ﴿ و اذ اخذ الله میثق﴾ (الایة عمران : ۱۸۷) آیت کریمہ کے معنیٰ کا بیان اور حضور کی نبوت کے مقدم ہونے پر اس آیت کی دلالت کا بیان امام احمد رضا قدس سرہ کے رسالے " تجلی الیقین " میں نقلا عن السبکی فی فتاواہ ، گزر چکا ہے ۔

خاص طور پر امر نبوت کو ظاہر کرنے کے در پے ہونے کے بعد اور کیسے حضور علیہ السلام کے زمانۂ بعثت کے تمام رویا وحی نہ ہوں کہ حضور کے تو سبھی خواب (خواہ قبل بعثت ہوں یا بعد بعثت) وحی ہیں ۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ علامہ قاری نے 'زبدہ' میں اور " شرح السید " میں تحریر فرمایا ہے کہ جملہ ایام وحی وہ تئیس سال ہیں ان میں چھ مہینہ تھے خواب میں ۔

اور اسی سے حضور کے اس فرمان عالیشان کی تشریح کی گئی ہے " رویا المومن جزء من ستة و اربعین جزء من النبوة " کہ مومن کا خواب نبوت کے چھیالیس جزؤں میں سے ایک جز ہے ۔

شرح بعض کلمات وبیان وجوہ اعراب:

(فذالك) تو وہ یعنی وحی سونے کے وقت ہو یا مقام نبوت کے بلوغ کے وقت ثابت ہو۔

(من) ابتدائیہ ہے یا تعلیلیہ اور ظرف لغو صلہ ہے "بلوغ" کا اور 'من' تبعیضیہ ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے یعنی برتقدیر تبعیض معنی ہوگا آپ کی نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی۔

(بلوغ) میں تنوین تعظیم کی ہے اور (فليس ينكر منه) میں 'فا' فصیحہ ہے اور ایک نسخے میں "منه" کے بجائے "فيه" آیا ہے اور اس کو اشباع کے ساتھ (یعنی کھینچ کر) پڑھا جائے گا اور اس کی ضمیر راجع ہے "حين بلوغ من نبوته" کی جانب اور دوسرے نسخے میں جو "منه" آیا، اس کی تقدیر پر 'ہ' کی ضمیر راجع ہوگی آپ ﷺ کی جانب۔

(حال محتلم) یہ "ینکر" کا نائب فاعل ہے۔ اور "محتلم" کو مصدر میمی ہونے کی بنیاد پر فتح لام کے ساتھ پڑھا جائے گا بمعنی حلم وبردباری اور اسم فاعل ماننے کی صورت میں بکسر لام پڑھا جائے گا۔

اور دونوں تقدیروں میں اظہر، تقدیر ثانی ہے اس لئے کہ وہ تو آپ کو صرف نبوت کی ابتدا میں ہوا تھا تاکہ آپ ﷺ وحی سے اور فرشتوں کی ملاقات سے مانوس ہو جائیں اس لئے کہ ابتداً اگر فرشتہ اچانک آجاتا تو ممکن تھا کہ ملاقات نہ کر پاتے تو جب آپ ان سے مانوس ہو گئے اور آپ کا حال قوی ہو گیا تو وہ فرشتہ آپ کے پاس بیداری میں بھی آنے لگا۔ (الذخرو العدة ص: ۲۱۸)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

ہم بحمد اللہ تعالیٰ قصیدہ بردہ شریف کی فصل خامس کے بارہ شعر کی شرح کر چکے اور اب بحول اللہ اسی فصل کے تیرہویں شعر کی شرح کی جارہی ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸٤)تبارك الله ما وحی بمكتسب ولا نبی علی غيب بمتهم

(ترجمہ: سبحان اللہ بھلا وحی کسبی ہوسکتی ہے (یعنی وحی کسب سے حاصل ہونے والی شئ نہیں اور نہ ہی کوئی نبی غیب بتانے پر متہم ہوسکتا ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم (اس بیت میں) استئنافا اور از سرے نو وحی کے متعلق کلام کررہے ہیں اور بیان کررہے ہیں کہ وحی محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اسی وجہ سے ناظم شعر ایسا جملہ مستانفہ لائے جس کی ماقبل شعر سے مناسبت اور ربط ہے تو یہ جملہ مستانفہ (گویا) دعوے کی دلیل اور ایک سوال مقدرہ کا جواب ہے، گویا کوئی کہنے والا کہتا ہے، کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو شروع میں ہی اپنے بارے میں اور اپنی نبوت کے بارے میں کیوں نہیں بتادیا؟ اور آخر اعلان نبوت کو چالیس سال کی عمر شریف تک کیوں مؤخر کیا؟

تو شاعر ذی فہم اس سائل کو جواب دیتے ہیں "ما وحی بمكتسب" اورانہوں نے جواب دینے سے قبل اللہ تبارک وتعالیٰ کی پاکی کا ذکر یوں کیا "تبارك الله" وہ اس جانب اشارہ کرنے کے لئے کیا کہ مابعد ایک عجیب معاملہ ہے تو شاعر ذی فہم کا "تبارك الله" کہنا، کسی شخص کے موضع استعجاب میں "سبحان الله" کہنے کے مثل ہے۔

جواب کا بیان یہ ہے کہ وہ اطلاعات جو آپ ﷺ کو خواب میں دی گئیں عقل اس کا ادراک کرنے میں مستقل نہیں، لیکن اس کے باوجود عقل نہ اس کو منع کرتی ہے نہ اس کے حق ہونے میں شبہ کرتی ہے اور نہ ہی جس کے بارے میں

خبر دی گئی ہے یعنی آپ ﷺ کے معاملے میں شک کرتی ہے اور نہ ہی متہم کرتی ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کے صورت وسیرت اور صدق وامانت کا حسن ابتدا ہی سے ثابت ومسلم ہے یہاں تک کہ آپ اس منصب جلیل تک پہنچے تو عقل آپ ﷺ کے سلسلے میں مطمئن ہے اور یقین واذ غان کیئے ہوئے ہے آپ کے بارے میں کہ آپ نبی برحق ہیں جن کی جانب وحی کی گئی ہے اور جب آپ کو اپنے رب کی جانب سے حکم ملا اعلان نبوت کا اور اپنی حقیقت لوگوں کو بتانے کا تو اس وقت آپ ﷺ نے اپنے بارے میں خبر دی کہ آپ نبی ہیں اور آپ کی طرف وحی کی گئی ہے لہذا آپ ﷺ ان تمام باتوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے مامور ہیں اور وحی کے تابع ہیں اور آپ ﷺ اپنے رب کے حکم کا انتظار فرماتے رہے یہاں تک کہ پھر حکم ہوا تب آپ نے اعلان واظہار حق فرمایا اور اپنے بارے میں خبر دی۔ حالانکہ (یہ بات معلوم ہے کہ) وحی کسبی نہیں تو جب آپ کو حکم ملا تو آپ نے اعلان فرمادیا اور اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے تمام رویا وحی ہیں اگر چہ ہمیں معلوم بعد میں ہو جیسا کہ آپ کی نبوت کے بارے میں ہمیں علم تاخیر سے ہوا اور اس کے بارے میں ہمارا علم حضور کے بتانے تک مؤخر تھا اور اعلان نبوت کی تاخیر ایک حکمت الہیہ کی وجہ سے تھی جو اس کی مقتضی تھی اور وہ حکمت الٰہیہ یہ تھی کہ لوگ حضور اکرم ﷺ کے روشن احوال کا مشاہدہ کریں۔ اور آپ ﷺ کے پروان چڑھنے کے زمانے میں غور کریں، آپ کے بچپن کی حالت سے لے کر ادھیڑ عمر شریف تک کہ آپ بتوں اور بت پرستوں سے کتنا دور ونفور رکھتے اور ان کے تیوہارون سے دور رہتے اور (اعلان نبوت کو اس لئے مؤخر کیا) تاکہ وہ لوگ آپ کی سیرت طیبہ سے اتنا مانوس ہوجائیں کہ وہ جان لیں کہ حضور ان کے پاس کوئی ایسی چیز اچانک نہیں لائے ہیں کہ جو ان کی عادت شریفہ سے غیر مانوس ہو وہ اس لئے تاکہ قال اور حال میں مطابقت ہو جائے اور اس سے ان پر حجت لازم ہو جائے۔

یہ علامہ باجوری کی اجمالی تقریر وبیان کا نتیجہ اور خلاصہ ہے نیز وہ کہتے ہیں کہ یہ شعر ماقبل شعر کی دلیل ہے اور "تبارك الله" کا معنیٰ تنزه الله تعالیٰ یعنی پاک ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ان باتوں سے جو کافر بکتے ہیں۔

(ماوحی بمکتسب) یعنی وحی اگر چہ کم ہو " مکتسب' یعنی کسبی نہیں،تو اس میں تنوین تقلیل کی ہے یعنی وحی سعی اور کوشش سے کسی کے لئے بھی حاصل ہونے والی شئی نہیں کہ اس کو کوئی اسباب سے حاصل کر سکے اس لئے کہ اکتساب شئی کا مطلب شئی کو اس کے اسباب سے حاصل کرنا ہے کہ عادۃً شئی کا حصول انہی اسباب کے تحت ہوتا ہے اور جب وحی کسب سے حاصل ہونے والی شئی نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص فرما دینے کی وجہ سے ہے اپنے بندوں میں جسے چاہے لہذا عالم رویا میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کیا جاسکتا جس طرح عالم بے داری میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کیا جاتا ہے اس وجہ سے کہ فاعل مختار کا فعل صرف ایک حالت کے ساتھ مختص نہیں ہوتا ہے اور یہیں سے معلوم ہوا کہ کہ وحی کسبی نہیں ہوتی ہے اور اسی پر اہل حق ہیں! برخلاف ان فلاسفہ کے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ریاضت ومجاہدہ اور خلوت سے وحی حاصل ہو جاتی ہے جو کہ کفر صریح ہے لہذا اس پر ایمان لانا فرض ہے کہ وحی محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (الله ا علم حيث يجعل رسالته)(الانعام ١٢٤)

نیز وحی ولایت بھی کسبی نہیں بلکہ یہ بھی اللہ کے فضل سے ہے وہ جسے چاہے اس سے مخصوص کرے۔(ولا نبی علی غیب بمتهم) یعنی تمام انبیائے کرام میں سے کوئی بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام غیب بتانے پر متہم نہیں۔ اور 'غیب' یہاں بمعنیٰ غائب ہے یعنی غائب کے احکام کی خبر بتانے پر متہم نہیں،تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ مضاف کی تقدیر پر ہے۔ (غیب) موصوف محذوف کی صفت ہے اور وہ اس لئے کہ انبیائے کرام علیهم الصلوٰة و السلام قبل نبوت اور بعد نبوت (ہر دور میں) کذب سے معصوم ہیں جس طرح وہ تمام گناہوں سے معصوم ہیں۔ اس پر یہ فرمان باری تعالیٰ وارد نہیں کیا جائے گا ﴿ليغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وما تأخر﴾ (الفتح:۲) اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان ﴿ليغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وما تأخر﴾ اور اس فرمان ﴿ووضعنا عنك وزرك﴾ وغیرہ ذالک کے متعلق علامہ باجوری نے دوسرے طریقے سے جواب دیا ہے کہ وہ (ذنب اور وزر) جو ان انبیائے کرام سے واقع ہوئے ہیں وہ " حسنات الابرار سيئات

المقربین" کے باب سے ہیں۔

اس شعر میں اس فرمان باری تعالیٰ کی جانب اشارہ ہے ﴿وماهو على الغيب بظنين﴾ (التکویر:۲۴)

اور یہ "ظا" کی قرأت کی تقدیر پر ہوگا یعنی "ظنین" بمعنیٰ متہم۔

لہذا شعر کا مفہوم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے ﴿وماهو على الغيب بضنين﴾ نیز اس فرمان کی جانب بھی اشارہ ہے ﴿وما ينطق عن الهوىٰ ان هو الا وحي يوحى﴾ (النجم:٤)

علامہ باجوری فرماتے ہیں: شعر کا حاصل معنی یہ ہے کہ انبیائے کرام تمام کبائر اور صغائر حسیسہ سے بالاجماع معصوم ہیں اور صغائر غیر حسیسہ سے بھی معصوم ہیں محققین کے موقف کے مطابق اور راجح بھی یہی ہے کہ انبیائے کرام قبل نبوت اور بعد نبوت اس سے بھی معصوم ہیں (حاشية الباجوري ص٤٦)

علامہ خرپوتی، ناظم شعر کے اس قول (ولا نبي على غيب بمتهم) کے تحت فرماتے ہیں کہ ناظم فاہم کا یہ جملہ بعض کوتاہ نظروں کے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم نہیں تو انبیاء غیب کی خبریں نہیں بتا سکتے۔

اقول: یہ ان کوتاہ بیں لوگوں کی انتہائی جہالت ہے اور کتاب کے بعض حصے پر ایمان لانا ہے اور بعض سے کفر کر کے ان یہود کے نقش قدم پر چلنا ہے جن پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ فرما کر عتاب کیا کہ (افتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض) اور یہ کہنا کہ نبی کریم کو غیب کا علم نہیں یہ تو سرے سے نبوت کی ہی نفی ہے اس لئے کہ نبوت شرعاً اور لغۃً کہتے ہی غیب پر مطلع ہونے اور غیب کی خبر دینے کو ہیں اور اس مقام کی ایسی تحقیق کہ پھر جس پر مزید اضافے کی حاجت نہیں وہ ہمارے جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے اس موضوع پر مستقل رسالے میں موجود ہے جس کا نام "الدولة المكية بالمادة الغيبية" ہے۔

(تبارك الله) برائے تعجب ہے، 'تبارك' برکت مصدر سے بمعنیٰ کثرت خیر ہے اور اس کا معنی ہے کہ اللہ کی خیر ہر شئی پر غالب اور زائد ہے اور وہ عظیم ہے اپنی ذات وصفات اور افعال میں، مولیٰ فناری تفسیر فاتحہ میں فرماتے ہیں

کہ مروی ہے کہ صاحب ابن عبادؔ "رقیم"، "تبارك" اور "متاع" کے معنیٰ میں متردد تھے اور وہ عرب کے قبیلوں کا دورہ کیا کرتے تھے تو انہوں نے (ایک دن) کسی عورت کو اپنے بیٹے سے یہ سوال کرتے ہوئے سنا 'این المتاع'؟ تو اس کے اس چھوٹے لڑکے نے جواب دیا 'جاء الرقیم و اخذ المتاع وتبارك الجبل' کتا آیا اور سامان لے کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ یہ سن کر انہوں نے ان کلمات کے بارے میں پوچھا ان کو معلوم ہوا کہ ان کی لغت میں 'رقیم' کا معنی کلب ہے اور 'متاع' اس چیز کو کہتے ہیں جس کو پہلے پانی سے تر کیا جائے پھر اس سے پیالوں کو قلعی کی جائے اور 'تبارك' بمعنی صعد یعنی چڑھنا ہے، ایک قول یہ ہے کہ 'تبارك' کا معنیٰ دوام وثبات ہے کہ جس کے لئے انتقال وتبدیلی نہ ہو، اسی وجہ سے 'تبارك' مضارع نہیں کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ انتقال کے لئے ہے، تو اس بنیاد پر "تبارك" کا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر فعل ماضی ہو کر ہی مختص ہے تو اس تقدیر پر وہ ایسا فعل ہے جس کی گردان نہیں آتی اور نہ اس سے فعل مضارع آتا ہے۔ "البرهان" میں مذکور ہے کہ یہ لفظ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہی مستعمل ہے اور فعل ماضی کے ساتھ ہی مستعمل ہے۔ انتہیٰ (الخربوتی ص:۱۴۴)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل خامس سے چودہویں شعر کی شرح پر ہم آپہونچے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۵) کم ابرأت وصبا باللمس راحته　　　و اطلقت اربا من ربقة اللمم

(ترجمہ: حضور کے کف مبارک نے نہ جانے کتنے بیماروں کو چھوکر اور مسح فرما کر شفا بخشی ہے اور نہ جانے کتنے محتاجوں کو پریشانی اور گناہوں کے پھندے سے نجات دی ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم چوں کہ اُمرِ نبوت کے بیان سے فارغ ہو لئے اور بیان کر چکے کہ نبوت محض اللہ تعالیٰ کے فضل

سے ہے وہ جسے چاہے عطا کرے، تو اب وہ (اس شعر میں) بعثت کی حکمت اور فوائد نبوت کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ نبوت اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے ذوی العقول بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ ہے، بندوں کے معاد اور معاش (دنیا وآخرت) میں ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے۔ (مفردات ص ۲۸۴)

حضور علیہ السلام سراپا رحمت وہدایت ہیں

اور یہ کہ نبوت کا منصب، لوگوں کو اوصاف ظاہرہ وباطنہ سے نجات دلانا ہے، جیسا کہ نبوت کی تعریف سے ظاہر ہے جو ابھی بیان ہوئی نیز منصب نبوت نفوس کا تزکیہ کرنا لوگوں کو ہدایت کرنا اور خصوصا ان تمام لوگوں میں سے مومنین کو بارگاہ ایزدی تک پہنچانا ہے اور ان مومنین پر عنایت کی عطا وبخشش کرنا ہے اور ان پر نعمت کو تمام کردینا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوعليهم أيٰته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب و الحكمة و ان كانوا من قبل لفى ضلٰل مبين﴾ (آل عمران: ١٦٤) اور ہمارے نبی کریم ﷺ کو اس منصب نبوت سے بہت وافر وکثیر حصہ ملا ہے جیسا کہ تلاوت کردہ آیت کریمہ سے معلوم ہوا نیز یہ کہ آپ ﷺ سراپا رحمت وہدایت ہیں جیسا کہ خود حضور نے بذات خود اپنے متعلق فرمایا" انا رحمة مهداة' لہذا آپ ﷺ تمام لوگوں کے لئے رحمت ہیں بلکہ تمام عالمین کے لئے رحمت ہیں۔ امام قشیری "لطائف الاشارات" میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان ﴿لقد من الله على المومنين اذ بعث فهيم رسولا﴾ آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین پر احسان عظیم فرمایا اور ان کو احسن نعم عطا کیا اس طرح کہ اللہ نے ان کے پاس مصطفےٰ خیر الوریٰ صلاوات الله عليه و على آله جیسا رسول بھیجا، جنہوں نے ان کو ان کا دین سمجھایا، ان کے لئے دلائل وبراہین کو ظاہر وواضح کیا اور وہ اللہ کی نعمت یعنی رسول اللہ ﷺ ہر طرح سے انہی کے لئے تھی تو اللہ کی اس نعمت کا کافروں نے شکر ادا نہ کیا، اس کے حق کی تعظیم وتوقیر نہ کی اور نہ ان کی ہدایت وارشاد میں انہوں نے غور وفکر کیا اور نہ ہی وہ اپنی گمراہی اور سرکشی سے باز آئے۔ تو یہ اللہ کے ان دشمنوں کے اوصاف ہیں جنہوں نے انکار وغرور کیا لیکن رہے مومنین تو انہوں نے اختیار میں اس نعمت

کی اتباع و پیروی کی اورانہوں حکم کا سامنا کیا سن کراوراطاعت کر کے قدرت کی حقیقت کے بارے میں اسی وجہ سے مومنین دنیاوآخرت میں کامیاب ہوئے اوراللہ تعالیٰ کی جانب سے کرامت اورعظیم مرتبے کے مستحق ہوئے(۱۹۲۱)
لہذا آپ ﷺ واسطۂ عظمیٰ اور وسیلۂ کبریٰ ہیں اور لفظ نبی کے ہر معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے نبی ہیں اس لئے کہ نبی کا ایک معنیٰ راستہ بھی ہوتا ہے تو آپ ﷺ واحد راستہ ہیں اور ہر اس شخص کے لئے طریق وحید ہیں جو واصل حق ہو چکا یا بادشاہ بزرگ تر سے واصل ہوگا اور آپ ہی صراط مستقیم ہیں اور قرآن عظیم میں صراط مستقیم کی تفسیر بھی ایسی ہی کی گئی ہے تو حضور کا طریقہ اور حضور کا راستہ ہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر اہل حق واہل توحید ہیں اور آپ کے آستانے اور پناہ گاہ سے چمٹے رہنا اور آپ کے در کی چاکری میں لگے رہنا شریعت کے اعتبار سے ہے (لیکن رہا) طریقت تو وہ وصول الی اللہ کا قوی تر وسیلہ ہے اور وہ آپ ﷺ ہی ہیں جو تمام عالمین کی رحمت کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿وما ارسلنك الا رحمة للعالمين﴾ تو اس سے آپ علیہ السلام کی بعثت کی حکمت کی جانب اشارہ ہے۔

علامہ اسماعیل حقی ''روح البیان'' میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں (اللہ تعالیٰ اپنے حبیب سے مخاطب ہے کہ) اے محمد ہم نے تمہیں ان چیزوں کے کے ساتھ نہ بھیجا جو مذکور ہوئیں اور نہ اس طرح کی دیگر چیزوں کے ساتھ جو شریعت واحکام سے ہیں وغیرہ ذالک ان امور میں سے جو کسی ایک حال میں مدار سعادت دارین ہوتے ہیں (تو ہم نے تمہیں ان میں سے کسی بھی شئی کے ساتھ نہ بھیجا مگر تمہارے رحمت للعالمین ہونے کی حالت میں (یعنی ہم نے تمہیں اے حبیب! شریعت واحکام دے کر امور سعادت دارین وغیرہ کے ساتھ صرف تمام عالمین کی رحمت کے لئے بھیجا ہے) اس لئے کہ جن اشیاء کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا ہے وہ سعادت دارین کا سبب ہیں اور دونوں جہان میں مخلوق کے مصالح کے انتظام کا منشا ہیں تو جس نے ان سے اعراض واستکبار کیا وہ از خود آزمائشوں میں مبتلا ہوا تو اس پر رحم نہیں کیا جائے گا، (اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ) حضور کیسے رحمت للعالمین ہیں کہ حضور نے (کافروں کے لئے) تلوار اٹھائی اور ان کے اموال کو مباح ٹھہرایا (تو اس کے جواب میں) بعض علما نے فرمایا ہے

کہ حضور کافروں کے لئے بھی رحمت ہیں اس لئے کہ حضور کے سبب سے ان کی سزائیں اور عقوبات مؤخر ہوگئیں اور حضور ہی کی وجہ سے وہ استئصال، خسف اور مسخ کے عذاب سے بچ گئے (یعنی جڑ سے ختم ہونے اور دھسنے اور چہروں کے مسخ ہونے کے عذاب سے بچ گئے) حدیث پاک میں آیا ہے آپ علیہ السلام نے حضرت جبریل سے فرمایا" ان اللہ یقول وما ارسلنٰك الخ" فهل اصابك من هذه الرحمة؟ قال نعم انی كنت اخشى عاقبة الامر، فامنت بك لثناء اثنى الله على بقوله (ذی قوة عند ذی العرش مكين. مطاع ثم امين) ''یعنی بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے" وما ارسلنٰك.. الخ تو کیا تمہیں اس رحمت سے کچھ ملا بھی ہے؟ اے جبریل! تو وہ عرض کرتے ہیں ہاں حضور میں پہلے انجام سے خائف رہا کرتا تھا لیکن اب میں آپ کے صدقے میں اس تعریف کی وجہ سے مطمئین ہوگیا۔ جو اللہ تعالیٰ نے میری تعریف فرمائی یہ فرما کر (ذی قوة عند ذی العرش مكين مطاع ثم امين)

بعض اکابر علماء فرماتے ہیں کہ ﴿وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين﴾ میں 'رحمت' مطلقہ عامہ کاملہ شاملہ جامعہ ہے اور یہ رحمت غیبیہ اور شہادات علمیہ، عینیہ، وجودیہ، شہودیہ، سابقہ، لاحقہ، وغیرہ ذالک میں سے تمام مقیدات کو محیط ہے اور "عالمین" جمع عوالم یعنی عالم اجسام اور عالم ارواح میں سے ذوی العقول وغیرہ۔

اور جو رحمت للعالمین ہوگا تو لازم ہے کہ وہ تمام عالمین سے افضل ہو۔ نیز بعض اکابرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور کا رحمت للعالمین ہونا حضور کے خلق عظیم سے متصف ہونے کے سبب سے ہے اور حضور کا تمام مراتب کا ان کے مقاموں میں لحاظ فرمانے کے سبب سے ہے جیسے ملک وملکوت، طبیعہ نفس، روح اور سر۔ اور " التاويلات النجمية" میں ہے کہ سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ کے حق میں اس فرمان باری تعالیٰ ﴿ورحمة منا﴾ کے درمیان اور ہمارے نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں اس فرمان باری تعالیٰ ﴿وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين﴾ (الانبیاء: ۱۰۷) کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حق میں لفظ رحمت کو 'من' کے ساتھ مقید کرکے ذکر کیا گیا اور 'من' تبعیض کے لئے ہے! لہذا وہ رحمت ہوئے اپنے ایمان لانے

والوں کے لئے اور اپنے متبعین کے لئے، ہمارے نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت تک، مگر پھر رحمت ان کی امت سے منقطع ہوگئی ان کے دین کے منسوخ ہو جانے کی وجہ سے لیکن ہمارے نبیٔ کریم رؤف رحیم کے حق میں رحمت کو تمام عالمین کے لئے مطلقا ذکر کیا گیا، لہذا رحمت عالمین سے کبھی منقطع نہیں ہوگی۔ دنیا میں تو اس لئے کہ آپ کا دین کبھی منسوخ نہیں ہوگا اور رہا آخرت میں (آپ کی رحمت کا منقطع نہ ہونا) تو اس لئے کہ تمام مخلوق آپ کی شفاعت کی محتاج ہے حتی کہ ابراہیم علیہ السلام بھی تو ان باتوں کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

'اعرائس البقلی' میں مذکورہ ہے کہ اے بیدار مغز! بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے خبر دی کہ اس نے سب سے پہلے نور محمد علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر عرش علیٰ سے لے کر تحت الثریٰ تک تمام مخلوق کو آپ کے نور کے بعض حصے سے پیدا فرمایا لہذا اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب کو عالم وجود وشہود میں بھیجنا یہ ہر موجود کے لئے رحمت ہے اس لئے کہ سب انہی سے پیدا ہوئے ہیں تو ان کے ہونے سے مخلوق کا ہونا ہے اور ان کا وجود تمام مخلوق کے وجود کا سبب ہے نیز جمیع خلائق پر اللہ کی رحمت کا سبب ہے تو آپ ﷺ کی ذات رحمت کافیہ ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ جمیع خلائق صورۃ پیدا اور مخلوق ہو کر قدرت کے وسیع وکشادہ میدان میں حقیقی روح کے بغیر موجود تھی اور حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری کا انتظار کر رہی تھی، پھر حضور جب عالم میں تشریف لائے تب عالم حضور کے وجود سے زندہ ہوا اس لئے کہ حضور ہی تمام مخلوق کی روح ہیں اور اے عاقل! بے شک عرش علیٰ سے لے کر تحت الثریٰ تک کوئی بھی شئی عدم سے نہ نکلی مگر ناقص، مطلع اور واقف ہونے کے اعتبار سے اللہ کے قدیم ہونے کے اسرار پر (یعنی اس اعتبار سے مخلوق ناقص وجود میں آئی تھی کہ وہ اللہ کے قدیم ہونے کے اسرار پر کمال معرفت کے ساتھ واقف نہ تھی) اسی وجہ سے وہ الوہیت اور کبریائیت کے سمندروں کے ایک کنارے تک پہنچنے سے عاجز تھے کہ پھر اجساد عالم کے لئے اکسیر اور اشباح عالم کی روح حضرت محمد ﷺ حقائق علوم ازلیہ لے کر تشریف لائے اور آپ ﷺ نے راہ حق کو خلق کے لئے روشن ومنور فرما دیا اتنا کہ ازلیوں اور ابدیوں کے سفر کو آپ نے سب کے لئے ایک قدم کی دوری کا بنا دیا لہذا حضور جب صحن مکان سے قربت کے سفر کی جانب روانہ ہوئے تو آپ ان کے پاس محض

ایک قدم میں پہنچ گئے کہ ﴿ سبحان الذی اسری بعبدہ ﴾ یہاں تک کہ آپ مقام ُاو ادنیٰ ٗ تک پہنچ گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام مخلوق کو آپ کی تشریف آوری کے صدقے میں معاف فرما دیا۔

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہر نبی عقوبت کو مقدم فرمانے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کے بموجب ﴿ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا ﴾ (الاسراء: ۱۵) لیکن ہمارے نبی کریم ﷺ رحمت کو مقدم فرمانے والے ہیں اس فرمان باری تعالیٰ کے بموجب ﴿ وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمین ﴾ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا کہ آپ رحمت پر آخری مہر ہوں نہ کہ عقوبت پر، فرمان باری تعالیٰ کے مطابق ﴿ سبقت رحمتی علی غضبی ﴾، اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں سب میں آخری امت بنایا گیا لہذا وجود کی ابتدا وانتہا اور انجام سب رحمت ہے۔

مزید جاننا چاہئے کہ ارادۂ حق کا تعلق جب ایجاد خلق سے ہوا (یعنی حق تعالیٰ نے جب مخلوق کو وجود بخشنے کا ارادہ فرمایا) تو اس نے حقیقت احمدیہ کو بارگاہ ایزدی کے پردے سے ظاہر کرکے، امکان کی 'میم' کے ذریعہ انہیں ممتاز کر دیا اور تمام عالمین کے لئے انہیں رحمت بنا دیا اور دین اسلام کو ان سے شرف بخشا پھر ارواح کے چشمے ان سے بہہ نکلے اور پھر عالم اجسام اور عالم ارواح مین جو ظاہر ہونا تھا ظاہر ہوا جیسا کہ خود آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا " انا من الله والمؤمنون من فیض نوری " کہ میں اللہ سے ہوں اور مومنین میرے فیض نور سے ہیں لہذا حضور مبادئ کائنات کی ترتیب کی غایت جلیلہ اور انتہا ہیں کما قال اللہ تعالیٰ " لو لاك لما خلقت الا فلاك " یعنی اے محبوب اگر تمہیں پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا۔ (روح البیان: ۵/۵۲۷، ۵۲۹)

اور آپ ﷺ کی رحمت میں سے یہ ہے کہ آپ بیماروں کو شفا دینے اور مریضوں کو عافیت عطا کرنے والے ہیں اسی وجہ سے ناظم نے فرمایا:

کم ابرأت وصبا باللمس راحته ... و اطلقت اربا من ربقة اللمم

(ترجمہ:۔ حضور کے کف مبارک نے نہ جانے کتنے بیماروں کو چھوکر اور مسح فرما کر شفا بخشی ہے اور نہ جانے کتنے

محتاجوں کو پریشانی اور گناہوں کے پھندے سے نجات دی ہیں

حضور ﷺ کے شافی و عافی ہونے کے بیان میں احادیث

اور آپ ﷺ کے دستہائے مبارک سے جو بیماروں کو شفا حاصل ہوئی، اس کے متعلق قاضی عیاض کی کتاب ''الشفاء'' سے بیان قارئین کرام کے پیش نظر ہے؛

''عن محمد بن اسحق: حدثنا ابن شهاب و عاصم بن عمر بن قتادة و جماعة ذكرهم بقضية احد بطولهاقال: و قالو؛ قال سعد بن ابى وقاص ان رسول الله ﷺ لينا و لنى السهم لا نصل له فيقول " ارم به" و قدر مى رسول الله ﷺ يومئذ عن قوسه حتى اندقت، و اصيب يومئذ عين قتادة ـ يعنى ابن النعمان حتى وقعت على و جنته، فردها رسول الله فكانت احسن عينيه و رواهٔ ابو سعيد الخدرى عن قتادة و بصق على اثرسهم فى وجه ابى قتادة فى يوم ذى قرد قال: فما ضرب على ولا قاح''

(ترجمہ: حضرت سعد ابن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک ایسا تیر عطا فرمایا کہ جس کی پیکان نہیں تھی اور وہ دے کر فرمایا اسے پھینکو اور اسی دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے قوسین سے تیری پھینکا تھا یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گیا تھا اور اسی دن حضرت قتادہ یعنی ابن نعمان کی آنکھ اتنی دکھ رہی تھی کہ ان کے رخسار پر لٹک گئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھ کو اپنے دستہائے مبارک سے اسکی جگہ پہ واپس لوٹا دیا تو وہ آنکھ دوسری آنکھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگئی۔ نیز حضرت ابو سعید خدری نے بھی حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو قتادہ کے چہرے میں تیر کے اثر پر اپنا لعاب دہن گھنگور گھٹا والے دن لگایا تھا، حضرت ابو قتادہ نے فرمایا کہ حضور کے لعاب دہن لگنے سے پھر میرے زخم میں نہ درد ہوا اور نہ وہ کبھی سوجا۔ شفا شریف میں عبارت یوں ہے (ماضرب علیّ ولا قاح)

امام نسائی، عثمان بن حنیف سے روایت کرتے ہیں کہ ایک نابینا نے حضور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ

سے میرے لئے دعا فرمادیں کہ مولیٰ تعالیٰ میری آنکھوں کے اوپر سے پردہ ہٹا دے تو حضور نے فرمایا کہ جاؤ اور وضو کر کے دو رکعات نماز ادا کرو اور پھر یوں دعا کرو " اللهم انی اسئلك و اتوجه الیك بنبی محمد نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بك الی ربك ان یكشف عن بصری ، اللهم شفعه فی" یعنی اے اللہ میں تیرے حضور دست سوال دراز کرتا ہوں اور تیری بارگاہ میں تیرے نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کا وسیلہ دیتا ہوں اور حضور! میں آپ کی بارگاہ میں آپ کے وسیلے سے مانگ رہا ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ میری آنکھوں کے اوپر سے پردہ اٹھادے (اور مجھے بصارت عطا فرمادے) (اور پھر حضور نے فرمایا) کہ اے اللہ میرے صدقے میں تو اسے شفا عطا فرمادے۔ راوی کہتے ہیں کہ نابینا لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھادیا۔

مروی ہے کہ ابن ملاعب الاسنہ کو مرض استسقا لاحق ہوا (یہ ایسا مرض ہے جس میں پیاس نہیں بجھتی) تو اس نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ایک قاصد بھیجا، (اس مرض کی دوا کے لئے) تو آپ ﷺ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس پر اپنا لعاب دہن لگا کر اس قاصد کو دے دیا، قاصد نے انتہائی حیرت سے وہ مٹی لی، اس کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو بہر حال قاصد وہ مٹی لے کر اس کے پاس اس وقت پہنچا کہ وہ موت کے قریب ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی اس نے (حضور کا لعاب دہن لگی ہوئی مٹی) پی ویسے ہی اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرمادی۔

امام عقیلی حبیب ابن فدیک (انہیں فریک بھی کہا جاتا ہے) سے روایت کرتے ہین کہ ان کے والد گرامی کی آنکھیں سفید ہو گئیں تھیں (یعنی موتیا بند ہو گیا تھا) اور وہ ان سے کچھ بھی دیکھ نہیں پاتے تھے تو (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں پھونک دیا تو ان کو سب نظر آنے لگا، راوی فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ اسی سال کی عمر میں بھی سوئی کے اندر دھاگا ڈال لیا کرتے تھے!!

جنگ احد کے موقع پر کلثوم بن حصین کے سینے میں تیر لگ گیا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن شریف ڈال دیا تھا تو فوراً ان کو (اس تکلیف سے) نجات مل گئی۔

حضرت عبد اللہ ابن انس کے سر کے زخم پر حضور نے اپنا لعاب دہن لگا دیا تو اس سے پیپ نکلنا بند ہو گئی۔ جنگ خیبر

کے موقع پر حضرت علی کی آنکھوں میں حضور نے اپنا لعاب دہن لگایا تھا جس وقت کہ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے تو حضور کے لعاب دہن کی برکت سے ان کی آنکھیں صحیح ہو گئیں تھیں۔

نیز جنگ خیبر کے ہی دن حضور نے سلمہ ابن اکوع کی پنڈلی پر لگے زخم پر پھونک ماری جس سے وہ شفایاب ہو گئے اور ابن اشرف کو قتل کرتے وقت حضرت زید بن معاذ کے پیر میں ٹخنوں تک تلوار لگ گئی تھی، حضور نے ان کے پیر میں پھونک ماری تو وہ بھی شفایاب ہوئے۔

اور سرکار نے خندق کے دن علی بن حکم کی پنڈلی پر پھونکا جب وہ ٹوٹ گئی تھی تو حضور کے پھونکنے سے وہ زخم صحیح ہو گیا اور وہ اپنے گھوڑے سے نہیں اترے۔

حضرت علی بن ابی طالب کو زخم لاحق ہوا تو وہ دعا کرنے لگے تو نبیٔ کریم ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ تو اسے شفا عطا فرما۔ یا فرمایا تو اسے عافیت عطا فرما) پھر حضور نے اپنے قدم شریف سے انہیں مارا جس کی وجہ سے وہ زخم اس دن کے بعد کبھی تکلیف نہ دیا۔

ابو جہل نے جنگ بدر میں حضرت معوذ ابن عفرا کا ہاتھ کاٹ دیا تو وہ حضور کی بارگاہ میں اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے حاضر آئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنا لعاب دہن لگا دیا اور اس کو جوڑ دیا تو وہ جڑ گیا۔ (رواہ ابن وھب)

انہی کی روایت میں مزید ہے کہ بدر کے دن حضرت خبیب بن یساف کے کندھے پر ایک ضرب لگ گئی جس سے وہ ایک جانب جھک گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوٹا دیا اور اس پر دم فرمایا یہاں تک کہ وہ صحیح ہو گئے۔

اور قبیلہ خثعم سے ایک خاتون حضور کی بارگاہ مین حاضر آئیں جن کے ساتھ ایک ایسا بچہ تھا جس پر بلا تھی اور وہ بول نہیں سکتا تھا تو حضور نے پانی منگایا اور اس میں کلی فرمائی اور ہاتھ دھلے اور پھر اس پانی کو اسے دے دیا اور اس بچے کو پلانے کا اور اس پانی کو ملنے کا حکم دیا، تو وہ بچہ صحیح وسالم اور عقلمند ہو گیا اتنا کہ عام لوگوں کی عقلوں سے بڑھ کر عاقل ہو گیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو لیکر حضور کی بارگاہ میں آئیں

جس پر جنون طاری رہا کرتا تھا تو آقا علیہ السلام نے اس بچے کے سینے پر اپنا دست مبارک پھیرا تو اس نے فوراً قے کردی (شفا شریف کے الفاظ ہیں: "فثع ثعة") پھر حضور نے فرمایا' نکال دے' یہ فرماتے ہی اس کے پیٹ سے کالے کیڑے کی طرح کچھ نکلا (شفا شریف کے الفاظ ہیں: " الجر والاسود") اور پھر بھاگ گیا۔

محمد بن حاطب کے ہاتھ پر بچپن میں (گرم) دیگچی الٹ گئی تو حضور نے اس پر اپنے دست مبارک سے مسح فرمایا اور ان کے لئے دعا فرمائی اور اس پر اپنا لعاب دہن لگایا تو اس کی جلد صحیح ہوگئی نیز حضرت شرجیل جعفی کی ہتھیلی میں گانٹھ تھی (شفا شریف کے الفاظ ہیں: "فكانت فى كف شرجيل الجعفى سلعة") جو انہیں تلوار اور جانور کی لگام پکڑنے سے روکتا تھا تو (ایک دن) انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کی شکایت کی تو حضور نے ان کے ہاتھ کو اپنے کف مبارک سے اتنا ملا کہ اس زخم کو دفع فرمادیا۔ اور پھر اس گانٹھ کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

مزید ایک روایت یہ کہ حضور کھانا تناول فرمارہے تھے کہ اسی حال میں ایک چھوٹی بچی نے حضور سے کھانا مانگ لیا، حضور نے سامنے رکھا ہوا کھانا اسے دے دیا، وہ بچی تھوڑی کم حیا والی تھی کہنے لگی میں وہ کھانا چاہتی ہوں جو آپ کے دہن مبارک میں ہے تو حضور نے وہ کھانا بھی عطا فرمادیا جو آپ کے منہ میں تھا اور یہ تو حضور کی شان ہی نہیں تھی کہ کوئی حضور سے کچھ مانگے اور حضور اسے عطا نہ کریں بہر حال تو حضور کا عطا کردہ کھانا جیسے ہی اس بچی کے پیٹ میں جا کے ٹھہرا اس پر اتنی حیا ڈال دی گئی کہ پھر پورے شہر مدینہ میں اس سے زیادہ باحیا کوئی خاتون نہ تھی!! (ص ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰)

شفا شریف میں وارد الفاظ غریبہ کا بیان

(ما ضرب علی) یعنی اس چوٹ اور زخم نے مجھے پھر کبھی درد و تکلیف نہ دی (و لا قاح) اور نہ ہی پھر اس سے (زخم سے) کبھی پیپ اور مواد نکلا۔ (فثع) بفتح المثلثة و تشديد العين المهملة بمعنیٰ ایک مرتبہ قے کرنا۔ (الجرو الاسود) بجیم مثلثۃ یعنی اس میں اعراب کی تینوں صورتیں رفع نصب جر جائز ہیں اور رائے مہملہ اور واؤ کے ساتھ ہے بمعنی کتوں اور درندوں کے چھوٹے بچے نیز چھوٹی ککڑیوں اور چھوٹے کڑوے پھلوں پر بھی بولا

جاتا ہےاور یہاں ہر معنی کا احتمال ہے،اس کی جمع، یامیں بدلنے کے بعد واوکوحذف کر کے " اجـــــر "آتی ہے۔
(سلعة) بکسر سین وسکون اللام وعین مہملہ بمعنی، گوشت اور کھال کے درمیان غدودا اور گانٹھ جیسی زیادتی۔
علامہ خر پوتی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا بیمارزدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کے واسطے شافی اور عافی ہونا آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ قیامت تک باقی ہے اس لئے کہ (آج بھی) اگر کوئی شخص اپنے دل کو حضور ﷺ سے باندھ کر حضور پر درود بھیجے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے حضور کے وسیلے سے دعا کرے تو یقیناً اللہ کے حکم سے حضور اس کے مرض کی دوا ہوں گے بلکہ اکابر علماء واولیاء کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش بھی آئے ہیں،
"المواھب" میں امام قشیری سے منقول ہے کہ ان کا بیٹا سخت بیمار ہوا کہ موت کے قریب پہنچ گیا اور معاملہ انتہائی دشوار ہوگیا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت کی تو میں نے حضور سے اپنے لڑکے کے معاملے کی شکایت کی تو حضور نے فرمایا کہ تم آیات شفا سے کہاں بے خبر ہو؟ (وہ کہتے ہیں) کہ پھر میں بیدار ہوا تو اس میں غور کرنے لگا کہ اچانک میں کتاب اللہ میں سے چھ جگہوں پر مطلع ہوا۔ (وہ یہ ہیں) ﴿ ویشف صدور قوم مومنین﴾، ﴿ وشفاء لما فی الصدور﴾، ﴿یخرج من بطونها شراب مختلف الوانهٔ فیه شفآء للناس﴾، ﴿ وننزل من القرء ان ماهو شفآء و رحمة للمؤمنين﴾، ﴿ واذا مرضت فهو يشفين﴾، ﴿قل هو للذين ء امنوا هدى و شفآء﴾
وہ کہتے ہیں کہ میں نے پھر ان آیتوں کو لکھ کر پانی سے بھر دیا اور اس کو پلا دیا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میرے لڑکے کو رسی سے کھول دیا گیا ہو اور اسے آزاد کر دیا گیا ہو۔
امام ابوبکر رازی فرماتے ہیں کہ میں اصبہان میں ابونعیم کے پاس تھا، تو شیخ نے ان سے کہا کہ جب ابوبکر ابن علی کو بادشاہ کے پاس لے جا کر قید کر دیا گیا تھا تب میں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اس حال میں کہ حضرت جبریل حضور کے دائیں جانب کھڑے، تسبیح سے اپنے ہونٹ ہلا رہے تھے، کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابوبکر سے کہہ دو کہ وہ دعائے کرب پڑھ کر دعا کرے جو صحیح بخاری میں مذکور ہے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف کو دور

فرمادے، وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے صبح ان کو خبر دی تو انہوں نے دعا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ ہی دیر وہاں رکے کہ وہاں سے آزاد کر دیئے گئے۔

دعائے کرب جس کو شیخین نے روایت کیا، حضور کے یہ الفاظ ہیں: " لا الـه الا الله العظيم الحليم، لا اله الا الـلـه رب الـعرش العظيم، لا اله الا الله رب السماوات والارض و رب العرش الكريم" (خرپوتی ص۱۴۶)

شعر میں وارد الفاظ غریبہ کی شرح اور بیان وجوہ اعراب:

(کم ابرأت) میں "کم'' خبریہ ہے بمعنی بہت یعنی بہتوں کو شفادی (كثيرا ما ابرأت) یہ 'الابراء' مصدر سے بمعنی زائل کرنا دور کرنا ہے اور یہاں معنیٰ ہے "شـفـت" کا (شفادی)(وصبـا) " الوصـب" بمعنی مرض یعنی صاحب المرض۔(باللمس) "با" سببیہ اور جار مجرور متعلق ہے" ابرأت" کے۔ (راحته) یعنی ہتھیلی کا پیٹ، کف دست، یہ " ابرأت" کا فاعل ہے۔(اطـلـقت)، " الاطلاق" مصدر سے بمعنیٰ چھوڑنا، معاف کرنا، قید سے آزاد کرنا۔(ا رب بکسر 'را' بمعنیٰ حاجت مند۔تو ناظم شعر کے قول(اربا) کا معنیٰ صاحب الاحتیاج ہے اور (ارب) محرکہ کا معنیٰ ہوتا ہے حاجت اور (ارب) (ہمزہ کے فتح اور 'را' کے کسرہ کے ساتھ) کا معنی ہوتا ہے صاحب الحاجت (حاجت مند) برخلاف اس کے جو علامہ باجوری کے کلام میں واقع ہوا۔ اور اس کی تصریح یہ ہے کہ ان کا قول" اربا" بفتح ہمزہ وکسرا 'را' بروزن" فرحا" کا معنیٰ ذا ارب و ذا حاجة (ص۴۷)

(ربقة) یہ متعلق ہے" اطـلقت " سے اور " ربـقة" بالكسر کا معنیٰ ہوتا ہے، گرہ والی رسی جس سے جانور باندھے جاتے ہیں۔ (الـلـمـم) بفتحتین، چھوٹے گناہ اور یہاں اس سے مطلق گناہ مراد ہیں اور دیوانگی کا ایک طرف اور گناہ سے قربت مراد ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلي و نسلم علي رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين.

بحمداللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم چودھویں شعر کی شرح سے فارغ ہولئے اوراب پندرہویں شعر کی شرح کی جائے گی اوراس سے متصلاً ہم سولہویں شعر کی شرح کریں گے اوراسی پر بحول اللہ سبحانہ وتعالیٰ فصل خامس اختتام پذیر ہوجائے گی، ناظم ذی فہم فرماتے ہیں:

(۸۶)و احيت السنة الشهباء دعوتهٗ حتى حكت غرة فى الاعصر الدهم

(ترجمہ:۔اورحضور کی دعا نے قحط سالی کوسرسبز وشادات کردیا یہاں تک کہ وہ سال تاریک زمانوں میں روشن نظر آنے لگا۔

(۸۷)بعارض جاد او خلت البطاح بها سيبا من اليم او سيلا من العرم

ترجمہ:۔(اوراس مردہ سال کوزندہ کیا) اس بادل کے ذریعہ جوخوب برسا یہاں تک کہ تو گمان کرتا کہ اس کی وجہ سے پرنالے سمندر سے بہہ رہے ہیں یاسخت طوفانی بارش سے سیلاب آ گیا ہے۔

ربط: گزشتہ شعر میں ناظم فاہم نے آپ ﷺ کی عالم سفلی میں تاثیر کی طرف اشارہ کیا کہ آپ کی دعا فوراقبول ہوتی ہے اوراللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے عالم سفلی کومسخر فرمادیا ہے اوراب اس شعر میں وہ عالم علوی میں آپ کے کلمات کے نافذ ہونے کے بیان کی جانب ترقی کرتے ہیں نیز تدبیرامورکرنے والوں کے وزیرہونے کا بیان کرتے ہیں کہ جواللہ کے حکم سے تدبیرامورفرماتے ہیں اوروہ ملائکہ ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشادفرماتا ہے (وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله)اسی وجہ سے شاعرذی فہم فرماتے ہیں:

و احيت السنة الشهباء دعوتهٗ حتى حكت غرة فى الاعصر الدهم

اور (احياء) آپ ﷺ کے معجزات میں سے ہے۔(احيت) بمعنیٰ" اخصيت" (سرسبز وشاداب کیا)یعنی

احیاء بمعنی سرسبز و شاداب کرنا ہے لہذا معلوم ہوا کہ اس میں استعارہ تصریحیہ تبعیہ ہے جو پہلے مصدر یعنی ''الاخصاب'' (سرسبز وشاداب کرنا) میں جاری ہوا،تشبیہ دی گئی اس کو" احیاء " سے اور حال یہ ہے کہ الاخصاب" مصدر سے" اخصبت "مشتق ہوا اور " الاحیاء " مصدر سے ''احیت مشتق ہوا لیکن مشبہ یعنی " اخصبت" کا ذکر ذہن میں پوشیدہ کرلیا گیا اور " احیت"" مشبہ بہ ذکر کر کے " اخصبت" بطور تشبیہ مراد لیا گیا۔ نیز قارئین (السنة الشهبا) کو استعارہ مکنیہ بنا سکتے ہیں اس طرح کہ قحط سالی (السنة الشهبا) کو عدم انتفاع میں مردوں سے تشبیہ دی جائے ذہن میں پھر ذہن ہی میں مردوں کو قحط سالی کے مفہوم کے لئے استعارہ کرلیا جائے ،تو قحط سالی (السنة الشهباء) ذکر کر کے اس سے مردے مراد لئے گئے ہیں پھر" احیاء" کو جو مشبہ کے ملائمات میں سے ہے،اس کو مشبہ بہ کے لئے ثابت کیا اور مشبہ بہ السنة الشهباء یعنی قحط سالی ہے،تو یہ استعارہ مکنیہ اور تخلیہ ہوا،اور" احیت" کی اسناد" دعوته" کی جانب بطور مجاز ہے، اسناد الشئی الی سببه '' کی قبیل سے،اس لئے کہ محیی و ممیت (جلانے والا اور مارنے والا) حقیقت میں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔

(السنة) کا معنیٰ سال ہوتا ہے اس کی اصل" سنهة'' بروزن" جبهة" ہے،'' صحاح" میں مذکور ہے کہ یہ لفظ اکثر بمعنی سال مستعمل ہے اور اس میں غالب خشک سالی اور سختی ہے،لیکن اس کے برخلاف لفظ" عام" اس سال کو کہتے ہیں جس میں خوشحالی اور زرخیزی ہو۔

(الشهباء) کہتے ہیں اس خشک سال کو جس میں نہ بارش ہو اور نہ سبزی (یعنی بغیر بارش اور سبزی کے خشک سال) اور لفظ" شهبا" سے اس کو موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس موسم میں زمین ہریالی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سفید ہوجاتی ہے اور بیاضی کا غلبہ ہوجاتا ہے (اور شهب مادے سے سفیدی کا معنیٰ اکثر لیا جاتا ہے)اور زمین سفید ہونے کی طرف نسبت کی وجہ سے (گویا) مردہ ہے،اور اس مردہ زمین کو حضور کی دعا نے زندہ کیا۔ ' احیت دعوته' یعنی حضور ﷺ نے اپنے رب سے دعا کی کہ اس مردہ زمین کو بارش نازل فرما کر زندہ کردے تو حضور کی

دعا کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرما کر بارش نازل فرمائی اور اس سال کو زندہ فرما دیا، قحط سالی اور سختی کو خوش حالی اور شادابی میں بدل کراتنی خوش حالی اور سرسبز وشادابی ہوگئی کہ ناظم کہتے ہیں'' حتـی حـکـت'' یعنی مشابہ ہوگیا وہ سال، جیسا کہ مذکورہ ذیل شعر میں لفظ حکایت بمعنی تشبیہ دینا ہے۔

ظلـمـنـاك فـی تشبیـه صدغیك بـالمسك وقـاعدة التشبیه نـقـصـان مـا یحكی

(ترجمہ: ہم نے آپ کے ساتھ ظلم کیا کہ آپکی کنپٹی کو مشک سے تشبیہ دے ڈالی (لیکن کیا کریں) تشبیہ میں قاعدہ ہی یہی ہے کہ مشبہ کا نقصان ہوتا ہے)

اور (حکت) میں "ھی" کی ضمیر پوشیدہ راجع ہے'' السنة'' کی جانب (الـغرة) بضم الغین المعجمۃ اور وہ اصل میں اس طویل سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی پر ہوتی ہے، اور اس کی تعبیر کرم سے کی جاتی ہے، تو کسی بھی شئی کے "غرہ" کا مطلب اس شئی کا عمدہ اور احسن حصہ ہے۔

(الاعـصر) ،عصر بمعنی زمانہ کی جمع ہے۔اور "الاعـصـر الدھم" سے مراد وہ خوشحال ایام ہیں جس میں خوب کثرت سے سرسبزہ وشادابی ہوتی ہے۔(الـدھـم) بـضم الدال و سكون الھا" نیز اول کی اتباع میں بضم ھاء بھی پڑھا جاتا ہے، یہ'ادھم' بمعنی اسود کی جمع ہے۔

(شرح بیت ثانی): اور یہ" احیـــــــاء" یعنی مردہ اور خشک سال کو زندہ کرنا، آپ ﷺ کی دعا سے حاصل ہوا (بـــعـــــارض) یعنی بادل کے سبب سے، تو معلوم ہوا کہ دوسرے شعر میں (بعارض) میں 'با' سببیہ ہے۔ (عـــارض) اس بادل کو کہتے ہیں جو کنارۂ آسمان میں حائل ہوتا ہے۔(جـــاد) ، جَـود بفتح جیم سے ہے بمعنی موسلا دھار بارش تو اب'' جـــاد'' کا معنی ہوگا کہ بہت تیز بارش برسی۔(او) عاطفہ ہے بمعنی 'واو' لیکن بعض نے اسے" الی ان" کے معنی میں لیا ہے۔

علامہ ابن حجر مکی نے" افضل القریٰ" میں اس پر اعتراض کیا ہے اور تفصیل سے اس کا رد کیا ہے، ان کے افادات کا خلاصہ یہ ہے کہ (او) جو' الـــــی ان' کے معنیٰ میں ہوتا ہے وہ ماضی پر داخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ تو صرف فعل

مضارع پر داخل ہوتا ہے۔آگے چل کر علامہ ابن حجر مکی، علامہ ابن مرزوق کے اقوال سے استناد واستدلال کرتے ہیں جوانہوں نے اس شعر کی شرح میں فرمائے۔لہذا" شرح همزيه" میں علامہ ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں: پھر میں نے اس قصیدے کے شارح علامہ ابن مرزوق کو دیکھا کہ وہ میرے ذکر کردہ دلائل سے واقف ہیں،اس لئے کہ وہ (او خلت البطاح بها) کے متعلق فرماتے ہیں کہ (او) یہاں عاطفہ ہے پھر انہوں نے اس کو بمعنیٰ 'واو' بنایا یا بمعنیٰ 'بل' یا وہ اپنی اصل پر شک کے لئے ہے یا وہ تخییر کے لئے ہے لیکن اس کا بیان دشوار ہے بہرحال انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا کہ "او" غائیہ ہے کسی طرح بھی اور 'او' غائیہ کی اصل صرف یہ ہے کہ اس کا ماضی پر داخل ہونا ممتنع ہے ورنہ تو شعر میں غائیہ کا معنیٰ اس سے زیادہ قریب ہے جس کو انہوں نے دشوار جانا، اور جس سے انہوں نے تکلف کیا اور اس سے بھی جس کے بارے میں انہوں نے تصریح کی کہ نحویوں نے "او" کی صرف دو قسمیں بیان کی ہیں:

ایک عاطفہ اور دوسری ناصبہ جو غائیہ یعنی غایت کے لئے ہوتی ہے۔تو عاطفہ کا معاملہ تو بالکل واضح ہے اس میں تو کلام ہی نہیں، لیکن رہا ناصبہ تو وہ مضارع کے ساتھ خاص ہوتا ہے، لہذا اب جو 'او' کی تیسری قسم ثابت کرے یعنی وہ ماضی پر داخل بھی ہو اور عطف کے لئے نہ ہو!! تو ایسے شخص پر بیان لازم ہے۔(ملخصا من شرح الهمزيه ص: ١٧٦، ١٧٧)

خلت البطاح) یعنی ''تو گمان کرتا کہ پرنالوں کا پانی'' تو اس تقدیر سے واضح ہوا کہ یہ بحذف مضاف ہے یا پھر وہ محل ذکر کر کے حال مراد لینے کی قبیل سے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''وادی بہہ نکلی'' (سال الوادی) اور جیسے کہا جاتا ہے ''نہر جاری ہے'' اور یہی صورت اوجہ ہے۔(البطاح) جمع ہے " ابطح " کی بمعنیٰ پانی بہنے کی وسیع اور کشادہ جگہ۔(سيبا) بروزن ''غیب'' بمعنیٰ بہنا۔(اليم) بفتح 'یا' بمعنیٰ بحر اور "سيب" بمعنیٰ عطا بھی ہوتا ہے، قاموس میں ہے: کہا جاتا ہے "فاض سيبه على الناس" (فلاں کی عطا اور بخشش لوگوں پر جاری ہوئی)۔(سيلا) بمعنیٰ کثرت بارش سے اچانک جاری پانی کا جمع ہوجانا، حدیث پاک میں آیا ہے کہ " اللهم انی

اعـوذ بك مـن السيـل و البـعيـر السؤول" یعنی اے اللہ میں سیلاب اور سرکشِ اونٹ سے تیری پناہ مانگتا ہوں"(الـعـرم) بفتح عین وکسرِ را بمعنیٰ سخت طوفانی بارش، یا وہ ملک سبا کی ایک وادی کا نام ہے اس لئے کہ اس وادی سے اس کے رہنے والوں پر بہت سیلاب آجاتا تھا یا پھر وہ ملک یمن کے پانی کا بند ہے جس کو ملکۂ بالقیس نے بنوایا تھا، مفسرین اور مؤرخین کے ذکر کرنے کے مطابق، کہ انہوں نے اس کی عظیم ہیئت و کیفیت اور صنعت گری کو ذکر کیا۔

اور شعر میں اشارہ ہے اس روایت کی جانب جو حضرت انس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آقا علیہ السلام کے زمانۂ اقدس میں ایک سال لوگ سخت قحط سالی اور تنگی میں مبتلا ہوئے تو اسی اثنا میں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن خطاب فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی کھڑے ہوئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! اموال ہلاک ہو رہے ہیں اہل و عیال بھوکے مر رہے ہیں، آپ ہمارے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا فرما دیں تو حضور نے اپنے دستہائے مبارک اٹھائے اور اس وقت حال یہ تھا کہ آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا ابھی نہیں تھا، (راوی کہتے ہیں) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ آپ ﷺ نے ابھی دستہائے مبارک نیچے بھی نہ کئے تھے کہ آسمان میں بادل مثل پہاڑ نظر آنے لگے، اور پھر حضور منبر شریف سے ابھی نیچے نہ اترپائے تھے کہ میں نے دیکھا کہ بارش کا پانی آپ ﷺ کی ریش مبارک پر بہہ رہا تھا بہر حال بارش اس دن، اس کے دوسرے اور تیسرے دن یہاں تک کہ دوسرے جمعہ تک ہوتی رہی، کہ پھر ایک شخص دوسرے جمعہ کو کھڑے ہوئے اور عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ! عمارتیں ڈھہ رہی ہیں، اموال ڈوب رہے ہیں آپ ہمارے لئے اللہ سے دعا فرما دیں تو آپ ﷺ نے اپنے دستہائے مبارک کو پھر اٹھایا اور یوں دعا فرمائی" اللهم حوالينا و لا علينا" اے اللہ ہمارے گرد برسا، ہم پر نہیں۔

پھر حضور نے بادلوں کی جانب اشارہ فرمایا وہ صاف ہو گئے اور آسمان کھل گیا اور شہر مدینہ منورہ گڑھے کے مثل نظر آنے لگا اور وادیٔ قناۃ پورے ایک مہینے تک بہتی رہی اور اطراف واکناف سے آنے والا ہر شخص صرف بارش کے

متعلق گفتگو کرتا تھا۔

ناظم فاہم نے اسی مفہوم کو قصیدہ ہمزیہ میں عمدہ اور بہترین طریقے سے تعبیر کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ودعـــا لـــلانـــام اذ دهـــمتهـــم سـنة مـن مـحـو لهـا شهبـا

(ترجمہ: آپ ﷺ نے لوگوں کے حق مین دعا فرمائی جس وقت وہ خشک سال لوگوں کو سختی اور قحط سالی میں مبتلا کیئے ہوئے تھا۔)

فـــاستهـلــت بـــالـغيـث سبـعة ايـــام عـلـيهـم سـحـابة وطـفـأ

(ترجمہ: تو حضور کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ آسودہ کرنے والا بادل مسلسل سات دن تک ان پر موسلا دھار بارش برساتا رہا)

تتـحـرى مـواضـع الـرعـى والسقـى وحيـث الـعـطـاش تـو هـى السقـأ

(ترجمہ: اور وہ بادل ان سوکھی اور پیاسی زمینوں کا قصد کرتے تھے کہ جن جگہوں اور زمینوں میں پیاس پانی کے مشکیزوں کو پھاڑ دیتی ہے)

واتـــى الـــنـــاس يشتـكـون اذاهـــا ورخـــاء يـؤذى الانـــام غـــلاء

(ترجمہ: (جب سات دن تک مسلسل پانی برستا رہا) تو لوگ حضور کے پاس اپنی تکالیف کی شکایتیں لے کر آنے لگے کہ سخت طوفانی بارش اب لوگوں کو ایذا دے رہی ہے)

فـدعـا فـانـجـلـى الـغـمـام فـقـل فـى و صف غيــث اقـلاعــه استسقـاء

(ترجمہ: پھر حضور نے دوبارہ دعا فرمائی تو بادل کھل گئے لہذا تم بارش کی صفت میں یوں کہو کہ اس کا کھلنا، اس کا برسنا اور آسودہ کرنا ہے)

مذکورہ بالا اشعار کے الفاظ غریبہ کی شرح:

(دهـمتهـم) بمعنیٰ " غشيتهـم " (یعنی اچانک آپڑنا کے معنی میں ہے)(مـحـو لهـا) بمعنیٰ سخت قحط سالی

(شهبا) بغیر بارش اور ہریالی والا سال۔(استهلت بالغيث) یعنی موسلا دھار بارش ہوئی (وطفاء) واو مفتوحہ اور تائے ساکنہ کے ساتھ بمعنیٰ تمام اطراف کو اپنے کثرت پانی کی وجہ سے سیراب اور آسودہ کرنے والا بادل۔(تتحری) یعنی وہ بادل قصد کرتے تھے اپنے پانی کے ساتھ۔(توهی) بر بنائے مجہول بمعنیٰ پھٹنا، خرق یعنی ان بادلوں نے ہر مقام کو اپنے پانی سے عام کر دیا یہاں تک کہ وہ ان پیاسی زمینوں کا قصد کرتے کہ جس میں پیاس کے مشکیزے پھٹ جایا کرتے ہیں یہاں تک کہ پھر وہ نہروں اور نالوں کے پانی کے محتاج ہوتے ہیں ان میں سے پانی پینے کے لئے۔اور پھر جب ان پر سات دن مسلسل پانی برستا رہا اور قریب تھا کہ بارش ان کو ہلاکت میں ڈال دے تو لوگ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر آئے اور حال یہ تھا کہ اس وقت آپ ﷺ اسی دن کی طرح منبر شریف پر تشریف فرما تھے کہ جس دن لوگوں نے حضور سے بارش کے لئے دعا کرنے کو کہا تھا۔(یشتکون اذاها) یعنی ان بادلوں کی اذیت اور نقصان کی شکایت کرتے ہوئے یعنی ان بادلوں سے برسنے والے پانی کا نقصان راستوں کو کاٹنے، زندگی کو معطل اور گھروں کو برباد کرنے کی وجہ سے۔ (ورخاء) یعنی بارش کی اتنی کثرت وکشادگی جو لوگوں کو تکلیف دینے لگے۔(گلاء) بمعنیٰ عظیم شدت۔(اقلاعه) بمعنیٰ انکشاف یعنی بادلوں کا انکشاف اور بادلوں کا کھلنا، پانی پلانا ہے یعنی بارش کا نہ برسنا بارش کا برسنا ہے، بادلوں کا رک جانا آسمان کا آسودہ کرنا ہے۔

متعارف اور استعمال کے خلاف اس لئے کہ "استسقاء" اکثر پانی طلب کرنے کے معنی ک لئے ہوتا ہے نہ کہ بادلوں کو رفع کرنے کے لئے۔(شرح الہمزیہ ص:۳۳۶،۳۳۵،۳۳۶)

بیان کیا جاتا ہے کہ ابو طالب نے آپ ﷺ کو آپ کے زمانۂ طفولیت میں پیش کر دیا تھا جس سال قحط پڑا تھا اور کعبہ معظّمہ سے پناہ گیر ہوکر ابو طالب نے آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کے وسیلے سے پانی طلب کیا اور اس وقت قریش کی ایک جماعت ان کے ارد گرد تھی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی برکت سے ان پر پانی نازل فرما دیا، اسی وجہ سے ابو طالب کہتے ہیں:

وا بیـض یستسـقـی الـغـمـام بـوجهـه　　ثـمـال الیتـامی و عـصـمة لـلأرامـل

(ترجمہ:حضور ایسے روشن نورانی چہرے والے ہیں کہ ان کے نورانی چہرۂ مبارک کے صدقے میں بادلوں سے پانی طلب کیا جاتا ہے، جو یتیموں کے فریادرس اور بیواؤں کے لئے پناہ گاہ ہیں)

(تو ابوطالب کے اس شعر میں) اسی قصے کی یاد کی طرف اشارہ ہے،لہذا قصیدہ بردہ شریف کے اس شعر کو ہلکے سے تبدیل وتغیر کے ساتھ یوں بھی پڑھا جاسکتا ہے:

واحیـت السـنة الشهبـاء طـلـعتـه　　حتی حکت غـرة فی الاعـصـر الدهم

(ترجمہ:۔اور حضور کے روشن نورانی چہرے (طلعت زیبا) نے قحط سالی کو سرسبز وشادات کردیا یہاں تک کہ وہ سال تاریک زمانوں میں روشن نظر آنے لگا)

امام ابن حجر مکی اس قصے کو" افضل القریٰ " میں اس طرح بیان کرتے ہیں: ابن عسا کر نے عرفطہ سے روایت کیا؛ وہ فرماتے ہیں کہ میں اس سال مکہ آیا تھا جس سال اہل مکہ سخت قحط سالی میں مبتلا تھے تو قریش نے کہا کہ اے ابو طالب! وادیاں سوکھ چکی ہیں، اہل وعیال کمزور ہورہے ہیں، آؤ اور پانی کے لئے دعا کرو! تو ابوطالب نکلے اور ان کے ساتھ ایک طفل تھے، جو گویا تاریکی کے آفتاب کی طرح تھے جن کے چہرۂ مبارک کی تجلی سے کالے بادل چھٹ رہے تھے، اور حال یہ تھا کہ ان کے اردگرد کئی بچے تھے، تو ابوطالب نے ان کو اٹھا کر ان کی پشت انور کو کعبے سے لگادیا اور وہ طفل انگلی سے پناہ گیری ہوئے، حالاں کہ اس وقت آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا کہ اتنے میں یہاں سے لے کر وہاں تک تاحد نگاہ بادل گھر آئے، وادیاں پانی سے بھر کر بہنے لگیں، جنگلات اور نہریں سرسبز وشاداب ہوگئیں، اسی واقعہ کے متعلق ابوطالب یہ شعر کہتے ہیں:

وا بیـض یستسـقـی الـغـمـام بـوجهـه　　ثـمـال الیتـامی و عـصـمة لـلأرامـل

(شرح الہمزیہ ص:۱۵۵)

الفصل السادس

فی شرف القراٰن الکریم ومدحه

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

بحمد اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم فصل خامس سے فارغ ہو لئے اور اب فصل سادس کے پہلے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۸)دعنی ووصفی آیات له ظهرت ظهور نار القریٰ لیلاً علی علم

(ترجمہ:۔چھوڑ دے مجھے اور حضور کی نعت خوانی کرنے دے، حضور کے ان معجزات سے کہ جو ضیافت کی اس آگ کی طرح روشن ہیں جو رات میں پہاڑ پر روشن ہوتی ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے جب آپ ﷺ کے بعض معجزے بیان کیئے تو انہیں خیال آیا کہ یہ سب آیات اور علامات تو ظاہر و باہر ہیں لیکن ان میں کچھ وہ بھی ہیں جو زیادہ مشہور نہیں تو کہیں عدو معاند اور کافر حاسد کے لئے اس میں مجال انکار نہ ہو۔تو اسی وجہ سے ناظم ذی فہم نے چاہا کہ مومنین کے قلوب میں مزید یقین کو ثابت کر دیا جائے اور ذلیل ہٹ دھرم کی سرزنش کی جائے نیز مجال انکار کا دروازہ اس دلیل کو ذکر کر کے بند کر دیا جائے جو شہرت میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ (اے سننے والے) امین و مامون (علیہ السلام) کے معجزات اور آیات میں نے جو ذکر کئے ہیں، اس میں تیرے لئے انکار کی قطعاً کوئی جگہ نہیں اور اگر تو انکار کرتا ہے تو پھر (سن لے) کہ یہ وہ آیت اور نشانی ہے کہ جس کے بعد پھر تجھے مجال انکار رہی نہیں سکتا، اور کیوں کر رہے کہ یہ معجزہ مرور زمانہ اور گردش ایام کے ساتھ دائم وقائم ہے، لہذا وہ کہتے ہیں:

دعـنـــي ووصــفـــي آيــات لـــه ظهــرت　　　ظهـور نـــار الــقـرىٰ ليلاً عـلى عـلـم

شعر کے کلمات غریبه کی شرح:

(دعنی) بمعنی چھوڑ دو مجھے" ودع" سے امر کا صیغہ ہے (ووصفی) 'یا' کے فتح کے ساتھ، مفعول معہٗ ہے اور 'واو' بمعنیٰ "مع" ہے یا پھر وہ معطوف ہے مفعول پر اور وہ مفعول" دعنی" کی ضمیر ہے۔(آیات) ، آیة کی جمع ہے بمعنیٰ نبوت کی علامات ظاہرہ، اور اس کا نکرہ لانا برائے تعظیم ہے، یعنی آیـات عـظیمه۔(له) محل صفت میں ہے یا" ظهـرت "، فعل کے فاعل سے حال واقع ہے، لہذا بر تقدیر اول (محل صفت میں ہونا) وہ محلا مجرور ہے اور بر تقدیر ثانی (حال ہونا) وہ محلا منصوب ہے، اور اس صورت میں فعل پر حال کا مقدم ہونا برائے تخصیص ہوگا، نیز (له) کو ظرف لغو" ظهـرت" سے متعلق بھی کر سکتے ہیں اور اس تقدیر پر جملہ بتاویل مفرد ہو کر محل جر میں" آیــات " کی صفت ہو جائے گا۔(ظهور) مفعول مطلق مصدر نوعی ہے، (الـقرىٰ) بمعنی مہمانی کا کھانا" قرىٰ " سے بمعنیٰ جمع کرنا بھی آتا ہے کہا جاتا ہے: قـرىٰ الشـئـی یـقری" بمعنیٰ جمع کرنا اور کہا جاتا ہے " قـری المـاء فـی الحوض" یعنی حوض میں پانی جمع ہو گیا۔" قـری الـضیف یقری قری و قرای ءً بمعنیٰ ضیافت کرنا مہمان نوازی کرنا۔(لیلاً علی علم) میں 'علم' بمعنیٰ بلند پہاڑ، حضرت خنساء رحـمها الله اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ میں کہتی ہیں:

وان صـخـــرا لتــأتـم الهـداة بـه　　　كـــانـــه عـلـم فـی راسـه نـــار

(ترجمہ:۔اور سخت چٹان بھی نرم ہو جانے کا ارادہ کرے اس کی وجہ سے (یعنی میرے بھائی کی عادت ومزاج سے سخت سے سخت آدمی بھی نرم اور ٹھنڈا ہو جاتا تھا) گویا وہ (یعنی میرا بھائی) ایک ایسا پہاڑ ہے کہ جس کی چوٹی پر مہمانی کی آگ جل رہی ہے کہ کوئی بھی مہمان ومسافر آ کر وہاں سکون حاصل کر سکتا ہے)

(لیلاً علی علم) (پورانے زمانے میں) عرب کے فیاضوں کی یہ عادت ہوا کرتی تھی کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر آگ جلاتے تھے تا کہ مسافرین رات میں اسے دیکھ کر وہاں آئیں اور وہاں کھانے پینے وغیرہ کی اپنی دیگر ضروریات کو

پورا کریں۔اور (لیل) اور (علم) کا نکرہ لانا،نوعیت بیان کرنے کے لئے ہے یعنی سخت سیاہ رات اور خوب بلند پہاڑ یا پھران لفظوں کی تنکیر تعظیم کے لئے ہے۔

شعر کا حاصل معنیٰ: اے مجھے کلام میں اختصار کرنے کی نصیحت کرنے والے مجھے چھوڑ دے اور حضور کی وصف بیانی اور نعت خوانی کرنے دے کہ تو مجھے اس وجہ سے نصیحت کرتا ہے کہ کلام میں اطناب اور طول ، اکتاہٹ اور ملول پیدا کرتا ہے(مگر تو سن لے کہ) حبیب کے ذکر سے پیٹ کبھی شکم سیر نہیں ہوسکتا لہذا تو مجھے حضور علیہ السلام کے اوصاف کے ساتھ تنہا چھوڑ دے اوران آیات ظاہرہ وعلامات باہرہ کے ذریعہ حضور کی وصف بیانی کرنے دے کہ جوجہل کی ظلمت کے وقت محاسن کے اخلاق کے ذریعے آفاق میں ظاہر ہیں اوراس آگ کی طرح روشن ہیں کہ جو بطور علامت پہاڑوں کی چوٹیوں پر روشن کی جاتی ہے اس تاریک رات میں کہ جس کی تاریکی اور ظلمت میں ہوتا کہ اس جلتی ہوئی روشن آگ کو دیکھ کر محتاجین مسافرین اور ضرورت منداپنی اپنی ضرورتوں کو فیاضوں اور کریموں کے یہاں پورا کرنے کے لئے حاضر آئیں، بحمد الله الملك المنام

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی فصل سادس کے دوسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۸۹) فالدر یزداد حسنا و هو منتظم　　　ولیس ینقص قدرا غیر منتظم

(ترجمہ:۔پس دریتیم لڑی میں پروئے ہوئے زیادہ حسین لگتے ہیں(ان کا حسن بڑھ جاتا ہے) حالانکہ بغیر ہار اور لڑی کے ان کی قدر و قیمت میں کوئی کمی بھی نہیں آتی۔)

ربط: (گزشتہ شعر میں) شاعر ذی فہم نے ایک شخص کو اپنے آپ سے الگ کر کے اس سے سوال کیا تھا کہ وہ ان کو

حضور نبی کریم ﷺ کی تعریف وتوصیف کرنے دے، ان آیات وعلامات سے کہ جو ضیافت کی آگ کے مثل روشن اور ظاہر و باہر ہیں، دعویٰ یہ تھا کہ آپ ﷺ کے معجزات نفاست اور قدر و قیمت میں بکھرے ہوئے موتیوں کے مشابہ ہیں اور ناظم فاہم کا اس شخص مجرد سے وہ سوال کرنا اور تنہا چھوڑنے کو کہنا اس بات کو بتاتا ہے کہ وہ ان معجزات کو نظم کرنے پر عزم کئے ہوئے ہیں، لہذا انہوں نے ایک شخص کو متصور کیا جو ان سے سوال کررہا ہے کہ آپ ﷺ کے معجزات جب اتنے ظاہر و باہر اور روشن ہیں تو پھر تمہارے ان کو ذکر کرنے اور نظم کرنے سے کیا فائدہ؟ تو ناظم اسی کا جواب دیتے ہیں:

فالدر یزداد حسنا و هو منتظم   ولیس ینقص قدرا غیر منتظم

تو معلوم ہوا کہ شعر مقام جواب میں لائے ہیں گویا ناظم ذی فہم جواب دے رہے ہیں کہ آیات وعلامات نبوت کو ذکر کرنا فائدے سے خالی نہیں اس لئے کہ لڑی کی شکل میں ترتیب اور موزونیت کے ساتھ اس کا ذکر اس کے حسن و ظہور کو نگاہوں میں اور بڑھاتا ہے لہذا آپ ﷺ کے معجزات اگرچہ (پہلے سے ہی) اکمل طریق پر ظاہر و واضح ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو سلیقے سے نظم کرنے سے ظہور پر ظہور ہوتا ہے اور لڑیوں میں اس کو پرونے سے حسن پر حسن بڑھتا ہے باوجود یکہ ان کی قدر و قیمت اور خوبصورتی بکھرے ہوئے ہو کر بھی کچھ کم نہیں ہوتی! اس لئے کہ اس کا حسن اور نظم ذاتی ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوسکتا، اب چاہیں وہ موتی بکھرے ہوئے ہوں یا لڑی میں پروے ہوئے، ہاں البتہ یہ ہے کہ ان معجزات کا تذکرہ منظوم سننے میں لذت زیادہ آتی ہے بنسبت نثر میں بیان کرنے کے، اس لئے کہ جو چیز کسی صفت سے بڑھتی اور زائد ہوتی ہے وہ اس وصف کے سلب ہونے سے کم بھی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے ناظم نے امر محسوس سے استدلال کیا تاکہ اس سے معقول کا ادراک کیا جاسکے، اسی لئے ناظم یوں گویا ہوتے ہیں: " فالدر یزداد حسنا!...الخ"

مفہوم شعر: وہ موتی جن کا حسن معلوم ہے وہ بڑے بڑے موتی اور در یتیم ہیں جن کا حسن بڑھ جاتا ہے لڑی میں پروے ہوئے ہونے کے حال میں، اس وجہ سے کہ وہ مناسب طریقے سے یا سلیقہ سے مرتب کئے گئے ہیں،

جبکہ ان موتیوں کی قدر و قیمت لڑی میں پروئے نہ ہونے کے حال میں بھی کم نہیں ہوتی! اس وجہ سے کہ ان کا حسن ذاتی ہے اور وہ ان سے کسی بھی حال میں الگ نہیں ہوسکتا، چاہیں حالت نظم ہو یا حالت نثر! لیکن ان سب باتوں کے باوجود نظم، اضبط واحفظ اور فہم کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ ناظم کے قول (ولیس ینقص قدراً) میں "صنعتِ "احتراس" ہے اس لئے کہ نظم سے حسن کے زیادہ ہوجانے سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ (شاید) غیر نظم اس کی قدر و قیمت میں نقص وکمی پیدا کرتا ہے، تو اس وہم کو اس قول سے رفع ودفع کیا گیا ہے۔ (کہ نظم میں نہ ہونے سے بھی اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی)

تشریح: "فا" تعلیلیہ ہے (ینقص) فعل مضارع ہے، 'نقص' مصدر سے معروف ومجہول ہر دو طرح پڑھا گیا ہے! لہذا "ینقص" کو بر تقدیر فعل معروف، "یا" کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے اور بر تقدیر مجہول 'یا' کے ضمہ اور 'قاف' کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ "نقص" لازم اور متعدی ہر دو طرح آتا ہے۔ (حسنا) اور (قدراً) یہ دونوں حال واقع ہیں یعنی "وھو منتظم" اور "غیر منتظم" حال ہیں۔

(غیر منتظم) کے اعراب کے سلسلے میں تمام شارحین نے اس پر اکتفا کیا ہے کہ وہ "ینقص" فعل کے فاعل سے حال واقع ہے، حالانکہ "ینقص" فعل کا فاعل ماننے کی صورت میں اس کو "غیر منتظم" رفع کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور اس تقدیر پر "فلیس" ایسا فعل ہے جس کی گردان نہیں کی جاتی اور اس کا اسم مرفوع اور خبر منصوب ہوتی ہے اور یہاں "لیـــــس" کا اسم ضمیر شان ہوگا اور اس کے بعد جو جملہ فعلیہ ہے وہ محل نصب میں "لیس" کی خبر ہوگا "المعجم الوسیط" میں آیا ہے کہ "لیس" جملہ فعلیہ پر داخل ہوگا یا مرفوع مبتدا وخبر پر تو اس صورت میں اس کا اسم ضمیر شان ہوگا اور اس کے بعد والا جملہ محل نصب میں اس کی خبر ہوگا مزید جملہ فعلیہ کی مثال "لیس یقوم زید" اور مبتدا وخبر کی مثال "لیس زید قادم" نیز یہ کہ "منتظم" میں دو صورتیں ہوسکتی ہیں،

پہلی یہ کہ وہ "انتظم" فعل سے اسم فاعل ہونے کی بنیاد پر " منتظمٌ " 'ظا' کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہو بمعنیٰ مرتب کرنا جمع کرنا کہا جاتا ہے کہ " نظمہ فانتظم اُس نے جمع کیا اس کو تو وہ جمع ہو گیا اور اسم مفعول ماننے کی بنیاد پر اسے 'ظا' کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں، " انتظم الاشیاء " سے بمعنیٰ اکٹھا کرنا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا، لہذا معلوم ہوا کہ " انتظم "لازم و متعدی ہر دو طرح مستعمل ہے۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ کی فصل سادس سے تیسرے شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے: ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۰) فما تطاول آمال المديح الی ما فيه من كرم الاخلاق الشيم

(ترجمہ:۔ تو کیا ایک ثنا خواں کی آرزوئیں وہاں تک پہنچ سکتی ہیں جہاں آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ اور خصائل محمودہ ہیں)

تشریح:۔ (اس شعر میں شاعر ذی فہم اظہار عجز کر رہے ہیں وہ اپنے آپ کو بری ٹھہرانا چاہتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی ثنا خوانی کا نہ حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ کسی وجہ عام کے ذریعہ آپ ﷺ کے اوصاف کی انتہا تک پہنچ سکتے ہیں، اس لئے انہوں نے پہلے اپنا نام حضور ﷺ کے جملہ مداحوں میں درج کیا اور پھر یہ اطلاع دی کہ تمام مداحان رسول اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی سب ملکر آپ ﷺ کی مدح کی انتہا تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے لہذا ناظم اگر تنہا ایک ہی وقت میں اس وجہ کو بیان کرنا چاہیں جس کے سبب ذات کی مدح سرائی سے صفات کی مدح سرائی کی طرف عدول کیا گیا ہے تو آخر وہ کیسے حق ادا کر سکتے ہیں؟ اسی لئے ناظم اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں:

فما تطاول آمال المديح الی ما فيه من كرم الاخلاق الشيم

تشریح: (فا) ماسبق کی علت بیان کرنے کے لئے ہے یا پھر وہ عاطفہ ہے۔ (ما) استفہامیہ مبتدا ہے اور (تطاول) اس کی خبر ہے یا 'ما' نافیہ ہے اور اس کے مابعد فعل ماضی ہے 'واو' اور 'لام' کے فتحہ کے ساتھ یا پھر 'تطاول' باب تفاعل سے 'واو' کے فتحہ اور 'لام' کے ضمہ کے ساتھ فعل مضارع ہے ایک 'تا' کے حذف پر۔ (آمال) بالرفع "تطاول" کا فاعل ہوگا یہ 'امل' بمعنیٰ امید کی جمع ہے اور ایک نسخے کے مطابق یائے متکلم کی جانب مضاف ہے یا دوسرے نسخے کی بنیاد پر "مدیح" کی جانب مضاف ہے۔ (مدیح) بروزن فعیل بمعنیٰ اس فاعل ہے یعنی "مـــــادح" بمعنیٰ ثنا خواں یا وہ اسم مفعول کے معنی میں بمعنیٰ ممدوح ہے اور یہی وجہ کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے زیادہ بہتر ہے۔ (الی) متعلق ہے "تطاول" سے (مال) موصولہ ہے اور اس میں ظرف مستقر ہے جو اس کا صلہ ہے۔ (من) بیانیہ ہے اور 'کرم' کی اضافت اخلاق کی جانب اضافت الصفت الی الموصوف کی قبیل سے ہے، یعنی دراصل یوں ہے "الاخلاق والشیم الکریمة" 'اخلاق' خلق بضمتین کی جمع ہے بمعنیٰ طبیعت اور 'الشیم' شین مشدد کے کسرہ اور 'یا' کے فتحہ کے ساتھ "شیمة" کی جمع ہے بمعنی خلق بضمتین لیکن اخلاق سے مراد یہاں کسبی کردار ہیں اور 'شیـــــم' سے مراد طبیعت وفطرت ہے یا ہر ایک سے دونوں مراد ہیں۔ اور (ہم معنیٰ کی) تکرار تاکید کے لئے ہے۔

حاصل معنیٰ: جب تک ساتوں آسمان موجود ہیں تب تک کسی بھی ثنا خواں کی امیدیں آپ ﷺ کے مکارم اخلاق اور محاسن کردار کی انتہا تک ہرگز نہیں پہنچ سکتیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی چھٹی فصل سے چوتھے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے: ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۱) آیات حق من الرحمٰن محدثة　　　　قدیمة صفة الموصوف بالقدم

(ترجمہ: قرآن کی آیتیں رحمان کی جانب سے (باعتبار نزول، کتابت، تلفظ) حادث ہیں (مگر باعتبار معنیٰ اور کلام نفسی) قدیم ہیں (اس لئے کہ وہ صفت ہے موصوف بالقدم کی۔ (اور قدیم کی صفت بھی قدیم ہوتی ہے)

ربط: شاعر ذی فہم نے (گزشتہ شعر میں) چوں کہ تمام مدح خوان رسول ﷺ کے عجز کا اظہار کیا ہے کہ وہ سب آپ ﷺ کی حق ثنا خوانی اور آپ کی مدح خوانی میں غایت وانتہا تک پہنچنے سے عاجز وقاصر ہیں، تو اس سے ایک وہم پیدا ہو کہ پھر تو ناظم ذی فہم حضور کی نعت خوانی کرنا چھوڑ دیں گے حصول مقصد سے عاجز ہونے کی وجہ سے، لہذا اس شعر میں ناظم نے اسی وہم کو دفع کیا ہے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ مداح رسول جب جب آپ ﷺ کی حق مدح سے عاجز وقاصر ہوتا ہے تو وہ (اس پر لطف عمل کو) چھوڑتا نہیں ہے بلکہ اس کی جانب اور متوجہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ آپ ﷺ کے تمام اوصاف ونعوت میں سے اس صفت اور نعت کی قصد وجستجو میں لگ جاتا ہے جو حضور کی سب سے افضل نعت ہو اور پھر وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید وہ روئے زمین پر باقی آیات کے ذریعہ آپ ﷺ کی حق مدح کے قریب اجمالا پہنچ سکتا ہے اگر چہ تفصیلی طور پر وہ عاجز ہی رہے گا اور ان آیات کا قصد وہ یہ اعتراف کرتے ہوئے کرتا ہے کہ وہ پھر بھی حق ثنا خوانی ادا نہیں کرسکتا اور اس میدان کی انتہا کو پہنچنے سے پھر بھی وہ عجز پر باقی ہی رہے گا، ہاں البتہ ایک بات ہے کہ " العجز عن الادراك ادراكٌ " یعنی کسی شئی کے ادراک سے عاجز ہونے سے بھی ایک قسم کا ادراک ہوتا ہے۔

لہذا ناظم فاہم اب ان آیات کے ذکر کی طرف منتقل ہوتے ہیں جو آپ ﷺ کی نبوت کے دوام پر دلالت کرتی ہیں

اور جو آیات کہ ہمیشہ باقی رہیں گی، تو وہ یوں گویا ہوتے ہیں:۔

آیــات حــق مــن الــرحــمٰــن مــحــدثة　　قــديــمة صفة الــمــوصــوف بــالــقــدم

تشریح: (آیات حق) مبتدا محذوف یعنی 'ھی ' کی خبر ہے یا" بعض معجزاته " مبتدا محذوف کی خبر ہے۔
(آیات) آیت کی جمع ہے بمعنیٰ علامت ہے، اس کا اطلاق قرآن پاک کے اس ٹکڑے پر ہوتا ہے جس کو ماقبل اور ما بعد سے منقطع کرلیا گیا ہے۔ اور اسے " آیت " اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے لانے والے کے صادق ہونے پر علامت ہوتی ہے۔

شعر میں اگر 'حق' سے مراد کلمہ جلالت یا نبیٔ کریم ﷺ کی ذات ہے تو اس کی اضافت بمعنیٰ لام ہے (یعنی آیـات لحق) اور اگر 'حق' صفت مشبہ بمعنیٰ ثابت ہو جو باطل کی ضد ہوتا ہے تو اضافت بیانیہ ہوگی۔ (من الرحمن) یہ یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا آیات کی صفت ہے یا پھر " حـق " بمعنیٰ کلمۂ جلالت (اللّٰـه) سے متعلق ہے، تو اس تقدیر پر" من الرحمن " بیان ہوگا" حق " کا، نا کہ خبر کے بعد خبر۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے جملہ اسمائے صفات میں سے صفت رحمان کو ترجیح دینے کی وجہ کیا ہے؟ تو اس صفت کو ترجیح دینے کی وجہ اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کو مبعوث کرنا اور آپ ﷺ پر آیات نازل فرمانا، محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ہے نا کہ بندوں کے مصالح کو محفوظ رکھنے کے لئے اللہ پر واجب، جیسا کہ معتزلہ گمان کرتے ہیں۔ اور 'رحـمـت' اصل میں رقت قلب کو کہتے ہیں اور وہ صفت نفسانیہ ہوتی ہے جو رحم کرنے والے سے مرحوم پر احسان کرانا چاہتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حق میں رحمت سے مراد ارادۂ خیر ہوتا ہے اس لئے کہ یہ تفسیری قاعدہ ہے کہ وہ افعال جن کے آغاز وانجام ہوں، مبادی اور غایات ہوں، تو اگر ان افعال کی اسناد اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب باعتبار بدایات کرنا ممکن نہ ہو تو وقت اسناد ان افعال سے بطور مجاز مرسل ان کے انجام مراد لئے جاتے ہیں جیسے غضب، حیا، تکبر، استہزا وغیرہ ایسا ہی کچھ تغیر کے ساتھ روح البیان میں ہے۔

لفظِ 'محکم' و 'محدث' کے معانی

(محدثة) بمعنیٰ نیا حادث اور ایک نسخے مین بجائے اس لفظ کے 'محکمة' بمعنیٰ محفوظ آیا ہے اور اس سے بھی تفسیر کی گئی ہے اس فرمان باری تعالیٰ کی (ما یاتیهم من ذکر من الرحمن محدث) الآیہ، اور شعر میں لفظ "محدثة" کا اطلاق 'آیات' پر اسی فرمان باری تعالیٰ سے ماخوذ ہے۔ امام ابو منصور ماتریدی کی 'تاویلات اہل سنت' میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان (ما یا تیهم من ذکر من محدث) کے متعلق بعض علماء نے فرمایا کہ 'محدث' سے مراد 'محکم' ومضبوط ہے کہ قرآن پاک آگے پیچھے سے باطل کی آمیزش سے محفوظ اور محکم ہے اور اسے محکم ومضبوط کر دیا گیا کہ تمام مخلوق اس کے مثل لانے سے عاجز ہے، تو اس تقدیر پر محدثة اور محکمة کے درمیان کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے نیز "محدث" کی تفسیر ایک اور طرح کی گئی ہے، تاویلات وغیرہ کتب میں اس کی تفصیل موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول تو حادث ہے لیکن وہ خود بایں معنیٰ قدیم ہے کہ وہ موصوف بالقدم کی صفت ہے (اور قدیم موصوف کی صفت بھی قدیم ہوتی ہے) اور وہ جو موصوف بالقدم ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اور قرآن متجلی ہے اس میں جو غلاف میں نبیٔ اکرم ﷺ پر اتارا گیا ہے اور جو مصاحف میں مکتوب ہے زبانوں سے پڑھا جاتا ہے، سینوں میں محفوظ ہے، لہذا اس کا اترنا حادث ہے اس کی کتابت حادث ہے اس کی قرأت حادث ہے اس کا حفظ کرنا حادث ہے (لیکن قرآن حادث نہیں) مزید یہ کہ قرآن ایک ہی ہے اس میں ظاہر کے تعدد کے لحاظ سے کوئی تعدد نہیں، لہذا اس پر لفظ حادث کا اطلاق جائز نہیں جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان علامہ باجوری کے کلام سے عنقریب آئے گا جس طرح کہ امام احمد رضا قدس سرہ کی تصنیف لطیف "انوار المنان فی توحید القرآن" سے اس اہم بحث کی مزید تفصیل آئے گی۔ اور دوسرے نسخے میں جو لفظ "محکمة" آیا ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان (احکمت اٰیته) سے ماخوذ ہے۔ اور "محدثة" "قديمة" اور صفة الموصوف" یہ سب (شعر میں) یا تو "آیات" کی صفات ہیں یا ان میں سے ہر ایک خبر کے بعد خبر ہے، نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شعر کے دونوں مصرعہ بطور استئناف وارد ہوئے ہوں اور یہ آیات

کے قدیم ہونے کی تعلیل ہو اس لئے کہ آیات موصوف بالقدم کی صفت ہیں اور قدیم کی صفت بھی قدیم ہوتی ہے،
اور " بالقدم "متعلق ہے "الموصوف" سے اور " محدثة " اور " قديمة " کے درمیان جمع کرنا صنعت طباق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پاک صفت 'کلام' کا بیان

بیان اعراب سے چوں کہ ہم فارغ ہوئے لہذا اب ہمیں صفت کلام کے متعلق آغاز سخن کرنا چاہئے اور رب تعالیٰ
ملك علام کے حق مین اس کی حقیقت اور اس کے معنیٰ کا بیان کرنا چاہئے، لہذا ان باتوں کا ذکر کرنے کے بعد ہم
حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے واقعہ کی تفصیل بیان کریں گے۔ اور اہل جنت کی نشو و نما اور دار النعیم میں انکی حالتون کا
بیان لائیں گے۔ (اقول)

لقانی (شاعر) اپنی منظوم 'جوهرة التوحيد' میں ایک شعر کہتے ہیں:

حیاته كذا الكلام السمع ثم البصر بذی اتانا السمع

علامہ باجوری مذکورہ بالا شعر کے تحت فرماتے ہیں: اہل مذاہب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کے معنیٰ میں مختلف ہیں!!
اہل سنت کہتے ہیں کہ (کلام) صفت ازلی ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، وہ حروف واصوات نہیں
، وہ تقدم و تاخر اور اعراب و بنا سے پاک ہے، سکوت نفسی سے بایں طور پر منزہ ہے کہ نفس میں کلام پر غور نہیں کیا
جائے گا اس پر قدرت ہونے کے باوجود اور وہ آفت باطنیہ سے پاک ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو سکے جیسا کہ گونگے
اور بچے ہونے کے حال میں قدرت نہیں ہوتی ہے۔

اور فرقۂ حشویہ اور وہ فرقہ جو اپنے آپکو حنبلی کہتا ہے، ان کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام وہ حروف واصوات ہیں جو
یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور مرتب ہوتے ہیں: حاشیہ (۱)

(حاشیہ ۱) قال الازہری: البانی جو کہ زمانے کی حشویت کا قائل تھا اور فرقۂ حشویہ کا ترجمان تھا، کتاب العلو پر اس کے مقدمے سے تو یہی
بات روشن ہے (جو اوپر مذکور ہوئی)

یہ جد کریم امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے خطبے کا ترجمہ ہے، اصل خطبہ عربی میں آپ کی تصنیف لطیف " انوار المنان فی التوحید

القرآن" سے ملاحظہ کیا جائے۔ (فقیر ارسلان رضا غفرلہٗ)

اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ قدیم ہیں اور ان میں سے بعض نے تو یہاں تک غلو کیا کہ ان حروف اور نقوش کے قدیم ہونے کا گمان کر بیٹھے جو ہم پڑھتے ہیں بلکہ بعض کا جہل تو مصحف کے غلاف کے قدیم ہونے تک تجاوز کر گیا۔

معتزلہ کہتے ہیں: اس کا کلام حروف واصوات ہے جو حادث ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم نہیں لہذا اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا معنی ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بعض اجسام میں کلام کا خالق ہے اس لئے کہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کلام بغیر حروف واصوات کے ہو ہی نہیں سکتا حالانکہ یہ بات مردود ہے کیوں کہ کلام نفسی لغتاً ثابت ہے جیسا کہ اخطل کے اس شعر میں اشارہ ہے:

ان الکلام لفی الفؤاد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

(ترجمہ:۔ کلام تو یقیناً دل میں پوشیدہ ہوتا ہے، زبان تو بس دل کی بات پر دلالت کرنے کے لئے بنائی گئی ہے)

مزید یہ کہ باری تعالیٰ کا کلام صرف ایک صفت ہے جس میں تعدد نہیں لیکن اس کے اقسام اعتبار یہ ہیں (کہ ان اعتبارات اور حیثیات سے اس کی کئی قسمیں ہیں): تو کسی فعل مثلاً فعل نماز کے طلب سے اس کے تعلق کے اعتبار سے اس کا کلام ''امر'' ہے اور مثلاً ترک زنا کے طلب سے تعلق کی حیثیت سے اس کا کلام " نھی " ہے اور اس تعلق کے اعتبار سے کہ مثلاً فرعون نے فلاں حرکت کی، تو اس کا کلام " خبر " ہے اور اس تعلق کے اعتبار سے کہ مطیع و فرماں بردار کے لئے جنت ہے تو اس کا کلام " وعد " ہے اور اس تعلق کے اعتبار سے کہ نافرمان جہنم میں ڈالا جائے گا تو " وعید " ہے وغیرہ ذالک

نیز یہ کہ امر و نہی کے علاوہ کی نسبت سے کلام باری تعالیٰ کا تعلق، تعلق تنجیزی قدیم ہوگا لیکن رہا امر و نہی کی نسبت سے تعلق تو اگر ان میں مامور بہ اور منہی عنہ کے وجود کی شرط نہیں لگائی گئی ہے تو اس سے تعلق بھی اسی طرح (تعلق تنجیزی قدیم ہے) اور اگر ان کے وجود کی شرط لگائی گئی ہو تو امر و نہی میں تعلق ماموراور منہی کے وجود سے پہلے ''صلوحی" ہوگا اور بعد وجود " تنجیزی حادث" اور جاننا چاہئے کہ کلام اللہ کا اطلاق نفسی قدیم پر بایں معنی ہوتا ہے کہ یہی وہ

صفت ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے اور کلام اللہ کا اطلاق کلام لفظی پر بایں معنی ہوتا ہے کہ یہ اس کی مخلوق ہے اور اس کی اصل ترکیب میں کسی کے لئے کسب نہیں، اور اسی معنی پر سیدہ عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے فرمان کو محمول کیا جاتا ہے کہ " مابین دفتی المصحف کلام الله تعالیٰ "یعنی مصحف کی دو دفتیوں کے درمیان جو ہے وہ کلام اللہ ہے۔لیکن یہ سوال اپنی جگہ رہا کہ کلام اللہ کا اطلاق کلام نفسی اور لفظی پر کس طرح ہوتا ہے تو ایک قول یہ ہے کہ اشتراک کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ کلام نفسی میں اطلاق حقیقی ہے اور کلام لفظی میں مجازی اور ہر اس شخص پر حکم کفر ہے جو انکار کرے کہ مصحف کی دو دفتیوں کے درمیان جو ہے وہ کلام اللہ نہیں مگر یہ کہ اس کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ صفت نہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔(تحفة المرید)

علامہ باجوری کا کلام اس پر ختم ہوتا ہے اور ''شرح البردة" میں سب سے زیادہ تضاد اس کے بارے میں جس کا ابھی بیان گزرا یعنی وحدت قرآن کے سلسلے میں، اس میں یوں تصریح ہے کہ حاصل یہ ہے کہ وہ الفاظ جن کو ہم پڑھتے ہیں، ان کی دو دلالتیں ہوتی ہیں ایک "دلالت بالوضع" یہ وہی دلالت ہے جس کا اعتبار علامہ ابن قاسم نے کیا ہے، اس لئے کہ اس دلالت کا مدلول مساوی ہوتا ہے اس مدلول کے جس پر صفت قدیمہ دلالت کرتی ہے اور دوسری ''دلالت بالالتزام العرفی" ہے نا کہ عقلی یہ وہی دلالت ہے جس کا اعتبار سنوسی وغیرہ متقدمین نے کیا ہے اس لئے کہ اس دلالت سے مدلول، صفت قدیمہ ہوتا ہے، لہذا دونوں مسلک صحیح ہیں جیسا کہ حواشیٔ کبریٰ میں ہے۔(حاشیة الباجوری علی قصیدة البردہ ص ۵۱)

قال الازهری: مذکورہ بالا سطور اس کے منافی ہیں جو علامہ باجوری نے ابھی (اس سے پہلے) بیان کیا تھا کہ کلام اللہ صفت واحدہ ہے اس میں کوئی تعدد نہیں۔

أقول: یہی بات حق و صحیح ہے یعنی وہ جو علامہ باجوری نے پہلے بیان کی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام صفت واحدہ ہے اس میں ایک تعدد نہیں، یہ حق ہے جس پر ائمہ متقدمین گزرے ہیں۔اور جد کریم امام احمد رضا قدس سرہ نے "انوار المنان فی التوحید القرآن" میں انتہائی بہترین انداز میں اور خوبصورت تفصیل کے ساتھ وحدت

قرآن کو ثابت فرمایا ہے اور اشتراک یا حقیقت ومجاز کی وجہ سے اس کے تعدد کو رد کیا ہے۔
ماسبق میں کیئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کے لئے قارئین کرام کے پیش نظر اس کا بیان ہے لہٰذا ہم ان کا کلام چند جگہوں میں بیان کریں گے، کتاب کے خطبے میں آپ یوں فرماتے ہیں:
(یہ جد کریم امام احمد رضا کے خطبے کا ترجمہ ہے، اصل خطبہ عربی میں آپ کی تصنیف لطیف ''انوار المنان فی توحید القرآن'' میں ملاحظہ ہو۔ فقیر ارسلان رضا غفرلہٗ

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

سب خوبیاں اللہ کے لئے جو ایک ہے اپنی ذات میں، تنہا ہے اپنی صفات میں برتر و بالا ہے حدوث سے اور علامات حدوث سے اپنے قدیم ہونے میں، بلند و بالا ہے اس بات سے کہ حدوث اس کے کلام کے مسمّی یا اس کی آیات کے مصداق تک پہنچ سکے اور پاک ہے اس بات سے کہ اس کے کلام کے لئے کوئی تجدد ہو اس کے تجلیات کے تجدد سے یا کوئی تعدد اس کے کسوات کے تعدد سے، وہی ہے جس نے اپنا کلام قدیم اتارا اپنی مخلوق میں سب سے افضل و سردار، رسولوں کے خاتم اور اپنی اولین شاہکار پر، ان پر اور ان کے آل واصحاب اور ذریات پر درود ہو سب سے افضل تسلیم ہو سب سے اکمل، تحیت ہو سب سے ستھری، اور برکت ہو سب سے نامی تو قرآن متجلی ہے ذہنوں میں، کانوں میں، اوراق میں، زبانوں میں، زمان ومکان میں اور وہ رحمان سے نہ کبھی جدا ہو سکتا ہے نہ ہی کبھی اکوان سے مل سکتا ہے، اس کے جناب میں سے کسی بھی شئی میں قلوب واذہان، زبان و بیان اور اقلام سب حادث ہیں (مگر وہ قدیم ہے) اور احوال بدل سکتے ہیں، وضعیں تبدیل ہو سکتی ہیں مگر قرآن اپنے قدیم وثابت ہونے پر اسی طرح ہمیشہ رہے گا جس طرح کہ وہ ہمیشہ سے تھا۔
جاننا چاہیئے کہ علمائے کرام نے کسی بھی شئی کے وجود کے لئے چار مراتب رکھے ہیں (۱) پہلا مرتبہ وجود مشہودی کا (یعنی مشاہدے اور نگاہ میں موجود ہونا) مثلاً زید کہ جو خارج میں موجود ہو (۲) دوسرا درجہ وجود ذہنی کا (یعنی کسی شئی

کا اذہان میں موجود ہونا) مثلا زید کی وہ صورت ذہنیہ جو کہ اس کو ملاحظہ کرنے کا آئنہ اور آلہ ہے۔(۳) تیسرا درجہ وجود تعبیری کا (یعنی الفاظ و بیان میں موجود ہونا) جیسے تم اپنی زبان سے لفظ 'زیـــد' کہتے ہو (تو یہ وجود فی العبارة ہے) اس لئے کہ اسم مسمی کا عین ہوتا ہے۔

اس کو بیان کرنے کے بعد آگے امام احمد رضا قدس سرہٗ اپنے اس دعوے کو ایک حدیث جلیل سے مؤکد و مدلل کرتے ہیں اور اس سے جو قرآن میں آیا ہے، آپ بیان فرماتے ہیں: "مسند احمد" "سنن ابن ماجه" "صحاح الحاكم" اور "ابن حبان" میں ہے: "عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه عن النبی ﷺ عن ربه عزوجل انا مع عبدی اذا ذكرنی و تحركت بی شفتاه" یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے رب عزوجل سے روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے پاس ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور جس وقت کہ میرے ذکر کے لئے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں۔

(۴) اور چوتھا درجہ وجود تحریری کا (یعنی عبارت و کتابت میں موجود ہونا) جیسے کہ لفظ "زید" جب کہ لکھا جائے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (يجدونه مكتوبا عندهم فی التوراة والانجيل) (الاعراف: ۱۵۷) اس آیت کریمہ میں ہٗ کی ضمیر سے مراد نبیٔ اکرم ﷺ ہیں۔

ائمۂ متقدمین کا قول فیصل

ائمہ سلف کا یہ عقیدہ حقہ صادقہ ہے کہ مذکورہ بالا جہات اربعہ سب کے سب حقیقتا اور حقا قرآن عظیم کے وجود کی جگہیں ہیں اور فرقان کریم کے شہود کے تحقیقا و صدقا مقامات اور جلوہ گاہیں ہیں، تو قرآن وہ ہے جو اللہ رب العزت عز جلالہ کی صفت قدیمہ ہے اور اس کی ذات کریمہ کے ساتھ ازلا و ابدا قائم ہے، اس سے اس کا جدا ہونا محال ہے نہ یہ عین ذات ہے نہ غیر ذات نہ خالق ہے نہ مخلوق وہ بعینہ ہماری زبانوں سے پڑھا جاتا ہے، ہمارے کانوں سے مسموع ہے، ہمارے سطور میں مکتوب ہے، ہمارے سینوں میں محفوظ ہے، والحمد للہ رب العالمین اور ایسا نہیں کہ وہ قرآن کے علاوہ کوئی دوسری شئی ہے جو قرآن پر دلالت کرتی ہے، ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ سب تو اس کی تجلیات ہیں اور

وہ ان میں متجلی ہے حقیقتاً، بغیر ذات الٰہیہ سے جدا ہوئے، بغیر کسی شئی حادث سے متصل ہوئے، بغیر ان میں حلول کیئے اور جلوات کے تعدد کی وجہ سے کسی تعدد کے اس تک پہنچے بغیر جیسا کہ میں نے کہا:

اتجدد الملابس مغير للابس (کیا نئے نئے لباس، لباس والے کو بدل سکتے ہیں)

اور میں نے کہا:

شمس وراء مدارك الوطواط فعليك بالايمان لا الابعاط

(آفتاب کا وجود، چمگادڑ کی سمجھ سے ماورا ہے، لہذا تم پر ایمان لانا واجب ہے، اور جہل میں تجاوز نہ کرنا واجب ہے) یعنی جس طرح چمگادڑ سورج کے وجود کا احساس نہیں کرسکتا اور وجود شمس اس کی سمجھ سے ماورا ہے، لیکن اس کی سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے سورج کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح کلام اللہ کی حقیقت انسان کی عقل سے ماورا ہے، لہذا ہم پر اجمالا ایمان لانا واجب ہے، اور اس میں جہل نہ کرنا واجب ہے۔ فقیر ارسلان رضا غفرلہٗ)

وحدت قرآن پر حدیث جبریل سے استدلال

پھر آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ) بیان کردہ وحدت قرآن کے مفہوم کی تائید سنت سے کرتے ہیں بلا شبہ و تمثیل:

یہ ہمارے سردار حضرت جبریل (ان پر تعظیم کے ساتھ درود ہو) اللہ کے دشمن ابو جہل نے آپ کو اونٹ کی شکل میں دیکھا، جس وقت کہ وہ اس پر دوڑ پڑے اور اس اونٹ کے ایسے دانت اور ایسا سر تھا کہ کہ اس طرح کبھی نہیں دیکھا گیا، یہاں تک وہ دشمنِ خدا پیچھے ہٹ گیا۔ تو کیا کسی کے لئے یہ گمان کرنا جائز و درست ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت جبریل نہیں تھے" بلکہ وہ کوئی دوسری شئی تھی جو حضرت جبریل پر دلالت کر رہی تھی، اللہ کے لئے پاکی ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ یقیناً حضرت جبریل ہی تھے اور خود حدیث پاک میں بھی آپ ﷺ سے مروی ہے کہ " ذاك جبريل لو دنا منى لاخذه" یعنی وہ جبریل تھے، اگر وہ (ابو جہل) مجھ سے قریب ہوتا تو یہ اس کو ضرور پکڑ لیتے۔ اس حدیث کو ابن اسحاق ،ابونعیم اور بیہقی نے روایت کیا، حضرت ابن عباس سے مروی ہے " و ان كنا نعلم ايضا باليقين" ان صورة جبريل الجميلة ليست الصورة الجميلة بل له ست مئة جناح قدسد

الافق ' ،یعنی ہم لوگ یہ بات یقین سے جانتے تھے کہ حضرت جبریل کی حسین وجمیل صورت وہ صورت نہیں تھی (جو نظر آتی تھی) بلکہ ان کے چھ سو پر تھے جن سے انہوں نے آسمان کو گھیر رکھا ہے۔

نیز یہ کہ صحابۂ کرام نے قبیلہ بنی قریظہ کے راستے مین دحیہ بن خلیقہ کو ایک سفید خچر پر ان کی طرف مخاطب دیکھا تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر دی تو حضور نے فرمایا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ وہ جبریل تھے انہیں قبیلہ بنی قریظہ کی جانب بھیجا گیا تھا ان کے قلعوں کو لرزانے اور ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لئے اور اعرابی والی حدیث کہ ایک اعرابی نبیٔ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں آکر ایمان، اسلام، احسان، ساعت اور اس کی علامات کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کوئی ان کو نہیں پہچانتا تھا اور نہ ان پر سفر کا اثر محسوس ہوتا تھا، ان کے تیز سفید کپڑے اور سخت کالے بال تھے اور پھر آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ وہ جبریل تھے تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے' مشہور و معروف ہے نیز ان کا حضور کی بارگاہ میں حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صورت میں آنا کئی ایک مرتبہ ثابت ہے (حضرت جبریل پر درود وسلام ہو) تو امام نسائی صحیح مسند کے ساتھ حضرت ابی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جبریل نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں دحیہ کلبی کی شکل میں حاضر آیا کرتے تھے اور اس کو طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس دحیہ کلبی کی صورت مین آیا کرتے ہیں! اور اس باب میں روایات امہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ہیں۔

لہذا کسی بھی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کے جبریل ہونے میں شک کرے اس پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ کہ جبریل نہ اعرابی تھے نہ کلبی!! وہ تو صرف حضرت جبریل کی مختلف صورتوں میں تجلیات تھیں، جبریل ان صورتوں کے تعدد کی وجہ سے کئی ایک نہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صورتیں جبریل کے ماسوا کچھ دوسری اشیاء ہیں جو ان پر دلالت کرتی ہیں،

اسی کے متعلق میں کہتا ہوں:

وحدت قرآن پر اعلیٰ حضرت کے عربی اشعار

أجبريل من السدرة　　و آخر جاء من قرية

(کیا ایک جبریل سدرہ سے آئے تھے اور دوسرے گاؤں سے)

و ثالثهم عدا جملا　　و رابعهم غدا دحية

(۱) (اور تیسرے نے اونٹ کی شکل اختیار کی اور چوتھے دحیہ کلبی کی صورت میں ہو گئے)

فمنهم من له ذنب　　و منهم من له لحية

(تو ان میں سے کوئی تھا جس کی دم تھی اور ان میں سے کسی کی داڑھی تھی)

وهذا باطل قطعاً　　فلا يرضاه ذو نهية

(اور یہ (جبریل کا متعدد ہونا) قطعاً باطل ہے، تو کوئی عقلمند اس سے راضی نہ ہوگا)

ومع ذا وحدة الكل　　يقين ما به مرية

(باجود اس کے کہ سب کا ایک ہونا یقینی ہے کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں)

هو العادي على الغاوي　　هو الموحي بلا فرية

(وہ گمراہ پر حملہ کرنے والے ہیں اور وہ بلا کسی تہمت کے (اللہ کی جانب سے) وحی لانے والے ہیں)

تو مذکورہ بالا افادات برھان ہیں اور اس کے پیچھے اہل عرفان کا طور ہے، تو اہل حقائق ان دقائق کو خوب جانتے ہیں اور ہم پر ان کو تسلیم کرنا اور ''یقین کرنا واجب ہے۔

وحدت قرآن پر آیات قرآنیہ سے استدلال

اس کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذکر حکیم (قرآن عظیم) کی روشن آیتیں وحدت قرآن پر استدلال کرتے ہوئے نئے اسلوب میں بیان فرماتے ہیں:

اللہ عزوجل فرماتا ہے﴿واذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا لعلكم ترحمون﴾ (الاعراف: ٢٠٤)
اللہ فرماتا ہے﴿لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه و قراٰنه فاذا قراٰنه فاتبع قراٰنه﴾ (القيامة: ١٦۔١٨)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿ فاقرأوا ما تيسر من القراٰن﴾ (المزمل: ٢٠)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے﴿ولقد يسرنا القراٰن للذكر فهل من مدكر﴾ (القمر: ١٧)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے﴿ بل هو اٰيت بينٰت فى صدور الذين اوتوا لعلم﴾ (العنكبوت: ٤٩)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿ و انه لفى زبر الاولين﴾ (الشعراء: ١٩٦)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿ فى صحف مكرمة مرفوعة مطهرة﴾ (عبس: ١٣۔١٤﴾
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿بل هو قراٰن مجيد فى لوح محفوظ﴾ (البروج:٢١۔٢٢)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿ انه لقراٰن كريم فى كتب مكنون لا يمسه الا المطهرون﴾ (الواقعة: ٧٧۔ ٧٩)
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿نزل به الروح الا مين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربى مبين﴾ (الشعراء: ١٩٣۔ ١٩٥)وغيره ذالك آيات۔

قارئین کرام مذکورہ بالاآیتوں میں غور فرمائیں کہ اسی کو کہیں مقرو ٹھہرایا، کہیں مسموع قرار دیا، کہیں محفوظ کہا، کہیں مکتوب فرمایا، اوراسی میں اس کو قرآن اور کلام رحمان کہا گیا۔اس کو بیان فرمانے کے بعد آپ اپنے کلام کو علمائے اعلام کے اقوال سے مؤکد فرماتے ہیں اوراس دعوے کا رد کرتے ہیں جو تعدد کو مفید ہے اشتراک کی وجہ سے کلام کو نفسی اور لفظی پر اشتراک اور حقیقت ومجاز کے ذریعہ محمول کر کے۔ پھر آپ اپنے کلام کو اس بحث میں قول فیصل سے ختم فرماتے ہیں:

ائمۂ کرام کی عبادات سے استدلال

سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ " الفقہ الاکبر "میں فرماتے ہیں قرآن مصاحف میں مکتوب ہے قلوب میں محفوظ ہے، زبانوں سے پڑھا جاتا ہے، نبیٔ اکرم ﷺ پر (تدریجاً) اتارا گیا ہے، اور ہمارا قرآن کے کلمات کو تلفظ کرنا مخلوق ہے، ہمارا اس کو لکھنا اور ہمارا اس کو پڑھنا مخلوق ہے مگر قرآن مخلوق نہیں۔

(امام اعظم) رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے وصایا میں فرماتے ہیں ہم اقرار کرتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی وحی ہے اس کا اتارا ہوا ہے اس کی صفت ہے، نہ وہ عین ذات ہے نہ غیر ذات بلکہ تحقیقی طور وہ اس کی صفت ہے، مصاحف میں مکتوب ہے، زبانوں سے پڑھا جاتا ہے سینوں میں محفوظ ہے بغیر ان میں حلول کئے (آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان تک) اور اللہ تعالیٰ معبود ہے اور وہ اپنی شان پر جس پر وہ ازل سے تھا دائم و قائم ہے اور اس کا کلام پڑھا جاتا ہے ،مکتوب ہے محفوظ ہے بگیر اس سے جدا ہوئے۔ الخ

عارف باللہ سیدی علامہ عبدالغنی نابلسی حنفی قدس سرہٗ القدسی ' المطالب الوفیة' میں فرماتے ہیں:

ہرگز نہ گمان کیا جائے کہ کلام اللہ تعالیٰ دو ہیں: ایک پڑھے جانے والے الفاظ اور دوسرا صفت قدیم جیسا کہ اس کا گمان ان بعض لوگوں نے کیا جن پر فلاسفہ اور معتزلہ کے اصطلاحات غالب آ گئے تو ان لوگوں نے اللہ کے کلام کے بارے مین وہ کچھ کہا جس کی طرف ان کی عقلوں نے انہیں پہنچایا اور انہوں نے کلام اللہ کے ایک ہونے پر سلف صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اجماع کی مخالفت کی، ان کا اس پر اجماع ہے کہ کسی بھی حال میں اس کے لئے تعدد نہیں، وہ ہی ہمارے پاس ہے (اس کی تجلیات) اور وہی قرآن اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور نہیں ہے وہ جو ہمارے پاس ہے اس کا غیر جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور نہیں ہے وہ جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم اس کا غیر جو ہمارے پاس ہے بلکہ وہ صفت واحدہ قدیم ہے جو موجود ہے اللہ تعالیٰ کے پاس بغیر کسی آلے کے کہ وہ وجود میں اس آلہ کا محتاج ہو اور وہ بعینہ ہمارے پاس موجود ہے لیکن (ہمارے پاس جو موجود ہے وہ) آلات کے سبب سے ہے وہ آلات ہمارا پڑھنا ہے، ہمارا لکھنا ہے، ہمارا حفظ کرنا ہے، تو جب ہم ان حروف قرآنیہ کو پڑھتے ہیں لکھتے

ہیں، یاد کرتے ہیں تو وہ صفت قدیمہ جو اللہ تعالیٰ جو کی ذات کے ساتھ قائم ہے جو اس کے پاس ہے وہی بعینہ ہمارے پاس جلوہ گر ہوتی ہے بغیر بدلے اس سے جو باری تعالیٰ کی صفت ہے اور نہ باری تعالیٰ سے جدا ہوئے اور نہ ہی ہم سے متصل ہوئے بلکہ وہ تو اسی حال پر ہے جس پر وہ ہمارے پڑھنے، لکھنے اور حفظ کرنے سے پہلے تھی۔ (ان کے آخری کلام تک جس کو انہوں نے طول دیا اور اچھے سے دیا، ان پر عطا کرنے والے بادشاہ حقیقی کی رحمت ہو)

موصوف (علامہ نابلسی) قدس سرہٗ "الحديقة الندية" کے باب اول کی فصل اول کی نوع اول میں فرماتے ہیں: جب تم نے یہ بات جان لی تو تم پر اس کے قول کا فساد ظاہر ہو گیا ہوگا جس نے کہا: اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کا اطلاق اشتراک وضعی کی وجہ سے دو معنیٰ پر ہوتا ہے، (۱) صفت قدیمہ پر (۲) دوسرا اس مجموعے پر جو حروف اور کلمات حادثہ سے مرتب ہے، (اس قول کا فساد اس لئے ظاہر ہے) کیوں کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں عقیدۂ شرک تک پہنچانے والی ہے نیز یہاں نبیٔ اکرم ﷺ کا اس حدیث (۱) میں قرآن کی طرف اشارہ فرمانا بھی اس بات کو مفید ہے کہ قرآن ایک ہے اس میں اصلاً کوئی تعدد نہیں اور وہی صفت قدیمہ اور وہی مکتوب ہے مصاحف میں وہی پڑھا جاتا ہے زبانوں سے، وہی محفوظ ہے قلوب میں، بغیر ان میں سے کسی شئی میں حلول کئے، اور جو ان باتوں کو ہمارے بیان کردہ کے مطابق نہ سمجھ سکے، اس پر دشوار ہونے کی وجہ سے، تو اس پر ایمان بالغیب واجب ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی باقی صفات پر بن دیکھے ایمان رکھتا ہے اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مصاحف، قلوب اور زبانوں میں جو ہے اس کو حادث کہے۔۔۔ (ان کے آخری قول تک جو انہوں نے افادہ فرمایا اور خوب فرمایا، ان پر بادشاہ بخشندہ کی رحمت ہو۔)

(۱)۔ وہ حدیث یہ ہے: ''بے شک اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے''، اس حدیث کو ابن شیبہ اور طبرانی نے ''الکبیر'' میں، ابو شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے)

امام اجل عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی شافعی قدس سرہٗ اپنی کتاب "ميزان الشريعة الكبرىٰ" میں فرماتے

ہیں: اہل سنت و جماعت نے اس کو (یعنی جو مصحف میں مکتوب ہے) حقیقتاً اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دیا ہے اگر چہ اس کا تلفظ کرنا ہماری جانب سے واقع ہوتا ہے، لہذا اس کو سمجھو اور اس سے زیادہ نہ بیان کیا جاتا ہے نہ کسی کتاب میں مسطور ہے۔اھ

اور آپ ہی نے " الیواقیت الجواھر فی عقائد الاکابر " کی سولہویں بحث میں فرمایا: وحی کا الفاظ میں ظاہر ہونا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت دحیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے، اس لئے کہ جبریل جس وقت کہ اس صورت میں ظاہر ہوئے نہ بشر محض تھے اور نہ محض فرشتہ اور نا ہی انسان اور فرشتہ ایک ساتھ تھے ایک حالت میں، تو جس طرح دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ان کی صورت بدلی تھی حالانکہ ان کی وہ حقیقت نہ بدلی جس پر کہ وہ پہلے سے تھے! تو اسی طرح کلام ازلی اور امر الٰہی، متمثل ہوتا ہے کبھی زبان عربی میں، کبھی زبان عبرانی میں اور کبھی سریانی زبان میں حالاں کہ وہ کلام، ذات باری تعالیٰ میں شئی واحد ہے ازلی ہے۔اھ

سیدی محی الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کتاب " فتوحات '' کے باب الاسرار میں فرماتے ہیں اگر (بفرض محال) قدیم، حادث میں حلول کرے تو خدا کا جسم ٹھہرانے والوں کی بات درست ٹھہرے گی (جبکہ) قدیم (کسی بھی حادث میں) نا حلول کرتا ہے اور نا ہی محل حوادث ہوتا ہے۔قرآن کا ذکر امان ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے کہ وہ کلام الرحمان ہے باوجودیکہ اس کے حروف زبان میں ایک دوسرے سے منقطع ہوتے ہیں اور اس کے نظم کئے ہوئے حروف اس میں جلوہ گر ہیں جو ہاتھوں اور قلموں سے لکھا گیا ہے تو الواح و اقلام حادث ہیں (لیکن) کلام حادث نہیں اور عقلوں پر اوہام حاکم ہیں۔اھ

''شرح فقہ اکبر'' جو کہ منسوب ہے امام سنت، علم ہدایت ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی جانب، حالاں کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے (اس کے مصنف کو)، اس میں مذکور ہے: کلام الٰہی کو، مصاحف میں مکتوب کے ظاہر ہونے کی وجہ سے، انفصال سے موصوف نہیں کیا جاسکتا اور ہم اس بات کا قول نہیں کرتے کہ کلام الٰہی، مصاحف میں حلول کئے ہوئے ہے کہ (اس قول کی وجہ سے پھر) انفصال اور ذات باری سے کلام کے زائل ہونے کا قول کرنا پڑے! اس

امر پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ اگر مکتوب، کلام اللہ نہ ہوتو ضرور وہ کلام بندوں کے درمیان معدوم ہوگا تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے کلام کوفوت کرنے کی طرف لے جائیگی۔اھ

کتاب " الابانة عن اصول الدين " جس کانسخہ،امام سنت ابوالحسین اشعری رحمہ اللہ کی جانب منسوب ہے، (اللہ بہتر جانتااس کے بارے میں)،اس کتاب میں ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ ہمیں بتاؤ کیاتم لوگ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام،لوح محفوظ میں ہے؟ تواس سے کہا جائے گا ، ہاں ہم یونہی کہتے ہیں،اس لئے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے﴿بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ﴾ (البروج: ٢١-٢٢)

توقرآن لوح محفوظ میں ہےاوروہی ان کے سینوں میں ہے جن کوعلم دیا گیا،اللہ عزوجل فرماتا ہے ﴿ بل هو آيٰت بينٰت في صدور الذين اوتوا العلم﴾ (العنكبوت: ٤٩) اوروہی تلاوت کیا جاتا ہے زبانوں سے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے﴿لا تحرك به لسانك﴾ (القيامة: ١٦)اورقرآن ہمارے مصاحف میں مکتوب ہے حقیقتا،محفوظ ہے ہمارے سینوں میں حقیقتا،متلو ہے ہماری زبانوں سے حقیقتا، ہمارے لئے مسموع ہے حقیقتاً،جیسا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿ فاجره حتى يسمع كلم الله ﴾ (التوبة:٦)

اورایک فرقے نے یہ قول کہ "ہم نے قرآن کا تلفظ کیا" صرف اس لئے کہا تا کہ یہ فرقہ ثابت کرے کہ (قرآن مخلوق ہےاورتا کہ اپنی بدعت کواورقرآن کے مخلوق ہونے کے قول کومزین کرے (دلیل سے)اورانہوں نے اپنے کفرکوان سے چھپایا جوان کے قول کے معنیٰ پر مطلع نہیں،اور پھر جب ہم ان کے مافی الضمیر پر مطلع ہوئے تو ہم نے ان کی بات کا رد کیا،لہذا یہ کہنا جائزنہیں کہ قرآن کی کوئی بھی شئ مخلوق ہے،اس لئے کہ قرآن پورا کا پورا غیرمخلوق نہیں یہ کہنا جائزنہیں۔اھ مختصراً

امام نسفی فرماتے ہیں،جیسا کہ " المطالب الوفية "میں ان سے منقول ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے،اس کی صفت ہےاوراللہ تبارک وتعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ ایک ہے قدیم ہے،نہ وہ حادث ہےاورنہ مخلوق،بغیرحروف واصوات کے ہے،محل قطع اور مقام آ گاز کلام سے منزہ ہے نہ وہ عین ذات نہ غیرذات،اوروہی پڑھا جاتا ہے زبانوں

سے، محفوظ ہوتا ہے دلوں میں، مکتوب ہوتا مصاحف میں حالاں کہ قرآن مصاحف میں رکھا ہوا نہیں۔اھ

" عقیدۃ الطحاوی" کے شارح فرماتے ہیں جیسا کہ ان سے " منح الروض الازھری" میں منقول ہے کہ جس نے کہا وہ جو مصاحف میں مکتوب ہے کلام اللہ تعالیٰ سے عبارت ہے یا کلام الٰہی کی حکایت ہے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کلام متجلی نہیں' ' تو اس شخص نے کتاب وسنت اور اسلاف امت کی مخالفت کی۔اھ

" اکنز العقائد شرح بحر العقائد" میں مرقوم ہے کہ قرآن کے کسی صورت میں ظاہر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ذی صورت بھی ہو، کیا اس میں غور نہیں کرتے کہ اس کا کلام نفسی کتابت میں، الفاظ میں تخیل میں ظاہر ہوا باوجودیکہ اس کے لئے ان صورتوں میں سے جن میں وہ ظاہر ہوا، کوئی صورت نہیں ہے۔اھ

"جمع الجوامع" میں مذکور ہے: قرآن کلام الٰہی ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، غیر مخلوق ہے اور وہ باوجود اس کے حقیقتاً ہے نہ کہ مجازاً، ہمارے مصاحف میں مکتوب ہے، ہمارے سینوں میں محفوظ ہے، ہماری زبانوں سے پڑھا جاتا ہے۔اھ

اور اللہ کی نعمت لاحق ہوا اس کے دو بندوں کو یعنی قاضی عضد الدین صاحب "مواقف" اور علامہ سید شریف جو اس کتاب کے شارح ہیں، تو اول الذکر نے مذہب حق میں ایک مستقل مقالہ تصنیف فرمایا، جس میں انہوں نے اجماع اسلاف کی اتباع کی اور ثانی الذکر نے ان کی تائید کی اور ان کے بازوؤں کو تقویت پہنچائی " شرح مواقف" میں باجودیکہ یہ دونوں "مواقف" اور" شرح مواقف" میں ان نو پید لوگوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

سید شریف قدس سرہ فرماتے ہیں: جاننا چاہئے کہ مصنف کا کلام الٰہی کی تحقیق میں ایک منفرد مقالہ ہے اس کے موافق جس کی طرف کتاب کے خطبے میں انہوں نے اشارہ کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ''معنیٰ'' کا اطلاق کبھی لفظ کے مدلول پر ہوتا ہے اور کبھی اس امر پر ہوتا ہے جو قائم بالغیر ہو، تو امام اشعری نے جب کہا کہ کلام الٰہی وہ معنیٰ نفسی ہے تو اس قول سے ان کے اصحاب نے سمجھا کہ ان کی مراد صرف لفظ کا مدلول ہے اور وہ قدیم ہے ان کے نزدیک، رہے عبارات! تو ان کو کلام مجازاً کہہ دیا جاتا ہے اس وجہ سے کہ یہ اس پر دلالت کرتے ہیں جو کلام حقیقی

ہے یہاں تک ان کے اصحاب نے تصریح فرمائی کہ الفاظ قرآن ان کے مذہب پر بھی حادث ہیں، لیکن وہ حقیقتاً کلام الٰہی ہیں۔ یہی وہ معنیٰ ہے جس کو انہوں نے اپنے شیخ (امام اشعری) کے کلام سے سمجھا ہے جس سے بہت سارے فاسد امور لازم آتے ہیں جیسے مصحف کے دوجلدوں کے درمیان جو ہے اس کے کلام ہونے کے منکر کی تکفیر نہ کرنا، جبکہ اس کا حقیقتاً کلام اللہ تعالیٰ ہونا معلوم ہے امور دین سے ضرورتاً اور جیسے اللہ کے کلام حقیقی کے ذریعہ کافروں سے طلب معارضہ اور مقابلہ نہ کرنا اور جیسے کہ وہ جو پڑھا جاتا ہے اور محفوظ ہے وہ حقیقتا کلام الٰہی نہیں۔ وغیرہ ذالک ان مفاسد امور میں سے جو ذہین وفطین پر پوشیدہ نہیں، لہذا واجب ہے کہ شیخ (امام اشعری) کے کلام کو اس پر محمول کیا جائے کہ ان کی مراد معنیٰ ثانی ہے۔ تو ان کے نزدیک کلام نفسی ایسا امر ہو جائیگا جو لفظ ومعنیٰ دونوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور وہ مکتوب ہے مصاحف میں، پڑھا جاتا ہے زبانوں سے، محفوظ ہے سینوں میں، حالانکہ وہ کتابت اور قرأت اور حفظ جو کہ حادث ہیں، کا غیر ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حروف والفاظ ترتیب وار پے در پے یکے بعد دیگر آتے ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ترتیب تو صرف تلفظ میں ہے، آلات (زبان، وغیرہ) کے نامساعد ہونے کے سبب تو تلفظ کرنا حادث ہے اور وہ دلیلیں جو حدوث پر دلالت کرتی ہیں ان کو حدوث پر محمول کرنا واجب ہے نہ کہ ملفوظ کو حدوث پر، دلیلوں کے درمیان تطبیق دینے کے لئے اور یہ جو ہم نے ابھی ذکر کیا اگرچہ ہمارے اصحاب متاخرین کے مخالف ہے مگر بعد تامل تم اس کی حقیقت کو جان لوگے۔ ان کی گفتگو (یہاں) ختم ہوئی۔

اور شیخ (امام اشعری) کے کلام کا یہ گوشہ ان میں سے ہے جس کو شیخ محمد شہرستانی نے اپنی کتاب "نهاية الاقدام" می ں اختیار کیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے کلام کا یہ پہلو احکام ظاہر یہ سے زیادہ قریب ہے جو "قواعد الملت" کی طرف منسوب ہیں۔ اھ

موصوف (شیخ عضدالدین) رحمہ اللہ "مواقف" کے خطبے میں فرماتے ہیں: اور اتاری اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آپ ﷺ کے ساتھ عربی روشن کتاب اور اپنے بندوں کے لئے ان کا دین کامل کیا، اور آپ ﷺ پر اپنی نعمت

تمام کردی اوران کے لئے پسند فرمایا دین اسلام کواور (اس نے نازل کیا) کتاب کریم قرآن قدیم کو غایات اور مواقف والا (یعنی اس کی انتہا اور غایت ہوتی ہے جہاں قاری رکتا ہے اور جہاں وقف کرتا ہے، یعنی اس کو ختم ہونے والا اور محل وقف والا بنایا ہے) جو محفوظ ہے قلوب میں، پڑھا جاتا ہے زبانوں سے، مکتوب ہے مصاحف میں۔اھ

سید (شریف) قدس سرہٗ (اس کی شرح میں) فرماتے ہیں انہوں نے قرآن کو قِدَم سے موصوف کیا پھر ایسے مضمون سے تصریح کی جواس پر دال ہے کہ قرآن ہی عبارات منتظمہ ہے جیسا کہ یہ سلف کا مذہب ہے، اس طرح کہ اسلاف نے فرمایا ہے کہ حفظ، قرأت اور کتابت حادث ہے، لیکن ان کا متعلق یعنی محفوظ، مقرو اور مکتوب قدیم ہے اور وہ جو یہ وہم ہوتا ہے کہ کلمات وحروف کا ترتیب اور غایات ووقوف کا پیش آنا۔ ان میں سے ہیں جو حدوث پر دلالت کرتے ہیں تو یہ وہم باطل ہے، اس لئے کہ وہ سب قرأت اور پڑھنے کے آلات کے قصور کی وجہ سے ہے۔

اور رہی وہ بات جو شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشہور ہوگئی ہے کہ قدیم ایسا معنیٰ ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، جس کی تعبیر ان عبارات حادثہ کے ذریعہ فرمائی گئی ہے؟ تو کہا گیا ہے کہ ناقل کی غلطی ہے، اس کا منشا لفظ ''معنیٰ'' کا مشترک ہونا ہے دو امر میں پہلا وہ مفہوم جو لفظ کے مقابل ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو قائم بالغیر ہوتا ہے اور اس کی زیادہ وضاحت انشاء اللہ تعالیٰ بعد میں عنقریب کی جائے گی۔اھ

(علامہ) حسن چلپی نے فرمایا عنقریب شارح اثنائے بحث کلام میں مصنف کے مذہب کو ثابت کریں گے اس کے مطابق جو کلام مصنف بتا رہا ہے یہاں کہ مصنف کا مذہب وموقف اسلاف کے موافق ہے اور اسی پر شرح مختصر میں تصریح ہے۔اھ

مقصد سابع کے شروع میں، اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ شرع مطہر سے ثابت ہے کہ کلام صفت باری تعالیٰ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اس کے مطابق جو کلام لفظی کے بارے میں اسلاف کی آرا ہے۔اھ

جد کریم امام احمد رضا قدس سرہٗ پھر آ گے "فواتح الرحموت" سے جو نقل کیا گیا ہے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب "مواقف" سے جو نقل کیا گیا ہے اس میں ایک طرح کی اس مضمون کی مخالفت اور مغایرت ہے جو میر سید شریف نے ان سے نقل کیا، (امام احمد رضا قدس سرہٗ) اس پر فرماتے ہیں کہ (یہ مغایرت) ہمیں ضرر نہ دے گی اس لئے کہ ہمارا مقصد یعنی وحدت کلام الٰہی اور نفسی قدیم اور لفظی حادث کی طرف اس کی تقسیم کا بطلان دونوں صورتوں میں حاصل ہے (ص:۲۸۶)

پھر "فواتح الرحموت" میں جو کلام میں احتمالات بیان ہوئے، آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس پر یہ کہتے ہوئے کلام کرتے ہیں: یہ جو شقیں اور احتمالات ذکر کئے گئے ہیں کہ کلام یا تو لفظی میں یا نفسی میں یا دونوں معنیٰ میں حقیقت ہے، تو اس پر میں کہتا ہوں کہ اس کی چوتھی شق ہے اور وہ یہ کہ کلام ان دونوں میں مشترک ہے، بطور اشتراک معنوی، لہذا وہ اس معنیٰ میں حقیقت ہے جو دونوں معنی کو عام ہے۔

اور اس کے بعد امام موصوف نے علامہ ابن ہمام اور علامہ تفتازانی اور ملا علی قاری کی اختیار کردہ شق پر عمدہ تعلق فرمائی اس کا بیان تفصیلی ہے حالاں کہ ہمیں اس کو ذکر کرنے سے امام احمد رضا قدس سرہٗ کے اس کلام نے مستغنی کر دیا جو موصوف نے شروع سے لے کر یہاں تک بیان فرمایا ہے، خاص طور سے وہ کلام جو آپ نے "فواتح الرحموت" سے نقل فرمایا۔ لہذا ہم ان باتوں کو ذکر کرنے میں مشغول نہ ہوں گے جن میں آپ نے (امام احمد رضا نے) ان کو خاطی ٹھہرایا ہے جیسا کہ ہم اس کو بیان کر کے مزید کلام کو طول نہ دیں گے جس پر علامہ باجوری نے "شرح الجوهرة" اور "شرح البردة" میں اپنا کلام ختم کیا ہے! حالاں کہ اس پر تنبیہ ہماری جانب سے ما سبق میں گزر چکی کہ ان کے کلام میں تضاد ہے۔ (فتذکر)

خلاصۂ کلام

اور اب مناسب معلوم دیتا ہے کہ قول فیصل اور خلاصۂ کلام، اس موقعہ پر ہم بیان کر دیں تا کہ وہ اس بحث کو اذہان سے قریب کر دے اور اس کو یاد کرنا آسان ہو جائے، امام ہمام احمد رضا قدس سرہ اپنے رسالۂ مبارکہ کے اختتام میں

تصریح فرماتے ہیں:

حاصل معنیٰ: یہ کہ تو مجھ سے یہ چند روشن اور واضح کلمات ذہن نشین کر لے، یہ تجھے اس دن کام آئیں گے جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے، مگر جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قلب سلیم لے کر حاضر آئے گا، (وہ کلمات یہ ہیں کہ) اگر تو کہے کہ جبریل نو پید ہوئے ابھی ابھی اونٹ کے نو پید ہونے سے یا وہ جب سے موجود ہیں اونٹ ہی ہیں تو تو کھلی گمراہی میں پڑا اور اگر تو کہے کہ اونٹ جبریل نہ تھے بلکہ کوئی دوسری شئی تھی جو ان پر دلالت کر رہی تھی! تو تو نے کھلی بہتان تراشی کی، بلکہ تو یوں کہہ کہ یقیناً وہ جبریل تھے اونٹ کی صورت میں متشکل تو اسی طرح اگر تو یہ گمان کرے کہ مکتوب اور مقرو کے حادث ہونے کی وجہ سے قرآن حادث ہے یا وہ ازل سے اصوات ونقوش ہی تھا تو بلا شبہ تو نے حق سے خطا کی اور اگر تو نے یہ گمان کیا کہ مکتوب اور مقرو اللہ تعالیٰ کا کلام ازلی نہیں بلکہ کوئی دوسری شئی ہے جو اس تک پہنچاتی ہے (اور اس کے معنیٰ ادا کرتی ہے) تو تو نے بہت بڑی تہمت لگائی، بلکہ یوں کہہ کہ وہ تحقیقی طور پر قرآن ہی ہے جو ان میں جلوہ گر ہے۔

اور اسی طرح جب جب تجھے اس مقام پر شبہ لاحق ہو تو اس کو ''حدیث جمل'' (یعنی اونٹ والا قصہ کہ جبریل امین نے اونٹ کی شکل اختیار کی تھی) پر پیش کر تیرے لئے حالت روشن ہو جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ المهیمن المتعال (انوار المنان: ص ۳۰۳)

ختم شد

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

فصل سادس کے پانچویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۲)لم تقترن بزمان وهی تخبرنا عن المعاد و عن عاد وعن ارم

(ترجمہ: (آیات حقہ) کسی مخصوص زمانے کے ساتھ مقترن نہیں اس کے باوجود بھی وہ ہمیں احوال آخرت، قصۂ عاد اول اور قصۂ عاد ثانی یعنی ارم کی خبریں دیتی ہیں۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے چاہا کہ گزشتہ شعر میں جو آیات کی تعریف بیان ہوئی کہ وہ قدیم اور موصوف بالقدم کی صفت ہے، (تو اس شعر میں) اسی معنیٰ کو تاکید کے اسلوب میں مزید پختہ کردیا جائے قِدَم کی تفسیر اور معنیٔ جدید کی تاسیس سے متضمن، تو وہ یوں کہتے ہیں:

لم تقترن بزمان وهی تخبرنا عن المعاد و عن عاد وعن ارم

یعنی کسی مخصوص زمانے کے ساتھ مقترن نہیں ہوتی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کی وہ کیفیت جو مبادی (آیت کے مقامات آغاز) اور مقاطع (آیات کے مقامات وقف وقطع) کی جلوہ گاہوں میں متجلی ہے اور قرآن کے مقامات آغاز اور وقف وہ آیتیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا ہیں پے در پے مترتب آتی ہیں جو کہ حادث ہے (تو اللہ تعالیٰ کا کلام ترتب وتعاقب اور انفصال سے پاک ہے، ہاں اللہ کا کلام وہ ہے جو ان میں متجلی ہے اور کسی زمانۂ مخصوص کے ساتھ مقترن نہیں) یعنی وہ جو نبیٔ کریم ﷺ پر نازل ہوا وہ یہی صفت قدیمہ ہے جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا، لہذا نہ وہ مسبوق بالعدم ہے اور نہ معدوم ہو (یعنی نہ اس پر کبھی عدم طاری ہوا اور نہ کبھی ہوسکتا ہے) اور اس کے قدیم ہونے کے لوازم میں سے یہ ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ مقترن نہ ہو اور قرآن پاک ایک ہے جس میں اصلاً کوئی تعدد نہیں جیسا کہ ان آیات کریمہ اور نصوص صریحہ سے مستفاد ہے جو کہ ماسبق میں ہم نے امام احمد

رضا قدس سرہٗ کی کتاب" انور المنان فی توحید القرآن " سے قارئین کو پڑھ کر سنایا۔
اور یہی صفت، ان تمام باتوں کے باوجود، اخبار کے ظاہر ہونے کے مقامات میں متجلیٰ ہے تو وہ ہمیں عاد وارم کے قصے سناتی ہے اور ہر اس بات کی خبر دیتی ہے جو دنیا میں ہوا اور آخرت میں ہوگا۔
اور ناظم فاہم کی جانب سے اس شعر اور ماقبل شعر میں یہ قول اس بارے میں صریح ہے کہ وہ اسلاف کے طریقے پر گامزن ہیں اسلاف کا مسلک یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو غیر مخلوق ہے اور وہ ایسا ہی پڑھا جاتا ہے، مکتوب ہے محفوظ ہے، نبی کریم ﷺ پر اتارا گیا ہے وہ لباسوں کے تعدد اور جلوات کے تکثر سے متعدد نہیں ہوا، اور اسی وجہ سے شاعر ذی فہم نے اپنے اس قول " صفة الموصوف بالقدم "کو 'آیات' پر محمول کیا تا کہ اس جانب اشارہ ہو کہ وہ اپنی ذات کی تعریف میں صفت بسیطہ ہے جو متجلی ہے ذکر کردہ مختلف جلوہ گاہوں میں جو ذات قدیم سبحانہ و تعالیٰ سے جدا نہیں اور نہ ہی کسی حادث میں حلول کئے ہوئے ہے، جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ثابت ہو چکا اور اس لئے بھی تا کہ میں قارئین کرام کے لئے امر محسوس سے مثال بیان کرسکوں جو ذہن کو معنیٰ معقول کے قریب کردے، اگر چہ وہ مثال سے بلند و بالا ہے اور اس کے لئے مثل اعلیٰ ہے اور اس کے مثل کوئی شئی نہیں وہی برتر و بالا ہے!

امر محسوس سے مثال

ذرا دیکھو تو اس آئینے کو جس میں، سورج کی شعائیں اور صورتوں کا عکس پلٹتا ہے، اس کے مقابل ہونے سے تو کیا سورج اور صورتیں اپنی جگہ اور محل سے ہٹ کر آئینے میں حلول کر گئیں یا سورج کئی ایک ہو گئے کہ ایک آسمان میں ہو اور دوسری آئینے میں، یا ذی صورت شئی متعدد ہوگئی کہ ایک شئی اپنی جگہ پہ ہو اور اس کے ماسوا دوسری شئی آئینے میں؟ ایسا ہرگز نہیں، سورج متعدد نہ ہوا بلکہ وہ تو جیسا تھا ویسا ہی وسط آسمان میں رہ کر آئینے میں متجلی ہوا اور اس کی شعاؤں کا ایک سرا آسمان میں رہا اور دوسرا سرا شعاؤں میں سے آئینے میں رہا، تو وہ نہ اپنی جگہ سے ہٹا اور نہ ہی آئینے میں حلول کیا۔ اسی طرح صورت والی شئی وہ وہی ہے ایک اپنی حد ذات میں اور وہی بغیر انفکاک اور حلول کئے آئینے میں متجلی ہے، اسی طرح قرآن قدیم کی صفت واحدہ ہے جو کسوات (لباسوں) کے تغیر سے نہ متغیر ہوا اور

نہ ہی تعینات کے حدوث سے حادث ہوا (اور اللہ ہی سے لغزشوں سے حفاظت ہے اور اسی سے استقامت وثابت قدمی کی توفیق ہے)

شریعت محمدیہ بھی کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں

یہ ایک بات ہوگئی اور دوسری بات یہ کہ ناظم کے اس قول" لم تقترن" میں ایک دوسرے معنیٰ کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ آقا علیہ السلام کی شریعت مطہرہ جس کو قرآن لایا وہ کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں جیسا کہ ہم سے پہلی شریعتیں (کہ صرف ایک مخصوص زمانے کے ساتھ مختص ہوتی تھیں) اس لئے کہ وہ ان کے ساتھ مخصوص تھیں، لیکن رہی ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت تو اس نے اپنے سے پہلے شریعتوں کو منسوخ کر دیا اور وہ باقی رہے گی اور اس پر عمل ہوتا رہے گا یہاں تک کہ سیدنا عیسیٰ (علی نبینا و علیه السلام) اتریں گے اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کی شریعت پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور ہمارے نبی کی امت میں سے ایک ہوں گے اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کو باقی رکھنا چاہا تو اس نے اس کتاب کو جس کو آپ ﷺ پر اتارا، حفظ سے جمع کر دیا پھر اس کو تغیر سے محفوظ کر دیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿انا نحن نزلنا الذكر و انا له لحفظون﴾ (الحجر: ۹) اور یہی معنیٰ مناسب ہے اس سے جس کی تصریح ناظم عنقریب اس سے متصل اس شعر میں کریں گے "دامت لدينا الخ" اور یہ شعر بیان کے بعد بیان ہے اس اشارے کا جس کو ناظم کا یہ قول" لم تقترن" متضمن ہے، تو ہمارے نبی اکرم ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں تو ان کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ کی کتاب تمام لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے تو اس کے بعد کوئی کتاب نہیں! لہذا اس شعر کے بعد ناظم کا قول اس کا بیان ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا، ورنہ تو ہر حادث کسی نہ کسی زمانے سے ملا ہوا ہوتا ہے اور قدیم ہر زمانے کے ساتھ۔

اور یہ بات آپ سے چھوٹ نہ جائے کہ شعر کی اس معنیٰ سے شرح جو ہم نے ثابت کیا، اسلاف کے مذہب کے زیادہ موافق ہے جو کہ ماسبق میں ثابت ہو چکا اور یہی معنیٰ زیادہ مناسب ہے معنیٔ وحدت قرآن کے جو کہ نفس شعر

سے مستفاد ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا، تو آیات کی صفت قدیمہ سے تفسیر کرنا جیسا کہ ہم نے کی زیادہ بہتر ہے تفسیر بالمعانی کرنے سے جیسا کہ بعض شارحین اس طرف مائل ہوئے۔

بیان اعراب:۔ (لم تقترن) یہ آیات کی صفت کے بعد صفت ہے یا ''قدیمۃ'' میں ضمیر مستتر سے حال واقع ہے اوراس میں (ہی کی پوشیدہ) ضمیر 'آیات' کی ہے۔(بزمان) یہ متعلق ہے "لم تقترن" سے۔اور متکلمین کے نزدیک زمانہ نام ہے اس متجد دمعلوم کا جس سے دوسرے متجد دکو قیاس کیا جائے جو کہ موہوم ہے۔

(وھی) میں واو حالیہ ہے اور 'ھی' مبتدا ہے اور ضمیر راجع ہے،'آیات' کی طرف اور جملہ (تقترن) اس کی خبر ہے اور پورا جملہ اسمیہ محل نصب میں 'لم تقترن' کے فاعل سے حال واقع ہے۔

(عن المعاد و عن عاد و عن ارم) ان میں سے ہر ایک متعلق ہے" تخبرنا" سے اور لفظ 'عن' کو مذکورہ تینوں مقام پر مکرر لائے اس لئے کہ وہ تینوں (یعنی معاد، عاد اور ارم) انواع مختلفہ ہیں، تو ان کو ایک ہی میں جمع بہتر نہیں اور اس لئے بھی کہ ان میں ہر ایک کے الگ الگ واقعات ہیں جو اس کے ساتھ ہی مخصوص ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو وزنِ شعر کی وجہ سے مکرر کیا گیا اور اس کا حسن یہ ہے کہ مقام مدح میں اطناب وتطویل اچھی مانی جاتی ہے۔

(المعاد) مصدر میمی ہے بمعنی 'عود' (لوٹنا) یعنی وہ مخلوق کے معدوم ہوجانے کے بعد ان کے لوٹنے اور عود کرنے کی خبر دیتی ہے تو 'معاد' کا معنیٰ مخلوق کا دار آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف واپس آنا، دار دنیا میں معدوم ہوجانے کے بعد، اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وھو الذی یبدؤ الخلق ثم یعیدہ) اور اللہ فرماتا ہے (کما بدانا اول خلق نعیدہٗ)

حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد

(عن عاد) یعنی وہ آیتیں ہمیں اس قبیلہ عاد کی خبر دیتی ہیں جس کی طرف سیدنا ہود علی نبینا و علیہ الصلوٰہ و السلام مبعوث کئے گئے تھے اور آیات قصۂ عاد بیان کرتی ہیں۔ "عاد" یہ علاقۂ 'یمن' میں عرب

کا ایک قبیلہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سورۂ اعراف میں فرمان کے بموجب (والی عاد اخاهم هودا) اس کے علاوہ قرآن کی اور سورتوں میں سے۔

ان کا قصہ یہ ہے: قوم عاد عمان اور حضرموت کے درمیانی علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے کچھ بت تھے جن کو پوجا کرتے تھے، یعنی صداء'صمود' اور 'هباء' بتوں کو پوجتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک نبی حضرت ہود کو مبعوث فرمایا جو ان میں سب سے بہتر وافضل حسب ونسب والے تھے تو ان کی قوم نے انہیں جھٹلایا اور ان کی خوب شدت سے نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر تین سال بارش روک لی یہاں تک کہ یہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور اس زمانے میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب بھی ان پر کوئی بلا اور پریشانی اتر پڑتی تو پوری قوم، مسلم کافر سب مل کر بیت مکرم کی طرف متوجہ ہوتے اور اللہ تعالیٰ سے وسعت وکشادگی کی دعا کرتے، لہٰذا (حسب عادت) قوم عاد کے سر برآوردہ لوگوں میں سے ستر لوگوں نے مکہ کی طرف جانے کی طیاری کی، تو وہ مکہ میں داخل ہوئے اور ان کا رئیس قیل بن عتر تھا تو قیل نے یوں دعا کی ''اے اللہ قوم عاد پر پانی نازل فرما جو تو ان پر برسایا کرتا تھا'' تو اللہ تعالیٰ نے تین بادل ظاہر فرمائے، سفید، لال اور کالا اور پھر ندا کی آسمان سے اے قیل! اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے چن لے، وہ بولا میں کالا بادل چنتا ہوں اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ پانی والا ہے! وہ بادل ان کے ملک پہنچ کر گھر گیا، یہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے اور بولے یہ بادل ہم پر خوب برسے گا کہ اتنے میں ان پر اس بادل سے تیز وتند ہوا نکلی جس نے ان سب کو ہلاک کر دیا! اور حضرت ہود اور ان کے ساتھ کچھ مومنین نے نجات پائی۔

عاد ثانی یعنی ارم ذات العماد کا واقعہ

(عن ارم) اس کا عطف ہے یا تو قریب پر ہے یا بعید پر اور " ارم " سے مراد وہ " ارم ذات العماد " ہے جس کی قد وقامت ستون جیسی تھی اور وہ عاد ثانی کے لئے ثابت ہے اس لئے کہ قرآن ان کے قصے کے بارے میں بھی سورۂ فجر میں یوں خبر دیتا ہے ﴿ الم تركيف فعل ربك بعاد ارم ذات العماد التى لم يخلق مثلها فى البلاد ﴾

علامہ نیسا پوری نے اس آیت کی تفسیر میں ان کا قصہ ذکر فرمایا ہے جس کا اجمالی بیان یوں ہے کہ عاد بن ارم کے دو لڑکے تھے شداد اور شدید یہ دونوں پوری دنیا کے بادشاہ ہوئے پھر شدید مرگیا تو ساری بادشاہت شداد کے حصے میں آگئی اور اس کی عمر نو سو سال کی تھی، وہ مطالعۂ کتب کا بہت شوقین تھا، اس نے ایک دن جنت کے اوصاف پڑھ لئے تو اس کا نفس بہت خواہش مند ہوا اور اس کے دل میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ میرا گھر بھی جنت ہو اس جنت کی طرح جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے تو اس نے اپنے لشکر میں سے ایک گروہ اس غرض کے لئے روانہ کیا تاکہ وہ ایک ایسا صحرا تلاشیں جس کی آب و ہوا لطیف ہو، پتھروں سے خالی ہو، خوب پانی اور درختوں والا ہو، تو یہ لوگ چل پڑے اور انہوں نے ایک صحرا ڈھونڈ لیا جس طرح کہ اس نے ان کو بتایا تھا، سرزمین عدن میں، تو ان لوگوں نے اس کی خبر بھجوائی، (اطلاع پاتے ہی) شداد نے اپنے وزراء سے مختلف قسم کے جواہر اور سونا چاندی منگائے، چنانچہ ان لوگوں نے اتنا سونا چاندی جمع کیا کہ جس کا شمار نہیں! پھر شداد نے ان سب جواہرات کو اس سرزمین پر ایک لاکھ مزدوروں اور مستریوں کے ساتھ بھجوادیا، وہ اس کی دیوار کی تعمیر سے فارغ ہو لئے تو انہوں نے ہرے زبرجد اور لال یاقوت سے بنے ستونوں کو اس میں نصب کر دیا اور اس کے اوپر بہت سارے محل تعمیر کئے بالا خانوں کے اوپر بالا خانے سونے چاندی سے بنائے، اور کئی نشست گاہیں بنائے جس کے دروازے ایک دوسرے سے نظر آتے تھے اور ان معماروں نے بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کے لئے اس کے قلعے میں ایک خالص سونے کا محل تعمیر کیا اور بادشاہ کے ایک ہزار وزیر تھے لہذا قلعے کے اردگرد ایک ہزار محل بنائے، ہر وزیر کے لئے ایک محل، اور اس میں چاندی کی نہریں بنائیں جس میں دودھ، شراب اور شہد سے نہریں جاری کی گئیں، یہاں تک کہ یہ لوگ تین سو سال میں اس کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تب شداد اپنے وزرا اور اتباع و انصار کو ساتھ لے کر اس کی طرف نکل پڑا! اور جب محض ایک دن رات چلنے کی دوری رہ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک چیخ بھیجی جس نے سب کو ہلاک کر ڈالا، اور ان میں سے کوئی بھی زندہ باقی نہ رہا!! بیان کیا جاتا ہے کہ اس جنت میں سوائے ایک مومن کے کوئی داخل نہ ہوا، ایسے ہی علامہ خرپوتی کی شرح میں ہے: (شرح الخرفوتی ص:۱۵۵)

اورعبد اللہ بن قلابہ سے مروی ہے کہ وہ (ایک دن) اپنے اونٹ کو تلاش کرتے کرتے، اسی جنت میں آپہنچے، انہوں نے وہاں سے جتنا ہوسکا سونا چاندی لے لیا، یہ خبر حضرت امیر معاویہ کی بارگاہ تک جا پہنچی تو انہوں نے اسے حاضر ہونے کا حکم دیا، انہوں نے حاضر آکر) سارا ماجرا بیان کر دیا! تو امیر معاویہ نے حضرت کعب کے پاس خط لکھا اوران سے اس بارے میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ وہ ارم ذات العماد ہے، عنقریب آپ کے دورامامت میں ایک ایسا مسلمان مرداس میں داخل ہوگا جو سرخ زرد رنگ والا اور پست قد ہوگا، اس کے ابرو اور ایڑی پر تل ہوگا، وہ اپنا اونٹ ڈھونڈنے کے لئے نکلے گا، (بہرحال) پھرامیر معاویہ اس کی طرف ملتفت ہوئے اور ابن قلابہ کو بغور دیکھا، پھر فرمایا یا خدا یہ وہی شخص ہے (شیخ زادہ ص:۱۵۴)

آیت کی تفسیر

نیز یہ علامہ قرطبی، اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿لم یخلق مثلها فی البلاد﴾ کی مراد پر کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

(''مثلها'' سے مراد یا تو قبیلۂ عاد ہے یا وہ شہر ہے جس کو انہوں نے بنایا تھا اور شہر ارم سے دمشق وغیرہ مراد ہے، وہ تصریح فرماتے ہیں: معن ابن مالک سے مروی ہے کہ اسکندریہ میں ایک خط ملا، کسی کو نہیں معلوم وہ کیا ہے؟ مگر اس میں یہ لکھا تھا کہ میں شداد بن عاد ہوں جس نے عماد کو بلند کیا، میں نے اس کی تعمیر اس وقت کی جب نہ بڑھاپہ تھا نہ موت تھی، مالک کہتے ہیں کہ ان پر سے سو سال بھی گزر جایا کرتے تھے تب بھی وہ کوئی جنازہ نہیں دیکھ پاتے!۔

نیز یہ کہ ثور بن زید سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس میں یوں مذکور تھا: میں شداد بن عاد ہوں، میں نے ہی عماد کو تعمیر کیا اور میں ہی ہوں جس نے اپنے ہاتھوں سے وادی کے بطن کو باندھا اور میں نے ہی سات ہاتھوں کے لئے خزانہ اکٹھا کیا جس کو صرف امت محمد ﷺ ہی نکال سکے گی۔ (القرطبی تحت تفسیر قوله تعالیٰ (لم یخلق مثلها فی البلٰد)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدۂ بردہ کی فصل سادس کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۳)دامت لدینا ففاقت کل معجزة　　　من النبیین اذ جاء ت ولم تدم

(ترجمہ: (آیات حقہ) ہمارے پاس دائم وقائم ہیں لہذا یہ (معجزۂ قرآن)، تمام انبیائے کرام کے تمام معجزات سے افضل ہے، اس لئے کہ (انبیائے کرام کے معجزات) صادر ہونے کے بعد دائم نہیں رہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم، گزشتہ شعر میں بیان کردہ معنیٰ کو مسلسل مؤکد کئے جارہے ہیں یعنی "قدیمة" اور "تقترن" کے معانی کی مزید تاکید کررہے ہیں اور آیات کے قدیم اور کسی زمانے کے ساتھ مقترن نہ ہونے سے جو معنیٰ لازم مستفاد ہوتا ہے، اسی سے تصریح فرماتے ہیں اور وہ معنیٔ لازم آیات کا دوام ہے، جس کو یوں کہا "دامت" یعنی آیات قرآنیہ ثابت ومستقر ہیں اور مستمر ہیں کہ جو ہمارے پاس تغیر وتبدیل سے سالم ومحفوظ ہیں، برخلاف ہم سے پہلے نازل شدہ کتب کے، اس لئے کہ وہ (کتب سماویہ) اگرچہ اپنی اپنی حد ذات میں دائم وقائم ہیں لیکن ہم سے پہلی امتوں یعنی یہود ونصاریٰ کے پاس وہ دائمی صورت میں باقی نہیں رہیں کہ انہوں نے تغیر وتبدیل کر ڈالا انہیں، اور اسی طرح ان کتب کے معانی واحکام بھی ہمارے نبی اکرم ﷺ کے اس شریعت کے ساتھ تشریف لانے کے بعد دائم نہیں رہے کہ جس نے ماقبل شرائع (گزشتہ شریعتوں) میں سے بہت سارے احکام منسوخ کردیئے (اور رہا یہ سوال کہ) گزشتہ شریعتوں کے کچھ احکام اب بھی باقی ہیں؟ (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) وہ ہمارے حق میں ہمارے نبی اکرم ﷺ کے باقی رکھنے کی وجہ سے مشروع ہیں، تو معلوم ہوا کہ حضور شارع اور ناسخ ہیں (یعنی قانون بنانے والے بھی ہیں اور منسوخ فرمادینے والے بھی ہیں)، اس کے حکم سے کہ جس کے لئے سارے امور ہیں وہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور وہ بادشاہ بزرگ تر سبحانہ وتعالیٰ ہے۔

سیدنا امام احمد رضا قدس سرہ کا اس موضوع پر (حضور علیہ السلام کے شارع ہونے پر) ایک رسالہ ہے جس کا نام " منیة اللبیب فی ان التشریع بید الحبیب" ہےاور آیات کے دائم ہونے کی اس طرح یہ توجیہ کرنے کی طرف ابھی قریب ہی میں اشارہ گزر چکا، یاد کریں اور اسی سے قید لگانے کا فائدہ بھی ظاہر ہو گیا یعنی " دامت" کو " لدینا" کے ساتھ (مقید کرنے کا فائدہ)۔

(لدینا) منصوب ہے جو فعل ماضی کا ظرف ہے اور (دامت) میں (پوشیدہ ''ھی'') کی ضمیر راجع ہے "آیات" کی جانب (ففاقت) میں 'فا' تعلیلیہ ہے، اور "فاقت" بمعنیٰ فائق و بلند ہونا ہے۔ (کل معجزة) یہ "فاقت" کا مفعول ہے اور معجزہ کہتے ہیں اس خارق عادت امر کو جو مدعیٔ نبوت سے صادر ہو اور متضمن ہو مقابلے کا مطالبہ کرنے کے ساتھ (یعنی چیلنج کے ساتھ ہو) اور کسی شاعر نے خارق عادت امور کو نظم کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

اذا ما رأیت الامر یخرق عادة　　فمعجزة ان من نبی لنا صدر

(ترجمہ: یعنی اگر تو کوئی ایسی چیز دیکھے جو خارق عادت ہو تو وہ ''معجزہ'' ہے اگر وہ ہمارے لئے کسی نبی سے صادر ہوئی ہو)

و ان بان منه قبل وصف نبوة　　فالارهاص سمه تتبع القوم فی الاثر

(اور اگر وہ خارق عادت امر) کسی نبی سے اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہوا ہو تو اس کو تو "ارھاص" (نبوت کی بنیاد نام دے کہ اس کے اثر سے قوم (نبی کی) اتباع کرتی ہے۔)

وان جاء یوما من ولی فانه　　الکرامة فی التحقیق عند ذوی النظر

(ترجمہ: اور اگر ایسا امر کبھی کسی ولی سے رونما ہو جائے تو وہ تحقیقی طور پر اہل نظر کے نزدیک ''کرامت'' ہے۔)

و ان کان من بعض العوام صدوره　　فکنوه حقا بالمعونة واشتهر

(اور اگر اس طرح کے معاملے کا صدرو کسی عام آدمی سے ہو، تو اس کو 'معونت'' کے نام سے مشہور کرو۔)

و من فاسق ان کان وفق مراده　　یسمی بالاستدراج فیما استقر

(اور کسی فاسق سے اگر اس کی مراد موافق آجائے، تو اس میں جو ثابت ہوا ہے اسے ''استدراج'' (فریب سے موسوم کیا جاتا ہے)

و الا فیدعیٰ بالاهانة عندهم   و قد تمت الاقسام عند الذی اختبر

(اور اگر ان میں سے کچھ نہ ہو تو ان پر ''اہانت'' کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اور ہر باخبر شخص کے نزدیک (اب اس کی قسمیں پوری ہو گئیں۔)

(من النبیین) محل جر میں" معجزة" کی صفت ہے اور" معجزة" میں تنوین استغراق کے لئے ہے جیسا کہ " النبیین " میں الف لام استغراق کے لئے ہے۔ اسی طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ " النبیین " کے عموم میں داخل ہیں تو قرآن آپ ﷺ کا ایسا معجزہ ہے جو اپنے ماسوا ہر معجزے سے فائق ہے اگر چہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کا ہی معجزہ ہو اس لئے کہ (آپ ﷺ کے بھی دیگر معجزات) صادر ہونے کے بعد ہمیشہ قائم نہیں رہے (برخلاف معجزۂ قرآن کے) جیسا کہ ناظم فاہم نے فرمایا" اذ جاء ت ولم تدم"

(اذ) مفید تعلیل ہے جو" فاقت" کا معمول ہے اور" فاقت" میں ضمیر راجع ہے" آیات" کی طرف اور "جائت" میں میں ضمیر راجع ہے" کل معجزة" کی جانب، اور" کل" کو مؤنث کیا اس کے تانیث کسب کرنے کی وجہ سے مؤنث کی جانب مضاف ہونے سے۔ (ایک سوال مقدرہ کا جواب ہے کہ فعل مؤنث لائے یعنی "جاء ت" جب کہ اس کی ضمیر مؤنث "هی" راجع ہے کلمۂ "کل" کی جانب جو مذکر ہے۔ تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ "معجزة" جو کہ کلمۂ مؤنث ہے اس کی جانب مضاف ہونے کی وجہ سے "کل" نے تانیث حاصل کر لی ہے۔)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدۂ بردہ کی فصل سادس کے چھٹے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹٤) محکمات فما یبقین من شبه　　　لذی شقاق و لا یبغین من حکم

(ترجمہ: (آیات حقہ) محکم ہیں لہذا وہ کوئی شبہ باقی نہیں رکھتیں کسی اختلاف کرنے والے کے لئے اور نہ ہی کسی دوسرے حاکم وفیصل کو چاہتی ہیں۔)

ربط: (گزشتہ شعر میں) شاعر ذی فہم کی جانب سے بیان ہوا کہ آیات کی صفت یہ ہے کہ وہ ہمارے پاس دائم ہے اور تمام انبیائے کرام کے تمام معجزات سے فائق ہے اور اس کی شرح میں پھر ہماری جانب سے آیات کے دائم ہونے کا معنی بھی بیان ہو چکا کہ آیات کا نظم تغیر وتحریف سے اور اس کا معنی نسخ وتبدیل سے سالم ومحفوظ ہے اور (یہ بات مسلم ہے کہ) "الشئی اذا ثبت، ثبت بجمیع لوازمه" یعنی شئی جب بھی ثابت ہوتی ہے اپنے تمام لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، لہذا ناظم نے اس شعر میں چاہا کہ (آیات حقہ کے) بعض لوازم کی تصریح کردی جائے اور جو اس کے بعد بعض لازمی معنوں پر دلالت کرتی ہے ان معانی کے ضمن میں جس کو کلمہ شامل ہے تو وہ فرماتے ہیں:

محکمات فما یبقین من شبه　　　لذی شقاق و لا یبغین من حکم

تشریح:۔ (محکمات) 'حا' کے فتحہ اور کاف مشدد کے ساتھ، مبالغہ ہے "محکمات" بالتخفیف کا اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو کہ 'واؤ' کے ساتھ مروی ہے یعنی "و محکمات" یہ مرفوع ہے جو مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی "هن محکمات" ہے یا یہ "آیات" کی خبر کے بعد خبر ہے یا پھر یہ "آیات" کی صفت کے بعد صفت ہے بہر حال لفظ "محکمات" چار معانی کا احتمال رکھتا ہے۔

معنئ محکم کی تحقیق

(۱)ان میں سے ایک یہ کہ وہ " التحکیم" مصدر(بمعنیٰ حاکم بنانا) سے ہوتو معنیٰ ہوگا کہ اسے حاکم وفیصل بنایا گیا ہے(۲) ثانی یہ کہ وہ " الحکمۃ" (بمعنیٰ دانا ہونا) سے ہوتو معنی ہوگا کہ اسے حکیم اور دانا بنایا گیا ہے اس کے حکمتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ہے (و القرء ان الحکیم)اور (و الذکر الحکیم) (۳) تیسرا یہ ہے کہ وہ "الاحکام" بمعنیٰ مضبوط کرنا) سے ہوتو معنی ہوگا کہ اس کو اس طرح محکم و مضبوط بنایا گیا ہے کہ وہ نسخ وتبدیل کا احتمال نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کے احکام میں ایک دوسرے سے تعارض ہے۔ (۴) چوتھا معنی یہ کہ وہ" الحَکمۃ" بفتح حا(بمعنیٰ منع کرنا) سے ہوتو معنیٰ ہوگا کہ اس کو تحریف سے ممتنع اور محفوظ کردیا گیا ہے۔

اور معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیات کو اس طرح محکم کیا کہ نہ تو اسے محو کیا جائے گا اور نہ تبدیل یا اس نے اسے حکم وامثال پر مشتمل کیا یا اسے فیصلہ کرنے والی کیا کہ وہ ہر مجمل پر فیصلہ کرے۔ یا اسے حاکم بنایا اسکے علاوہ تمام کتب سماویہ پر اور سنن نبویہ اور قیاسات عقلیہ اور اتفاقات اجماعیہ پر یا یہ کہ وہ دلالت کرتی ہے حق و باطل پر یا حرمت وحلت کا حکم بتاتی ہے اسی طرح علامہ علی قاری نے " الزبدۃ" میں افادہ فرمایا ہے(زبدہ ص ۸۸)

اقول: (علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے)ان معانی کو بیان کیا جن کا احتمال لفظ" محکمات " رکھتا ہے مختلف طریقوں سے یعنی بالتشدید (محکمات)، بالتخفیف (محکمات)، بفتح کاف بکسر کاف(وغیرہ صورتوں کا احتمال رکھتا ہے)، نیز انہوں نے (ملا علی قاری نے) "او" جو کہ مفید تشکیل ہے کے ذریعہ عطف کیا (اس طرح کہ انہوں نے یوں فرمایا"ان الآیات جعلھا اللہ تعالیٰ محکمۃ لا تنسخ ولا تبدل " او" جعلھا مشتملۃ علی حکم و مثل " او" جعلھا ذات حکم۔ الخ)

اس جانب اشارہ کرنے کے لئے کہ قضیہ مانعۃ الخلو ہے مانعۃ الجمع نہیں، (یعنی یہ ایک ساتھ جمع آسکتے ہیں کہ آیات محکم بھی ہو، حاکم بھی ہو، حکیم بھی ہو، حکمت وامثال پر مشتمل بھی ہو وغیرہ ذالک مگر ایک ساتھ برطرف نہیں ہوسکتے)

اور علامہ علی قاری نے بہت اچھا کیا جہاں نہیں کہا جیسا کہ شیخ زادہ نے کہا (اور اس قائل کے قول پر جو کہتا ہے کہ مشترک کے لئے ایسا عموم ہے کہ کل مراد ہوتا ہے) جبکہ کل مراد لینے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے اس لئے کہ محتمل صورتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں بلکہ وہ (معنی) ایک دوسرے کے قریب ہیں! تو ایسے مفہوم کے تحت ان کا اندراج جو کل کو عام ہو، ناپسندیدہ نہیں اور اس بنیاد پر 'محکمات' کا مدلول مشترک ہے جس کے لئے کوئی عموم نہیں ہوتا! جس وقت کہ وہ دلالت کرے ایسے معانی متباینہ پر جن کا اندراج جنس واحد کے تحت نہ ہوسکے۔ اور علامہ قاری نے "زبدہ" میں "محکمات" کی بہت ہی عمدہ شرح فرمائی، اختصار اور ایضاح مراد کے ساتھ فرماتے ہیں 'محکمات' وہ ہوتا ہے جو نہ نسخ ہو اور نہ تبدیل، تو اس شرح کی تقدیر پر 'محکمات' قرآن کے محکم و متشابہ تمام کلمات کو شامل ہو گیا اور اس طرح شرح کرنے سے وہ (یعنی ملا علی قاری) مستغنی ہو گئے اس جواب سے جو علامہ خرپوتی نے اس اشکال کا دیا جو کہ ناظم فاہم کے جمیع قرآن کو 'محکمات' سے تعبیر کردینے سے پیدا ہوا باوجودیکہ قرآن مین کچھ آیتیں محکم ہیں اور کچھ متشابہ، اور وہ اس طرح مستغنی رہے کہ وہ محکمات کو معنی لغوی پر محمول کرنے میں نہ پڑے اور نا ہی انہوں نے وہ مشقت اٹھائی جو کہ علامہ خرپوتی نے اٹھائی کہ انہوں نے محکمات سے بعض آیات مراد لیں، اس طرح کہ وہ اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: (محکمات کا جمیع آیات پر) حمل معنیٰ لغوی کے اعتبار سے ہے نہ کہ اصطلاحی، اس بنیاد پر کہ محکمات کی ضمیر میں 'استخدام' ہوسکتا ہے بایں طور کہ ضمیر 'آیات' کی طرف راجع ہو اور اس سے بعض آیات ہی مراد ہوں۔

اقول: بعید از امکان نہیں کہ دعویٰ کیا جائے کہ پورا کا پورا قرآن محکم ہے، متشابہ ہو یا غیر متشابہ! مگر یہ کہ جو محکم ہے ہر طرح سے محکم ہے اور متشابہ محکم کے حکم میں ہے اپنی مراد کے پھرنے کے اعتبار سے، اس لئے کہ اس کی مراد کا لوٹنا، محکم کی طرف ہے۔ تو وہ ظاہر کے اعتبار سے جو کہ مراد نہیں متشابہ ہے اور اللہ کی مراد پر محکم ہے اور اس کا مرجع ام کتاب (قرآن) ہونے پر وہ محکم ہے۔ اور آیات کی تعریف کہ وہ محکم ہیں اس کتاب کی تعریف ہے جو کہ سیدنا محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے ان تمام نتائج کے ساتھ جو کہ آیات کے محکم ہونے پر برآمد ہوتے ہیں اور اس کے تمام

لوازم کے ساتھ جیسے اس کتاب کا اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہونا اوران پر محافظ ہونا اور آپ ﷺ کے حق میں اس کا شاہد ہونا اور پہلی کتابوں پرنگہ بان ہونا اوران پر امین ہونا اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی جانب متوجہ کرنے والا ہے: ﴿ و انزلنا اليك الكتٰب بالحق مصدقاً لما بين يديه من الكتٰب و مهيمناً عليه﴾ (المائدة: ٤٨)

قرآن کے مصدق، محافظ، شاہد، نگہبان اور امین ہونے کا بیان

علامہ خازن اس آیت پاک کی تفسیر میں تصریح فرماتے ہیں: اللہ عزوجل کے فرمان ﴿ وانزلنا اليك الكتٰب﴾ میں خطاب نبی اکرم ﷺ کے لئے ہے یعنی اوراے محبوب ہم نے تمہاری طرف قرآن اتارا (بالحق) یعنی صدق وسچائی کے ساتھ کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے ﴿مصدقا لما بين يديه من الكتٰب﴾ یعنی تصدیق فرماتی ان تمام کتابوں کی جن کو اللہ تعالیٰ نے انبیا پر اتارا (و مهيمنا عليه) حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا، یعنی وہ ان کتب پر گواہ ہے جو اس سے پہلے ہوئیں، اور یہیں سے حضرت حسان کا یہ شعر ہے:

ان الكتاب مهيمن لنبينا و الحق يعرفه ذو وا الالباب

(ترجمہ: بے شک کتاب (قرآن کریم) ہمارے نبی کریم ﷺ کے حق میں گواہی دینے والی ہے اور عقل وخرد والے اسے حق وصدق جانتے ہیں)

ان کی مراد یہ ہے کہ وہ کتاب گواہی دینے والی اور تصدیق فرمانے والی ہے ہمارے نبی کریم ﷺ کی اور قرآن پاک ہی سابقہ کتب پر محافظ ہے! اس لئے کہ یہ وہ کتاب ہے جو نسخ وتغیر اور تبدیل ہونے والی نہیں اور جب قرآن شاہد ہے تو اس کی شہادت تورات، انجیل، زبور اور تمام کتب منزلہ پر حق وصحیح ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ " مهيمن " کا معنیٰ 'امین' ہے اور قرآن پاک ہی اپنے سے پہلی تمام کتب سماویہ پر امین ہے اس میں کہ اس نے اہل کتاب کو ان کی کتابوں کی خبر دی تو اگر اہل کتاب بھی قرآن کے بارے میں یہی بات کہیں تو سچے ہوں گے ورنہ تو نہیں (تفسیر الخازن ۲/ ۲۹۲، ۲۹۳)

قـال الازهری: یہیں سے معلوم ہوگیا کہ قرآن اپنے سوا تمام کتب (سماویہ) پر بایں معنیٰ حاکم ہے کہ وہ ان باتوں کو ظاہر کرنے والا ہے جن کو اہل کتاب چھپاتے ہیں اور یہ کہ آپ ﷺ کا حکم ان میں نافذ ہے لہذا وہ سابقہ شریعتوں کے لئے ناسخ ہے۔

قرآن کے حاکم وشاہد ہونے کی حدیث سے تائید

اوراس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو حضرت کلبی سے مروی ہے کہ ابوصالح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے راوی ہیں کہ خیبر کے ایک مرد وعورت نے زنا کیا اوران کی کتاب میں اس کی سزا رجم کرنا تھی، لیکن ان دونوں کے بلند رتبہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ان کے حق میں اس سزا کو پسند نہ کیا، تو انہوں نے ان کا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کردیا اس امید پر کہ شاید ان کے یہاں کچھ رخصت ہو مگر حضور نے ان دونوں پر رجم کا فیصلہ فرمایا، تو نعمان بن اوفی اور بحری بن عمرو بول پڑے کہ اے محمد (ﷺ) آپ نے ان پر جسارت کردی، ان پر رجم کی سزا نہیں، تو رسول اللہ نے فرمایا" بینی و بینکم التوراۃ" ہمارے تمہارے درمیان تورات ہے بولے آپ نے تو فیصلہ کردیا ہے، فرمایا کہ تم میں تورات کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ بولے ایک کانا شخص ہے جو فدک میں رہتا ہے، اس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے، بہرحال انہوں نے اس کو پیغام بھجوایا! تو وہ مدینہ آیا۔ حالانکہ حضرت جبریل رسول اللہ ﷺ سے اس کے اوصاف بیان فرما چکے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے اسی سے فرمایا کہ کیا تم ابن صوریا ہو؟ بولا ہاں، حضور نے فرمایا کیا تم یہودیوں کے سب سے بڑے عالم ہو؟ بولا، وہ یہی گمان کرتے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے (اس سے) تورات میں سے کچھ آیتیں طلب کیں جس میں رجم کا ذکر ہے، تو اس سے فرمایا پڑھو، تو جب وہ آیت رجم پہ پہونچا تو اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اوراس کے بعد والی آیتوں کو رسول اللہ ﷺ پر تلاوت کردیا، تو حضرت عبداللہ ابن سلام نے فرمایا کہ یارسول اللہ! یہ اس آیت کو چھوڑ کر آگے نکل گیا، تو وہ (حضرت عبداللہ ابن سلام) کھڑے ہوئے اوراس کی ہتھیلی کو اس پر سے ہٹا دیا، تب اس نے رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کو آیت پڑھ کر سنائی کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر زنا کر بیٹھیں اوران کے خلاف ثبوت بھی

قائم ہو جائیں تو ان دونوں کو رجم کیا جائے گا اور اگر عورت حاملہ ہو تو اس وقت تک روک دی جائے کہ جو اس کے پیٹ میں ہے اس جن دے'' اور اس کے بعد پھر حضور ﷺ نے یہود یوں کو حکم دیا تب وہ رجم کئے گئے، جس کی وجہ سے یہودیوں کو بہت غصہ آیا، لیکن پھر وہ وہاں سے چلتے بنے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ﴿الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتٰب﴾ یعنی تورات کتاب کا ایک حصہ ہے (﴿یدعون الی کتٰب الله لیحکم بینهم ثم یتولی فریق منهم وهم معرضون﴾ (آل عمران: ۲۳) (معالم التنزیل" میں آیت مذکورہ کی تفسیر کے تحت)

امام طبری اپنی سند میں ابن زید سے روایت کرتے ہیں: حیی ابن اخطب کے حکم میں قبیلہ بنی نضیر کے لئے دو خون بہا تھے اور قبیلہ بنی قریظہ کے لئے ایک خون بہا تھا اس لئے کہ وہ (یعنی حیی ابن اخطب) قبیلہ بنی نضیر میں سے تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے باخبر کیا جو تورات میں ہے کہ فرمایا (وکتبنا علیهم فیها ان النفس بالنفس) (المائدة: ٤٥) راوی کہتے ہیں کہ پھر جب بنی قریظہ نے یہ آیت دیکھی تو ابن اخطب کے فیصلے سے راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم محمد ﷺ کی بارگاہ میں فیصلہ کرائیں گے تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا (فان جائوك فاحکم بینهم او اعرض عنهم) یعنی حضور کو اختیار عطا فرمایا (کہ چاہیں تو فیصلہ فرمائیں اور چاہیں تو ان سے اعراض کریں) (وکیف یحکمونك و عندهم التوراة فیها حکم الله) پوری آیت، راوی کہتے ہیں کہ ایک بڑی قوم کا شخص جب کسی چھوٹی قوم کی عورت سے زنا کر لیتا تھا تو یہ لوگ اس عورت کو سنگ سار کر دیتے تھے اور اس بڑی قوم کے شخص کا منہ کالا کر دیتے تھے یعنی اس کے منہ پر کالک پوت کر اسے اونٹ پر بٹھا دیتے اور پھر اس کے منہ کو اونٹ کے دم کی طرف کر دیتے تھے اور اگر چھوٹی قوم کا مرد کسی بڑی قوم کی عورت سے زنا کر بیٹھتا تھا تو یہ اس مرد کو سنگ سار کرتے اور عورت کے ساتھ وہی کرتے (جو اس معزز قوم کے مرد کے ساتھ کرتے) تو اسی وجہ سے وہ اپنا مقدمہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں لے گئے، راوی کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا ''میں تمہیں اللہ اور اس تورات کا واسطہ دیتا ہوں جس کو اس نے موسیٰ پر کوہ سینا

کے دن اتارا، کیا پاتے ہوتم تورات میں زانیوں کے بارے میں؟ بولا اے ابوالقاسم، رذیلہ عورت کو سنگ سار کریں گے اور معزز مرد کو اونٹ پر بٹھال کر اس کا منہ کالا کریں گے اور پھر اس کے چہرے کو اونٹ کی دم کی طرف کردیں گے اور رذیل مرد کو سنگ سار کریں گے جب وہ شریفہ سے زنا کرے گا اور شریفہ کے ساتھ وہی کریں گے (جو شریف مرد کے ساتھ کیا تھا) تو نبی کریم ﷺ نے پھر اس سے فرمایا ''میں تجھے اللہ کا اور اس تورات کا واسطہ دیتا ہوں جو اس نے موسیٰ پر اتارا کو وہ سینا کے دن کیا پاتا ہے تو تورات میں؟ تو وہ کترانے لگا یعنی تیزی سے دائیں بائیں جانے لگا دھوکے میں اور نبی کریم ﷺ اس کو اللہ کی اور اس تورات کی قسم دیتے رہے جو اس نے موسیٰ پر اتاری طور سینا کے دن یہاں تک کے بول پڑا کہ اے ابوالقاسم '' شیخ اور شیخہ جب زنا کر بیٹھیں تو ان دونوں کو رجم کردو قطعاً تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ حکم یہی ہے، ان دونوں کو لے جاؤ اور سنگ سار کردو'' حضرت عبداللہ فرماتے ہیں میں انہی لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ان دونوں کو رجم کیا تھا، تو مرد اس عورت پر اس کو مار سے بچانے کے لئے چھایا رہا اور اس کو پتھروں سے بچاتا رہا، خود کے ذریعے یہاں تک کہ مر گیا۔ (روایت میں الفاظ آئیں ہیں " یجنئ علیھا " اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس عورت پر اس نے اپنے آپ کو اوندھ لیا اسے مار سے بچانے کے لئے (الطبری ۱۰/ ۳۲۸)

روایت میں آیا " الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجمودھما " جیسا کہ وہ یہ آیت ہے تورات کی اسی طرح یہ قرآن پاک کی بھی ایسی آیت ہے جس کی تلاوت منسوخ ہے نہ کہ حکم۔

بیان وجوہ اعراب اور شرح کلمات میں: (فما یبقین) میں 'فا' برائے نتیجہ ہے اور " یبقین " الابقاء مصدر سے جمع مؤنث کا صیغہ ہے بمعنیٰ دوام۔ (من) زائدہ ہے (شبه) " شبھة " کی جمع ہے اور شبہ کہتے ہیں اس کو جو ثابت کے مشابہ ہو اور لیکن ثابت نہ ہو۔ (لذی شقاق) ظرف مستقر صفت ہے " شبه " یا یہ متعلق ہے " یبقین " سے۔ اور " شقاق " کا معنیٰ اختلاف ہے یعنی ان محکم آیات نے کوئی شبہ باقی ہی نہیں رکھا اختلاف کرنے والے کے لئے اور ذوشقاق یعنی اختلاف کرنے والا کافر ہے اس لئے کہ وہ دین کی مخالفت کرنے

والا ہے جب وہ ایک کنارے اور شق میں ہو اور اسلام دوسرے جانب میں ہو، بلکہ یہ آیات محکمات تو ان شبہادت کو زائل کر دیتی ہیں۔ (و لا یبغین من حکم) یعنی اور نہ ہی وہ (اپنے سوا) کسی حَکم وفیصل کو چاہتی ہیں۔ "حَکَم" بفتحتین بمعنیٰ حاکم یعنی قرآن پاک اپنے اوپر کسی دوسرے حاکم کا محتاج نہیں ہے حدیث کے ذریعے اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ (کہ کوئی کہہ سکے کہ قرآن حدیث کو طلب کرتا ہے) اس لئے کہ حدیث، کتاب ہی کی طرف ٹیک لگائے ہوئے ہے اور اسی طرح اجماع وقیاس ہے اس لئے کہ یہ دونوں (اجماع وقیاس) محتاج ہیں ان دونوں میں سے ہر ایک کے (یعنی قرآن وسنت کے)۔

"حِکَم" کسرہ وفتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا، حکمت کی جمع ہونے کی تقدیر پر، تب معنیٰ ہوگا کہ قرآن مزید حکمتوں کا محتاج نہیں، اس کے قوانین کے واضح ہونے کی وجہ سے بلکہ تمام حکمتیں اور قواعد اسی سے ماخوذ ہیں۔

(لا یبغین) بمعنیٰ طلب کرنا جیسا کہ بیان ہوا اور "من" زائدہ ہے یا پھر اس کا معنیٰ ہوگا کہ قرآن نے حاکم ہونے کی وجہ سے ظلم وناانصافی نہ کی، تو اس تقدیر پر "من" افادۂ تمیز کے لئے ہوگی! اس لئے کہ وہ حاکم ہے فیصلے اور عدل کرنے کے اعتبار سے نہ کہ کسی اور حیثیت سے اور اس شعر میں تلمیحاً اس فرمان باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے (هو الذی انزل علیك الكتٰب منه اٰیٰت محكمٰت﴾ (آل عمران: ۷) اور "یبقین" اور "یبغین" کے درمیان تجنیس کامل ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ علامہ خرپوتی تصریح فرماتے ہیں: پھر وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ علیه الصلوٰة و السلام نے فرمایا کہ قرآن کو پانچ قسموں پر اتارا گیا ہے:

خوشخبری دینے والا، ڈر سنانے والا، نسخ کرنے والا اور نسخ ہونے والا، محکم اور متشابہ، موعظت اور امثال، حلال و حرام تو جو اس کی بشارتوں سے خوش ہوا، اس کے ڈرانے سے ڈرا اور اس کے ناسخ پر عمل کیا، اس کے منسوخ سے محفوظ رہا اور اس کے محکم پر اقتصار کیا اور اس کے متشابہ کو اس کے محکم کے سپرد کیا اور اس کے پند ونصائح سے نصیحت حاصل کی، اور اس کی کہاوتوں سے عبرت حاصل کی اس کے حلال کو حلال جانا اور اس کے حرام کو حرام جانا تو

وہ لوگ یقیناً مومنین میں سے ہیں۔ان کے لئے بلند درجات ہیں انبیاء شہداٗ اور صالحین کے ساتھ اور یہ کتنے بہتر ساتھی ہیں اور وہ میرا وارث ہے اور مجھ سے پہلے انبیا کا وارث ہے اور وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حفظ و آمان میں رہتا ہے اور جب بھی قرآن کی تلاوت کرتا ہے رحمت اسے گھیر لیتی ہے اور اس پر سکینے کے نزول ہوتا ہے اور اس کا حشر میرے زمرے میں ہوگا اور میرے لواٗ (جھنڈے) کے نیچے'' یا اللہ ہمیں حسن خاتمہ اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حشر نصیب فرما۔(الخرپوتی ص ۱۵۷)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

بعون اللہ تعالیٰ قصیدہ بردہ کی فصل سادس کے آٹھویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے: ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۵) ماحوربت قط الاعاد من حرب   اعدی الاعادی الیها ملقی السلم

(ترجمہ: (آیات حقہ سے) کبھی بھی معارضہ نہیں کیا گیا مگر بڑے سے بڑا دشمن شدت بلاغت کی وجہ سے ہمیشہ اس کی طرف مطیع و فرماں بردار ہوکر ہی لوٹا۔)

ربط: شاعر ذی ہم جب معانی کے اعتبار سے آیات کے اوصاف بیان کر چکے نیز ان کی جانب سے آیات کا مستمر اور جاری معجزہ ہونا گزشتہ اوراق میں بیان ہو چکا، اپنے اس قول کے ذریعہ (دامت لدنیا) اور ''معجزہ'' جیسا کہ بیان ہوا کہتے ہیں ایسے خارق عادت امر کو جو مدعیٔ نبوت کے ہاتھوں سے صادر ہو اور ملا ہوا ہو مطالبۂ معارضہ (چیلنج) سے، تو اب ناظم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ معارضے کا مطالبہ اور چیلنج قرآن کی جانب سے بالفعل واقع ہو چکا ہے اور کفار سے معارضہ طلب کیا جا چکا ہے مگر وہ اپنی آخری کوشش کے باوجود اس سے عاجز رہے، جیسا کہ معلوم ہے اس فرمان باری تعالیٰ سے (وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا)، تو ناظم فاہم یوں گویا ہوتے

ہیں:

مــاحــوربــت قــط الاعــاد مـن حــرب   اعــدی الاعــادی الیھا مـلـقـی الســلـم

امام رازی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جاننا چاہئے کہ قرآن میں مطالبۂ معارضہ (چیلنج) کئی طرح آیا ہے: ان میں سے ایک یہ فرمان باری تعالیٰ ﴿ فـاتـوا بـکـتٰـب من عند الله ھو اھدی ﴾، ثانی یہ فرمان باری تعالیٰ ﴿ قـل لـئِن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بـمثـلـه ولـوکان بعضھم لبعض ظھیرا ﴾ ،ثالث یہ فرمان باری تعالیٰ ﴿ فـاتـوا بـعشر سور مثله مفتریٰت ﴾ رابع یہ فرمان باری تعالیٰ ﴿ فاتوا بسورة من مثله ﴾ (تفسیر الرازی ۱/ ۳۹۲)

کلمات غریبه کی شرح اور بیان وجوہ اعراب: (مـاحوربت) 'المحاربة' مصدر سے، یعنی نہیں معارضہ کیا گیا، تو 'مـحــاربـه' سے بطور تشبیہ معارضہ مراد ہے، وجوہ شبہ جیسے مخالفت، طلب غلبہ اور نافرمانی، دونوں لفظوں میں جامع ہونے کی وجہ سے اور اس میں استعارہ تصریحیہ تبعیہ ہے جو پہلے دونوں کے مصدروں میں جاری ہوا، پھر " محاربة" سے (حوربت) مشتق ہوا اور " معارضة" سے (عورضت) ، لیکن ' حوربت' جو کہ مشبہ بہ ہے کو ذکر کر کے، ' عورضت' مراد لے لیا گیا۔ (تو ترجمہ ہوگا "نہیں معارضہ کیا گیا کبھی")

(قط): ماضی کے لئے ظرف زمان ہے بر سبیل استغراق اور صرف نفی میں استعمال ہوتا ہے۔

(الّا استثنائے مفرغ ہے، اور مستثنیٰ منہ، محذوف ہے یعنی، تقدیری عبارت یوں ہوگی " مــاحـوربـت قط فـی حــال مـن الاحــوال الا حــال کونھا عاد الیھا اعدی الاعادی ملقی السلم" (یعنی کبھی بھی کسی بھی حال میں اس سے معارضہ نہیں کیا گیا مگر اس کیفیت میں کہ اس کی طرف بڑے سے بڑا دشمن بھی مطیع و فرماں بردار ہوکر ہی لوٹا)

(عاد) یا تو بمعنیٰ " رجع " ہے یا بمعنیٰ " صار " ہے اور بمعنی صار ہونے کی تقدیر پر وہ افعال ناقصہ میں سے ہوگا۔

(من) ابتدائیہ ہے یا تعلیلیہ اور (من حرب) متعلق ہے "عاد" سے اور "حَرَب" بفتحتین بمعنیٰ سختی اور مراد مجازاً شدت بلاغت ہے، اور اصل میں اس کا معنیٰ مال کا چھن جانا ہے جس سے سختی لازم آئے۔ تو یہ ملزوم ذکر کر کے لازم مراد لینے کی قبیل سے ہے، یعنی "حربَه حَرَبا" اس کا جمیع مال چھین لیا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد سلب حجت ہو جو مثل مال ہے اس لئے کہ ہر شخص اپنی حجت اور دلیل پر اندیشہ کرتا ہے کہ کہیں اسے باطل اور کمزور نہ کر دیا جائے جس سے رسوائی ہو جیسا کہ اپنے مال پر ڈرتا ہے۔

اور (ماحوربت قط الاعاد من حرب) سے مراد بہت جلد اپنی ہار مان لینا، اتنی جلدی کہ جیسے وہ ساتھ ہی ہو۔ (اعدی) تقدیراً مرفوع ہے اور "عاد" جب کہ بر تقدیر ثانی بمعنیٰ "صار" ہو تو اس تقدیر پر یہ (یعنی اعدی) اس کا اسم ہوگا۔

(الاعدیٰ "عداوۃ" مصدر سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور (الاعادی) یہ 'اعدا' کی جمع ہے جو کہ 'عدو' کی جمع ہے، لہذا وہ جمع الجمع ہے۔ (الیھا) جار مجرور متعلق ہے 'عاد' سے یا "ملقی السلم" سے۔

(ملقی السلم) بر تقدیر اول (یعنی عاد بمعنیٰ رجع ہو تو) حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا بر تقدیر ثانی (عاد بمعنیٰ صار ہو تو) کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

"السلم" بفتحتین کا معنیٰ یا تو ہتھیار رہے یا مطیع و فرماں بردار ہونا ہے، قرآن پاک میں آیا ہے (و القوا الیکم السلم) بمعنیٰ مطیع و فرماں بردار ہونا۔

حاصل معنیٰ: کسی نے کبھی بھی آیات سے معارضہ و مقابلہ نہ کیا مگر یہ کہ بڑے سے بڑا اور قوی سے قوی معارض و معاند بھی ان آیات کے کمال فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اپنے معارضے سے اس حال میں رجوع کیا اور اس حالت میں لوٹا کہ وہ آلۂ معارضہ کو ڈالے ہوئے ہوتا، عناد کی کیفیت کو ختم کئے ہوئے ہوتا اور معجزے کے ظاہر اور خارق عادت ہونے کی وجہ سے اسے تسلیم کئے ہوئے ہوتا۔

معارضے سے عجز کے متعلق دو اقوال

پھر معارضین پر دہشت طاری ہونا اور معاندین کا معارضے سے عاجز ہونا، کیا ان امور میں سے ہے جن سے قدرت انسانی عاجز ہوتی ہے اس کے خوش بیانی اور حسن معانی پر مشتمل ہونے اور اعلیٰ طبقۂ بلاغت میں ہونے کی وجہ سے تو یہ معجزہ اس صورت میں مردوں کو زندہ کرنے اور جادو کے پھیرنے اور کنکریوں کے تسبیح پڑھنے کے معجزے کے مثل ہوگا یا پھر ان کا عجز ان کی ہمتوں کے پھر جانے کی وجہ سے ہے اور معارضہ کرنا ان کے مقدور میں ہے؟

تو اس میں علمائے اہل سنت مختلف ہیں اور جمہور پہلے قول پر ہیں اور اسی پر اعتماد ہے اور قول ثانی شیخ ابوالحسن اشعری اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے اور دونوں ہی اقوال پر اہل عرب معارضہ کو ترک کر دیئے تھے خواہ وہ اس سے معارضہ ترک کئے تھے جو ان کی مقدور میں نہیں تھا یا اس سے ترک کئے جو ان کی مقدور کی جنس میں سے تھا، اس کے مثل لانے سے عاجز ہونے کی وجہ سے، ایسا ہی علامہ علی قاری کی تصنیف " الزبدة" میں ہے (زبدہ:ص ۸۸)

روایت کی جاتی ہے کہ ولید بن مغیرہ قریش کے درمیان انتہائی فصیح تھا، تو وہ ایک دن نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں بلاغت میں معارضہ کرنے کی غرض سے آیا اور نبی اکرم ﷺ سے کہنے لگا، مجھ پر کچھ پڑھیں، تو حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اس کو یہ فرمان باری تعالیٰ پڑھ کر سنایا۔ ﴿ ان اللـه يامر بالعدل و الاحسان ، و ابنآی ذی القربیٰ و ینھیٰ عن الفحشآء و المنكر والبغی يعظكم لعلكم تذكرون﴾ تو اس نے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی تو حضور ﷺ نے اعادہ فرمایا تو کہنے لگا، " واللـه ان له الحلاوة و ان عليه لطلاوة و ان اعلاه لمثمر و ان اسفله لمغدق مايقول هذا بشر ''یعنی بخدا اس کلام میں بہت حلاوت ہے اور بے شک یہ حسن معانی پر مشتمل ہے، اس کا ظاہر پھل دار ہے اس کا باطن خوشگوار ہے یہ انسان کا کلام نہیں۔ (یہ کہہ کر) کھڑا ہوا اور مجلس سے چلتا بنا اور اس کے سوا کچھ نہ کہا۔

یحییٰ بن حکیم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن سے معارضہ کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے سورۂ اخلاص میں غور کیا تاکہ اس کے مثل لائیں یا اپنے زعم میں اسکی لکڑی پر ہی کچھ بن دے (یعنی انہی الفاظ اور وزن پر

دوسرے الفاظ پرو دیں) تو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے دہشت اور ہیبت طاری ہوگئی اور انہوں نے اس سے توبہ کی اور اپنے ارادے سے رجوع کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کفار اپنے زعم میں سورۂ القارعة کے مثل لے آئے ہیں اور وہ مماثل ان کے یہ الفاظ ہیں" الفيل ما الفيل وما ادراك ما الفيل له ذنب قصير و خرطوم طويل ان ذالك من خلق الله نقليل!!) یعنی ہاتھی کیا ہاتھی تم نے کیا جانا کیا ہے ہاتھی اس کی چھوٹی ہے پونچھ اور لمبی ہے سونڑھ بے شک وہ اللہ کی مخلوق میں بہت کم تعداد میں ہے نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان (ولكم في القصاص حيوٰة) کا معارضہ اپنے اس قول سے کیا،" القتل انفى للقتل" پھر انہوں نے اس میں غور کیا اور اس میں بہت ساری کمیاں پائیں تو بعد تفکر وہ ہکا بکا رہ گئے اور بہت مغلوب ہو گئے، بلند ہے اللہ تعالیٰ ان بکواسوں سے جو ظالم بکتے ہیں بہت بلند۔(خرپوتی ص:۱۵۸)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکريم ، و آله و صحبه الکرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ کی فصل سادس کے نویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۶) ردت بلاغتها دعوى معارضها   رد الغيور يد الجاني عن الحرم

(ترجمہ: (آیات حقہ کی) بلاغت نے معارض کے دعویٰ ہی کو رد کر دیا جس طرح ایک غیرت مند، گنہگار کے ہاتھوں کو اپنی محرموں سے پھیر دیتا ہے۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ شعر میں جب یہ بیان کر دیا کہ نظم قرآن ایسا معجزہ اور ایسا فصیح و بلیغ ہے کہ وہ اپنے معارض کو لوٹا دیتا ہے اور اس کو معارضہ کرنے سے پھیر دیتا ہے اور اس کو اتنا مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی طرف مطیع و

فرماں بردار ہوکر ہی لوٹتا ہے،تو اب انہوں نے چاہا کہ نظم وقرآن میں جہت اعجاز کو بیان کر دیا جائے تو وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

ردت بـــلاغتهـــا دعـوى عـمـــارضهـــا		رد الغيـور يـد الجـانـى عـن الحـرم

تو یہ جملہ مستأنفہ ہے جو ماقبل شعر کے مضمون کی علت کا بیان ہے یا پھر آیات کی صفت ہے (ردت) بمعنیٰ باطل کرنا، پھیر دینا، (بـلاغتهـا) یہ " ردت "کا فاعل ہے،اور بلاغت کا معنیٰ لغت میں،خبر دینا ہے معنیٰ کے انتہا کو پہنچنے کی اور غایت کو پالینے کی اور اصطلاح میں بلاغت کہتے ہیں کلام کا مقتضیٰ حال کے مطابق ہونا فصاحت کے ساتھ اور فصاحت کا معنیٰ حشو وزوائد،تعقید اور غرابت سے خالی ہونا ہے،اور متکلم میں بلاغت کا مطلب ہے ایسا ملکہ جس کے ذریعہ متکلم کلام بلیغ مرتب کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

اور " معارضها" میں 'ها' کی ضمیر راجع ہے بلاغت کی جانب یا آیات کی جانب اور تعبیر کرنے میں لفظ بلاغت کو فصاحت پر ترجیح دی (یعنی یوں کہا 'بـلاغتهـا' یوں نہیں کہا" فـصـاحتهـا" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاغت زیادہ خاص ہے،تو وہ فصاحت سے تعبیر کرنے سے مستغنی ہے اس لئے کہ بلاغت،فصاحت کو شامل ہوتا ہے اس کا عکس نہیں۔

(دعـویٰ) اصل میں کہتے ہیں کسی چیز کو طلب کرنا یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ حق ہے اور اس کا استعمال اکثر باطل میں ہوتا ہے۔

(معـارضها) یعنی آیات کے مثل لانے کے لئے مقابلے کرنے والا۔ (رد) مصدر ہے جو کہ موصوف محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب،یعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی" ردا مثـل رد الـغيـور" (یعنی غیرت مند کے پھیرنے کی طرح پھیرنا)

(الـغيـور) بمعنیٰ بہت زیادہ غیرت مند اور یہ ایک موصوف محذوف کی صفت ہے یعنی "رجل "محذوف کی صفت ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی " رد الرجل الغيور" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا:ان اللہ یغار و ان المومن یغار" یعنی یقیناً اللہ غیرت فرماتا ہے(اپنی شان کے لائق) اور بے شک مومن غیرت مند ہوتا ہے۔ نیز حدیث پاک میں آیا ہے" ان الله غیور یحب الغیور" بے شک اللہ غیور ہے غیور کو پسند فرماتا ہے، اور غیرت اصل میں کہتے ہیں، کسی حق میں غیر کی شرکت کو ناپسند کرنے کو اور اللہ کی غیرت اس کا اپنے بندے کو بے حیائیوں پر بڑھنے سے منع فرمانا ہے اور مومن کی غیرت کا معنیٰ، اس کے دل میں ایسا ہیجان اور بے قراری کیفیت کا ہونا ہے جو اسے آمادہ کرے محرم کو بے حیائیوں اور اس کے مقدمات سے روکنے پر(خرپوتی ص ۱۵۹)

(ید الجانی) مفعول ہے" ردت" کا اور 'ید' سے مراد درپے ہونا یا تصرف کرنا ہے، سبب بول کر مسبب مراد لینے کی قبیل سے، (الجانی)، جنایت بمعنیٰ جرم سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور (الحرم) میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک 'حا' اور'را' کے فتحہ کے ساتھ حَرَم، یا'حا' اور'را' دونوں کے ضمہ کے ساتھ سے حُرُم یا'حا' کے ضمہ اور 'را' کے فتحہ کے ساتھ حُرَم۔

(عن الحرم) متعلق ہے" ردت" سے اور" ردت" میں ضمیر راجع ہے آیات کی جانب اور" معارضھا" میں ضمیر راجع ہے بلاغت کی طرف یا آیات کی طرف۔

حاصل معنیٰ: آیات قرآنیہ اور کلمات فرقانیہ کی فصاحت نے معارض ومقابل کے دعوے ہی کو باطل کر دیا اور رفع ودفع کر دیا چہ جائے کہ اس سے معارضہ اور مقابلہ ظہور پذیر اور وقوع پذیر ہوتا (یعنی دعویٰ معارضہ ہی باطل ہوگیا، ظاہر اور واقع ہونا تو دور کی بات) اس طرح رد کیا) جس طرح کہ کمال غیرت اور شدت حمیت سے موصوف و منعوت شخص، گنہگار کے ہاتھوں کو اور خیانت وبغاوت کرنے والے کے تصرف کرنے کو رد کر دیتا ہے اور روک دیتا ہے ان کو اس سے کہ وہ اس کے محارم کے اردگرد چکر لگائیں یا اس کی گھر کی عورتوں تک پہنچیں۔

علامہ خرپوتی فرماتے ہیں: پھر جاننا چاہئے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن المقفع جو کہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فصیح تھا، نے قرآن سے معارضہ کرنا چاہا تو اس نے ایک کلام نظم کیا اور اسے مفصل کر کے اس کا نام 'سور' رکھا، پھر

ایک دن اس کا گزر ایک مکتب پر سے ہوا جس میں ایک بچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کرر ہا تھا (یٰـــآرض ابلعی مآءكِ ویٰسمآء اقلعی) آیت تو وہ بولا بے شک اس کلام سے کبھی معارضہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کلام بشر کا ہو ہی نہیں سکتا۔ (خر پوتی ص ۱۵۹)

قرآن میں جہت اعجاز

علامہ باجوری کہتے ہیں مصنف کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز بشر کو عاجز کر دینا ہے اس کے مثل لانے پر اس کے ایسی فصاحت و بلاغت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جس تک وہ نہیں پہنچ سکتے، تو اس قول کی بنیاد پر قرآن ان کے مقدور کی جنس میں سے نہیں (بلکہ ان امور میں سے ہے جس سے قدرت انسانی عاجز ہوتی ہے) اور یہی جمہور کا قول ہے اور قول ثانی یہ ہے کہ وہ ان کے مقدور کی جنس میں سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے مثل لانے سے انہیں پھیر دیا ہے اور اسی وجہ سے اس کو قول صرفہ سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ اعجاز میں زیادہ داخل ہے اس لئے کہ ان کا ایسی چیز سے عاجز ہونا جو ان کے مقدورات میں سے ہے وہ ان پر حجت قائم کرنے میں زیادہ دخیل ہے کہ وہ اس چیز سے عاجز ہوگئے جو ان کے مقدور کی جنس میں سے ہے! لیکن اس پر یہ لازم آئے گا کہ قرآن کا اعجاز اس کی ذات میں نہیں بلکہ پھیر دینے کی وجہ سے ہے، تو اس قول کی تقدیر پر وہ (قرآن) بذات خود معجز نہیں ہوگا، لہذا حق و صحیح قول اول ہی ہے (حاشية الباجوری ص: ٥٤)

شاعر ذی فہم نے اس شعر کے ذریعہ مسیلمہ کذاب کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے اپنے زعم میں قرآن سے معارضہ کیا جب اس نے دعوئ نبوت کیا تھا اور گمان کیا کہ جبریل اس کے پاس یہ لے کر آئے! تو اس نے سورۂ و النازعات" کا معارضہ کرنے کی غرض سے کہا: " و الطاحنات طحناً و العاجنات عجناً والخابزات خبــزاً" (یعنی آٹا پیسنے والیوں کی قسم، آٹا گوندھنے والیوں کی قسم روٹی پکانے والیوں کی قسم) تو رسوا ہوا: اللہ نے اس میں برکت نہ دی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے نویں شعر کی شرح سے جب ہم فارغ ہو لئے تو اب ہم بعون اللہ تعالیٰ اسی فصل کے دسویں شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۷) لها معانٍ کموج البحر فی مدد وفوق جوهره فی الحسن و القیم

(ترجمہ: آیات حقہ کے معانی سمندر کی موجوں کی طرح ہیں کثرت و زیادتی میں اور حسن و قیمت میں تو سمندر کے جواہر سے بھی بڑھ کر ہیں۔

ربط: یہ جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرما رہے ہیں شاعر ذی فہم کی جانب سے لوٹتا ہے وہیں پر جہاں سے انہوں نے آغاز کیا تھا یعنی معانیٔ قرآن کی اوصاف بیانی کی طرف درمیان میں نظم قرآن کی اوصاف بیانی کرنے کے بعد (یعنی شاعر ذی فہم نے قرآن کی مدح کا آغاز پہلے اس کے معانی کی وصف بیانی سے کیا، چنانچہ دو شعر میں انہوں نے صرف معانی قرآن کی صفت بیان کی یعنی" آیات حق.. الخ اور " لم تقترن.. الخ ان دونوں شعروں میں اور پھر دو شعر وہ ایسے لائے جو معانیٔ قرآن و نظم قرآن دونوں کی صفت ہیں یعنی" دامت لدینا.. الخ " اور " محکمات " لیکن اس کے بعد انہوں نے درمیان میں مسلسل دو شعر صرف نظم قرآن کی صفت میں بیان کئے یعنی" ،ماحوربت.. الخ اور" ردت بلاغتها...الح" تو شروع میں صرف معانیٔ قرآن کی صفت سے آغاز کیا پھر معانیٔ قرآن اور نظم قرآن دونوں کی صفت بیان کی اور درمیان میں صرف نظم قرآن کی صفات بیان کئے اور اب اخیر میں پھر معانیٔ قرآن کی طرف یہ کہہ کر لوٹتے ہیں" لهامعان کموج.. الخ")

تو شاعر ذی فہم شروع سے ہی مختلف اسلوب و انداز میں معانیٔ قرآن کی صفات بیان کر رہے تھے، تو کبھی وہ معانیٔ قرآن کی صفت بیان کرتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ نظم قرآن بھی اس میں شامل ہوتا ہے جیسا کہ انہوں نے اس

شعر میں کیا" دامت لدینا' اور کبھی وہ معانی قرآن کو نظم سے الگ کر کے تنہا ذکر فرماتے ہیں، کسی موقع پر اجمال کے ساتھ اور کسی موقع پر تفصیل کے ساتھ اور تاکید کو معنیٔ جدید کی تاسیس کے ساتھ ملاتے ہیں جیسا کہ ان کے فعل سے اس شعر میں ظاہر ہے، اور اس شعر کا معنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے (قل لو كان البحر مدادا لكلمٰت ربى لنفد البحر قبل ان تنفد كلمٰت ربى ولو جئنا بمثله مددا) گزشتہ اوراق میں اس آیت پاک پر ہم کچھ گفتگو کر چکے ہیں، ہم نے اس فرمان باری تعالیٰ (كلمٰت ربى) کی ایک صورت، شاعر ذی فہم کے مذکورہ ذیل شعر کی شرح کے موقع پر بیان کی تھی:

نبينا الامر و الناهى فلا احد ابر فى قول 'لا' منهٔ و لا نعم

یاد کیجئے! اور اس فرمان باری تعالیٰ میں اور بھی کئی صورتیں ہیں جو مقام کے مناسب ہیں لہذا ہم بیان اعراب اور کلمات کی شرح کے ساتھ اس فرمان باری تعالیٰ کی تفسیر پہلے کریں گے، تو ہم آغاز کلام کرتے ہیں: 'روح البيان' میں ہے: (قل لو كان البحر) یعنی تم فرما دو اگر سمندر کا پانی (مداداً لكلمٰت ربى) میرے رب کی علم و حکمت کی باتوں کے لئے سیاہی ہو یعنی اس کی معلومات اور حکمتوں کے لئے کہ پھر سمندر کے پانی سے ان کو لکھا جائے جیسا کہ سیاہی اور روشنائی سے لکھا جاتا ہے۔ (روح البيان)

تفسیر جلالین میں مذکور ہے: (لكلمٰت ربى) یعنی اس کی باتوں کو لکھنے کے لئے اور اس کے کلمات؛ اس کی حکمتیں اس کے عجائب ہیں اور کلمات ان سے عبارت ہے (لنفد البحر) تو ضرور جنس سمندر کا پورا پانی اپنی کثرت کے باوجود ختم ہو جائے اور اس میں کچھ باقی نہ رہے اس لئے کہ ہر جسم متناہی ہے (قبل ان تنفد كلمٰت ربى) یعنی میرے رب کی باتیں یعنی اس کی معلومات اور حکمتیں ختم نہ ہوں گی اس لئے کہ وہ غیر متناہی ہیں جو ختم ہونے والے نہیں جیسے اس کا علم لہذا کلام کی کوئی دلالت نہیں ہے اس کے ختم ہونے پر سمندر کے ختم ہو جانے کے بعد اور جمع قلت کو اختیار فرمایا گیا جمع کثرت پر جو کہ 'كلم' ہے اس پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ وہ جب قلیل سے مقابلہ نہیں کر سکتا تو کثیر سے کیسے کرے گا (ولو جئنا) اگرچہ ہم موجود سمندر کی طرح اور لے آئیں یعنی اس کے پانی کی

طرح (مددا) زیادہ اعانت کے لئے یعنی تو وہ بھی ختم ہوجائے گا، لیکن کلمات کبھی ختم نہ ہوں گے ان کے غیر متناہی ہونے کی وجہ سے (جلالین)

قلت: جو بیان ہوا اس سے ظاہر ہے کہ لفظ 'قبل' مجاز ہے اور سمندر کے ختم ہونے سے کنایہ ہے بغیر کلمات الٰہی کے ختم ہوئے اور یہی معنیٰ واضح ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان سے بھی: (ولو انما فی الارض من شجرۃ اقلٰم و البحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمٰت اللہ) تو نفس قرآن سے ہی مراد ظاہر و واضح ہے اور قرآن بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

اور ہوسکتا ہے کہ کلمات اللہ سے پہلے مضاف (کتابۃ) مقدر ہو کہ مقام اس کا مقتضی ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ تقدیر یوں ہے 'قبل ان تنفد کتابۃ کلمات ربی" یعنی کلمات الٰہی کی کتابت کے ختم ہونے سے پہلے جیسا کہ جلالین شریف میں مضاف مقدر کیا گیا ہے (لکلمٰت ربی) کی تفسیر کرتے وقت کہ اس میں اس طرح مذکور ہے (الکلمات ربی) یعنی کلمات رب کی کتابت کے لئے الخ جیسا کہ گزر چکا، اس تقدیر پر لفظ 'قبل' اپنے حقیقی معنیٰ پر ہوگا نہ کہ مجازاً کما لا یخفیٰ

حالاں کہ حق یہ ہے کہ کلام مقام فرض و تقدیر میں لایا گیا ہے اور اس تقدیر پر معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے کلمات کو اس کی حقیقت پر واقف ہونے کے بعد لکھنا ممکن ہوجائے اور سمندر ایسی روشنائی ہوجائے کہ ساتوں سمندر اس کو اور زیادہ کریں اور سب پیڑ قلم ہوجائیں، تو ضرور سمندر قلم اور کتاب سب ختم ہوجائیں قبل اس کے کہ وہ اس کی انتہا کو پہنچیں جس کو لکھنے پر وہ لگے ہوئے تھے، لہذا اس تقدیر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا اور نہ ہی حذف مضاف کا دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت رہ جاتی ہے۔

اور اس شعر میں آیات کے قدیم ہونے کی جانب اشارہ ہے! لہذا اس شعر میں ایسی تاکید ہے جو معنیٰ جدید کی تاسیس پر مشتمل ہے، " التاویلات النجمیۃ " میں مرقوم ہے: اگر روئے زمین پر جتنے بھی پیڑ ہیں، قلم ہوجائیں اور اور سمندر سیاہی میں تبدیل ہوجائیں اور اتنی سیاہی کے مقدار کے مطابق ہی کا پیاں خرچ کردی جائیں اور لکھنے والے

اس وقت تک لکھتے رہیں کہ سارے قلم لکھتے لکھتے ٹوٹ جائیں، سمندر ختم ہو جائیں اور کاپیاں بھر جائیں اور لکھنے والوں کی عمریں ختم ہو جائیں (تب بھی) اللہ تعالیٰ کے کلام کے معانی ختم نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ ساری چیزیں اگر چہ کثیر ہیں مگر متناہی ہیں لیکن اس کے کلام کے معانی غیر متناہی ہیں، اس لئے کہ وہ قدیم ہیں اور محدود و متناہی، لامحدود و لامتناہی کو پورا نہیں کر سکتا۔ انتہیٰ

اور آیت پاک میں واضح اشارہ ہے قرآن کے قدیم ہونے کی جانب، اس لئے کہ غیر متناہی ہونا قدیم کی خاصیت میں سے ہے، اور قرآن پاک کے بارے میں آیا ہے " ولا تنقضی عجائبہ " یعنی کوئی بھی قرآن مجید کے معانی عجیبہ اور فوائد کثیرہ کی حقیقت کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا، نیز آیت پاک میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ حکمائے الٰہیہ کے کلمات اور ان کے علوم بھی کبھی منقطع نہیں ہوں گے اس لئے کہ ان کے علوم، حکمت کے چشموں سے جاری ہیں، جس طرح کہ چشمے کا پانی اپنے چشمے سے منقطع نہیں ہوتا، اور کیوں کر منقطع ہو کہ حکیم کی حکمت رب العالمین کی جانب سے تلقین ہے وراس کے خزانوں سے بہہ رہی ہے اور اس کے خزانیں کبھی ختم ہونے والے نہیں جیسا کہ وہ آیت پاک اس پر دال ہے۔

ایک عارف باللہ ایک ایسے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں جو کہ غیر متناہی علوم کے چشمے کے ایک نوک کی مقدار بھر دیا جاتا ہے اور جب زمانے کے تھوڑے سے حصے میں ان کا یہ حال ہے تو مدت عمر میں ان کے حال کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے! (روح البیان ص ۹۵)

علامہ باجوری فرماتے ہیں: (لھا معان) یعنی ان آیات کے اتنے معانی کثیرہ ہیں جنکی کوئی انتہا نہیں بلکہ آیات، ایک دوسرے کے معانی کو اور بڑھاتی ہیں، جیسا کہ شاعر ذی فہم نے اشارہ کیا اپنے اس قول میں (کموج البحر فی مدد) یعنی آیات کے معانی سمندر کی موج کی طرح ہیں اس معنیٰ میں کہ اس کی موجیں بھی ایک دوسرے کو زیادہ کرتی ہیں، اس لئے کہ کوئی موج نہیں آتی مگر اس کے پیچھے دوسری موج ہوتی ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے اس سے ان علماء کے اقوال کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جنہوں نے اس قول کو ہلکا قرار دیا ہے جو علوم قرآن کے

بارے میں کہا گیا کہ اس کے ظاہری معانی مجموعہ میں چوبیس ہزار آٹھ سو علوم ہیں۔(الباجوری ص: ٥٤)

قرآن کے لامحدود عجائب کا اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی تصنیف لطیف سے بیان

قال الازھری: نیز امام ہمام جد کریم یکتائے زمانہ امام احمد رضا نے علم نبی ﷺ کے موضوع پر اپنے بے مثال رسالے مسمیٰ بہ " الدولة المكية بالمادة الغيبية" پر اپنی تعلیق میں اس کی تفصیل جلیل اور تقریر جمیل بیان کی ہے جن ناختم ہونے والے عجائب پر قرآن مشتمل ہے، تو آپ تصریح فرماتے ہیں:

جلیل القدر امام سمین اپنی تفسیر میں پھر علامہ جمل ''فتوحات الٰہیہ'' میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان (مافرطنا فی الكتٰب من شئی) (الانعام: ٣٨) کے تحت تصریح فرماتے ہیں

علماء، کتاب کے سلسلے میں مختلف ہیں کہ آخر اس سے کیا مراد ہے؟ تو ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے اور اس قول پر عموم ظاہر ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہوگا سب تحریر فرما دیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے تو اس قول پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عموم باقی ہے؟ تو بعض علماء نے کہا ہاں عموم باقی رہے گا اور جمیع اشیاء قرآن میں مکتوب ہیں یا تو صراحۃً یا اشارۃً اور بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد خصوص ہے اور معنیٰ ہوگا ہم نے قرآن میں ایسی کوئی شئی اٹھا نہ رکھی جس کی مکلفین کو حاجت ہو۔اھ

اور خازن کے الفاظ یہ ہیں کہا گیا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے یعنی قرآن جمیع احوال پر مشتمل ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:(تفصيل الكتٰب لا ريب فيه) (يونس : ٣٧)

جلالین شریف میں مذکور ہے: تفصیل الکتاب سے مراد، ان احکام وغیر احکام کا روشن بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے، " الجمل " میں ہے: جلالین شریف کے الفاظ کہ وہ روشن بیان ہے اس کا جس کو اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا دیا ہے یعنی لوح محفوظ میں جس کو تحریر فرمایا ہے اس کا روشن بیان ہے۔اھ

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفسیر میں حضرت سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل فرمایا ہر شئی کا روشن بیان اور جو قرآن میں ہمارے

لئے بیان کیا گیا اس میں ہم نے تھوڑا جانا ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (و نزلنا علیك الكتٰب تبیانا لكل شئی) (النحل: ۸۹)

حضرت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور عبداللہ ابن امام احمد نے اپنے والد کی کتاب الزہد کے زوائد میں اور ابن ضریس نے فضائل القرآن میں اور ابن نصر مروزی نے اپنی کتاب 'فی کتاب الله ' میں اور طبرانی نے ' المعجم الكبیر ' میں اور بیہقی نے ' شعب الایمان ' میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ جو علم حاصل کرنا چاہے تو قرآن میں غور وخوض کرے اس لئے کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے'' اور آپ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کہ " فلیثور " (یعنی غور وخوض کرے) میں ان اندھوں کا بہترین رد ہے جو کہتے ہیں کہ ہم قرآن کے اندر، چند اوراق میں کچھ حروف کے علاوہ کچھ نہیں پاتے! آخر وہ علم ماکان ومایکون کا حامل کیسے ہوگیا!! اور اپنی جان کی قسم ان سرکشی کرنے والے معترضوں کا یہ قول، ان سے پہلے مشرکین کے اس قول کی طرح ہے کہ " كیف یسع العالمین الله و احد " کہ سارے جہاں کی وسعت ایک خدا کیسے رکھ سکتا ہے؟ اور بحمد اللہ تعالیٰ میں نے اوہام کو دور کرنے کے لئے اور افہام کے قریب کرنے کے لئے اس کو اپنے رسالے " انباء الحی ان كلامه المصون تبیان لك شئی (۱۳۲۶) میں بیان کر دیا ہے اور وہ تمہیں بس ہے (امام سیوطی نے اسکو " اتقان " کی اٹھہتر ویں نوع میں بیان کیا ہے، " شفا الصدور " میں امام ابن سبع کے حوالے سے کہ انہوں نے فرمایا ہے یقیناً بعض علما نے ایسا کہا ہے۔، ۱۲ منه حفظه جدیدة۔

جو کہ علامہ قاری نے 'مرقاۃ' میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

بعض علماء کا کہنا ہے کہ ہر آیت کے ساٹھ ہزار مفہوم ہوتے ہیں اور حضرت علی كرم الله وجهه سے مروی ہے کہ اگر میں قرآن کی تفسیر سے ستر اونٹ لادنا چاہوں تو میں ضرور ایسا کرسکتا ہوں (۱) اھ

(۱) اسی طرح امام سیوطی نے امام اجل عارف ابن ابی حمزہ عن علی كرم اللـه تعالیٰ وجهه ذکر کیا ہے، ان کے

الفاظ یہ ہیں: لوشئت ان اوقر سبعین بعیرا من (ام القرآن) لفعلت۔
تو علامہ قاری کی عبارت سے ظاہر یہی ہے کہ لفظ 'ام' کاتب کے قلم سے ساقط ہوگیا ہے (یعنی دراصل یوں ہے کہ اگر "ام القرآن" یعنی سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بھرنا چاہوں تو بھر دوں) (۱۲ منہ حفظہ جدیدۃ)
اور شرح بردہ میں علامہ ابراہیم بیجوری کے شروع میں الفاظ یہ ہیں: ہر آیت کے ساتھ ہزار مفاہیم ہوتے ہیں اور جو مفاہم سمجھنے سے رہ گئے وہ بہت زیادہ ہیں اور امیر المومنین کی اثر میں انکے الفاظ یہ ہیں کہ اگر میں چاہوں تو ضرور ستر اونٹ سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے لاددوں۔اھ
اور سیدی امام عبدالوہاب شعرانی کی " الیواقیت والجواھر " میں امام اجل ابوتراب نخشبی سے ہے: کہاں ہیں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کا انکار کرنے والے کہ اگر میں تم سے تفسیر فاتحہ میں کلام کروں تو میں ضرور تمہارے لئے ستر چوپائے بارآور کردوں !اھ
اور عشماوی کی شرح صلاۃ سیدی احمد الکبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سیدی عمر مخضار سے ہے: اگر میں آیت پاک (ما ننسخ من اٰیة) (البقرة: ۱۰۶) کی تفسیر یوں املاً کرانا چاہوں کہ ایک لاکھ اونٹ لد جائیں اور اس کی تفسیر پوری نہ ہو، تو ضرور میں ایسا کرسکتا ہوں۔ اور اسی کتاب میں ابوفضل کے گھرانے کے بعض اولیاء سے مروی ہے ہم نے قرآن پاک کے ہر حرف کے تحت چار لاکھ معانی پائے اور اس کے ہر حرف کے ایک مقام میں جو معانی ہیں وہ دوسرے مقام کے معانی کے سوا ہیں۔
مزید فرماتے ہیں کہ سیدی علی خواص (نفع الله به) نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۂ فاتحہ کے معانی پر مطلع کیا تو مجھ پر اس کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نوسونوے (۱۲۴۹۹۰) علوم منکشف ہوئے۔اھ
" مواھب " پر زرقانی میں ہے: امام غزالی نے اپنی کتاب میں علم لدنی کے متعلق، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمان ذکر کیا ہے "اگر میرے لئے تکیہ لپیٹ دیا جائے تو میں بسم اللہ کی 'ب' کی تفسیر میں ستر اونٹ بھر دوں۔اھ
امام شعرانی کی " میزان الشريعة الكبرىٰ " میں ہے: میرے برادر گرامی افضل الدین نے سورۂ فاتحہ میں سے

دولاکھ سینتالیس ہزارنوسوننانوے (۲۴۷۹۹۹) علوم استخراج فرمائے ہیں پھران سب کو بسم اللہ کی طرف پھیر دیا، پھر بائے بسم اللہ کی طرف اور پھر 'با' کے نقطے کی طرف پھیر دیا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے نزدیک مقام معرفت میں انسان قرآن سے اس وقت تک کامل نہیں مانا جاتا جب تک کہ قرآن کے جمیع احکام اور ان احکام میں مجتہدین کے تمام مذاہب کو حروف تہجی کے جس حرف سے چاہے نکالنے کی صلاحیت نہ رکھے۔اھ

آگے فرماتے ہیں: اوراس بارے میں امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمان ان کی تائید کررہا ہے کہ اگر میں چاہوں تو ضرور تم لوگوں کے لئے 'با' کے نیچے والے نقطے کے علم سے اسی اونٹ لاددوں۔اھ

اقول: ان مثالوں سے سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس فرمان کی حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم جائے تو میں اسے کتاب اللہ میں ڈھونڈ لوں گا، انہی سے حضرت ابوالفضل مرسی نے اس کو روایت کیا جیسا کہ 'اتقان' میں ہے اور حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس فرمان کے ظاہری مفہوم کو، تنگی مقام اور کچھ گمان کی وجہ سے پھیرا گیا اس طرف کہ ان کے قول کا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن میں اس چیز کو پالیتے جو رسی کو پانے کی طرف ان کی رہنمائی کرتی۔

بیت المقدس کی تاریخ فتح کا قرآن سے استنباط

اور یہ جلیل القدر امام جلال سیوطی نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (الم غلبت الروم) (الروم: ۱۔۲) سے یہ استنباط کیا کہ مسلمان بیت المقدس کو پانچ سو تراسی ہجری (۵۸۳ھ) میں فتح کریں گے، اور ان کے کہنے کے مطابق ہی واقع ہوا۔اھ

اقول: ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کا فتح ہونا معلوم ہے اور اسی سن میں مورخین نے ذکر کیا ہے جیسے ابن اثیر نے کامل میں اور رہے امام جوینی تو ان کا انتقال فتح بیت المقدس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ہوگیا تھا چہ جائے کہ وہ امام جن سے امام جوینی نے یہ استنباط نقل کیا تھا! علامہ ابن خلکان نے فرمایا: ابومحمد جوینی کا انتقال ذی قعدہ ۴۳۸ھ میں ہوا ہے اسی طرح سمعانی نے کتاب "الذیل" میں کہا ہے اور "الانساب" میں ہے کہ ان کی وفات چار سو

چونتیس ۴۳۴ھ میں بمقام نیسا پور ہوئی۔اھ

لہذا یہ جملہ کہ "فتح بیت المقدس ان کے کہنے کے مطابق واقع ہوئی" امام سیوطی کے کلام سے ہے نہ کہ امام جوینی رحمهما الله تعالیٰ کے تو پاک ہے وہ ذات جس نے اس امت کو ان کے نبی ﷺ کی بدولت عزت وکرامت بخشی اور اپنی جان کی قسم اگر ان لوگوں سے کہا جائے کہ بتاؤ آخر انہوں نے آیت کریمہ (آلٓمٓ غلبت الروم) سے یہ کیسے استنباط کیا؟ تو ضرور حیرت واستعجاب میں ڈوب جائیں گے اور کچھ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم اپنے جہل کی وجہ سے " حبر الامة " (امت کا سردار لقب حضرت عبداللہ ابن عباس) کے علم پر کیسے حکم لگا سکتے ہیں جن کے لئے نبی اکرم ﷺ نے یوں دعا فرمائی " اللهم علمه الكتاب " اے اللہ اسے کتاب کا علم عطا فرما۔

قرآن میں ہر شئی ہے

اور ابن سراقہ نے کتاب الاعجاز میں امام ابوبکر بن مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عالَم میں کوئی شئی بھی ایسی نہیں جو کتاب اللہ میں نہ ہو۔اھ

سیدی ابراھیم دسوقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات زندگی کے بارے میں " الطبقات الکبریٰ " میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے اگر حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے بند تالوں کو کھول دے تو تم ضرور مطلع ہو جاؤ گے اس پر جو قرآن میں عجائب وحکم اور معانی وعلوم ہیں اور پھر تم اس کے ماسوا میں نظر کرنے سے مستغنی ہو جاؤ گے اس لئے کہ صفحات ہستی میں جو کچھ مرقوم ہے وہ سب اس میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (ما فرطنا فی الکتٰب من شئی) (الانعام: ۳۸) اھ

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفسیر میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام عبدالرحمان بن زید بن اسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (مافرطنا فی الکتٰب من شئی) کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کتاب کو نہیں جانا کہ نہین ہے کوئی شئی ایسی جو اس کتاب میں نہ ہو امام دیلموی 'مسند الفردوس " میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " من اراد علم

الاولین و الآخرین فلیثور القرآن" کہ جو چاہے اگلوں پچھلوں کو جاننا، تو اسے قرآن میں تفتیش کرنا چاہئے حالانکہ اس روایت کو ہم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع میں بیان کر آئے ہیں تو اسی سے ہم نے آغاز کیا تھا اور اسی پر ختم کرتے ہیں (الدولة المكية)

شرح کلمات غریبہ اور بیان وجوہ اعراب:۔

(لھا معان) میں 'لھا" ظرف مستقر، خبر مقدم ہے اور اسے افادۂ حصر اور اہتمام اور اس مبتدا کو خاص کرنے کے لئے مقدم کیا جو کہ نکرہ ہے۔

(معان) مبتدا مؤخر ہے جو' با' پر تقدیری ضمہ کے ساتھ مرفوع ہے اور اس پر تنوین 'یائے' محذوف کے عوض کے طور پر ہے مختلف اقوال میں سے قول اصح پر تنوین 'یاء' کا عوض ہے یا ضمہ کا یا پھر وہ منصرف ہونے کی وجہ سے ہے اور تنوین تعظیم کے لئے ہے جس پر قرینہ شاعر ذی فہم کا یہ قول ہے (کموج البحر فی مدد) اور (موج)' ماج البحر' سے مصدر ہے بمعنیٰ مضطرب ہونا نیز بلند لہروں کے موج مارنے کو کہا جاتا ہے یعنی سمندر کی بلند موجیں اور اس سے کثرت اور بے انتہا کا معنیٰ مراد ہے۔ (مدد) بفتح اول، 'مداد' کی طرح یعنی وہ جس سے شئی کو زیادہ کیا جائے جیسے دوات کے لئے روشنائی اور مدد و نصرت اس لئے کہ سمندر میں ہر موج دوسری موج کو بڑھاتی ہے اور اسی طرح قرآن کہ اس کا بعض کی تفسیر کرتا ہے اور ایک دوسرے کو بڑھاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس ' مد ' سے ہو جو جزر سمندر کا مقابل ہے (یعنی سمندر کے پانی کے اتار کا مقابل ہے اور اس کی ضد سمندر کے پانی کا چڑھنا اور اس کا زیادہ ہونا ہے) تو اس صورت میں کلام میں مضاف مقدر ہوگا یعنی تقدیر یوں ہوگی " فی وقت مدہ" (فوق) لازم النصب ظرف ہے جو محل رفع میں ہے اور آیات کی صفت کے بعد صفت ہے اور تقدیر اس طرح ہوگی " للآیات معان کانت و ثبتت فوق" یعنی آیات کے معانی ثابت و موجود ہیں جو فائق ہیں۔ یا پھر یہ" معان" کی صفت ہے جو ابتدا کی وجہ سے مرفوع ہے اور " جوھرہ" میں ضمیر " بحر" کے لئے ہے۔ (فی الحسن) جار مجرور متعلق ہے معنی زیادۃ'' سے جس کو لفظ 'فوق' متضمن ہے۔ (القیم)' قاف' کے کسرے اور

'یا' کے فتحہ کے ساتھ جمع ہے قیمت کی۔

حاصل معنیٰ: وہ روشن آیتیں کہ جو موصوف بالمعجزات ہیں، ان کی فصاحت وبلاغت سے صرف نظر کرنے کے باوجود بھی ان کے لئے ایسے معانی کثیرہ ثابت ہیں جو کہ کثرت وزیادتی اور کبھی ختم نہ ہونے میں سمندر کی موجوں کی طرح ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا(قل لو کان البحر مدادا لکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی) یعنی کلمات سے مراد ان کے معانی ہیں۔ یا پھر وہ سمندر کی لہروں کی طرح ہیں نصرت وامداد میں اس لئے کہ قرآن کی آیتیں بھی ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں جس طرح کہ سمندر کی موجیں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں اور ان آیات کے لئے ایسے معانی اور احکام حسنہ اور پسندیدہ حکمتیں ہیں جو کہ سمندروں کے جواہرات یعنی لؤلؤ اور مرجان سے حسن وقیمت میں بڑھ کر ہیں ارباب بصیرت اور ماہرین کے نزدیک۔ علامہ قاری نے 'زبدۃ' میں اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ (زبدہ ص۹۴)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے گیارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، ناظم فاہم فرماتے ہیں:

(۹۸) فلا تعدو لا تحصی عجائبها ولا تسام علی الاکثار بالسأم

(ترجمہ: تو آیات حقہ کے عجائب وغرائب لاتعداد و بےشمار ہیں اور ان کی کثرت کے باوجود انہیں اکتاہٹ اور ملول ہونے سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔)

ربط: (گزشتہ شعر میں) شاعر ذی فہم نے آیات قرآنیہ کو سمندر کی موجوں سے کثرت وفروانی (وجہ شبہ) میں تشبیہ دی اور ان کی صفت، تفوق سے بیان کی کہ آیات قرآنیہ سمندر کے جواہرات سے مول اور قیمت میں فائق اور بڑھ

کر ہیں۔تو نبی اکرم ﷺ کی وصف بیانی میں آیات کی کیفیت کی تعریف وتوصیف کرنے اورتشبیہ دینے پر جو معانی مرتب ہوتے ہیں،شاعر ذی فہم اب انہی معانی کی تصریح فرماتے ہیں،تو وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

فلا تعدو لا تحصی عجائبها ولا تسام علی الاکثار بالسام

لہٰذا دونوں مصرعوں میں جو مفہوم بیان کیا گیا ہے ناظم فاہم اس مفہوم کواور زیادہ محفوظ کر کے بطور نتیجہ لائے ہیں نیز یہ کہ آیات قرآنیہ کوموج سمندر سے تشبیہ دینے سے معانی قرآن کے منتھی ہونے کا وجو وہم ہوسکتا تھا اسلئے کہ سمندر کی موجیں منتہی اور ختم ہونے والی ہیں تو اس وہم کو (اس شعر کے پہلے مصرع میں) دفع کیا ہے جس طرح کہ دوسرے مصرع میں کثرت وفروانی کی وجہ سے بے رغبتی اوراکتاہٹ وملول کے وہم کودفع کیا ہے کیوں کہ انسان جو اہرات کی بہت زیادہ کثرت یااس کے بے بہااور بیش قیمتی ہونے کی وجہ سےاس سے منہ موڑ لیتا ہےتو اسی مفہوم کو وہ یوں ادا کرتے ہیں:

فلا تعدو لا تحصی عجائبها ولا تسام علی الاکثار بالسام

تشریح: (فا) برائے نتیجہ ہے۔(لا تعد و لا تحصی) ("عدّ" اور" احصاء" میں ہلکا سافرق بیان کیا جارہاہے کہ:) " عد الشئی " اس صورت میں ہوتاہے کہ جب شئ ایک ایک ہواور " احصاء"اس صورت میں ہوگا جب شئ پوری پوری ہو۔(یعنی معنیٰ ہوگا کہ '' آیات کے عجائب کو نہ تنہا تنہا شمار کیا جاسکتا اور نہ ہی پورا پورا) (عجائبها) میں"عجائب" جمع ہے عجيبة کی کہاجاتا ہے ' العجيبة و المعجبة" یعنی وہ جس سے تعجب ہو" العجاب" وتخفیف اورتشدید دونوں کےساتھ اور " الاعجوبة " بھی اسی معنیٰ میں ہےاور" عجائبها" میں 'ها' کی ضمیر قرآن کی آیات کے لئے ہے،معنی یہ ہے کہ علوم غریبہ اوراسرار عجیبہ اوردقائق لطیفہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آیات قرآنیہ کے عجائب وغرائب گنے اور شمار نہیں کئے جاسکتے،کسی بھی زمان ومکان میں اور نہ ہی کسی وقت وآن میں۔

" زبدة" میں ہے،یعنی آیات کے معانی کوشماراور گنتی میں ہرگز نہیں لایا جاسکتا اور نہ ہی اس کے معانی عجیبہ کو کسی

مکان وحیز میں محیط کیا جاسکتا ہے اور وہ عجائب القرآن، عبرتیں اور حکمتیں ہیں، آداب اور عادتیں ہیں، مواعظ اور دلیلیں ہیں، عوارف ومعارف ہیں، ترغیب وترھیب ہیں، وعدو وعید ہیں، احکام وامثال ہیں وغیرہ ذالک تو کثرت تلاوت سے اکتاہٹ قریب نہیں آسکتی، اس لئے کہ آیات قرآنیہ مشک ختن کے مثل ہیں جتنی بارتم اس کو لگاؤ گے اتنی ہی زیادہ اس سے خوشبو پھوٹے گی اور حدیث پاک میں آیا ہے " لا یخلق عن کثرة الرد ولا تفنی عجائبه ولا تنقضی غرائبه ولا یشبع منه العلماء" یعنی کثرت کے ساتھ تلاوت کرنے سے قرآن پرانا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے عجائب وغرائب کبھی فنا اور ختم ہوسکتے ہیں اور علماء اس سے کبھی سیر نہ ہوں گے۔ (الزبدة ص ۹۰)

(ولا تسام) یعنی کبھی ترک نہیں کیا جائے گا، "سام السائمة" سے بمعنیٰ جانور کو اس کے حال پر چراگاہ میں چرتا چھوڑ دینا اور یہ فعل لازم ومتعدی دونوں طرح آتا ہے " معجم" میں ہے "سامت الماشية" بمعنیٰ چوپائے کا چراگاہ میں جہاں سے چاہنا چرنا اور گھاس پر دائم رہنا۔ " سام الابل و نحوها فی المرعیٰ" کا معنیٰ چراگاہ میں اونٹ وغیرہ جانوروں کو چرتے چھوڑ دینا اور " سام الانسان و نحوه ذلا او خسفا او هوانا" سے اس کا معنیٰ ہوگا ذلت ورسوائی کو انسان پر چاہنا اور ذلیل کرنا یا" ولا تسام" کا معنی یہ ہے کہ آیات سے قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ مشقت میں پڑا جائے گا! اور ضمیر دونوں صورتوں میں آیات کی جانب ہی راجع ہوگی۔ (علی الاکثار) متعلق ہے "لاتسام" سے اور اس میں "علی" بمعنیٰ "مع" ہے جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے (ویطعمون الطعام علی حبه) الاية۔ (الاكثار) بمعنیٰ کوئی شئی کثرت کے ساتھ لانا اور اس پر الف لام مضاف الیہ کے عوض کے طور پر ہے یعنی دراصل یوں ہے " اکثارها" (بالسام) میں "با" افادۂ سبب کے لئے ہے جار مجرور متعلق ہے " لاتسام" سے اور " السام" بفتحتین بمعنیٰ اکتاہٹ اور ملول ہونا اور یہ " سَئِمَ، یَسْأَم سامة و سآما" سے مصدر ہے بمعنیٰ" مل یمل ملا لة و مللا۔

بعض حکماء نے فرمایا ہر آیت کے ستر معانی ہوتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے " ان

هـذا القرآن ذو شجون و فنون و ظهور و بطون " کہ یقیناً یہ قرآن مختلف علوم وفنون اورظاہروباطن معانی والا ہے، اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوسکتے اور نہ ہی اس کی انتہا کو پہنچا جاسکتا ہے اوراس کی تلاوت کرنے والا کبھی اکتا تا نہیں اور بار بار تلاوت کرنے اور سننے سے نہ وہ ملول ہوگا اور نہ ہی کثرت تلاوت سے اس کی آب وتاب اور رونق جاسکتی ہے جیسا کہ مخلوق کے کلام میں ہوتا ہے بلکہ جتنی زیادہ تکرار ہوتی ہے اتنا زیادہ اس کا حسن بڑھتا ہے اورتلاوت کی تکرار علمائے عرب وعجم کی تدریس اور عربیوں اور عجمیوں کی وجہ سے اس کے حروف متغیر نہیں ہوتے بلکہ غلطی درستگی کی طرف پھیردی جاتی ہے جیسا کہ جامع صغیر کی حدیث پاک میں ہے " اذا قـرأ الـقاری فـاخـطـاء ولـحـن اوكان اعجميا كتبه الملك كما نزل " یعنی قاری سے اگرقرآن پاک کی تلاوت کے دوران خطا اور اعرابی غلطی سرزد ہوجائے یا وہ عجمی ہے تو فرشتہ اسے ویسا ہی تحریر کرے گا جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے۔

اوراس شعر کے معنیٰ میں شیخ ابوالقاسم شاطبی کا وصف قرآن کے بارے میں ایک قول ہے جس کی خوبی اللہ ہی کے لئے ہے: قرآن ایک ایسا بہترین ساتھی اور ہم نشین ہے جس کی باتیں اکتاہٹ پیدا نہیں کرتیں بلکہ اس کی تکرار سے اس میں حسن وخوبصورتی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے (خرپوتی ص:۱۶۱)

خلاصہ یہ ہے کہ آیات حسن واعجاب میں جب انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں، تو طبیعت ملول ہوکر اسے چھوڑ نہیں سکتی یعنی جو شخص بھی اس کی کثرت کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ اس سے کبھی ملول نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس کا کمال حسن قلوب میں مؤثر ہوتا ہے، تو اس کی کیفیت یہ ہے جیسا کہ لعین القلب کے نسبت کہا گیا:

يزيدك وجهه حسنا　　　اذ ما زدته نظرا

(رخ مصحف تیرے حسن کو بڑھادے گا اگر تو اس میں نظر وفکر کو برھائے۔)

اوراتنے پر ہی قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے گیارہویں شعر کی شرح تام ہوتی ہے۔ ولـلّـه الحمد اولا و آخرا وصلى الله تعالىٰ على سيدنا محمد وآله وصحبه اجمعين۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٔ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے بارہویں اور تیرہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۹۹) قرت بها عین قاریها فقلت له لقد ظفرت بحبل الله فاعتصم

(ترجمہ: آیات حقہ سے (حب) اس کے قاری کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں تو میں نے اس سے کہا کہ یقیناً تو کامیاب ہوگیا ہے لہذا تو اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے۔)

(۱۰۰) ان تتلها خیفة من حر نار لظی اطفأت حر لظی من وردها الشبم

ترجمہ: (اور میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ) اگر تو جہنم کی بڑھکتی آگ کی گرمی کے خوف سے اس کی تلاوت کرتا ہے تو تو آیات کے گھاٹ کے ٹھنڈے پانی سے جہنم کی بڑھکتی آگ بجھادے گا)

ربط: شاعر ذی فہم مسلسل وصف قرآن اور فضائل قرآن کو مختلف اسلوب و انداز میں بیان کررہے ہیں، وہ قرآن کی ایک فضیلت بیان کر کے معا دوسری فضیلت کی طرف بڑھ جاتے ہیں تو وہ فضائل قرآن بیان کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے گزشتہ شعر میں یہ بیان کرنے کی راہ ہموار کی کہ قرآن کے متعدد فضائل وفوائد ہیں جن کا ثمرہ اور نتیجہ اس کے حق مین نکلتا ہے جو اس کی قرأت کرتا ہے، اس کے نظم کی تلاوت کرتا ہے، اس کے احکام پر عمل کرتا ہے (اس کی نشانیوں کے پیچھے چلتا ہے) اس کے معانی کا قصد کرتا اور جو اس کی اضافت کو حسن قرأت سے پڑھتا ہے، تو وہ اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں:

قرت بها عین قاریها فقلت له لقد ظفرت بحبل الله فاعتصم

ان تتلها خیفة من حر نار لظی اطفأت حر لظی من وردها الشبم

لہذا انہوں نے شعر میں وہ فضیلتیں اور نعمتیں شمار کرائی ہیں جو قاریٔ قرآن پر مرتب ہوتی ہیں۔

تشریح: (قرت) "القرۃ" مصدر سے بمعنیٰ ٹھنڈک کہا جاتا ہے" قرت عینه تقر" فتح وکسرہ کے ساتھ یعنی اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اہل عرب کے نزدیک راحت وسکون سے کنایہ ہے اس لئے کہ ان کے ملک میں بہت گرمی ہوتی تھی، تو ان کے یہاں ٹھنڈک ہی میں راحت وسکون ہے اور اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ وہ" قر قرارا" بمعنیٰ ثابت ہونے سے ہو یعنی قاری کا نفس ثابت ہوگا ی'' تو اس صورت میں'' عین'' سے مجاز مرسل کے طور پر ''نفس'' مراد ہوگا جز ذکر کر کے کل مراد لینے کی قبیل سے (قاریھا) یا تو" قرأ" بالہمز سے بمعنیٰ پڑھنا ہے یا" قرا" بالالف سے بمعنیٰ جمع کرنا ہے اور جائز ہے کہ " قاریھا" سے مراد تابع اور قاصد ہو " قرأت الیه" بمعنیٰ قصد کرنا سے (قارئھا) میں ہمزہ نظم کی وجہ سے ساکن کر دیا گیا اور پھر 'یا' سے بدل دیا گیا لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب " قاریھا" "قرأ" بالہمز سے ہو، حالانکہ یہ بھی جائز ہے کہ " قاریھا" کا معنیٰ " قاصدھا" ہو اور یہ " قرا یقر قروا " سے بمعنیٰ قصد کرنا ہوگا۔

(بھا) متعلق ہے" قرت" سے اور 'با' سببیہ۔(فقلت له) میں 'فا' فصیحہ ہے جو شرط مقدر کو بیان کر رہا ہے، جس کی تقدیر یوں ہوگی" اذا قرت بھا عین قاریھا فقلت له" یعنی جب قاری کی آنکھیں اس سے ٹھنڈی ہوگئیں تو اب میں اس سے کہتا ہوں۔

(لقد ظفرت) میں 'لام' قسم کی تمہید ہے، معنیٰ ہوگا بخدا تو کامیاب ہوگیا ہے، (ظفرت) صیغۂ حاضر پر فعل ماضی ہے اس میں دو صورتیں ہوسکتی ہیں یعنی 'فا' پہ فتحہ یا کسرہ، معنیٰ یہ ہے تو کامیاب ہوگیا اور تو نے مراد کو پالیا۔

(بحبل الله) میں 'با' متعلق ہے" فاعتصم" سے اور حبل اللہ میں استعارہ تصریحیہ ہے اور " فاعتصم" استعارہ کے لئے ترشیح ہے اور استعارہ کا قرینہ حبل کا کلمۂ جلالت (اللّٰہ) کی طرف مضاف ہونا ہے اور 'حبل' (رسی) سے مراد آیات ہیں یا پھر حبل اللہ سے مراد عبداللہ ہے۔

(فاعتصم) یہ شرط محذوف کا جواب ہے اور " اعتصم" امر حاضر کا صیغہ ہے اعتصام سے بمعنیٰ پکڑنا اور یہاں

اعتصام سے مراد اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اس کے مامور بہ کو ادا کرنا اور اس کے منہی عنہ سے باز رہنا ہے۔اور "فاعتصم" معطوف ہے جو انشاء کا اپنے سے پہلے انشاء پر عطف کی قبیل سے ہے اور معطوف علیہ "لقد ظفرت" جملہ انشائیہ قسمیہ ہے۔

(شرح بیت ثانی) (ان تتلها) یہ اس قول کے مقولے کے تحت مندرج ہے جس کا ذکر ابھی گزرا یعنی "فقلت له لقد ظفرت بحبل الله فاعتصم" تو یہ لفظ اعتصامؑ کی گویا تفسیر ہے۔ (تتلها) میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ تلاوت یعنی "تلا يتلوا تلاوة" سے بمعنیٰ تلاوت کرنا پڑھنا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ "تلاه يتلوه" سے بمعنیٰ پیچھے چلنا ہے اس صورت میں معنیٰ ہوگا کہ "اگر تو آیات کے پیچھے چلے گا یعنی اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے گا تو، تو جہنم کی آگ بجھادے گا بہر حال دونوں صورتوں کا احتمال ہے۔ (خيفة) خوف کی طرح بمعنیٰ خشیت مفعول لہ ہے یا حال ہے یا پھر تمیز اور (من) اسی سے متعلق ہے یعنی "خيفة" سے۔

(لظى) جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بر تقدیر ہذا وہ علمیت اور تانیث (دو منع صرف) کی وجہ سے غیر منصرف ہے یا وہ جہنم کا ایک طبقہ ہے، علامہ زمخشری "کشاف" میں فرماتے ہیں:

"لظى" آگ کا نام ہے جو 'اللظى" بمعنیٰ آگ کی خالص لپٹ سے منقول ہے اور شعر میں علم یا اسم جنس ہونے کی بنیاد پر تنوین اور بغیر تنوین دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے اور اسم جنس ہونے کی بنیاد پر تنوین برائے تفخیم وتہویل ہوگی یعنی بڑا بتانے اور خوف دلانے کے لئے ہوگی یعنی وہ "لظى" جس کی حقیقت کو نہیں جانا جاسکتا۔(اطفأت) شرط کی جزا ہے (من) متعلق ہے "اطفات" سے (الورد) مصدر ہے جس کا معنیٰ پانی پر وارد ہونا ہے، اور یہاں "ورد" سے اسم مکان مراد ہے یعنی "ورد" بمعنیٰ "مورد" ہے یعنی پانی کا گھاٹ۔(الشبم) نقطے والی شین کے فتحہ اور غیر مشدد با کے کسرہ کے ساتھ بمعنیٰ ٹھنڈا اور جب ٹھنڈا پانی اس طرح موضع انتفاع میں ہو کہ اس سے راحت اور پاکی اور زندگی حاصل کی جائے، تب لفظ "شبم" کا اطلاق قرآن پر بطریق استعارہ کیا جائے گا، جیسا کہ اس قول میں ہے "رايت من فلان صديقا حميما" کہ اس میں مراد، فلاں کے لئے صداقت اور

دوستی کو بطریق مبالغہ ثابت کرنا ہے یعنی میں نے فلاں کو ایک بہت اچھا دوست خیال کیا۔ اسی طرح یہاں مراد یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن ٹھنڈے پانی کے گھاٹ کی طرح بطریق مذکورہ ہے اور اس میں ایک دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ وہ " لجین الماء" کی قبیل سے ہو یعنی آیات مثل پانی کا گھاٹ ہے اس لئے کہ قرآن اور پانی ان دونوں میں سے ہر ایک حیات انسانی کا سبب ہے کہ علم، پانی کے مشابہ ہے تو جس طرح پانی ابدان واجسام کی زیست کا سبب ہے اسی طرح قرآن ارواح کی حیات کا بدرجہ اولیٰ سبب ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ " من صار حیا بالعلم لم یمت ابداً" کہ جو علم سے زندہ ہو جاتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔

اور شعر میں حضور ﷺ کی ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ترکت فیکم ما ان تمسکتم به فلن تضلوا بداً کتاب الله تعالیٰ و سنة رسوله" یعنی میں تمہارے درمیان وہ چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اس سے متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول (ﷺ) کی سنت۔

احادیث در فضائل قرآن

حدیث میں جو قرآن کے فضائل وارد ہوئے ہیں، ہم انہیں موقع کی مناسبت سے یہاں بیان کر دینا لائق و مناسب سمجھتے ہیں، فـنـقـول: امام ترمذی اور امام دارمی وغیرہ نے حضرت علی سے روایت کیا انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب فتنے پیدا ہوں گے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان سے چھٹکارا پانے کی کیا سبیل ہوگی، فرمایا'' کتاب اللہ کہ اس میں تم سے پہلوں کے قصیں ہیں، تمہارے بعد والوں کی خبریں ہیں اور یہ تمہارے بیچ فیصلہ کرنے والی ہے یعنی وہ فیصلہ کی کتاب ہے کوئی ہنسی کی کتاب نہیں، جو کسی ظالم کی وجہ سے اسے چھوڑ دے گا، اللہ اسے ہلاک فرما دے گا اور جو اس کے سوا کسی اور سے ہدایت چاہے گا اللہ اسے گمراہ فرما دے گا اور وہی اللہ کی مضبوط رسی ہے، وہی حکمت والا ذکر ہے، وہی صراط مستقیم ہے اور وہی ہے جس سے قلوب ٹیڑھے نہیں ہوتے اور نہ زبانیں اس سے مشتبہ ہوتی ہیں اور نہ علماء اس سے سیر ہوتے ہیں اور نہ بار بار دہرانے سے وہ پرانا ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائب کبھی ختم ہو سکتے ہیں، جس نے اس کو بیان کیا جس نے اس کے ذریعہ کوئی بات کہی

سچا ہے اور جس نے اس پر عمل کیا، اجر پائے گا اور جس نے اس کے ذریعہ فیصلہ کیا، عادل ہے اور جس نے اس کی طرف بلایا اس نے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی''۔

امام دارمی نے حضرت عبداللہ ابن عمرو کی حدیث کو مرفوعاً روایت کیا کہ قرآن، اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔

امام احمد اور امام ترمذی نے حضرت شداد بن اوس کی حدیث روایت کی کہ جو بھی مسلمان اپنی خواب گاہ میں لیٹنے کے بعد قرآن پاک کی کوئی سورت پڑھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتے کو وکیل بنا دیتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے تو کوئی تکلیف دہ شئی اس کے بے دار ہونے تک اس کے قریب نہیں آتی۔

امام دارمی حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے روایت کرتے ہیں: جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو وہ فیض نبوت کو قریب کر لیتا ہے اپنے پہلوؤں کے درمیان مگر یہ کہ اس کی طرف وحی نہیں ہو سکتی، حافظ قرآن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ قرآن پڑھنے کی کوشش کرنے والے کے ساتھ کوشش کرے اور جاہل کے ساتھ جہالت کرے، جبکہ اس کے سینے میں کلام اللہ ہے امام بزار نے حضرت انس کی حدیث روایت کی: وہ گھر جس میں قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے کثیر الخیر ہے اور وہ گھر جس میں قرآن پاک نہیں پڑھا جاتا ہے، قلیل الخیر ہے امام طبرانی نے حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا: تین ایسے ہیں کہ انہیں فزع اکبر (بڑی دہشت) ہولنا کی میں نہ ڈال سکے گی اور نہ ان کا حساب کتاب ہوگا اور وہ مشک کے ایک ٹیلے پر رہیں گے جب تک تمام مخلوق کا حساب نہیں ہو جاتا: جو رضائے الٰہی کے لئے تلاوت قرآن کرتا تھا، اور قرآن سے قوم میں فیصلہ کرتا تھا اور وہ اس سے راضی تھے۔۔۔الحدیث

امام احمد وغیرہ عقبہ بن عامر کی حدیث سے روایت کرتے ہیں: ''جس جلد میں قرآن ہوگا اسے آگ نہیں کھا سکتی''

ابوعبیدہ نے فرمایا کہ جلد سے مراد مومن کا دل اور اس کا پیٹ ہے جس میں قرآن ہے۔

امام طبرانی کے نزدیک عصمہ بن مالک کی حدیث یوں ہے اگر قرآن سینے میں محفوظ کر لیا جائے تو آگ اسے نہیں جلا سکے گی۔

اور انہی کے نزدیک سہل بن سعد کی حدیث میں ہے: اگر قرآن دل میں ہوتو آگ اسے چھو نہیں سکتی'' امام طبرانی نے معجم صغیر میں حدیث انس سے روایت کیا: جو قرآن کی صبح وشام تلاوت کرے اس کے حلال کو حلال جانے اس کے حرام کو حرام جانے تو اللہ تعالیٰ اس کے گوشت اور خون کو آگ پر حرام فرمادے گا اور اسے صالحین کے ساتھ کردے گا یہاں تک کہ جب قیامت کا دن آئے گا تو قرآن اس کی دلیل ہوگا۔

ابوعبیدہ نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کیا: قرآن ایسا سفارشی ہے جس کی سفارش مقبول ہے اور ایسا باعظمت ہے جو تصدیق کرنے والا ہے((ا)اسی طرح امام سیوطی کی "اتقان فی علوم القرآن" کے اس نسخے میں ہے جو ہمارے پاس موجود ہے شاید وہ "شاھد صدق" ہے یعنی سچ کی گواہی دینے والا۔) جو اس کو اپنے سامنے رکھے گا تو وہ اسے جنت لے جائے گا اور جو اسے اپنے پیچھے رکھے گا تو وہ اسے جہنم کی طرف ہانک دے گا۔

امام طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کی: حاملین قرآن جنتیوں میں سے عارفین ہوتے ہیں۔

نسائی اور ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن الصحابة اجمعین روایت کی: اہل قرآن وہ اہل اللہ اور اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔

امام طبرانی نے " اوسط " میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے بیان کیا: جو شخص بھی اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم دے گا تو کل قیامت کے دن اسے جنت میں تاج پہنایا جائے گا۔ ابوداؤد اور احمد الحاکم نے حضرت معاذ بن انس کی حدیث بیان کی جس نے قرآن پڑھا تو پورا پڑھا اور اس پر عمل کیا، تو کل قیامت کے دن اس کے والد کو تاج پہنایا جائے گا!

اگر وہ تاج تم میں ہوتا تو اس کا نور دنیا کے گھروں میں سورج کے نور سے بڑھ کر ہوتا، تو اس شخص کا کیا کہنا جس نے اس پر عمل کیا۔!!

اقول: امام شاطبی نے اس حدیث پاک کے معنیٰ کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ فرماتے ہیں:

هـنيـئـا مـريـئـا والـداك عـليهـمـا　　مـلابـس انـوار مـن التـاج والحلـى

فـمـا ظـنـكـم بـالبـخـل عـنـد جـزائـه　　اولٰـئك اهـل الـلـه والـصـفـوة المـلا

قلت: امام شاطبی کے شعر سے ظاہر یہ ہے کہ مناسب معلوم ہوتا کہ حدیث کے الفاظ " البـس والده " کے بجائے " البـس والداه " صیغۂ تثنیہ پڑھوں (یعنی اس کے صرف والد ہی کو نہیں بلکہ والد و والدہ دونوں کو قیامت کے دن تاج پہنایا جائے گا۔)

امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام احمد نے حضرت علی کی حدیث روایت کی: جس نے قرآن پڑھ کر یاد کر لیا، پھر اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے خاندان کے دس ایسے لوگوں کے سلسلے میں اس کی سفارش قبول فرمائے گا جن کے لئے جہنم لازم ہو چکی ہوگی۔

امام طبرانی نے " اوسط " میں حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا: جس نے اپنے سینے میں قرآن جمع کیا تو اللہ کی بارگاہ میں اس کی ایک دعا مستجاب ہے، اب وہ چاہے اس دعائے مستجاب کو دنیا مین جلد استعمال کر لے یا چاہے تو اسے اپنے لئے بچائے رکھے آخرت میں۔

شیخین وغیرہ نے حضرت ابوموسیٰ کی حدیث اپنی سند کے ساتھ روایت کی: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے ''اتـرج " (سنترے کی طرح ایک خوشبودار) پھل کی طرح ہے، اس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور مزہ بھی اچھا ہے اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا کھجور کی سی ہے کہ اس کا مزہ تو اچھا ہے مگر اس کی کوئی خوشبو نہیں اور اس فاجر کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے خوشبودار پودھے کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی ہے مگر مزہ کڑوا ہے اور اس فاجر کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کے پھل کی طرح ہے کہ جس کا مزہ بھی کڑوا ہے اور اس کی کوئی خوشبو بھی نہیں۔

مذکورہ بالا حدیث میں وارد مفہوم کو امام شاطبی نے شعر میں اس طرح تعبیر کیا ہے:

وقـارئـه الـمـرضـی قـر مثـالـه　　كـلا تـرج حـاليـه مـريحـا و موكلا

و بـعـد فـحبـل الـلـه فينـا كتـابـه　　فـجـاهـد بـه حبل العـدى متـحبلا

(مقبول بارگاہ الٰہی قاریٔ قرآن کی مثال اترج پھل کی طرح ثابت ہوئی ہے، جس کی حالت خوشبودار اور مزیدار ہے۔تو اللہ کی رسی ہمارے درمیان اس کی کتاب ہے، لہذا اس کے ذریعہ جماعت کی رسی کو پکڑنے کی کوشش کرو۔)
(قر مثاله) یعنی اس کی مثال ثابت ہوئی۔ (حاليه) یعنی" حلوه" (مریحا) یعنی تم اس میں خوشبو پاؤ گے، (موكلا) یعنی پھل دار، (متحبلا) " تحبلت الدابة" سے ہے یعنی گابھن ہونے میں جانور کے پایوں کا چمٹ جانا، یا وہ " تحبل الصيد حبلة" سے ہے یعنی شکار کے لئے پھندا لگانا اور اس کے ذریعہ اس کا شکار کرنا۔

شیخین نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان کی حدیث روایت کی: تم میں سب سے بہتر اور ایک روایت میں ہے تم میں سب سے افضل وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' امام بیہقی نے " الاسماء" میں اضافہ کیا: قرآن کی فضیلت تمام کلام پر ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت تمام مخلوق پر'' امام ترمذی اور امام حاکم نے اپنی سند صحیح کے ساتھ حضرت عبد اللہ ابن عباس کی حدیث روایت کی بے شک وہ جس کے پیٹ میں کچھ بھی قرآن نہ ہو ویران گھر کی طرح ہے'' اور ابن ماجہ نے حضرت ابوذر کی حدیث اپنی سند سے روایت کی: تمہارا صبح جا کر قرآن کی ایک آیت سیکھنا تمہارے لئے سو رکعات نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابن عباس کی حدیث اپنی سند سے روایت کی: جس نے کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کی پھر اس کی پیروی کی جو اس میں ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے سبب گمراہی سے ہدایت نصیب فرمائے گا اور قیامت کے دن اسے برے حساب سے محفوظ رکھے گا'' ابن ابی شیبہ نے حضرت ابوشریح الخزاعی کی حدیث روایت کی: بے شک یہ قرآن ایک رسی ہے جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے لہذا اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو تو یقیناً تم اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور نہ کبھی ہلاک ہو گے۔

امام دیلمی حضرت علی کی حدیث روایت کرتے ہیں:

''حاملین قرآن اللہ کے سایۂ رحمت کے تلے ہوں گے جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا۔''

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث روایت کی: قیامت کے دن حافظ قرآن آئے گا تو قرآن کہے گا اے رب اسے زیور پہنا تو اسے تاج کرامت پہنا دیا جائے گا، تو وہ پھر کہے گا اے رب اسے زیادہ عطا فرما دے، اے رب تو اس سے راضی ہو جا تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو جائے گا۔

اور اس سے کہا جائے گا: " اقــرأ و ارق " کہ قرآن پڑھتا جا اور اپنے درجات بلند کرتا جا اور اس کے لئے ہر آیت کے بدلے نیکی بڑھا دی جائے گی۔

انہوں نے حضرت عبداللہ ابن عمر کی حدیث روایت کی: ''روزے اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے۔''

نیز انہوں نے حضرت ابوذر کی حدیث روایت کی: بے شک تم اللہ کی بارگاہ میں کوئی بھی شئی ایسی لے کر نہ لوٹو گے جو کہ اس کی جانب سے نکلے ہوئے کلام یعنی قرآن سے زیادہ افضل ہو۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے چودھویں اور پندرھویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۰۱) کانھا الحوض تبیض الوجوه به   من العصاة و قد جاؤہ کالحمم

(ترجمہ: (آیات حقہ گویا حوض (کوثر) ہیں کہ جس سے گنہگاروں کے چہرے روشن ومنور ہوں گے حالانکہ وہ اس کے پاس کوئلے کی طرح سیاہ آئیں گے۔)

(۱۰۲) وکالصراط وکالمیزان معدلة   فالقسط من غیرھا فی الناس لم یقم

(ترجمہ: (نیز آیات حقہ) پل صراط کے مشابہ ہیں اور عدل و انصاف کے اعتبار سے میزان کی طرح ہیں، لہذا

لوگوں کے درمیان اس کے بغیر انصاف قائم نہیں رہ سکتا)

ربط: شاعر ذی فہم آیات کے ساتھ مختص فضائل کو بیان کرنے کے بعد جب اس کے قاری پر مرتب ہونے والے فضائل وفوائد کے بیان تک آ پہنچے، تو انہوں نے وہ فوائد عمومی طور پر سب گزشتہ شعر میں بیان کر دیئے اور اب وہ اس کے بعض فوائد کی تفصیل دو شعروں میں بیان کر رہے ہین لہذا وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

کانها الحوض تبيض الوجوه به من العصاة و قد جاؤه كالحمم

شاعر ذی فہم نے مذکورہ بالا دونوں شعروں کا مفہوم اس حدیث پاک سے لیا ہے، جس کا بیان فضائل قرآن میں گزر چکا ہے کہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت مقبول ہے اور (اپنے احکام کے نافرمانوں کی) شکایت کرنے والا (اور مطیعوں کی) تصدیق فرمانے والا ہے۔ اور انہوں نے شعر میں ذکر کردہ اس ماخوذ معنیٰ کی تعبیر بطور تشبیہ کی، کہ وہ فرماتے ہیں: ''کانھا الحوض۔۔۔اھ''

تشریح: (کان) برائے تشبیہ ہے اور اس کی ضمیر آیات کی ہے۔ (الحوض) اس سے مراد حوض کا پانی ہے لہذا اس میں مضاف محذوف ہے یا مجاز مرسل کے طور پر حوض ذکر کر کے پانی مراد لیا گیا ہے محل ذکر کر کے حال مراد لینے کی قبیل سے اور اس سے مراد یا تو جنس حوض ہے یا پھر اس سے مراد حوض کوثر ہے جو کہ جنت میں ایک نہر ہے جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، وہ چھوٹے بڑے موتیوں کی چٹان پر بہہ رہی ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے ہیں۔

روایت کی جاتی ہے کہ گنہگار کو جہنم میں عذاب دینے کے بعد نکالا جائے گا اور پھر اسے جلے بھنے سیاہ حالت میں جنت میں داخل کیا جائے گا، تو وہ اس کا پانی پیئے گا اور اس کے پانی میں تیرے گا جس کی وجہ سے اس کا گوشت اگ جائے گا، اس کے اعضا متناسب ہو جائیں گے اور اس کا چہرہ مثل چودھویں کے چاند دمک اٹھے گا۔ اسی طرح شیخ زادہ نے بیان کیا ہے (شیخ زادہ ص۱۶۴)

(تبيض الوجوه به) میں " تبیض " کا جملہ حوض کی صفت ہے یا اس سے حال واقع ہے یا پھر وہ جملہ مستأنفہ

ہےاور " الـوجوہ" سے بحذف مضاف " ذو الـوجوہ" مراد ہےاوراس میں حذف سے مجاز ہے یا پھر وہ بر سبیل مجاز مرسل جز بول کرکل مراد لینے کے قبیل سے ہے۔" بـہ" متعلق ہے" تبیض" سے، 'بـا' سببیہ ہےاور ضمیر حوض کی ہے۔ (مـن العصاۃ) میں " من" بیانیہ ہےاور " مـن الـعصاۃ" یہ " الوجوہ " کی صفت ہے یاحال واقع ہےاور" عـصــاۃ" یہ عاصی کی جمع ہے(بمعنیٰ گنہگار)اس سے مراد وہ گنہگار ہیں جوآپ ﷺ کی شفاعت کے سبب سے جہنم سے نکالے جائیں گے۔(وقد جاءوہ) یعنی اور حال یہ ہوگا کہ گنہگار عذاب سے نکل کرحوض کے پاس آئیں گے یا وہاں سے سیدھے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضرآئیں گے،لہذا معلوم ہوا کہ اس میں" واو" حالیہ ہےاور فاعل کی ضمیر راجع ہے " الـعـصاۃ" (گنہگار) کی جانب اور مفعول کی ضمیر راجع ہے " الحوض " کی جانب یا نبی اکرم ﷺ کی طرف۔

(کــالـجمم) یہ محل نصب میں حال واقع ہے یعنی گنہگار سرکار کی بارگاہ میں اس حالت میں حاضر ہوں گےاوراس حال میں حوض کوثر پر وارد ہوں گے کہ وہ کوئلے کی طرح کالے جلے بھنے ہوئے ہوں گے۔" الــحـمـم" جمع ہے " حممۃ" کی بمعنیٰ کوئلہ اور راکھ اور ہر وہ چیز جوآگ سے جلادی گئی ہو۔

شرح بیت ثانی: (کالصراط) یعنی یہ آیات حقہ،سیدھی اور مستقیم ہونے میں صراط یعنی راستے کی طرح ہیں استقامت کی تمیز کومعنیٰ صراط کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے حذف کرلیا گیا ہے۔" الـصراط" 'صاد'اور 'سین'اور'زا' تینوں کے ساتھ ایک ہی معنی ہے،(راستہ)

صراط کا معنیٰ

لہذا اس میں تین لغات ہیں اوراس سے مراد وہ دین ہے جس میں پیچ وخم نہیں اور وہ دین حق ہے یا اس سے مراد وہ مشہور ومعروف پل صراط ہے جوجہنم کی پیٹھ پر بچھایا گیا ہے جو کہ بال سے زیادہ باریک،تلوار سے زیادہ تیز ہے، جنتی اس کو پار کرلیں گےاور جہنمیوں کے قدم اس پر سے پھسل جائیں گےاور پھر فرشتوں کی ایک جماعت زبانیہ ان کوجہنم کے کتوں اور درندوں سے ہانک کر جہنم میں لے جائے گی اور پل صراط کے دونوں کناروں پر ملائکہ

ہوں گے جو کہہ رہے ہوں گے " اللھم سلم " اور کچھ لوگ اس پر سے چندھیا دینے والی بجلی کی طرح گزر جائیں گے اور کچھ تیز آندھی کی طرح اور کچھ تیز رفتار گھوڑے کی طرح اور کچھ رینگتے گھسٹتے ہوئے پار کریں گے وغیرہ ذالک حالات جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں یا یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے حق میں کشادہ ہے اور کچھ کے حق میں اس کے برخلاف تنگ ہے اور لوگ اس پر سے اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت کی طرف جائیں گے۔

(وکالمیزان معدلة) میزان (ترازو) کہتے ہیں اس کو جس سے لوگوں کے اعمال کی مقدار معلوم کی جائے، حالانکہ عقل اس کی کیفیت کے ادراک سے قاصر ہے اور ایک قول یہ ہے کہ میزان پر نامۂ اعمال کا وزن کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ نیکیوں کو اجسام نورانیہ اور برائیوں کو اجسام ظلمانیہ بنا دیا جائے گا (اور اجسام ہو جانے کے بعد ان کا وزن کیا جائے گا) اور ایک قول یہ ہے کہ بندے کو ایک مرتبہ اس کے نیک اعمال کے ساتھ تولا جائے گا اور دوسری مرتبہ برے اعمال کے ساتھ۔

(معدلة) یہ 'کالمیزان' میں جو تشبیہ دی گئی ہے اس کی تمیز ہے اور " معدلة " یہ مصدر میمی ہے یا اسم آلہ ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ آیات حقہ میزان کے مشابہ ہیں عدل وانصاف کرنے میں لہذا اس میں معتزلہ کا رد ہے جیسا کہ ان کے اس قول (کالصراط) میں بھی ان کا رد ہے اس لئے کہ وہ پل صراط اور میزان کا انکار کرتے ہیں اور میزان کے انکار میں کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فائدہ اور غرض نہیں جیسا کہ پل صراط کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح کے پل سے عبور کرنا ممکن ہی نہیں ہے لہذا اس کا ایجاد کرنا بے کار اور عبث ہے اور اگر ممکن مان بھی لیا جائے تو اس میں انبیائے کرام اور مومنین کی تعظیم ہے کہ اس کو پار کرنا ممکن ہے ان کے لئے اور انبیاء اور مومنین اس پر سے بلا مشقت آسانی سے گزر جائیں گے۔

لفظ قسط کی تحقیق

(فالقسط) میں 'فا' 'واؤ' کی طرح محض عطف کرنے کے لئے ہے اور 'قسط' مصدر ہے " قسط فلان یقسط قسطا " سے بمعنیٰ عدل وانصاف کرنا اور " قسطا و قسوطا " مصدر سے بمعنیٰ ہٹ جانا اور حق سے

پرے ہوجانا اور اسی طرح" المصباح المنیر" میں ایک صورت پر اختصار کیا گیا ہے یعنی مضارع میں کسر سین کے ساتھ، تو انہوں قسط قسطا و قسوطا کو باب ضرب سے ذکر کیا ہے بمعنیٰ ظلم کرنا نیز بمعنیٰ انصاف کرنا تو معلوم ہوا کہ وہ اضداد میں سے ہے اور شاید کہ وہ لغت سے مشہور اور کثیر الاستعمال ہے۔''القاموس'' میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ بضم سین باب نصر ینصر سے آتا ہے اور اس میں ہے کہ " القسط" بکسر قاف بمعنیٰ عدل کرنا آتا ہے، ان مصادر سے جو اس سے موصوف ہوں عدل کی طرح کہ اس میں واحد، تثنیہ اور جمع سب برابر ہوتے ہیں (یعنی یہ واحد تثنیہ اور جمع سب کی صفت ہوسکتا ہے) کہا جاتا ہے " میزان قسط" میزانان قسط" اور موازین قسط" قرآن پاک میں آیا ہے (ونضع الموازین القسط لیوم القیامة) اور یقسِط بکسر سین اور یقسُط بضم سین اقساط کی طرح عدل کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے اور بمعنیٰ حصہ و نصیب بھی آتا ہے۔ تو وہ ایک معنی میں دو صورتیں لائے یعنی ایک معنی عدل و انصاف کرنا بیان کیا اور پھر افادہ کیا کہ وہ " جور" یعنی حق سے ہٹ جانے کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے: اس طرح کہ انہوں نے یوں ذکر کیا " قَسَط یقسِط قِسطا و قُسُوطا" بمعنیٰ جار و عدل عن الحق یعنی حق سے ہٹ جانا اور ظلم کرنا جیسا کہ ان کے علاوہ دوسرے اہل لغات نے افادہ کیا کہ " قسط یقسط" باب ضرب سے دو معنیٰ میں آتا ہے: لہذا وہ اضداد میں سے ہے (یعنی دونوں معنی ایک دوسرے کی ضد ہیں)' المصباح المنیر" میں اس کی صراحت موجود ہے۔

لہذا مذکورہ بالا نقول سے ظاہر ہوگیا کہ علامہ خرپوتی نے قَسَط یقسُط من باب نصر اور قسط یقسِط من باب ضرب کے درمیان فرق ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ اس کے برخلاف ہے جو " القاموس" وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا افادہ کرتے ہیں کہ قسط یقسط باب نصر سے بھی بمعنیٰ عدل کرنا آتا ہے اور اسی وجہ سے ابھی شروع میں بتایا گیا کہ قسط یقسط و یقسط دونوں صورتوں میں عدل کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے، نیز قاموس میں یہ کہہ کر اسے مزید مؤکد کر دیا کہ وہ الاقساط کی طرح ہے (عدل کرنے کے معنیٰ میں) اور

یہ سب باتیں لغات کے بیان کے مطابق ہیں، لیکن رہا صرف معنی عدل میں اس کا استعمال تو وہ چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ لفظ قاسط بمعنیٰ جائر وظالم مستعمل ہے جیسا کہ قرآن پاک اس کی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (واما القٰسطون فکانوا لجہنم حطبا) اور باب افعال اس کا مزید فیہ بمعنیٰ عدل کرنا مستعمل ہے اللہ فرماتا ہے (واقسطوا) اور اسی وجہ سے امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح کے آخر میں فرمایا: قسط کو' مقسط' (منصف) کا مصدر کہا جاتا ہے لیکن رہا قاسط تو وہ بمعنیٰ جائر (ظالم) ہے۔

(من غیرھا) ظرف مستقر صفت ہے 'القسط' کی اور اس میں ضمیر آیات کی ہے۔(فی الناس) متعلق ہے (لم یقم) سے اور " فی الناس " کو " لم یقم " پر ضرورت شعری کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے یا پھر وہ " القسط " سے متعلق ہے۔ بہر حال معنی ہوگا کہ وہ عدل وانصاف جو لوگوں کے درمیان (رائج اور معروف) ہے وہ (بغیر اس کے) قائم ودائم نہیں رہ سکے گا اور اس کے بغیر وہ متحقق وثابت نہیں ہوسکتا۔

حاصل معنیٰ: بے شک یہ روشن آیتیں قیامت کے دن گنہگاروں کی اس طرح شفاعت کریں گے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر کا پانی جہنم سے نکلے ہوئے گنہگار مومنوں کو دار القرار یعنی جنت میں داخل ہونے سے پہلے اچھا کر دے گا ان کے سیاہ چہروں کو روشن ومنور کر کے۔ اس شعر میں آقا علیہ السلام کے اس فرمان کی جانب تلمیح ہے جس کا ذکر فضائل قرآن میں گزر چکا کہ " ان القرآن شافع مشفع وما حل مصدق " یعنی قرآن پاک قیامت کے دن گناہ صغیرہ وکبیرہ کے مرتکبین کی شفاعت کرنے والا ہے اور اس پر عمل کرنے والوں اور اس کی تلاوت کرنے والوں کے درجات بلند کرنے والا ہے اور وہ شاکی بلیغ ہے اور اپنی اس شکایت کرنے میں مصدق ہے یعنی وہ ان لوگوں کی شکایت کریگا جو اس کو ضائع کر دیں گے، اس پر عمل نہ کر کے، اس کی تلاوت نہ کر کے، اس کو بھلا کر اور اس کو ترتیل کے ساتھ نہ پڑھ کر اور وہ اس شکایت کی تصدیق بھی کرے گا، امام زہری سے مروی ہے جس بندے کے خلاف اس کی کوتاہیوں کی گواہی قرآن دے دیگا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

بیت ثانی کا حاصل معنیٰ: بے شک آیات بینات، حق وباطل کی تمیز میں پل صراط کے مشابہ ہیں نیز

عدل وانصاف اور دفع خصومات کے اعتبار سے میزان کی طرح ہیں اور جب وہ ایسے ہی ہیں تو دنیا میں لوگوں کے درمیان اس قرآن کے علاوہ کسی اور شئی سے عدل چاہنا اور کتاب اللہ سے براہ راست استعانت کرنے والی شئی (سنت رسول) کے علاوہ کسی اور چیز سے انصاف چاہنا ہرگز قائم و ثابت نہیں رہ سکتا، لہذا دنیا کا قیام اور دنیا مین رہنے والوں کا قوام صرف عدل وانصاف سے ہے اور عدل وانصاف شریعت سے قائم ہے اور شریعت قرآن سے قائم ہے تو اگر آیات قائم نہ ہوں تو دنیا ہی قائم نہیں رہ سکتی اور نہ ہی مخلوق کے اختلافات وخصومات رفع و دفع ہو سکتے ہیں۔ (خرپوتی ص ۱۶۵، ۱۶۶)

خاتمہ: ہماری جانب سے گزر چکا ہے کہ ہم نے گزشتہ اوراق میں، فضائل قرآن کے سلسلے میں ' اتقان ' سے ایک یہ حدیث ذکر کی تھی "شافع مشفع ماجد مصدق " کہ قرآن قیامت کے دن ایسا شافع ہے جس کی شفاعت مقبول ہے ایسا باعظمت ہے جو تصدیق کرنے والا ہے اور حدیث کے الفاظ کے علاوہ " ماحل مصدق " جو آیا ہے اس کے بھی معنیٰ صحیح پر ہم واقف ہوئے ہیں لہذا قارئین کرام کو بھی اس سے آگاہ وباخبر ہو جانا چاہئے۔ (دراصل حدیث میں دو طرح کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، ایک میں لفظ " ماجد " آیا ہے اور دوسرے میں لفظ " ماحل "، ایک نوعیت کی پوشیدگی تھی، وہ یہ کہ " ماحل " کا معنیٰ لغت مین: تہمت لگانے والا، بہتان تراشی، قطع زدہ اور شکایت کرنے والا ہے، لہذا ایک معنیٰ پر اسے محمول کر کے حضرت تاج الشریعہ نے اس کی توجیہ فرمادی، چوں کہ " ماحل " کے باقی اور معانی قرآن مجید کے شان کے لائق نہیں اور بیان کر دیا گیا کہ " ماحل مصدق " کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن کل قیامت کے دن ان لوگوں کی شکایت کرے گا جنھوں نے اسے ضائع کیا تھا اور انہوں نے اسے اس طرح ضائع کیا کہ انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، یا اس کی تلاوت نہ کی یا اس کو بھلا دیا یا پھر اس کو ترتیل کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر نہیں پڑھا اور قرآن اس شکایت کی تصدیق بھی کرے گا " تو " ماحل مصدق " کا ایک یہی معنیٰ ہو سکتا ہے۔ فقیر ارسلان رضا قادری غفرلہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ شریف کی فصل سادس کے سولہویں اور سترہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جا رہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۰۳)لا تعجبن لحسود راح ینکرها تجاهلا وهو عین الحاذق الفهم

(ترجمہ: تو ہرگز حاسد سے متعجب نہ ہونا جو تجاہل عارفانہ کر کے (آیات حقہ کا منکر ہو گیا ہے حالاں کہ وہ ماہر خوب سمجھدار ہے۔

(۱۰٤)قد تنکر العین ضوء الشمس من رمد و ینکر الفم طعم الماء من سقم

(ترجمہ: کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھ آشوب چشم کی وجہ سے سورج کی روشنی کا ہی انکار کر دیتی ہے اور کبھی منھ پانی کے ذائقے کا بیماری کی وجہ سے منکر ہو جاتا ہے۔)

ربط:۔ شاعر ذی فہم گزشتہ سے پیوستہ فصل سادس کے ان دو آخری شعروں میں ایک سوال مقدرہ کا جواب دے رہے ہیں؛ وہ سوال مقدرہ یہ ہے کہ آیات حقہ جب اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں تو پھر بہت سارے کافروں سے ان کے من جانب اللہ ہونے کا انکار کیسے صادر ہو گیا نیز ان آیات کو لانے والے کی صحت نبوت پر ان کی دلالت کا انہوں نے کیوں کر انکار کیا؟ لہذا ناظم اس کا یوں جواب دیتے ہیں:

لا تعجبن لحسود راح ینکرها تجاهلا وهو عین الحاذق الفهم

قد تنکر العین ضوء الشمس رمد و ینکر الفم طعم الماء من سقم

حاصل جواب: کفار ان آیات کا انکار حسد و عناد میں کرتے ہیں حالانکہ ان کے دل کو ان آیات کا یقین ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (وجحدوا بها و استقنتها انفسهم) لہذا اے سننے والے

(کسے باشد) کوئی وجہ نہیں ہے کہ تو تعجب کرے، باوجودیکہ تو واقف ہو چکا ہے کافروں کے حسد وعناد پر جو کہ ان کے انکار اور تجاہل عارفانہ کی وجہ سے ہے اس لئے کہ وہ اسی طرح ہے جو کہا گیا کہ جب سبب اور وجہ ظاہر ہو جاتی ہے تو تعجب ختم ہو جاتا ہے۔

تشریح: (لا تعجبن) یعنی تعجب کرنا مناسب نہیں اور تعجب اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی شئی کے سبب جہالت کے وقت انسان کو پیش آتی ہے۔

(حسود) اس سے مراد ذو الحسود، (یعنی حاسد) ہے اور حسد کہتے ہیں کہ کسی دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنے کو یا تمنا کرنا کہ وہ نعمت اس کی طرف پھر آئے اور "غبطہ" کہتے ہیں کسی دوسرے کی نعمت کے مثل اپنے لئے تمنا کرنا بغیر اس سے زوال نعمت کی تمنا کئے ہوئے۔

اور 'حسود' سے مراد دشمن اور معاند ہے۔ (راح) فعل ناقص بمعنیٰ صار ہے اور اس کا اسم ضمیر متصل ہے جو فعل میں پوشیدہ ہے اور "ینکرھا" محل نصب میں اس کی خبر ہے اور یہ سب مل کر (یعنی 'راح' فعل ناقص اپنے اسم وخبر سے مل کر) صفت ہوگی "حسود" کی۔ "راح" کا معنی اصل میں رات میں چلنا ہے اور پھر (بغیر وقت کی تخصیص کے مطلقا) جانے کے معنیٰ میں مستعمل ہو گیا، بہرحال مراد یہ ہے کہ کافر نے اس شئی کا انکار کیا جس کی دلالت اتنی ظاہر واضح ہوئی کہ وہ شئی اشیائے محسوسہ کی طرح ہو گئی ہے کہ نصف نہار جو کہ جانے کا اول وقت ہے، میں حاسۂ بصر سے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ (باجوری ص ۵۷)

تو اس بنیاد پر "راح" بمعنیٰ "ذھب" ہے اور اس میں ضمیر مستتر فاعل ہے اور "ینکرھا" محل نصب میں "راح" سے حال واقع ہے اور "تجاھل" کہتے ہیں جہل نہ ہونے کے باوجود جہل کا اظہار کرنا اور وہ حال ہونے کی بنیاد پر منصوب ہے یعنی متجاھلاً ہے یا پھر مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

(وھو عین الحاذق محل نصب میں جملہ حالیہ ہے، تو "واؤ" حال کیلئے ہے اور "عین" کو افادۂ تاکید کے لئے دو متلازم کلموں کے درمیان داخل کر دیا گیا ہے۔ اور "حاذق" کا معنیٰ ماہر ہے اور "الفھم" کہنے کے قرینے سے

حاذق یہاں بمعنیٰ قدرتی ماہر ہے تا کہ تجربہ کار ماہر۔ (الفهم) صفت مشبہ ہے اور یہ "فاهم" سے زیادہ بلیغ ہے اس لئے کہ اس میں جو مبالغہ ہے وہ فاہم میں نہیں، تو "فهم" کا معنیٰ تیز سمجھدار ہے اور معنیٰ یہ ہوگا کہ حاسد اس کا منکر ہو گیا حالاں کہ وہ صناعت بلاغت میں خوب ماہر تھا اور خواص تراکیب اور مقتضیات احوال کو بہت تیزی سے سمجھنے والا تھا۔

شرح بيت ثاني: (قد تنكر) الا نكار مصدر سے ہے اور "قد" یا تو افادۂ تقلیل کے لئے ہے یا برائے افادۂ تحقیق ہے اور جملہ "تنكر"، ان کے قول "لا تعجبن" کی علت بیان کر رہا ہے اور "عين" بمعنیٰ آنکھ ہے اور "ضوء" کو نور پر ترجیح دے کر "ضوء الشمس" کہا، "نور الشمس" نہ کہا، اس لئے کہ ضوء نور سے زیادہ قوی ہوتی ہے، کہ ضوء وہ روشنی ہے جو بالذات ہوتی ہے اور نور وہ روشنی ہے جو بالعرض ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا (جعل الشمس ضياء و القمر نوراً)

(من رمد) یعنی آنکھ کے مرض کی وجہ سے، تو معلوم ہوا کہ "من" تعلیلیہ ہے اور "رَمَد" بفتحتین بمعنی آنکھ کا مرض، کہا جاتا ہے "رمدت العين" بمعنیٰ آنکھ کا دکھنا۔ (وينكر) میں "واو" عاطفہ ہے اور جملہ معطوف ہے "تنكر" جملے پر اور (الفم) بالتشدید 'الفم' بالتخفیف کی طرح ایک ہی معنیٰ ہے (یعنی منھ) اور اس میں تین لغات ہیں: فتح فا، ضم فا و کسر فا اور کبھی میم کو مشدد کر دیا جاتا ہے، اس کی تصریح "القاموس" میں کی گئی ہے، اس طرح کہ فرمایا کہ 'الفم' تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے، اس کی اصل "فوه" ہے اور کبھی میم کو مشدد پڑھا جاتا ہے اور دوسری جگہ فرمایا: الفاه و الفوه بالضم، و الفيه بالكسر، و الفوهة و الفم، سب ایک ہی معنیٰ میں ہیں، اس کی جمع افواه اور افمام ہے، اس کا واحد نہیں! اس لئے کہ 'فم' کی اصل "فَوَه" تھی، اس کی ھا کو حذف کر لیا گیا جس طرح کہ "سنة" میں حذف کیا گیا، اور آخر میں 'واو' متحرک بچا تو واو متحرک ماقبل فتح ہونے کی وجہ سے اس کو الف سے بدلنا لازم ہو گیا تو باقی رہا "فا" اور کوئی اسم دو حرفوں پر ایسا نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک تنوین ہو لہذا اس کی جگہ ایک ایسا حرف لایا گیا جو 'فا' کا ہم جنس ہو اور وہ میم ہے۔

اس لئے کہ فا اور میم دونوں ہونٹ سے نکلنے والے حروف ہیں یعنی حــروف شــفهيــه ہیں اور میم، لفظ فم میں جو اتری ہے وہ 'واؤ' کے پھیلنے کے مشابہ ہے۔

اور اس کی تثنیہ " فمــان" فموان اور فـميـان آتی ہے اور اخیر والے دووزن نادر ہیں اور " الهوى" اس بنیاد پر جو قاموس میں بـضم ها بمعنیٰ اترنا ہے اور " الهوى" بفتح 'ها' بمعنیٰ چڑھنا ہے اور اس سے ظاہر ہوگیا 'فم' کے میم کو مشدد پڑھنا ایک لغت ہے، تو جس نے کہا کہ 'میم' کو مشدد پڑھنا ضرورت شعری کی وجہ سے ہے، اس سے بھول ہوئی۔

(طعم) بمعنیٰ لذت، مزہ۔ (الماء) کا معنیٰ معروف ہے۔ (من السقم) یعنی بوجہ بیماری کے جو اس کے ساتھ قائم ہے، تو " مـن" دونوں جگہ افادۂ تعلیل کے لئے ہے اور شیخ زادہ نے اس کو دونوں جگہوں پر ابتدائے غایت کے لئے قرار دیا ہے۔ " سقم" بفتحتین بمعنیٰ مرض۔

شیخ زادہ نے فرمایا جاننا چاہئے کہ گزشتہ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ حاسد کا انکار تو صرف اس واسطے سے ہے کہ وہ مسلوب التوفیق اور فضیلت انصاف پانے سے محروم ہے حالاں کہ وہ اس فضیلت کو خوب جانتا ہے لیکن مسلوب التوفیق ہونے کی وجہ سے، آیات باہرہ اور رسالت ظاہرہ کا انکار کرتا ہے جس طرح کہ مرض چشم کی وجہ سے آنکھ سورج کی روشنی کا انکار کر بیٹھتی ہے اور جس طرح کہ بیماری اور مرض کی وجہ سے منھ خوشگوار پانی کو کڑوا محسوس کرتا ہے۔

اور ان دونوں شعروں میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی جانب اشارہ ہے: (الــذيـن اتيـنٰهم الكتٰب يعرفونه كما يعرفون ابنائهم و ان فريقا منهم ليكتمون الحق وهم يعلمون) (البقره: ١٤٦)

یعنی رسول اللہ ﷺ کو خوب اچھے سے پہچانتے ہیں اور معین و مشخص اوصاف کے ذریعہ آپ اور آپ کے غیر میں تمیز رکھتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو اس طرح پہچانتے ہیں کہ دوسروں کے بچے ان پر مشتبہ نہیں ہوتے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ ابن سلام سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں حضور کو اپنے بیٹے سے زیادہ پہچانتا ہوں، انہوں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ میں (جناب) محمد (رسول اللہ ﷺ) کے بارے میں ذرا بھی شک نہیں کرتا کہ وہ نبی ہیں لیکن رہا میرا لڑکا تو ہوسکتا ہے

اس کی ماں نے کوئی خیانت کردی ہو!! تو یہ سن کر حضرت سیدنا عمر نے ان کے سر کا بوسہ دیا۔

تو رسول کی معرفت، آیات کی معرفت کو مستلزم ہے، اسی وجہ سے شاعر ذی فہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا (وهـو عيـن الحاذق الفهم)۔ (الشيخ زاده ص ١٦٧، ١٦٨)

نیز یہ کہ شعر میں صناعت تذییل ہے (اور علم معانی میں صناعت تذییل کہتے ہیں: ایک ایسے جملہ کو دوسرے جملے کے پیچھے لانا جو پہلے والے جملے کے معنیٰ پر مشتمل ہو، مؤکد کرنے کے لئے) لہذا اس شعر میں ماقبل شعر کی تذییل و تاکید ہے یعنی گزشتہ کلام کے مضمون کی ایسے معنیٰ سے تاکید ہے جو استقلال اور استعمال میں قائم مقام امثال کے ہے۔ اسی طرح "الذخر و العدة" میں ہے۔

ساتویں فصل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا بیان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کا آغاز کیا جا رہا ہے، یہ فصل ذکر شب معراج پر مشتمل ہے اور معجزۂ معراج فضیلت عظیم اور وصف خاص ہے جو کہ ہمارے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت ہے اور یہ فضیلت تمام انبیائے کرام علیہ وعلیهم الصلوٰة و السلام میں سے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص ہے، لہذا یہ فضیلت ان بعض فضائل میں سے ہے کہ جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیائے کرام و مرسلین عظام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم اجمعین سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس فضیلت معراج سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعلیٰ وارفع مقام و مرتبے پر فائز ہونے میں منفرد ہیں یعنی بارگاہ رب العزت میں سب سے مقرب و مکرم ہونے میں اور ہر کمال کے حصول میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بالاصالت یک وتنہا ہیں نیز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام مخلوق کے لئے واسطہ اور وسیلہ ہونے کے اعتبار سے مخصوص ہیں، فضائل و کمالات اور نعم و کرم کے حصول میں، لہذا شاعر ذی فہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کلام جدید لائے، وہ ایک معنیٔ جدید سے دوسرے معنی جدید کی طرف منتقل ہوتے ہوئے مسلسل بیان کرتے رہے یہاں تک کہ ندا تک آ پہنچے، غیبت سے خطاب کی جانب التفات کر کے، مزید وہ حبیب فرید کے ذکر میں اپنے سلسلۂ کلام کو معنیٔ جدید کے ساتھ جاری رکھتے ہیں اور ذکر فضائل و کمالات کی تمہید شروع کرتے ہیں، ان پوشیدہ اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ جن کے در پردہ فضیلت معراج ہے، تو وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

(۱۰۵) یا خیر من یمم العافون ساحته　　سعیا و فوق متون الاینق الرسم

(ترجمہ: اے وہ ذات جو ہر اس ذات سے افضل ہے کہ حاجتمند جن کی بارگاہوں کی طرف دوڑتے ہوئے آتے

ہیں اور جن کے محلوں کا قصد کرتے ہیں تیز رفتار اونٹنیوں کی پیٹھوں پر سوار ہو کر۔)

تشریح: (یا) حرف ندا ہے بعید کے لئے، حقیقتا یا حکما اور کبھی اس سے تاکیدا قریب کو ندا دے دی جاتی ہے۔(خیر) احتمال رکھتا ہے کہ وہ اسم تفضیل کا صیغہ ہو، مخفف یا وہ اسم ہو بمعنیٰ وہ چیز جس کی طرف سب راغب ہوتے ہیں (من) بمعنیٰ " الذی " ہے اور مضاف محذوف ہے، تقدیر یوں ہوگی " خیر کل منهم " یا بمعنیٰ " الذین " ہے جو عام ہے اور " ساحته " میں واحد کی ضمیر لفظ من کی طرف نظر کرنے کی وجہ سے لائے ہیں۔

(یمم) بمعنیٰ قصد کرنا، (العافون) جمع ہے عافی کی بمعنی سائل وطالب۔(ساحته) بالنصب " یمم " کا مفعول ہے، اور وہ بمعنیٰ گھر ومکان، لیکن یہاں بمعنیٰ گھر میں رہنے والا ہے اور ضمیر راجع ہے " من " کی طرف اور '' ساحتہ'' محل ذکر کر کے حال مراد لینے کی قبیل سے ہے، اس لئے کہ مکان کا شرف مکین کی بدولت ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے شاعر کہتا ہے:

وما حب الديار شغفن قلبی ولكن حب من سكن الديارا

(مرے دل کو دیار کی محبت نے فریفتہ نہیں کر رکھا ہے، بلکہ اس محبوب کی محبت نے فریفتہ کیا ہے جو اس دیار میں رہتا ہے)

یہ بطور مجاز مرسل ہے: معنیٰ یہ ہے کہ اے وہ جو ہر اس شخص سے بہتر وافضل ہے کہ جن کی ذات کی طرف سائلین اور مانگنے والے قصد کرتے ہیں، (یعنی اے وہ ذات جو ان تمام لوگوں سے افضل اور بڑھ کر ہے کہ سائلین جن کے گھروں کا قصد کرتے ہیں اس میں '' گھروں'' سے مراد، گھروں میں رہنے والے ہیں، محل بول کر حال مراد لینے کی قبیل سے)

(سعیا) بالنصب حال ہے " العافون " سے، یعنی اپنے پیروں پر دوڑتے ہوئے۔

(فوق) یہ ظرف متعلق ہے محذوف سے جس کا " سعیا " پر عطف ہے تقدیر یوں ہوگی " کائنین فوق

المتون" یعنی اونٹنیوں کی پیٹھوں اور پشتوں پر سوار ہوکر۔ (متون) متن کی جمع ہے بمعنیٰ پیٹھ۔ (الانیق)، جمع ہے" الناقة" کی بمعنیٰ اونٹنی " اینق " اصل میں " انوق " تھا، واوکونون پر مقدم کردیا تو " اونق " ہوگیا، پھر 'واو' کو 'یا' سے بدل دیا" اینق" ہوگیا۔ (الرسم) جمع ہے " رسوم" کی اور رسم کہتے ہیں ایسی اونٹنی جو زمین میں نشان ڈال دے خوب تیز دوڑنے کی وجہ سے یا وہ اونٹنی جو ایک دن رات مسلسل چلتی رہ سکتی ہو۔

حاصل معنیٰ: اے وہ ذات گرامی جو ہر اس ذات سے بہتر ہے کہ جن کی طرف حاجتمند قصد کرتے ہیں اور اے وہ جو افضل ہے ان سب لوگوں سے کہ جن کی بارگاہ سے اونٹنیوں پر سوار ہوکر آنے والے امید رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کا ایسے تمام لوگوں سے افضل ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ حاجتمندوں کی ضروریات وحاجات پورا کرنے والے اور ان کے مقاصد، عطا کرنے والے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے دوسرے شعر کی شرح کی جارہی ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(١٠٦) ومن هو الآية الكبرىٰ لمعتبر ومن هو النعمة العظمىٰ لمغتنم

(ترجمہ: اور اے وہ ذات گرامی جو ہر نصیحت حاصل کرنے والے کے لئے آیت کبریٰ ہے اور اے وہ ذات جو ہر فائدہ اٹھانے والے کے لئے نعمت عظمیٰ ہے)

ربط: (اس شعر میں) شاعر ذی فہم کی جانب سے آپ ﷺ کی بارگاہ کا مزید شوق ظاہر کیا جارہا ہے اور مزید اشتیاق دلایا جارہا ہے، لہذا انہوں نے سامعین کو شوق دلانے اور راغب کرنے کے لئے ندا کو مکرر کیا اور آپ ﷺ کے بلند اوصاف میں تفنن کرتے ہوئے بیان کیا۔

ومن هو الآية الكبرىٰ لمعتبر ومن هو النعمة العظمىٰ لمغتنم

تشریح: (ومن هو) اس کا ماقبل منادی پر عطف ہے۔ (الآیة) حق و باطل کی تمیز میں جس کے ذریعہ نصیحت حاصل کی جاتی ہے: معنی ہوگا اے علم ہدایت اور اے ہر نصیحت حاصل کرنے والے کے لئے آیت کبریٰ (سب سے بڑی نشانی) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (وانك لتهدى الى صراط مستقيم) اور " الکبریٰ " یہ " اکبر " کی تانیث ہے اور اس سے حضور ﷺ کو موصوف کیا گیا ہے اس لئے کہ حضور کی ذات تمام مخلوق سے افضل ہے اور حضور کا دین تمام ادیان سے بہتر اور بڑھ کر ہے۔ (لمعتبر) اسم فاعل کا صیغہ " الاعتبار " مصدر سے بمعنیٰ کسی چیز کو جانچنا پہنچانا! تو معتبر بمعنیٰ متعرف۔ (ومن هو) یہ معطوف ہے پہلے والے " من " پر۔ (النعمة (بولا جاتا ہے انعام اور منعم پر اور یہاں دوسرا والا مراد ہے (یعنی منعم) شیخ زادہ بھی اسی بات کے قائل ہیں (العظمیٰ) تانیث ہے " اعظم " کی (لمغتنم) اسم فاعل کا صیغہ ہے " اغتنم الشئی " سے بمعنیٰ غنیمت خیال کرنا، غنیمت جاننا، اور معنیٰ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات سب سے بڑی نعمت ہے ور ایسی نعمت کبریٰ ہے کہ لوگ اس کو غنیمت جانتے ہیں اور غنیمت جان کر اس نعمت کی اتباع و فرماں برداری کرتے ہیں اور اس کی اتباع کر کے سعادت دارین حاصل کرتے ہیں۔ شعر میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس فرمان کی جانب تلمیح ہے (الم ترا الی الذین بدلو نعمت اللہ)، اس آیت پاک کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ (تبدیل کرنے والوں سے مراد) وہ کفار قریش ہیں اور نعمت اللہ اسی طرح کہا گیا جس طرح آپ ﷺ کو رحمت کہا گیا! اور یہ بات حق ہے کہ آپ ﷺ حقیقتاً اپنے متبعین کے لئے نعمت ہیں۔

نیز اس شعر میں ایک اس فرمان باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے کہ (وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها) حضرت سہل فرماتے ہیں، اللہ کی نعمت حضور ﷺ ہیں اور دوسرا اس فرمان باری تعالیٰ کی جانب (وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے تیسرے اور چوتھے شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۰۷) سریت من حرم لیلا الی حرم   کما سریٰ البدر فی داج من الظلم

(ترجمہ: (یارسول اللہ) آپ ایک حرم سے دوسرے حرم تک راتوں رات تشریف لے گئے جس طرح کہ چودھویں کا چاند تاریک رات میں سیر کرتا ہے۔)

(۱۰۹) وبت ترقی الی ان نلت منزلة   من قاب قوسین لم تدرك ولم ترم

ترجمہ: اور حضور آپ شب معراج ترقی فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ قاب قوسین کی اس منزل تک جا پہنچے جس منزل کو نہ کوئی پاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے طلب کرتا ہے۔)

ربط: (مذکورہ بالا اشعار میں) شاعر ذی فہم اسرا اور معراج کے واقعے کو بیان کررہے ہیں جو کہ آپ ﷺ کا سب سے مشہور و معروف معجزہ اور آپ کی سب سے روشن کرامت ہے نیز جو آپ ﷺ کی نبوت اور آپ کے تمام انبیا و مرسلین عظام سے افضل ہونے پر سب سے واضح اور آشکارا دلیل ہے، اس وجہ سے کہ بادشاہ حقیقی کی بارگاہ میں اس درجۂ قرب پر فائز ہونا، آپ ﷺ ہی کا خاصہ ہے اور یہ ایسا معجزہ ہے کہ قرآن سورۂ اسرا میں اس پر ناطق ہے، اخبار صحیحہ صریحہ اس پر دال ہیں، صحابہ کرام سے وہ متواتر ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور یہ وہ حتمی یقینی امر ہے جس کے بارے مین قرآن نے کہا کہ آپ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک راتوں رات لے جایا گیا، لہذا اس کا منکر کافر ہے۔

واقعۂ معراج میں مذاہب مختلفہ

علمائے کرام قصۂ معراج کومختلف روایات پرلائے ہیں اوراس میں انکے مختلف مذاہب ہوگئے اورالگ الگ موقف ہوئے تو ایک قول یہ ہے کہ معراج صرف روح کے ساتھ ہوئی تھی خواب میں اورایک قول یہ ہے کہ پوری معراج روح اور جسم دونوں کے ساتھ حالت بے داری میں ہوئی اور کسی نے کہا جسم وروح کے ساتھ اسی طرح حالت بیداری میں بیت المقدس تک ہوئی اوراس کے بعدصرف روح کے ساتھ آسمانوں تک۔

اورصحیح یہ ہے جس پر جمہور ہیں کہ رات مین سیر کرنا اورمعراج ایک ہی رات میں جسم وروح کے ساتھ عالم بیداری میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے سماوات علیٰ تک پھرسدرۃ المنتہیٰ تک اور پھر وہاں تک ہوئی جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

مجھے یادآتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ نے اس موضوع پرایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس کا نام آپ نے "منبه المنية بوصول الحبيب الى العرش و الرؤية" رکھا،اس میں آپ نے بیان فرمایا کہ عرش کے آگے سے معراج آپ ﷺ کوصرف روح کے ساتھ حاصل ہوئی اورایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ اسراء دو مرتبہ ہوئی: ایک مرتبہ خواب میں اورایک دفعہ بیداری میں علماء نے فرمایا پہلی مرتبہ جومعراج خواب میں ہوئی وہ بطور تمہیداورآپ ﷺ پرآسانی فراہم کرنے کے لئےتھی جیسا کہ آپ ﷺ کی نبوت کا آغاز رویائے صالحہ سے ہوا۔

شاعر ذی فہم نے اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں بہترین اسلوب اورانتہائی بلیغ بیان کے ساتھ قصۂ معراج پیش کیا ہے کہ فرماتے ہیں:

وطوىٰ الارض سائراً والس   سماوات العلى فوقها له اسراء

(اور(آپ ﷺ نے)پوری دنیا کی مسافت طےفرمائی اور بلند آسمانوں کےاوپرآپ کا جانا ہوا۔

نصف الليلة التى كان لل   مختار فيها على البراق استواء

(تو وہ رات جس میں مختار دو عالم ﷺ براق پر تشریف فرما ہوئے، صف بستہ ٹھہر گئی)

وتــــرقـــی بـــــه الـــی قـــا ب قـوسین و تلك السعـادة القعساء

(اور پھر آپ ﷺ نے اس پر سوار ہو کر قاب قوسین کے مرتبے تک ترقی فرمائی اور یہ یقیناً بڑی سعادت کی بات ہے)

روایات مختلفہ کے درمیان جمع و تطبیق

امام ابن حجر مکی نے قصیدہ ہمزیہ پر اپنی شرح میں، ان روایات مختلفہ کے درمیان جمع و تطبیق کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی جانب ماسبق میں ہلکا سا اشارہ ہوا اور انہی مختلف روایات سے علماء کے درمیان اختلافات اور مختلف مذاہب پیدا ہوئے، شاعر ذی فہم کے مذکورہ ذیل شعر کے تحت

نـصف الـلیـلة التـی کـان لـل مـختـار فیها علی البراق استواء

علامہ ابن حجر تصریح فرماتے ہیں: واقعۂ معراج سب سے زیادہ مشہور و معروف معجزہ ہے، اور سب سے زیادہ روشن و واضح برہان اور سب سے مضبوط دلیل ہے اور یکے از اخبار صادقہ اور آیات عظیمہ ہے اور اسی وجہ سے بعض مفسرین کرام نے فرمایا کہ شب معراج شب قدر سے بھی افضل ہے، مگر آپ ﷺ کی نسبت اس لئے کہ آپ ﷺ کو اس رات اتنا عطا کیا گیا کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں، لہذا جسم کے ساتھ حالت بیداری میں معراج یہ ہماری نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے خصائص میں سے ہے اور معراج کے جسم کے ساتھ ہونے اور حالت بیداری میں ہونے میں اس نے اختلاف کیا جس کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں۔

اور روایات متباینہ منتشرہ کی وجہ سے یہ گمان کرنا کہ معراج کئی ایک مرتبہ ہوئی ہے اور ان متضاد روایتوں میں تطبیق صرف تعدد معراج کا دعویٰ کر کے ہی ہوسکتی ہے کہ دعویٰ کیا جائے کہ معراج ایک مرتبہ جسم کے ساتھ ہوئی اور ایک مرتبہ روح کے ساتھ، تو یہ زعم مردود ہے اور اصح یہ ہے کہ اسراء صرف ایک مرتبہ جسم و روح کے ساتھ بیداری میں ہوا اور وہ روائتیں جو وسط راہ سے ہٹی ہوئی ہیں، اگر ان کی تاویل ممکن ہو تو ٹھیک ورنہ تو اس پر وہم کا حکم لگایا جائے گا جیسے کہ اس روایت پر لگایا جاتا ہے کہ اسراء قبل بعثت ہوئی اس لئے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ وہ بعد اعلان نبوت ہوئی

اور وہ والی روایت مؤول ہے پھر امام ابن حجر اپنے سلسلۂ کلام کو یہ کہتے ہوئے جاری رکھتے ہیں: مختار دو عالم ﷺ نے اس شب بہت سارے عجائب ملاحظہ فرمائے ان میں سے ایک یہ کہ آپ کی بارگاہ میں جبریل حاضر آئے اور ایک روایت مین میکائل ہے اور دوسری روایت میں کسی تیسرے کا ذکر ہے۔

اور اسی طرح پھر وہ روایات کے درمیان جمع و تطبیق کرنا شروع کرتے ہیں: اس بات میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ پہلے حضرت جبریل اترے ہوں، پھر حضرت میکائیل اور اس کے بعد کوئی تیسرا، حطیم میں یا شعب ابی طالب میں، یا ابو طالب کے گھر میں یا ام ہانی کے گھر میں چھت کھلنے کے بعد روایات کے درمیان تطبیق اس طرح ہوگی کہ آپ ﷺ بیت ام ہانی میں آرام فرما تھے اور ان کا گھر شعب ابی طالب میں تھا اور ابو طالب کی طرف اس کی نسبت اس لئے کر دی گئی کہ وہ اس میں رہتے تھے، پھر فرشتے نے آپ ﷺ کو بیت ام ہانی سے مسجد حرام کی جانب نکالا تو آپ نیند کے اثر کی وجہ سے پہلو کے بل لیٹ گئے، پھر آپ کو اٹھایا اور مسجد حرام سے نکال کر براق پہ سوار کیا، تو آپ مسلسل جاگ رہے تھے اور ایک روایت مین یوں آیا ہے کہ " انہ کان بین النائم و الیقظان " یعنی آپ ﷺ سونے اور جاگنے کے درمیانی حالت میں تھے، تو یہ روایت آغاز واقعہ پر محمول ہے، اور ایک روایت مین ہے " فلما استیقظت " یعنی قلب ناز کے مشاہدہ عالم ارواح میں مشغول ہونے کی وجہ سے۔

پھر انہوں نے فرشتے کے دروازے سے نہ آنے کی حکمت بیان کی، فرماتے ہیں گھر کے دروازے سے نہ آنے میں حکمت یہ تھی کہ فرشتہ آسمان سے دفعۃ واحدہ اس مقام پر اترا جہاں آپ ﷺ جلوہ افروز تھے، اور آپ کے سوا کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہوا، بات کو انتہائی راز میں رکھنے کے لئے اور اس پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ (بارگاہ رب العزت سے) بغیر وقت متعین کئے بلاوا یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ آپ ﷺ مراد ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے موقعہ پر وقت متعین یہ بتانے کے لئے تھا کہ وہ مرید ہیں اور آپ دونوں کے درمیان فرق ہے، نیز یہ کہ گھر کی چھت کے کھلنے اور پھر مل جانے میں اس بات پر آگاہ کرنا تھا کہ اس رات آپ ﷺ کا صدر شریف شق ہوگا (چھت کے کھلنے اور ملنے کی طرح) اور اس میں آپ پر کوئی حرج نہیں ہوگا۔ (شرح ہمزیہ ص: ۲۰۹۔۲۱۰)

تشریح: (سریت) "سری یسری" سے بمعنیٰ رات میں سیر کرنا، اہل لغت نے ذکر کیا ہے کہ "سری" اور "اسریٰ" (ثلاثی مجرد اور مزید فیہ) دونوں ایک ہی معنیٰ میں ہے یعنی رات میں چلنا اور "اسریٰ" یہ اہل حجاز کی لغت ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا ہے۔ (من حرم) اس حرم سے مراد مکہ مکرمہ کا حرم شریف ہے۔ (لیلاً) ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس میں تنوین تقلیل کے لئے ہے یعنی یہ بتانے کے لئے ہے کہ سیر رات کے بہت چھوٹے سے حصے میں ہوئی۔ (الی حرم) اس حرم سے بیت المقدس کا حرم مراد ہے، دونوں کو محرم و معظم کے معنی میں حرم کہا جاتا ہے۔

(البدر) اس چودہویں رات کا چاند، جو اس کے کمال اور اس کے نور کے تمام کی رات ہے (فی داج) یعنی تاریک رات میں، تو "داج" اس فاعل صفت ہے موصوف محذوف کی یعنی "لیل" کی کہا جاتا ہے: "دجا اللیل" بمعنیٰ رات کا تاریک ہونا، (من الظلم) یعنی من اوقات مظلمة، اس کا بیان ہے اور وجوہ شبہ یہ ہیں: تیز رفتاری، کمال روشنی مقدرات کا ارتفاع اور کمالات کا جمع ہونا۔

اور ایک سوال یہ کہ 'لیل' کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے جبکہ معلوم ہے کہ سیر رات میں ہی ہوئی تھی؟ تو اس کے فائدے پر علامہ زمخشری تنبیہ فرماتے ہیں کہ اس کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ سیر رات کے تھوڑے سے وقت میں ہوئی، اور اگر اس کا ذکر نہ کیا جاتا تو ضرور خیال گزر سکتا تھا کہ سیر نے پوری رات کا استیعاب کر لیا تھا۔ یعنی یہ گمان ہو سکتا تھا کہ واقعۂ معراج پوری رات میں ہوا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کا سماوات علیٰ تک ترقی فرمانا، پھر وہاں سے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر رب العزت کی جانب سے پانا اور حاصل کرنا وہ جو حاصل کرنا تھا اور جنت و دوزخ کے احوال پر آپ کو مطلع فرمانا وغیرہ ذالک امور جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یہ سب رات کے تھوڑے سے حصے میں واقع ہوئے۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں: اس بات کی شہادت حضرت عبداللہ اور حضرت حذیفہ کی یہ قرأت دے رہی ہے (من اللیل) (کہ اس قرأت میں "من" تبعیض کے لئے ہے، جو اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ 'لیل' کا ذکر یہ

بتانے کے لئے ہوا ہے کہ سیر رات کے بعض حصے میں ہوئی) اور علامہ جوہری فرماتے ہیں کہ 'لیل' کے ذکر میں حکمت، تاکید کرنا ہے، اور کچھ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں حکمت اس وہم کو دفع کرنا ہے کہ سیر دن میں ہوئی اور "اسراء" (بمعنیٰ رات میں سیر) سے اس کی تعبیر مجازاً کردی گئی ہے۔

واقعۂ معراج رات میں ہونے کی حکمت:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب آیة اللیل محو فرمادی اور آیة النھار کو روشن کیا تو رات بہت شکست خوردہ اور رنجیدہ ہوئی، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رات کے اندر اپنے حبیب اور ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد ﷺ کی سیر اور معراج کرا کر ان دونوں میں فیصلۂ عدل فرمادیا۔

اس میں ایک حکمت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ دن نے رات پر دنیا کے سورج کے اس میں طلوع ہونے کی وجہ سے فخر کیا، (کہ شمس دنیا میرے اندر طلوع ہوتا ہے) تو رات نے دن پر اس شمس وجود کائنات ﷺ کے اس کے اندر سیر فرمانے اور طلوع کرنے کی وجہ سے فخر کیا جو کہ شمس دنیا سے زیادہ منور ہے اور وہی نور اکبر ہے اور انوار کی جنس عالی افضل ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بدر یعنی چودہویں کے چاند سے موسوم کرنا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے (طٰهٰ ما انزلنا علیك القراٰن لتشقیٰ) اس لئے کہ "طٰهٰ" میں "طا" کے عدد نو ہیں اور 'ھا' کے عدد پانچ تو کل چودہ ہوئے، تو گویا فرمایا: اے چودہویں کے چاند! ہم نے تم پر یہ قرآن اس لئے نہ اتارا کہ مشقت میں پڑو۔

شرح بیت ثانی: (بت) "بیتوتة" مصدر سے فعل ماضی خطاب کا صیغہ ہے یعنی حضور! آپ شب معراج تشریف لے گئے، اس کا "سریت" پر عطف ہے۔

(ترقی) "رقی ترقی رقیاً" سے بمعنیٰ چڑھنا محسوس طور پر یعنی یارسول اللہ ﷺ آپ تشریف لے گئے جسم و روح دونوں کے ساتھ، حالت بیداری میں نا کہ خواب میں، زمین سے بلند آسمانوں کی طرف، پھر جہاں تک اللہ

تعالیٰ نے چاہا۔(الی ان نلت منزلة) یعنی، یہاں تک کہ آپ قاب قوسین کے مقام ومرتبے تک اپنی نورانی روح کے ساتھ پہنچے، یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب معنوی میں اپنے مرتبے ومنزل کے مطابق جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ ثم دنا فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ﴾ یعنی آپ ﷺ مقام قرب میں تھے جس طرح کہ دو کمانوں میں ایک کو دوسرے سے قرب ہوتا ہے یا اس سے بھی کم، حالاں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مکان سے پاک ہے (من) یہاں بیانیہ ہے۔ (لم تدرك) یعنی یہ مقام قرب نہ آپ ﷺ سے پہلے کسی نے پایا اور نہ آپ کے بعد کوئی پا سکتا ہے۔ (ولم ترم) اور نہ ہی کوئی اس مرتبے کو طلب کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی بھی نبی مرسل کو حاصل نہ ہوا اور نہ کسی مقرب فرشتے کو اور یہیں سے اخذ کیا گیا ہے حضور کا تمام مخلوق انسان وجنات سے افضل ہونا، اسی طرح "عمدہ" میں ہے ہماری جانب سے ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الی يوم الدين.

قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے پانچویں اور چھٹے شعر کی شرح کی جارہی ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۰۹) وقدمتك جميع الانبياء بها و الرسل تقديم مخدوم علی خدم

(ترجمہ: (یارسول اللہ) آپ کو تمام انبیائے کرام ورسولان عظام نے اس مرتبۂ عظیمہ کے سبب امامت کے لئے آگے بڑھادیا، جس طرح امام، مقتدیوں پر مقدم کیا جاتا ہے۔)

(۱۱۰)وانت تخترق السبع الطباق بهم في موكب كنت فيه صاحب العلم

(ترجمہ: مزید یہ کہ (یارسول اللہ) آپ نے ساتوں آسمانوں کو فرشتوں کے ساتھ اس جماعت میں خرق فرمایا جس میں آپ صاحب علم یعنی سب کے رئیس وسردار تھے۔

ربط: شاعر ذی فہم نے گزشتہ اشعار میں یہ ذکر فرمایا کہ آپ ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں اس مقام قرب اور منزلۂ تقرب تک ترقی فرمائی کہ یہ مقام ومرتبہ آپ کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوا اور نہ کوئی اس تک پہنچ سکا بلکہ کسی بھی مقرب فرشتے اور نبیٔ مرسل کو یہ درست ہی نہیں کہ وہ اس مقام ومرتبے کو طلب کرے، تو یہ امور بیان کرنے کے بعد وہ مذکورہ بالا دونوں شعروں میں بعض وہ امور عجیبہ جو حضور علیہ السلام کے لئے واقع ہوئے کو بیان کررہے ہیں مثلاً انبیائے کرام ورسولان عظام کا آپ ﷺ کو امامت کے لئے آگے بڑھانا، اور انبیائے کرام کا انتظار میں رہنا آپ ﷺ کے لئے کہ آپ تشریف لاکر ان کی امامت فرمائیں اور آپ ﷺ کا انبیائے کرام ورسولان عظام سے ان کے الگ الگ منزلوں اور مقاموں میں ملاقات فرمانا اور ان پر سے گزرنا، عظیم جماعت اور بڑے جلوس میں اس حال میں کہ فرشتے آپ کے ساتھ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف منتقل ہوتے رہے اور بڑھتے رہے یہاں تک کہ پھر آپ تنہا سدرۃ المنتہٰی سے آگے بڑھے جو کہ آپ علیہ السلام ہی کا خاصہ ہے بغیر کسی نبی ورسول کی شمولیت کے، تو آپ ترقی فرماتے رہے اور بڑھتے گئے یہاں تک کہ آپ عرش تک پہنچے اور وہاں تک جہاں تک اللہ نے چاہا، اسی کو ناظم یوں کہتے ہیں:

وقــد متك جــميــع الانبيــاء بهــا　　　و الـرسـل تـقـديـم مـخـدوم علی خدم

وانــت تـخـتـرق السبع الـطبـاق بهم　　　فـی مـوكـب كـنـت فيـه صـاحب العلم

تشــريح: (وقـد متك)، 'تـقـديـم' مصدر سے فعل ماضی کا صیغہ ہے بمعنیٰ آگے بڑھانا اور ضمیر خطاب فعل کا مفعول ہے اور ضمیر خطاب نبی اکرم ﷺ کی ہے۔ (جـمـيـع الانبـيـاء) بالرفع " قدمتك " کا فاعل ہے (ایک سوال کہ فعل مونث کیوں ہے؟ تو اس کا جواب دیتے ہیں:) فعل کی تانیث یا تو س وجہ سے ہے کہ " جـمـيـع " بمعنیٰ جماعت ہے یا پھر اس وجہ سے کہ " جـمـيـع " نے جمع مکسر یعنی انبیاء کی طرف مضاف ہوکر مضاف الیہ سے تانیث حاصل کرلی ہے بہرحال جملہ معطوف ہے "بت" پر یا" نلت " پر۔ (بها) میں 'با' سببیہ ہے اور " ها" کی ضمیر جو کہ ضمیر منفصل مجرور ہے راجع ہے ' مـنـزلة ' کی جانب یا پھر بیت المقدس کی جانب راجع ہے بیت المقدس کی بقعۃ

سے تاویل کر کے جو کہ مفہوم ہے مقام کے قرینے سے۔(و الــرسـل) بالجر معطوف ہے مضاف الیہ پر(یعنی الانبیاء پر)اور یہ 'را'اور 'سیــن' کے ضمہ کے ساتھ 'رســول' کی جمع ہے اور یہاں سین کو ساکن کرنا ضرورت شعری کی وجہ سے ہے اور 'الـرسل' کا 'الانبیاء' پر عطف کرنے میں تعمیم کے بعد تخصیص ہے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ افضل ہیں تمام انبیائے کرام سے عموماً اور رسولان عظام سے خصوصاً (تـقـديم) مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی ایسی تقدیم جو کہ مشابہ ہے مخدوم یعنی متبوع کی تقدیم کے اور یہاں اس سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں۔(عـلى خدم) متعلق ہے" تـقـديم مخدوم" سے اور " خدم" جمع ہے خادم کی یہاں اس سے تابع مراد ہے۔اس شعر میں محض نبی اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف اور حضور کے عظیم شرف و فضیلت کا اظہار ہے اس میں کسی بھی نبی علیہم الصلوٰۃ و التسلیم کی تنقیص کے وہم کا گزر تک نہیں جیسا کہ عمدہ کے محقق بسامحمد بارود نے واضح فرمایا ہے، اس لئے کہ شعر تو محض اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ شب معراج آپ ﷺ کو نماز کے لئے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ و السلام پر مقدم کر دیا گیا اور پھر آپ علیہ السلام نے شب معراج ان کی امامت فرمائی، جیسا کہ یہ متعدد حدیثوں سے ثابت ہے، ان میں سے کچھ احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

حضور اکرم ﷺ کے امام الانبیاء ہونے کا ثبوت احادیث سے

(حضور عليه السلام نے فرمایا" فحانت الصلوٰة فاممتهم " یعنی پھر نماز کا وقت آ گیا تو میں نے انبیائے کرام کو نماز پڑھائی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے بیت المقدس میں فرشتوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی اور پھر آپ علیہ السلام انبیائے اکرم کی ارواح کے پاس تشریف لائے تو سب نے اللہ عزوجل کی ثناء کی اور حدیث میں حضرت ابراہیم على نبينا عليه افضل الصلوٰة و السلام کا یہ فرمان موجود ہے کہ "لقد فضلكم محمد" یقیناً محمد تم سے افضل ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ پھر حضور کے لئے حضرت آدم وغیرہ کو بیدار کیا گیا تو حضور نے اس رات ان کی امامت فرمائی۔

اور ایک روایت میں یوں ہے: (حضور علیہ السلام نے فرمایا: پھر میرے لئے بعض انبیاء کو بیدار کیا گیا جن میں حضرت ابرہیم اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ تھے

اور ایک روایت میں اس طرح ہے: پھر نماز کی اقامت کہی گئی تو انبیائے کرام ایک دوسرے کو بڑھانے لگے اور ایک دوسرے پر امامت کی ذمہ داری دینے لگے یہاں تک کہ سب نے (حضرت) محمد ﷺ کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیا۔

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے: تو جب آپ ﷺ مسجد اقصیٰ تشریف لائے تو آپ (وہاں) نماز ادا فرمانے لگے کہ اتنے میں تمام انبیائے کرام آپ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ (العمدة ص ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱)

واقعۂ معراج کے متعدد امور میں علماء کا اختلاف

اب اس میں اختلاف ہے کہ، وہ نماز آپ ﷺ کے آسمان کی طرف عروج فرمانے سے پہلے ادا فرمائی گئی یا بعد میں؟ اس شعر سے تو یہی مستفاد ہے کہ وہ نماز قبل عروج پڑھی گئی جیسا کہ پوشیدہ نہیں! اسی طرح علامہ خرپوتی نے فرمایا ہے، لیکن اس شعر میں " بها " میں 'ھا' کی ضمیر کو " منزلة " کی طرف لوٹانا کہ اس قاب قوسین کی منزل کو آپ ﷺ نے پایا کہ جس کو نہ کوئی پا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کو طلب کرتا ہے۔ شاعر ذی فہم نے اس شعر سے پہلے والے شعر میں اس منزل کا ذکر کر کے یہ بیان کیا کہ حضور کو امامت کے لئے اسی منزل کی وجہ سے مقدم کیا گیا تھا، تو ضمیر کو اس طرف لوٹانے سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس منزل (منزل قاب قوسین) کو پانے کے بعد بیت المقدس کی طرح لوٹتے وقت ان کو نماز پڑھائی، (یعنی نماز بعد عروج لوٹتے وقت ہوئی) بہر حال دونوں باتوں کا احتمال ہے اور تعدد کا دعویٰ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں (کہ کہہ دیا جائے نماز قبل عروج اور بعد عروج دونوں دفعہ ہوئی)

پھراس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ نماز فرض تھی یا نفل؟ تو اس روایت کی بنیاد پر کہ آپ ﷺ نے انبیائے کرام کو قبل عروج نماز پڑھائی، وہ نفل ٹھہرتی ہے اوراس روایت کی تقدیر پر کہ حضور نے ان کو بعد عروج نماز پڑھائی وہ فرض قرار پاتی ہے یعنی فجر کی،اسی طرح "مواھب" میں ہے(خرپوتی ص:۱۷۵)

علامہ خرپوتی اس کے قائل ہیں! لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ وہ نماز عشاء ہو جیسا کہ علامہ ابن حجر نے 'عـمـدہ' میں بیان کیا ہے بلکہ عشاء کی ہونا متعین ہے ان روایات کی وجہ سے جو گزریں اوراس آنے والی روایت کی وجہ سے وہ یہ کی آپ ﷺ جب بیت المقدس تشریف لائے تو براق سے نزول فرمایا پھراس حلقے میں اسے باندھ دیا جس میں انبیائے کرام باندھا کرتے تھے، پھر آپ مسجد میں داخل ہوئے،تو دیکھا کہ مسجد انبیائے کرام سے بھری ہوئی ہے، اتنے میں نماز کی اقامت کہی جانے لگی! حضور ﷺ نے فرمایا" فـقمنا صفوفا ننتظر من يومنا" یعنی پھر ہم صف بستہ کھڑے انتظار کرنے لگے کہ ہماری امامت کون کرے گا،تو جبریل نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے بڑھا دیا تو میں نے ان کو نماز پڑھائی پھر میں مسجد سے نکلا تو جبریل علیہ السلام شراب کا ایک برتن اور دودھ کا ایک برتن میرے پاس لائے تو میں نے دودھ اختیار کیا،تو جبریل کہنے لگے،آپ نے فطرت اختیار فرمائی،اورایک روایت میں ہے کہ جبریل نے کہا،حضور آپ نے درست کیا کہ آپ نے فطرت کی ہدایت کی،اگر آپ شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت محروم ہو جاتی ۔(خرپوتی ص۱۷۵)

حدیث معراج

'شفا شریف' میں ہے: پھر ہمیں آسمان کی طرف لے جایا گیا تو جبریل نے باب کھولنے کو کہا تو پوچھا گیا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا جبریل، پھر پوچھا گیا تمہارے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا محمد، پوچھا گیا کیا بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں بلایا گیا ہے،تو ہمارے لئے دروازہ کھول دیا گیا،تو ناگاہ میں آدم ﷺ کے پاس تھا،تو انہوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی ۔ پھر ہمیں دوسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا،تو جبریل نے دروازہ کھولنے کو کہا،آواز آئی کون ہے؟ کہا جبریل پوچھا اور کون ہیں ساتھ میں؟ کہا محمد، پوچھا کیا بلائے گئے ہیں؟ کہا ہاں بلایا گیا ہے تو ہمارے

لئے دروازہ کھول دیا گیا تو یہاں میری ملاقات دو خالہ زاد بھائیوں حضرت عیسیٰ ابن مریم اور حضرت یحیٰ بن زکریا صلیٰ اللہ علیھما سے ہوئی، توانہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔

پھر ہمیں تیسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا، یہاں بھی اسی طرح ذکر فرمایا، پھر ہمارے لئے آسمان کا دروازہ کھولا گیا تو میں یوسف علیہ السلام کے پاس تھا، ان کا عالم یہ تھا کہ انہیں حسن و جمال کا ایک پورا حصہ عطا کیا گیا تھا۔

بہر حال تو انہوں نے میرا استقبال کیا اور میرے لئے دعائے خری کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ ورفعنٰہ مکانا علیا﴾ پھر ہمیں پانچویں آسمان کی طرف لے جایا گیا، آگے پھر اسی طرح ذکر فرمایا، تو یہاں میری ملاقات حضرت ہارون سے ہوئی، انہوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ پھر ہمیں چھٹے آسمان پر لے جایا گیا، اسی طرح ذکر فرمایا پھر فرمایا کہ میں یہاں حضرت ابراہیم کے پاس تھا جو بیت معمور سے ٹیک لگائے ہوئے تھے اور بیت معمور وہ ہے کہ جس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے جب داخل ہوتے ہیں تو اس طرف پھر کبھی نہیں لوٹتے ہیں بہر حال پھر ہمیں سدرۃ المنتہیٰ لایا گیا اور اس کا عالم یہ ہے کہ اس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح ہیں اور اس کا پھل 'قلال' کے مشابہ ہے، تو جب ڈھانپ لیا اس کو اللہ کے حکم سے جو ڈھانپا تو اس کی حالت متغیر ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی بھی اس کے حسن و خوبصورتی کو بیان ہی نہیں کر سکتا، پھر اللہ نے مجھے وحی کی جو وحی کرنی تھی تو مجھ پر دن و رات میں کل پچاس نمازیں فرض ہوئیں، پھر میں موسیٰ کے پاس نیچے آیا انہوں نے کہا اللہ نے آپ کی امت پر کیا فرض فرمایا ہے؟ میں نے کہا پچاس نمازیں کہنے لگے آپ لوٹ جایئے اور اپنے رب سے اس میں سے کچھ تخفیف چاہیے اس لئے کہ آپ کی امت اس کو ادا نہ کر سکے گی، کیوں کہ میں بنی اسرائیل کو آزما چکا ہوں اور میں نے ان کو خبر دی تھی، حضور فرماتے ہیں تو میں اپنے رب کی بارگاہ میں لوٹا اور میں نے عرض کی، اے میرے رب میری امت پر تخفیف فرمادے، تو پانچ کم کر دی گئیں، تو میں نے لوٹ کر حضرت موسیٰ کو بتایا کہ مجھ پر سے پانچ کم کر دی گئیں ہیں، انہوں نے فرمایا، آپ کی امت اس کو ادا نہ کر سکے گی، لہذا اپنے رب کے پاس لوٹ جائیں اور تخفیف چاہیں، حضور فرماتے ہیں، کہ میں اپنے رب اور موسیٰ کے پاس آتا جاتا رہا یہاں تک کہ (رب نے) فرمایا کہ ''اے محمد، بے شک

وہ (بظاہر) ہر دن ورات میں کل پانچ نمازیں ہیں اور جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا مگر اس کو کر نہ سکا تو اس کے لئے وہ نیکی لکھ دی جائے گی اور اگر اس نیکی کو کر لیا تو اس کے حق میں دس لکھی جائیں گی اور جس نے کسی گناہ کا ارادہ کیا اور اس کا ارتکاب نہ کیا تو کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کا ارتکاب کر بیٹھا تو ایک گناہ لکھا جائے گا'' حضور فرماتے ہیں میں نیچے پھر حضرت موسیٰ کے پاس آیا اور میں نے انہیں خبر دی، تو وہ کہنے لگے اپنے رب کے پاس لوٹ جایئے اور اس میں کمی کرائیں، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تو میں نے ان سے کہا: میں اپنے رب کے پاس لوٹتا رہا یہاں تک کہ اب مجھے حیا آتی ہے''

روایات کے اختلاف پر تنبیہ

علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں: حضرت ثابت نے اس حدیث کو حضرت انس سے بہت اچھی طرح روایت کیا ہے کہ کسی نے بھی ان کی حدیث سے زیادہ درست حضرت انس سے روایت نہیں کیا اور حضرت ثابت کے علاوہ اوروں نے تو حضرت انس سے یہ حدیث بیان کرنے میں بہت خلط ملط کر دیا ہے خاص طور پر شریک ابن غیر کی روایت اس لئے کہ انہوں نے روایت کے شروع میں حضور کے پاس فرشتے کے آنے کا اور شق بطن اور پھر آب زمزم سے اس کو دھلنے کا ذکر کیا ہے جب کہ یہ واقعہ تو قبل بعثت حضور کے عہد طفلی کا ہے۔ نیز شریک نے اپنی حدیث میں کہا ہے کہ یہ واقعہ حضور پر وحی آنے سے پہلے کا ہے اور پھر انہوں نے قصۂ معراج ذکر کیا حالاں کہ اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ واقعۂ معراج بعد بعثت ہوا اور کئی ایک نے یہ بھی فرمایا ہے کہ معراج ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی اور کہا گیا ہے کہ اس سے بھی پہلے ہوئی۔ (الشفاص: ۱۲۷، ۱۲۸)

اور حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں جو یہ بیان ہوا کہ انہیں حسن و جمال کا ایک حصہ دیا گیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں ہمارے نبی کریم ﷺ کے حسن سے ایک حصہ دیا گیا ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں جو علامہ ابن حجر مکی نے قصیدہ ہمزیہ پر اپنی شرح میں بیہقی وغیرہ کی حدیث میں سے یہ ذکر کیا ہے: " فاذا انا برجل من احسن خلق الله " یعنی حضور نے فرمایا کہ شب معراج پھر ہماری ملاقات اللہ کی مخلوق میں سب

سے زیادہ حسین وجمیل شخص سے ہوئی جو کہ حسن و جمال میں تمام لوگوں سے افضل ہیں جس طرح کہ چودہویں کا چاند تمام ستاروں سے افضل ہوتا ہے'' اس لئے کہ اس سے مراد ہمارے نبی کریم ﷺ کے ماسوا ہیں۔

تشریح : (وانت تخترق) میں 'واو' حالیہ ہے اور جملہ محل نصب میں حال واقع ہے اور سیاق وسباق مفید حصر ہے اور صفت کے موصوف پر محدود ومحصور ہونے کو بتا رہا ہے یعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی: انت لا غیرك تـخـتـرق" یعنی حضور آپ ہی نے (ساتوں آسمانوں کو) خرق فرمایا نہ کہ آپ کے غیر نے اور یہ خبر حال ہے " قدمتك" میں "کاف" سے، نیز یہ کہ " خرق" سے تعبیر کرنے کو اس لئے ترجیح دی تا کہ ان کا رد ہو جائے جو آسمان کے خرق والتیام کو محال جانتے ہیں جیسے فلاسفہ۔

(السبع الطباق) یعنی سماوات جو بعض بعض کے اوپر ہیں، " طباق" یا تو جمع " طبقه" کی جیسے رحاب جمع ہے رحبة کی، یا پھر وہ جمع ہے "طبق" کی، جیسے جمال جمع ہے جمل کی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿ الذی خلق سبع سمٰوٰت طباقا﴾

(بهم) حال ہے " تـختـرق" فعل سے اور اس میں 'با' ملابست کے لئے ہے یعنی ان سے ملتے ہوئے گزر گئے اور ضمیر انبیاء ورسل کی ہے، (فی موكب) جار مجرور متعلق ہے " تـخـتـرق" سے۔ اور 'موكب' کہتے ہیں اجتماع عظیم کو (یعنی جلوس وقافلہ) لہذا اس میں تنوین برائے تعظیم ہے یعنی ہئیت عظیمہ پر اس طرح کہ حضور کے ساتھ حضرت جبریل ہوتے اور ہر آسمان کے فرشتے حضور کا استقبال کرتے اور حضور کے احترام میں دوسرے آسمان تک حضور کے ساتھ رہتے اور جبریل ہر آسمان کے دروازے کو کھلواتے جاتے تو ان سے پوچھا جاتا کون ہے تمہارے ساتھ؟ تو وہ کہتے محمد اس "موكب" یعنی جلوس سے مراد وہ جلوس عظیم ہے کہ یا رسول اللہ جس میں آپ صاحب لوا تھے یعنی اشارہ یہ ہے کہ آپ ان میں سب کے رئیس وسردار تھے۔

(العلم) کہتے ہیں اس نیزے کو جس کے سرے پر جھنڈا بندھا ہوتا ہے، جسے عادۃ امیر لشکر کے اوپر رکھا جاتا ہے، جس سے اشارہ ہو کہ یہ اس لشکر اور جمعیت والوں میں سب سے افضل ہے۔

تتمہ:

اس خاتمے کا تعلق ان باتوں سے ہے جو قاضی عیاض نے حضرت شریک کے بارے میں کہیں اور جو شریک نے اپنی روایت میں بہت خلط وملط کرڈالا اور دوسروں نے جوان کی تصدیق کی اور جن باتوں پر گرفت ہے اس کا جو جواب دیا گیا ہے نیز اس خاتمے کا تعلق اس سے بھی ہے جو شریک کی توثیق کے بارے میں کلام کیا گیا ہے اور اس سے کہ کیا ان کو ثقہ گردانا ہی معتمد ہے؟ (وغیرہ)، تو علامہ خفاجی کی شرح شفا میں اس طرح تصریح آئی ہے: علمائے کرام نے شریک کی اس روایت کا انکار کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ شریک کو اس میں کئی طرح سے غلطی ہوئی ہے، پہلی غلطی تو اس کی سند میں ہی ہوئی اس لئے کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن مالك ابن صعصعه روایت کیا ہے اور امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عن ابی ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کیا ہے (یعنی واسطے کے ساتھ) اور شریک نے اس کو بغیر کسی واسطے کے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کر دیا لہذا حضرت شریک کا سیاق کلام محدثین کے سیاق سے مخالف ہو گیا، زیادتی منکرہ اور تقدیم وتاخیر کی وجہ سے، حالاں کہ امام مسلم اپنی صحیح میں اس پر تنبیہ فرما چکے ہیں تو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو ذکر کیا وہ قدح ابن حزم کے موافق ہے مگر یہ کہ حافظ ابوالفضل ابن طاہر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شریک کی، اپنی تالیف کے ایک مستقل حصے مین تائید کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث کی تعلیل ان کے اس سلسلے میں تنہا ورمنفرد ہونے کی وجہ سے ہے اور ابن حزم نے جو یہ دعویٰ کیا کہ ''یہ شریک کی جانب سے آفت ہے'' اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ (تو ابن حزم کی یہ بات) قبول کئے جانے کے لائق نہیں اس لئے کہ فن جرح وتعدیل کے ائمہ کرام نے انہیں ثقہ گردانا ہے اور ان سے روایتیں لی ہیں، انہوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، نیز حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی انہیں ثقات میں شمار کیا ہے (مزید فرمایا کہ) جب ان سے کوئی ثقہ راوی حدیث روایت کرے نہ کہ ضعیف راوی تو اس میں ذرا برابر بھی حرج نہیں، اور یہ کہ حضرت سلیمان ابن ہلال رحمۃ اللہ علیہ جو کہ ثقہ ہیں، ان سے روایت کر چکے ہیں ہاں یہ بات تو ہے کہ وہ اپنے

اس قول میں ضرور تنہا ہیں: " و ذالك قبل ان یوحیٰ الیه " لیکن یہ اس بات کا مقتضی نہیں کہ ان سے حدیث کو متروک کر دیا جائے گا، اس لئے کہ کسی ثقہ راوی کا کسی مقام پر خطا و غلطی کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کی تمام روایات کو رد کر دیا جائے۔ اور اگر کوئی اس بات کا قول کرتا ہے تو اس سے اکثر اسلاف کی تردید لازم آئے گی!

شاید وہ یہ کہنا چاہ رہے ہوں " بعد ان اوحیٰ الیه " پھر کہا ہو " قبله " !اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابن حزم سے اس تک آگے بڑھ گئے اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ایسی بات ہے جو قوی نہیں! اور ان میں سے بعض ان سے روایت نہیں کیا کرتے تھے، حالانکہ محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بے شک وہ ثقہ ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت شریک کی روایت میں اختلاف ہے! لہذا جس میں وہ تنہا ہیں اس کو شاذ و منکر شمار کیا جاتا ہے اور بہتوں نے ان کی حدیث کے کئی مقام پر مخالفت کی ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں: انبیائے کرام علیهم السلام کی جگہیں اور معراج کا قبل بعثت ہونا نیند میں ہونا، سدرۃ المنتہیٰ کا ساتویں آسمان کے اوپر ہونا حالانکہ مشہور یہ ہے کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے یا چھٹے میں اور نیل و فرات دونوں ندیوں میں اور ان دونوں ندیون کی اصل آسمان دنیا میں ہے حالانکہ مشہور یہ ہے کہ دونوں سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے ہیں، شق صدر مبارک وقت اسراء ہونا (الی ان قال) تو یہ وہ چند مخالفت کے مقام ہیں سند اور متن میں جس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنی روایت میں خلط ملط کر دیا حالاں کہ ان میں سے بعض کا جواب دیا جا چکا ہے!

(هٰذا) یعنی یہ جو مذکورہ ہوا شق صدر مبارک اور اس کے بعد غسل قلب شریف کے متعلق۔ (انما کان وھو) یہ تو صرف اس وقت ہوا تھا جب آپ ﷺ (صبی) تھے، حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس دودھ پینے کے ایام میں، (قبل الوحی)، آغاز وحی سے قبل۔

مصنف لفظ " انما " اس لئے لائے تا کہ حضرت شریک رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا رد ہو جائے کہ وہ شب معراج ہوا۔

اوراس کا جواب یہ ہے کہ شق صدر مبارک کئی دفعہ ہوا ایک مرتبہ تو اس وقت جب آپ ﷺ ایام طفلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تاکہ حصۂ شیطان آپ سے ختم کردیا جائے جیسا کہ گزرا اور دوسری مرتبہ اس وقت ہوا جب آپ کی عمر شریف دس برس تھی آپ سے طفولیت زائل کرنے کے لئے، تیسری مرتبہ وقت بعثت تاکہ آپ کا قلب شریف وحی کے لئے ثابت ومضبوط ہوجائے چوتھی دفعہ شب معراج اس پر تقویت دینے کے لئے، اور پانچویں دفعہ ہونے کا بھی اضافہ کسی نے کیا ہے مگر علامہ ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شرح بخاری میں اس کی تضعیف کی ہے! اورانہوں نے اور علامہ برہان حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے والے چاروں کو صحیح قرار دیا ہے۔ الی آخرہ ۔ ماخوذ (۲/۲۴۳_۲۴۴)

اور دوسری بات یہ کہ علامہ شہاب حفاجی کی یہ تصریحات آپ کے پیش نظر کرنے کے بعد میں نے ملا علی قاری کی شرح شفا کی طرف مراجعت کی تو میں نے اس میں دیکھا کہ انہوں نے بھی اسی طرح تصریح فرمائی ہے جس طرح کہ علامہ شہاب حفاجی کی تصریحات گزریں لیکن انہوں نے مزید اس میں شق صدر مذکور کو تعدد پر محمول کر کے افادہ کیا اور حافظ بغوی سے نقل کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ حضرت شریک کی حدیث پر اعتراض درست نہیں اس لئے کہ اس میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ کہا جائے کہ وہ عالم نیند میں خواب تھا جسے اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کو دکھایا۔ آپ کے سامنے ذیل میں ان کی عبارت نقل کی جارہی ہے:

(ھذا) یعنی یہ سب جو ابھی بیان کیا گیا (انما کان وھو صبی وقبل الوحی) یہ تو محض اس وقت پیش آیا تھا جب آپ (ﷺ) صبی تھے اور وحی سے پہلے اس میں تعدد ممکن ہے، تو اس صورت میں کوئی وہم نہیں مگر صرف اس سبب سے جس کو مصنف نے یہ کہہ کر بیان کیا" وقد قال شریك فی حدیثه.. الخ ''یعنی حضرت شریک نے اپنی حدیث میں فرمایا ہے کہ یہ واقعہ قبل وحی پیش آیا اور پھر انہوں نے یہ کہنے کے بعد معاً قصۂ معراج ذکر کردیا حالانکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ واقعۂ معراج بعد بعثت ہوا'' لہذا اس تعارض سے جو ان دونوں کلام میں واقع ہے، اس کا وہم باقی رہا۔

پھر آگے علامہ قاری ان کی جانب منسوب وہم کو دفع فرمانے لگتے ہیں'' لیکن امام حافظ ابو محمد حسین بغوی فرماتے ہیں: وہ اعتراض جو حضرت شریک کی روایت پر کیا گیا وہ میرے نزدیک صحیح نہیں اس لئے کہ وہ بات تو خواب کی تھی عالم نیند میں جسے اللہ تعالیٰ عزوجل نے اپنے حبیب کو وحی سے پہلے دیکھایا، آخر حدیث کے ان الفاظ کی دلالت کرنے کی وجہ سے "فاستیقظ وھو بالمسجد الحرام" یعنی پھر حضور مسجد حرام میں بے دار ہوئے اور اس کے بعد حضور کو عالم بے داری میں وحی کے بعد آپ کے پہلے والے خواب کی تحقیق وتصدیق کے لئے معراج کرائی گئی، جس طرح کہ آپ ﷺ نے چھٹی ہجری کو حدیبیہ کے سال ہی خواب میں فتح مکہ مشاہدہ فرمائی تھی، اور پھر اس خواب کی تحقیق وتصدیق آٹھویں ہجری کو ہوئی، اور پھر اس فرمان باری تعالیٰ کا نزول ہوا: (لقد صدق اللہ رسولہ الرء یا بالحق) انتھیٰ۔

لہذا اس جمع وتطبیق سے اس فرمان باری تعالیٰ سے اشکال ختم ہوجاتا ہے: (وما جعلنا الرء یا التی اریناك الا فتنة للناس) تو تقدیر خواب کی تحقیق وتصدیق ہوجاتی ہے، اس لئے کہ محض خواب پر کوئی فتنہ (آزمائش وتکلیف) مرتب نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

قصہ معراج کب وقوع پذیر ہوا

اور بہت سارے علمائے محدثین نے فرمایا ہے کہ واقعۂ معراج ہجرت کے ایک سال پہلے ہوا تھا'' اس لئے کہ امام نووی نے ذکر فرمایا ہے کہ اکابر اسلاف اور جمہور محدثین وفقہاء اس پر ہیں کہ معراج بعثت کے سولہ مہینے بعد ہوئی اور امام سبکی نے فرمایا کہ اس پر تو اجماع ہے کہ وہ مکہ میں ہوئی تھی اور جو موقف ہم نے اختیار کیا وہ ہمارے شیخ ابو محمد دمیاطی کا قول ہے کہ معراج ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی اور وہ ماہ ربیع الاول میں ہوئی۔ انتھیٰ

سید جمال الدین محدث نے " روضۃ الاحباب" میں روایت کیا کہ معراج ماہ رجب المرجب کی ستائس تاریخ کو ہوئی، اس کے مطابق کہ جس پر حرمین شریفین میں عمل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ربیع الآخر میں ہوئی، اور کسی نے کہا رمضان میں کسی نے کہا شوال میں اور کسی نے کہا صحیفے کھلنے کے بعد ہوئی اور کسی نے کہا بیعت عقبہ کے بعد ہوئی

اور یہ بھی کہا گیا کہ حضور کو سیر ذی الحجۃ میں کرائی گئی اس لئے کہ آپ کی عمر شریف اس وقت اکیاون برس نو مہینے اٹھائیس دن تھی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ اور دوشنبہ کی رات، تو حضور کا زمانۂ معراج، حضور کی میلاد و مدارج کی طرح یوم دوشنبہ ماہ ربیع الاول کے اعتبار سے ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

اب ہم بعون اللہ سبحانہ وتعالیٰ قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے ساتویں شعر کی شرح کا آغاز کر رہے ہیں، شاعر فی ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۱۱) حتی اذا لم تدع شاوا لمستبق   من الدنو ولا مرقی لمستنم

(ترجمہ: (یارسول اللہ) آپ آسمانوں میں بڑھتے گئے یہاں تک کہ پھر آپ نے کسی بھی سبقت چاہنے والے کے لئے کوئی غایت باقی نہیں چھوڑی اور نہ ہی کسی بلندی پر چڑھنے والے کے لئے کوئی سیڑھی چھوڑی۔)

ربط: شاعر ذی فہم اس شعر میں اس وہم کو رفع کرنا چاہتے ہیں جو گزشتہ شعر سے پیدا ہوسکتا تھا کہ شاید اس انتہائی غایت تک آپ ﷺ کے اس سفر میں کوئی آپ کا شریک سفر بھی رہا ہو تو اسی وجہ سے اس شعر میں ناظم اس غایت و انتہا کو بیان کرنے لگے جس تک آپ کا وصل ہوا اور یہ کہ آپ کے عروج کا آغاز مقام قاب قوسین او ادنیٰ تک ہے جس کی وجہ سے آپ نے مقام قرب خاص کو پایا، اسی کو ناظم فاہم نے یوں کہا:

حتی اذا لم تدع شاوا لمستبق   من الدنو ولا مرقی لمستنم

تشریح: (حتی)، غایت ہے ان کے اس قول کی "تخترق" (اذا) ظرفیہ ہے جو معنیٰ شرط کو متضمن ہے یا محض شرط کے لئے ہے اور "اذا" کا جواب یا تو محذوف ہے یا پھر اس کا جواب (مابعد شعر میں) ''خفضت'' ہے (

لم تدع) یعنی نہیں چھوڑا آپ نے (فعل ماضی بلم واحد مذکر حاضر کا صیغہ) (شأو) بمعنیٰ غایت کہا جاتا ہے " فلان بعید الشأو " یعنی فلاں بڑا عالی ہمت ہے اور اس سے مراد غایت ہوتی ہے۔تو" لم تدع شأوا " کا معنی ہوگا (یارسول اللہ) آپ نے کسی انتہا اور غایت کو باقی ہی نہیں چھوڑا ''۔ (لمستبق) یہ یا تو متعلق ہے " لم تدع " سے یا پھر یہ ظرف مستقر ہے اور صفت ہے" شأو " کی، " مستبق " اسم فاعل کے صیغے پر بمعنیٰ سبقت چاہنے والا یا بمعنیٰ سبقت کرنے والا یا بمعنیٰ سبقت کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرنے والا اور وہ یہاں بمعنیٰ سبقت چاہنے والا ہے، اور اس میں تنوین برائے تکثیر ہے یعنی ہر سبقت چاہنے والے کے لئے آپ نے غایت نہ چھوڑی خواہ وہ نبی ہو یا فرشتہ (من الدنو) یا تو متعلق ہے " لم تدع " سے یا"شأو " کی صفت ہے اور " الدنو " (قرب) سے مراد قرب منزلت، قرب الٰہی اور تقرب الی اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے سے مراد انتہائی قرب اور لطف محل اور ایضاح معرفت اور حقیقت کا روشن ہوجانا ہے، اسلئے کہ حق تعالیٰ کے لئے باعتبار مکان کوئی قرب و بعد اور دور و نزدیک نہیں۔(لا مرقی) عطف ہے" شأو " پر یا نفی کی تکرار تاکید کے لئے ہے اور "المرقی " 'میم' کے فتحہ اور 'را' کے سکون کے ساتھ بمعنیٰ سیڑھی ہے۔(لمستنم) متعلق ہے" لم تدع " سے " مستبق " کی طرح اور یہ " استنم " بمعنیٰ بلند ہونا اور قادر ہونا سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور یہاں " مستنم " سے مراد جبریل امین ہیں اس لئے کہ وہ بلند مرتفع اور مطمئن یعنی متمکن و قادر ہیں، اس وجہ سے کہ قرآن میں ان کو کہا گیا" ذو قوۃ عند ذی العرش مکین " (کہ قرآن پاک میں ان کو ان صفات سے موصوف کیا گیا ہے۔)

اس شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے جو " شفا شریف " وغیرہ کتب میں وارد ہوئی کہ حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام آپ ﷺ کو لے کر جب آسمانوں میں چڑھتے گئے یہاں تک کہ وہ اس سدرۃ المنتہیٰ تک آ پہنچے جو کہ ایک درخت ہے جس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح ہیں، اس کی جڑ میں دو ظاہری اور دو باطنی نہریں ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل سے ان نہروں کے بارے میں دریافت کیا، تو جبریل امین نے عرض کیا حضور باطنی دو نہریں تو جنت میں ہیں اور ظاہری ندیاں نیل و فرات ہیں بہر حال تو جبریل امین اس مقام (مقام

سدرۃ المنتہی) پر پہنچنے کے بعد ٹھہر گئے اور عرض کیا" لودنوت انملة لا حترقت " کہ حضور اگر ایک پورے بھر بھی آگے بڑھا تو جل کر خاک ہو جاؤں گا اسی وجہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے سلسلے میں فرمایا (وما منا الا له مقام معلوم) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام سدرۃ المنتہی میں ہے اور " انوار التنزيل " میں ہے کہ روایت کی گئی ہے کہ وہ یعنی سدرۃ المنتہی ساتویں آسمان میں ہے اس تک تمام مخلوق کے علم کی انتہا ہے اور ان کے وہ اعمال جو اس کے اوپر سے اترتے ہیں اور اس کے نیچے سے چڑھتے ہیں وہ بھی وہاں تک جا کے منتہی ہو جاتے ہیں۔ انتہی۔(الخرفوتی ص: ۱۷۷، ۱۷۸)

حاصل معنیٰ: (یارسول اللہ ﷺ) آپ ابواب سماویہ میں دخول فرماتے رہے اور حجابات نورانیہ کو عبور فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کمال قرب مطلق تک بڑھنے کی کوشش کرنے والے کے لئے کوئی غایت باقی ہی نہیں چھوڑی اور نہ ہی عالم وجود کی رفعت کے طالب کے لئے چڑھنے ، ترقی کرنے اور قیام وقعود کرنے کی کوئی جگہ چھوڑی بلکہ آپ نے ان سب مقام ومرتبوں اور منزلوں کو مقام قاب قوسین اوادنیٰ تک تجاوز فرمایا اور پھر اس کے بعد آپ کے رب نے آپ کو وحی کی جو کرنا تھی۔(الزبدة ص: ۹۶)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدهٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم ، و آله و صحبه الكرام اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين.

قصیدہ بردہ شریف کی ساتویں فصل کے آٹھویں اور نویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، شاعر ذی فہم فرماتے ہیں

(۱۱۲) خفضت كل مقام بالاضافة اذ   نوديت بالرفع مثل المفرد العلم

(ترجمہ: (یارسول اللہ) آپ نے اپنے مقام ومرتبے کی نسبت کے اعتبار سے ہر مقام اور ہر بلند سے بلند درجے کو زیر فرما دیا (اس رات) جب آپ کو اوپر آنے کی ندا دی گئی منفرد وممتاز کی طرح۔)

(۱۱۳)کیما تفوز بوصل ای مستتر   عن العیون و سرایّ مکتتم

(ترجمہ: (یارسول اللہ آپ کواتنی بلندیوں پر یعنی مقام قاب قوسین اوادنیٰ تک اس لئے بلایا) تاکہ آپ اپنے رب سے ملنے اور واصل حق تعالیٰ ہوجانے میں (اور اس کے ماسوا سے قطع تعلق کرنے میں) فائز ہوجائیں جو وصل الٰہی کہ تمام نگاہوں سے کامل طریقے پر پوشیدہ تھی اور تاکہ آپ اسرار الٰہیہ میں سے کسی ایسے سر پر واقف ہوجانے میں کامیاب ہوجائیں جو راز کہ سب کے کانوں اور سماعتوں سے چھپا ہوا ہو۔

ربط: ان اشعار میں شاعر ذی فہم گزشتہ شعر کے مضمون کو مکمل کررہے ہیں اور ان امور کو بیان کررہے ہیں جو مقام قاب قوسین اوادنی تک آپ ﷺ کے عروج فرمانے میں آپ کو پیش آئے نیز یہ کہ آپ ﷺ کی اس عروج فرمانے کی وجہ سے جو تمام ملائکہ اور تمام انبیائے کرام ورسولان عظام پر آپ کی جو مزید فضیلت ثابت ہوتی ہے، ان کے مراتب پر آپ کے مرتبوں اور بلند درجات میں آپ کے مخصوص ہونے کی وجہ سے، اسی لئے ناظم فاہم کہتے ہیں:

خفضت کل مقام بالاضافة   نودیت بالرفع مثل المفرد العلم

کیما تفوز بوصل ای مستتر   عن العیون و سرایّ مکنتم

تشریح: (خفضت) یا تو محلاً مجزوم ہے اس بنیاد پر کہ "اذا" شرطیہ کا جواب ہے یا محل جر میں "لم تدع" کا بدل ہے یا پھر یہ جملہ استنافیہ ہے جو جملے کے مضمون کو مؤکد کررہا ہے اور وہ مضمون جملہ حضور اکرم ﷺ کی کمال ترقی وتعلّٰی ہے۔اور "خفض" کے کئی معنیٰ ہیں: ایک تو "خفض" اعراب میں نیچے والی حرکت یعنی زیر کو کہتے ہیں، اور "خفضہ من العلو الی الاسفل" کا معنیٰ اوپر سے نیچے اترنا، ہوتا ہے اور مرتبہ ومقام میں خفض کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے سے پہلے یا ساتھ والے کی ترقی کا پہلے مشاہدہ کرے اور پھر وہ دونوں آگے بڑھیں اور پھر یہ اسے پیچھے چھوڑ دے۔

بہرحال تو (خفضت) کا معنیٰ ہوگا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ نے ہر مقام کو تجاوز فرمایا اور آپ ہر مرتبے سے آگے بڑھ گئے اور آپ نے ہر درجے کو پیچھے چھوڑ دیا، لہٰذا یہ تعبیر میں بہت بہتر ہے اس سے کہ "خفضت" کی تفسیر

میں ’’حططت‘‘(آپ اوپر سے نیچے اتر آئے کہا جائے۔

(بالاضافة) یعنی آپ کے مقام ومرتبے کی بنسبت نہ کہ مطلقا اس لیے کہ تمام انبیائے کرام تو کمال سے متصف ہیں ہی لیکن ہمارے نبی کریم ﷺ اکمل ہیں، لہذا آپ ﷺ کے غیر کا مقام فقط آپ ﷺ کے مقام اور مرتبے کی نسبت سے پست ہے اس لئے کہ آپ کا مقام وہ ہر مخلوق کے مقام سے بلند ہے اگر چہ وہ مقام فی نفسہ بلند ہے اس لئے کہ وہ تو آپ کے مقام ومرتبے کی بنسبت پست نظر آرہا ہے اور اس تشریح پر قرینہ گزشتہ شعر اور اس شعر ہی میں ہے، گزشتہ شعر میں قرینہ " مستبق " اور مستنم " کے الفاظ ہیں اور اس شعر میں ’’ خفضت " قرینہ ہے اور ہاں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھنا کہ آپ ﷺ کے علاوہ باقی انبیائے کرام کمال سے متصف نہیں، اس لئے کہ یہ عقیدہ کفر ہے لہذا تم پر یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ تمام انبیائے کرام کمال سے متصف ہیں (کامل ہیں) اور ہمارے نبی اکرم ﷺ اکمل ہیں۔

ناظم شعر کا قول ’’ اذ ‘ ان کے اس قول " خفضت " کا یا تو ظرف ہے یا اس کی علت۔(نودیت) (باب مفاعلت سے فعل ماضی مجہول، واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے ' النداء ' مصدر سے اور ’ندا‘ طلب اقبال کو کہتے ہیں۔

(بالرفع) یعنی آپ کو ندا دی گئی جو ملی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کے آپ ﷺ کو بلند فرمانے سے، تو ’’رفع‘‘ مصدر ہے جو یہاں فاعل یا مفعول کی جانب مضاف ہے یعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی " رفع الله اياك " یا پھر " رفعك " (المفرد) سے یہاں مراد وہ جو فضائل وکمالات میں منفرد و بے مثال ہو، ہے۔ اور (العلم) سے مراد وہ جو مشہور ہے یعنی عالی قدر۔ بہر حال معنی ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے اقبال کو اپنے فضل وعنایت سے اسی طرح طلب کیا جس طرح کہ طلب کرنا لوگوں کے درمیان رائج ومعروف ہے، جیسے کسی کو تعظیم وتکریم کے ساتھ کہا جاتا ہے " يا هذاالرجل "

(حاشیہ: اس شعر میں شاعر ذی فہم نے علم نحو کی اصطلاحات کو انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ جمع فرمایا ہے خفض (جر) اضافت، ندا، رفع، مفرد اور علم کو شعر میں الفاظ کی لڑیوں میں اس طرح پرویا گیا ہے کہ ان کے لغوی معانی سے

مفہوم بھی ادا ہو جائے اور اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ بھی اگر چہ یہاں اصطلاحات نحویہ مقصود نہیں، اس شعر کا جو معنی بیان کرنا مقصود ہے وہ ترجمے میں گزر چکا، اس کے علاوہ اس شعر کا ایک معنیٰ اس طرح بھی ہوسکتا ہے: (یا رسول اللہ) جس طرح اضافت کی وجہ سے کلمے کو زیر آتا ہے اسی طرح آپ نے ہر درجے کو زیر کردیا اور جس طرح منادی مفرد اور علم پر رفع آتا ہے اور وہ مرفوع ہوتے ہیں اسی طرح آپ کو اس رات رفع کی ندا دی گئی اور آپ منادی مرفوع ہوئے (یعنی بلند کیئے گئے)''

شرح بیت ثانی: (کیما) "کَیْ" حرف تعلیل ہے بمعنیٰ ''تاکہ'' اور "ما" زائدہ ہے) یعنی "لکیما تفوز... الخ تو اس تقدیر پر "کَیْ" سے پہلے 'لام' مقدرہ ہے لہذا اس صورت میں "کی" مصدریہ ہوگا اور بذات خود فعل کو نصب کرنے والا ہوگا اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے پہلے 'لام' مقدر نہ ہو تو اس تقدیر پر وہ تعلیلیہ ہوگا اور فعل کے لئے ناصب وہ بذات خود نہیں بلکہ اس کے بعد 'ان' مقدرہ نصب کرنے والا ہوگا قول صحیح پر اور "کیما" میں "ما" مذکورہ دونوں صورتوں میں زائدہ ہی ہوگا لہذا ہر دو تقدیر پر یہ شعر ناظم کے قول "سریت" یا "بِتَّ" کی علت ہے۔

تو معنی یہ ہوگا کہ (یا رسول اللہ) آپ سدرۃ المنتہیٰ سے مقام قاب قوسین او ادنیٰ تک پہنچے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کے وصال اور اس کے ماسوا سے قطع تعلق کرنے) میں کامیاب ہوجائیں۔ (وصل) بمعنیٰ ملنا، ضد ہے قطع کی۔

(ای مستتر) میں "مستتر" جر کے ساتھ صفت ہے "وصل" کی اور "مستتر" 'استتار' مصدر سے بمعنیٰ چھپنا ہے، تقدیری عبارت یوں ہوگی: بوصل مستتر استتارا کاملا "(یعنی ایسا وصال جو استتار میں کامل ہے) یعنی کامل طریقے پر پوشیدگی (عن العیون) ظرف ہے جو متعلق ہے "مستتر" سے اور "عیون" (عین کی جمع ہے) بمعنیٰ آنکھیں (سر) بالجر کا "وصل" پر عطف ہے، معنیٰ ہوگا (یا رسول اللہ آپ کو اتنی بلندیوں پر مقام قاب وقوسین او ادنیٰ تک اس لئے بلایا تاکہ آپ اپنے رب سے ملنے میں اور واصل حق تعالیٰ ہوجانے میں فائز ہوجائیں جو وہ وصل الٰہی کہ تمام نگاہوں سے کامل طریقے پر پوشیدہ تھی) اور تاکہ آپ اسرار

الٰہیہ میں سے کسی سر پر واقف ہوجانے میں کامیاب ہوجائیں اس مقام پر آپ کو وحی کی جو وحی کی۔
(مکتتم) صفت ہے "سر" کی (یہ 'اکتتام' مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنیٰ چھپانا) یعنی ایسا راز جو کامل طریقے پر سب کے کانوں اور ساعتوں سے چھپا ہوا ہے ایسا راز جو خفیہ اور پوشیدہ ہونے میں کامل ہے۔ "سـر" (راز الٰہی) سے یہاں مراد وہ حقائق و معانی اور اسرار کاملہ ہیں جو آپ ﷺ کے علاوہ کسی پر منکشف نہ ہوئے۔

"ثم دنا فتدلی فکان قاب و قوسین او ادنیٰ" کی تفسیر

"الـزبـدة" میں ہے یارسول اللہ آپ اس انتہا کو پہنچے یعنی مقام قاب قوسین او ادنیٰ تک تاکہ آپ اپنے رب سے ملنے میں اور ماسوا سے قطع تعلق کرنے میں کامیاب ہوجائیں، اور وصل سے مراد قرب مکانی کا وصل نہیں بلکہ مراد حضور کے مرتبے کی عظمت کا ظہور ہے اور آپ کی معرفت کے انوار کا روشن ہونا ہے اور اس کی قدرت اور غیب کے اسرار کا مشاہدہ کرنا ہے اور اس کے اخلاق کو اختیار کرنا ہے اور کمال و جمال الٰہی کے مشاہدہ اور مطالعہ پر نظر کو منحصر کرنا اور غیر کی طرف نظر نہ کرنا ہے، اسی پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرر ہا ہے: (دنـا فتـدلیٰ) اور یہ دلالت اس آیت کی تفسیر میں جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک کی تقدیر پر ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ "دنـیٰ" کی ضمیر راجع ہے ہمارے نبی اکرم ﷺ کی جانب، روح البیـــان' میں ہے ضمیر کے آپ ﷺ کی جانب راجع ہونے پر ایک روایت میں حضور کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ "جب راتوں رات مجھے آسمان کی سیر کرائی گئی تو میرے رب نے مجھے اتنا قریب کیا کہ میرے اور اس کے درمیان دو قوس یا اس سے بھی کم کی مقدار رہ گئی تھی پھر مجھ سے کہا گیا آپ کی امت کو سب سے آخری امت بنایا گیا تاکہ وہ تمام امتوں کے نزدیک سب سے زیادہ ظاہر کرنے والی امت ہو یعنی دوسری امتوں کی خبروں پر واقف ہونے کی وجہ سے نہ کہ ان سے مؤخر ہونے کی وجہ سے بعض اکابرین نے فرمایا(ثـم دنـا) اشارہ ہے عروج اور وصول کی جانب اور (فتـدلـیٰ)اشارہ ہے نزول اور رجوع کی جانب اور (فکان قاب قوسین) نتیجے کی منزل کے اعتبار سے اشارہ ہے اس عالم صفات تک وصول کی طرف کہ جس کی جانب اس فرمان باری تعالیٰ میں اشارہ ہے (اللـه الصمد) نیز یہ کہ (او ادنیٰ) اشارہ

ہےاس عالم ذات کی طرف جس کی جانب اس فرمان باری تعالیٰ میں اشارہ کیا گیا ہے (اللہ احد)سورۂ اخلاص میں!

حاصل معنیٰ : (ثم دنا) یعنی پھر حضور حق کے قریب ہوئے خلق سے (فتدلیٰ) پھراترے خلق کی طرف حق کے پاس سے (فکان قاب قوسین)تو اس جلوے اور محبوب کے درمیان دو ہاتھ کا فاصلہ رہا،مرتبۂ وحدت واحدیہ میں جو مشاہدۂ صفات وخلق اور غیب ذات وحق کے درمیان جامع ہے (او ادنیٰ) بلکہ اس سے بھی کم، مرتبۂ وحدت احدیہ میں جو ذات حق کے غیب کے ساتھ مختص ہے۔

تو اس صورت میں یہاں دو امر ہوئے: ایک مرتبۂ قاب قوسین تک وصول کا اور یہ مرتبہ صرف صفات میں فنا ہونے سے حاصل ہوا اور دوسرا مرتبۂ او ادنیٰ تک وصول کا اور یہ مرتبہ ذات وصفات دونوں میں فنا ہونے سے حاصل ہوا، تو اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نزول وبقا کو میسر فرمائے تو معاملہ ان دو جہتوں میں پورا ہوجائے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ " دنا" سے لے کر آخر تک (تمام افعال) کی ضمیر راجع ہے اللہ تعالیٰ کی جانب۔

"کشف الاسرار" میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندے سے قریب ہونا دو طریقے پر ہے:

اول: بندے کی دعا قبول فرما کر، اس کی تمنائیں پوری فرما کر اور اس کے مقام ومرتبے کو بلند فرما کر، جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے ﴿ فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان﴾

ثانی: حقیقتاً قرب کے معنیٰ میں نہ کہ ان مذکورہ معانی میں جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ ثم دنا فتدلیٰ﴾ انتھی۔

تو بر تقدیر ثانی معنیٰ ہوگا (ثم دنا) پھر قریب ہوا جلوۂ رب العزت (فتدلیٰ) پھر وہ جلوہ خوب نزدیک ہوا یہاں تا کہ اس جلوے اور محمد علیہ السلام میں دو ہاتھ کا فاصل رہا بلکہ اس سے بھی کم، لہذا اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے قریب ہونے اور اترنے کا معنیٰ اسی طرح ہے جس طرح وہ روز رات کے تیسرے پہر میں اس سمائے دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اپنی شان کے لائق ہے)اور اہل معارف وحقائق کے نزدیک مقام تنزل اس معنیٰ میں ہے کہ اللہ تبارک و

تعالیٰ اپنے بندوں پر لطف وکرم فرماتا ہے اور اپنے خطاب میں ان کے لئے تنزل فرماتا ہے تو وہ اپنے اوپر ان الفاظ کا اطلاق واستعمال فرماتا ہے جو بندے اپنے اوپر اطلاق کرتے ہیں!! لہذا وہ الفاظ بندوں کے حق میں حقیقی ہیں اور رب تعالیٰ کے حق میں مجازی، جیسا کہ " انسان العیون " میں ہے۔

قاضی ابوالفضل کتاب الشفا میں فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے ' دنو ' اور ' قرب ' کی اضافت اللہ سے یا اللہ تعالیٰ تک جو واقع ہوئی ہے وہ قرب مکانی نہیں اور نہ ہی غایت کی نزدیکی ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے حضرت جعفر صادق سے ذکر کیا کہ (قرب سے مراد) حد اور غایت کا قرب نہیں بلکہ نبی کا اپنے رب سے نزدیک ہونا ہے اور رب کا اپنے نبی سے قریب ہونا، یہ نبی کے عظیم مقام ومرتبے کا اظہار اور مشرف کرنا ہے اور آپ کی معرفت کے انوار کا روشن ہونا اور اس کی قدرت کے اسرار غیبیہ کا مشاہدہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور کے لئے عطیہ ہے اور حضور کو مانوس کرنا اور کشادہ فرمانا ہے اور اکرام دینا ہے۔

" فتح الرحمن " میں ہے: توجو فکان قاب قوسین کی ضمیر کو اس تقدیر پر حضرت جبریل کے بجائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب لوٹاتا ہے تو یہ فرمان " فکان قاب قوسین الخ " پھر تو حضور ﷺ سے نہایت قرب، لطف محل، اتضاح معرفت اور حقیقت پر مطلع فرمانے سے عبارت ہوگا اور نام ہوگا رغبت کو قبول کرنے اور مقاصد ومطالب کو پورا فرمانے کا، جو کہ اجابت وقبول فرمانے اور احسان کرنے اور امیدوں کو جلد پورا فرمانے کے قریب ہے۔ (روح البیان)

اب اس امر میں قوم مختلف ہے کہ آپ ﷺ نے شب معراج اللہ تبارک وتعالیٰ کو بچشم قلب دیکھا ہے یا بچشم سر؟ تو بعض نے فرمایا کہ حضور کے قلب شریف میں قوت بصارت عطا کردی گئی تھی تو حضور نے اپنی دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، لہذا اس فرمان باری تعالیٰ (ما کذب الفواد ما رأیٰ) کا معنیٰ اس تقدیر پر یہ ہوگا، کہ جو دل کی نگاہوں نے دیکھا اسے دل نے جھٹلایا نہیں۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب کو ماتھے کی نگاہوں سے دیکھا، حضور علیہ السلام کے اس

فرمان کی وجہ سے " ان اللہ اعطیٰ موسیٰ الکلام و اعطانی الرویۃ" کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو شرف کلام بخشا اور مجھے شرف دیدار، نیز حضور علیہ السلام کے اس فرمان کی وجہ سے " رایت ربی فی احسن صورۃ" یعنی میں نے اپنے رب کا دیدار انتہائی حسین صفت میں کیا، یہاں صورت سے صفت مراد ہے۔ " الکواشی " میں ہے کہ اس میں رویت بچشم سر ماننے والوں کے لئے کوئی صحت نہیں اس لئے کہ ممکن ہے کہ رویت سے مراد رویت قلبی ہو بایں طور کہ حضور علیہ السلام رکو مزید معرفت عطا کی گئی ہو علامہ اسماعیل حقی روح البیان میں فرماتے ہیں کہ کلام کے مقابلے میں رویت کا ذکر دلالت کرتا ہے رویت چشمی پر اس لئے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے اس کا سوال کیا تھا لیکن انہیں منع، کر دیا گیا تو یہ اس بات کا مقتضی ہوا کہ وہ جس سے منع فرما دیئے گئے ہمارے نبی کریم ﷺ اس سے فضل میں زائد ہوں اور وہ رویت بصریہ ہی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رویت قلبی میں تمام انبیائے کرام مشترک ہیں حتیٰ کہ اولیائے عظام بھی، نیز یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کو دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے جب وہ کوہ طور پر غش کھا کر گر پڑے تھے، مزید یہ کہ اس کو زیادتی معرفت پر محمول کرنا کچھ فائدہ نہیں دیگا۔ انتھیٰ

بعض فاضلین فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل کی رویت کا تو ذکر فرمایا ہے لیکن آنکھ کی رویت کا ذکر نہیں فرمایا! اس لئے کہ آنکھ کی رویت یہ اس کے اور اس کے حبیب کے درمیان راز ہے اور اسی طرف شاعر ذی فہم نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ " و سر مکنتم"

حاصل : ہمارا مذہب رویت بچشم سر اور رویت بچشم قلب دونوں کی صحت کا ہے، اس حدیث کی وجہ سے جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت فرمائی ہے: رأیت ربی بعینی و بقلبی " کہ میں نے اپنے رب کو اپنی آنکھوں اور اپنے دل سے دیکھا لیکن ہم بندے اس کی کیفیت کو سمجھنے سے عاجز ہیں کہ کیسے دیکھا۔

"ما اوحیٰ" کے اسرار

اور اس قول " سر ای مکنتم " میں ان اسرار کی جانب اشارہ ہے جن کا انکشاف حضور نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی

پر نہ ہوا، اس تقدیر کی بنیاد پر کہ جس پر یہ فرمان باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے (فاوحیٰ الی عبده ما اوحیٰ) اور بعض فضلائے کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے " ما اوحیٰ " کے بعض اسرار کو تمام مخلوق سے پوشیدہ فرما دیا تاکہ کوئی دوسرا اس پر مطلع نہ ہو سکے (کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندے پر کیا وحی کی)! اس لئے کہ وہ اس کی خاص محبت و معرفت اور علو درجات میں سے ہے کیوں کہ خاص احباب کے درمیان کچھ ایسے اسرار اور راز پوشیدہ ہوتے ہیں جن پر کوئی دوسرا مطلع نہیں ہوتا۔ انتھیٰ

شاعر کہتا ہے:

لا یکتم السر الا کل ذی خطر　　　و السر عند کرام الناس مختوم

(ہر ذی رتبہ اور بلند مرتبہ شخص ہی راز کو پوشیدہ رکھ پاتا ہے اور مکرم و معظم لوگوں کے پیٹ میں ہی راز محفوظ رہتا ہے)

و السر عندی فی بیت لہ غلق　　　قد ضاع مفتاحہ والباب مختوم

(میرے پاس کسی کا راز ایسے ہوتا ہے کہ جیسے وہ کسی بند گھر میں ہو جس کی چابی کھوگئی ہے اور اس کا دروازہ مقفل ہے)

اور کوئی دوسرا کہتا ہے:

بین المحبین سر لیس یفشیہ　　　قول ولا قلم للخلق یحکیہ

(عاشقوں کے درمیان راز ایسا پوشیدہ ہوتا ہے کہ زبان کبھی اس کو افشا نہیں کرتی اور نہ ہی قلم اسے مخلوق سے بیان کرتا ہے)

سر یمازجہ انس یقابلہ　　　نور یحیر فی بحر من التیہ

(وہ راز جو کسی انسان کو معلوم ہو اس روشنی کی طرح ہے جو پریشان کن سمندر میں مزید پریشانی میں ڈال دے)

بعض اہل حال فرماتے ہیں: اگر ان اسرار میں سے ایک کلمہ بھی تمام اولین و آخرین کے سامنے بیان کر دیا جائے تو وہ سب اس وارد کلمے کے بوجھ سے فوت ہو جائیں جو کہ حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے خاص بندے کے قلب

منور پر وارد ہوا ہے، اور مصطفےٰ جان رحمت ﷺ ان اسرار کو اس قوت ربانیہ ملکوتیہ لاہوتیہ کی بدولت اٹھائے ہوئے ہیں جو قوت کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے اور اگر وہ قوت نہ ہوتو اس کے ایک ذرے کا بوجھ بھی آپ نہ اٹھا سکیں اس لئے کہ وہ اخبار عجیبہ اور اسرار ازلیہ ہیں کہ اگر ایک کلمہ بھی اس میں سے ظاہر ہو جائے تو تمام احکام معطل ہو جائیں، تمام ارواح واجسام فنا ہو جائیں تمام رسوم ختم ہو جائیں اور تمام وعقول وعلوم مضمحل ہو جائیں۔

نیز بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں: وہ وحی جو اس رات آپ ﷺ کی طرف کی گئی۔ اس کی کئی قسمیں ہیں: **ایک قسم** وہ ہے جسے آپ نے عوام تک پہنچا دی اور وہ شرائع واحکام ہیں۔ **دوسری قسم** وہ جو آپ نے خواص کو عطا فرمائی اور وہ معارف الٰہیہ ہیں۔ **تیسری قسم** وہ جو صرف آپ کے ساتھ ہی باقی ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہے جسے اللہ عزوجل نے آپ کے ساتھ خاص فرما دیا ہے اور وہ راز ہے جو آپ ﷺ اور اللہ عزوجل کے درمیان پوشیدہ ہے۔ (الخرفوتی ص ۱۸۰۔۱۸۱)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم ، و آلہ و صحبہ الکرام اجمعین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

ربط: قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے دسویں اور گیارہویں شعر کی شرح کا آغاز کیا جارہا ہے، شاعر ذی فہم نے گزشتہ شعر میں اس وصل الٰہی کا ذکر فرمایا جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور انہوں نے اس کا ذکر آپ ﷺ کے سدرۃ المنتہیٰ تک بلوغ و وصول اور عروج وسیر فرمانے کے لئے علت غائی کی حیثیت سے کیا (کہ مقام قاب قوسین او ادنیٰ تک آپ ﷺ کا سیر فرمانا اس لئے تھا تا کہ آپ وصل الٰہی میں کامیاب ہو جائیں)، جو دنو الی اللہ ودنو من اللہ و تدلیہ الی مصطفاہ ﷺ " سے عبارت ہے اور یہ ایک مسلم قاعدہ ہے کہ ' الشئی اذا ثبت ثبت بجمیع لوازمہ' کہ شئی جب بھی ثابت ہوتی ہے اپنے تمام لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے!

لہذا اس 'دنو' اور 'قرب' نے اس بات پر دلالت کی کہ آپ ﷺ نے تمام فضائل کو جو آپ کے سوا کسی میں نہیں کو جمع کیا اور ہر مقام و مرتبے کو جس پر کوئی نہیں پہنچا عبور فرمایا نیز آپ کے مولیٰ نے آپ کو ان عظیم و جلیل رتبوں کا مالک بنایا کہ اس کی انتہا کو جاننا بہت بڑی بات ہے اور آپ کے مولیٰ نے آپ کو وہ نعمتیں عطا فرمائیں کہ اس کی غایت کا ادراک کرنا بڑا مشکل کام ہے، شاعر ذی فہم کہتے ہیں:

(۱۱۴) فحزت كل فخار غير مشترك   و جزت كل مقام غير مزدحم

(ترجمہ: تو (یارسول اللہ) آپ نے تمام فضائل و شمائل بلا شرکت غیرے جمع فرمائے اور ہر مقام و مرتبے کو بلا کسی اجتماع واز دحام کے عبور فرمایا)

(۱۱۵) وجل مقدار ماو ليت من رتب   و عز ادراك ما اوليت من نعم

(ترجمہ: اور (یارسول اللہ) جن رتبوں ورمرتبوں کا آپ کو والی و مالک بنایا گیا وہ انتہائی عظیم و جلیل ہیں اور جو نعمتیں آپ کو عطا کی گئیں ان کا ادراک انتہائی مشکل امر ہے)

لفظی تشریح بیت اول: (فحذت) میں 'فا' برائے تفصیل و تفریع ہے اور " حزت" حاز الشئی سے بمعنیٰ جمع کرنا ہے۔ (كل) نصب کے ساتھ " حزت" کا مفعول ہے (فخار) یعنی وہ فضائل و شمائل جن سے فخر کیا جائے۔ (غير مشترك) منصوب ہے یا تو " حزت" کے فاعل سے حال واقع ہونے کی بنا پر یا " كل" کی صفت ہونے کی بنا پر یا پھر وہ " فخار" کی صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ " مشترك" یعنی اس میں مشترک نہیں لہذا وہ باب حذف و ایصال سے ہے، یعنی جب اس چیز تک تمہارے علاوہ کوئی اور نہ پہنچے کہ وہ بھی اس میں تمہارا شریک ہو جائے اور یہی بات " غير مزدحم" کے بارے میں کہی گئی ہے (جزت) 'جیم' اور 'زا' کے ساتھ بمعنیٰ تجاوز کرنا یعنی (یارسول اللہ) آپ نے کمالات کے ہر مقام کو تجاوز فرمایا اس تک جو ان سب سے اکمل ہے کہ اس مقام تک آپ کے سوا کوئی نہ پہنچ سکا۔

تشریح بیت ثانی: (جل) بمعنیٰ عظیم یعنی بڑی ہے اس کا عطف ہے " فحزت" پر (مقدار) بالرفع

فاعل ہے" جل "کا(ما) موصولہ ہے (ولیت) " ولاہ" سے بمعنیٰ والی وما لک بنانا یعنی آپ کی مملکت میں داخل ہونے کی وجہ سے آپ کی اس پر ولایت ہوگئی۔(من رتب) میں ' من" بیانیہ ہے اور " الرتب" جمع ہے ' رتبه' کی یعنی وہ مناصب شریفہ جن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کلام اور اس سے مابعد کلام سے مقصود اظہار تعجب ہے۔ (عــز) بمعنیٰ غالب ہونا اور بمعنیٰ ممتنع ہونا ہے اور یہاں مراد امتناع ہے۔(ادراك)یعنی کسی شئی کا ذات وصفات کے اعتبار سے احاطہ کرنا اور اس سے مراد جاننا ہوگا اگر" نــعــم" سے حقائق ومعارف اور علوم حکمت مراد لئے جائیں اور اگر مراد اس سے عام لیا جائے تو" ادراك" سے مراد وجدان ہوگا۔(ما) موصولہ ہے، (اولیت) یعنی وہ نعمتیں جو آپ کو دی گئیں۔(من) 'ما موصولہ کا بیان ہے،اور (نعم) جمع ہے 'نعمة' کی اور اس پہ تنوین تعظیم وتکثیر کی ہے یعنی وہ عظیم وکثیر نعمتیں اللہ نے جن کے ساتھ آپ کو خاص کیا۔

حاصل معنیٰ: تو ان رتبوں کو پانے کی وجہ سے آپ نے وہ تمام فضائل وشمائل کہ جن سے فخر کیا جاتا ہے اور جو آپ کے ساتھ مختص ہیں جمع فرمائے نیز آپ نے ہر مقام ومرتبے کو تجاوز فرمایا بغیر اس میں کسی اجتماع ازدحام کے اس لئے کہ اس مرتبے تک وصل آپ کے سوا کسی کا نہ ہوا۔(الباجوری ص ٦٢)

حضور اکرم ﷺ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے نعم وکرم اور آپ ﷺ کے مقام ومرتبے کا بیان

بعض فاضلین نے فرمایا:"كل فخارِ غير مشترك" سے مراد وسیلہ درجۂ رفیعہ،کوثر،شفاعت عظمیٰ مقام محمود اور لوائے ممدود کے مثل ہے اور " مقام غير مزدحم" سے مراد مقام محبت ختم نبوت،رسالت عامہ وغیرہ کے امثال ہیں، ساتھ ساتھ اس کے کہ جو اس میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک روایت کی طرف اشارہ ہے حدیث اسراء کے بارے میں کہ حضور نے فرمایا:'' پھر مجھے آگے کیا جاتا رہا اور حال یہ تھا کہ جبریل میرے پیچھے تھے یہاں تک کہ مجھے حجاب ذہب تک لایا گیا تو انہوں نے (جبریل نے) حجاب کو حرکت دی،تو آواز آئی کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں جبریل ہوں اور میرے ساتھ محمد (ﷺ) ہیں،فرشتے نے کہا (اللہ اکبر) اور پھر اس نے حجاب کے نیچے

سے اپنا ہاتھ نکالا اور مجھے اٹھا کر پلک جھپکنے کی تیزی میں اپنے سامنے رکھ دیا اور عالم یہ تھا کہ اس حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کے چلنے کا زمانہ تھی، پھر مجھ سے کہا" تـقـدم يا محمد " آگے بڑھئے اے محمد (ﷺ) میں آگے بڑھنے لگا تو فرشتہ پلک جھپکنے کی تیزی کے ساتھ مجھے حجاب لؤلؤ کی طرف لے گیا تو انہوں نے پھر حجاب کو حرکت دی، فرشتے نے حجاب کے پیچھے سے پوچھا کون ہے؟ انہوں نے کہا میں حجاب ذہب والا ہوں اور یہ میرے ساتھ محمد ہیں، تو اس فرشتے نے کہا اللہ اکبر، اور پھر حجاب کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکال کر مجھے اٹھالیا یہاں تک کہ مجھے اپنے سامنے رکھ دیا تو اسی طرح ایک حجاب سے دوسرے حجاب تک میں ہوتا رہا یہاں تک کہ میں نے ستر حجابوں کو پار کرلیا اور ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر میرے لئے ہرا رفرف اتارا گیا جس کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہورہی تھی اور میں اس سواری رفرف پر بیٹھ گیا، پھر اس نے مجھے اٹھایا یہاں تک کہ میں عرش تک پہنچ گیا اور وہاں میں نے عظیم وجلیل امور کا مشاہدہ کیا، پھر عرش سے ایک قطرہ میری زبان پر گرا، تو اس کا عالم یہ تھا کہ تمام چکھنے والوں نے اس سے زیادہ میٹھی چیز کوئی نہ چکھی ہوگی کبھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سے مجھے اولین وآخرین کا علم عطا فرمایا۔ (الخرپوتی ص ۱۸۱۔۱۸۲)

مزید یہ کہ بیت ثانی کے" وجـل مـقـدار ما وليت من رتب" میں اس جانب اشارہ ہے کہ آپ ﷺ قیامت کے دن اہل محشر پر شفاعت کے ذریعہ والی ہیں اس طرح کہ آپ کو شب معراج شفاعت عطا کی گئی اور اسی طرح ان چیزوں میں سے جو اس رات آپ کو عطا کی گئی یہ وحی بھی ہے جو آپ کی طرف ہوئی کہ انبیائے کرام پر جنت اس وقت تک حرام ہے جب تک آپ اس میں داخل نہ ہوجائیں اور بقیہ امتوں پر اس وقت تک حرام ہے جب تک آپ کی امت جنت میں داخل نہ ہوجائے نیز آپ ﷺ کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان (لـولاك لـمـا خـلـقـت الا فلاك) کہ اے حبیب اگر تمہیں پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا، اور اسی طرح اس شب حضور کو قوت جبروتیہ عطا کی گئی کہ جس سے آپ کے دشمن نیست ونابود ہوجائیں۔ وغیرہ ذالک وہ عطیات قلم جن کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

اورشاعرذی فہم کے اس قول" ما اولیت من نعم" میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا آپ ﷺ کو اس رات علم الاولین و الآخرین دینے کی طرف اشارہ ہے، نیز اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کی امت کو افضل امت بنایا گیا اور آپ کی امت کو نصیحت دی گئی اس لئے کہ آقا علیہ السلام سے مروی ہے آپ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے شب معراج میری امت کی کئی شکایتیں کیں۔ایک یہ اللہ نے فرمایا کہ میں ان سے کل کا عمل آج نہیں طلب کرتا، لیکن وہ مجھ سے کل کا رزق (آج ہی) مانگتے ہیں، دوسری یہ کہ فرمایا رب تعالیٰ نے کہ میں ان کا رزق ان کے سوا کسی کو نہیں دیتا اور وہ اپنے اعمال کو میرے سوا کو دے دیتے ہیں، تیسری یہ کہ فرماتا ہے: وہ رزق میرا کھاتے ہیں شکر دوسروں کا ادا کرتے ہیں اور میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور میری مخلوق کے ساتھ مصالحت۔ چوتھی یہ کہ عزت میرے لئے ہے اور میں ہی عزت دینے والا ہوں مگر وہ دوسروں سے عزت چاہتے ہیں پانچویں۔ یہ کہ میں نے تو جہنم کافروں کے لئے پیدا فرمائی ہے مگر وہ اپنے آپ کو اس میں ڈالنے کی کوششیں کرتے ہیں! فرمایا رب تعالیٰ نے کہ اے حبیب اپنی امت سے فرمادو کہ اگر تم کسی کے احسان کا بدلہ دو تو یاد رکھو کہ میں اس کا زیادہ حقدار ہوں اس لئے کہ میری نعمتیں تمہارے اوپر کثیر ہیں، اور اگر تم زمین وآسمان والوں میں سے کسی سے ڈرو تو یاد رکھو کہ میں اس کا زیادہ حقدار ہوں اپنی کمال قدرت کی وجہ سے اور اگر تم کسی سے امید رکھو تو میں اس کا زیادہ حقدار ہوں کہ تم مجھ سے امید رکھو اور اگر تم کسی سے اس پر اپنی جفا سے حیا کرو تو جان لو کہ میں اس کا زیادہ حقدار ہوں اس لئے کہ تمہاری جانب سے جفا ہے، میری طرف سے وفا اور اگر تم کسی کو اپنی جان و مال سے ترجیح دو تو یاد رکھو کہ میں اس کا زیادہ حقدار ہوں اس لئے کہ میں تمہارا معبود ہوں اور تم کسی کو اس کے وعدے میں سچا کہو تو جان لو کہ میں اس کا زیادہ حقدار ہوں اس لئے کہ میں صادق ہی ہوں۔

اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا: اے محمد! میں تمہاری امت پر مال کی کثرت نہ کی تاکہ قیامت کے دن ان کا حساب طویل نہ ہوجائے، میں نے ان کی عمریں طویل نہ کیں تاکہ کہیں ان کے دل سخت نہ ہوجائیں اور میں نے ان کے لئے موت اچانک نہ رکھی تاکہ دنیا سے ان کا نکلنا بغیر توبہ کے نہ ہو اور میں نے ان کو

دنیا میں تمام دوسری امتوں سے مؤخر کیا تا کہ قبروں میں وہ طویل مدت تک قید نہ رہیں،'' اسی طرح روح البیان میں ہے۔(خرپوتی ص:۱۸۲۔۱۸۳)

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

نحمدہٗ و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم ، و آله و صحبه الکرام اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

قصیدہ بردہ کی ساتویں فصل کے دو آخری شعروں کی شرح کی جارہی ہے شاعر ذی فہم فرماتے ہیں:

(۱۱٦) بشریٰ لنا معشر الاسلام ان لنا　　من العنایة رکنا غیر منهدم

(ترجمہ: ہم گروہ مسلمین کے لئے عظیم خوش خبری ہے اس لئے کہ اللہ کی رحمت وعنایت سے ہمارے لئے ایسا رکن ہے جو کبھی منہدم ہونے والا نہیں اور ایسی شریعت ہے جو کبھی منسوخ ہونے والی نہیں)

(۱۱۷) لما دعا الله داعینا لطاعته　　باکرم الرسل کنا اکرم الامم

(ترجمہ: اور جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی طاعت کی طرف ہمیں بلانے والے ہمارے نبی کو اکرم الرسل فرمایا تو ہم اکرم الامم ہوئے۔)

ربط: شاعر ذی فہم نے چوں کہ ابتدائے واقعۂ معراج سے لے کر ماقبل اشعار تک وہ باتیں اور وہ امور بیان کئے جو حضور اکرم ﷺ کی علو ہمت بلندی درجت اور تمام ملائکہ وانبیاء ورسولان کرام پر آپ کی فضیلت اور تمام مخلوق پر آپ کی شرف وبزرگی پر ان مخصوص فضائل وشمائل کی وجہ سے دلالت کرتی ہیں کہ جن کو نہ شمار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کی انتہا کو پہنچا جاسکتا ہے نیز وہ باتیں اس پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ ملک منعام (اللہ تعالیٰ) کی بارگاہ میں مرتبۂ قرب پر فائز ہیں اور آپ کو حقائق ومعارف کی کثیر نعمتیں آسان کلمات وغیرہ میں کامل طریقے پر عطا کی گئیں، تو جب یہ باتیں گزشتہ اشعار میں انہوں نے بیان کردیں تو اب وہ آپ ﷺ کی اس طرح وصف بیانی

کرتے ہیں جو ماقبل معنیٰ کی تاکید کرے جو کہ حضور اکرم ﷺ کے خصائص وامتیازات میں سے ہے ساتھ ہی ساتھ وہ خصائص وفضائل بیان کرتے ہوئے جو آپ ﷺ کے صدقے میں آپ کی امت کو نصیب ہوئے یعنی عنایت سرمدیہ اور سعادت ابدیہ اور یہ کہ آپ ﷺ ان کے لئے ایسا رکن ہیں جو کبھی زائل نہیں ہوسکتا اور ایسی سند ہیں جو کبھی ٹیڑھی نہیں ہوسکتی، تو آپ ﷺ ان کے لئے ابد تک ہیں اور حضور کی حکومت اور حضور کی مدد و نصرت آخری مدت تک ان کے لئے دائم وقائم رہے گی اور آپ کے رب کے حکم سے امور مرغوبہ اور آسائش میں آپ ہی ﷺ کی بارگاہ کی طرف رجوع ہے اور زمانے کے مصائب وشدائد کو دفع کرنے کے لئے آپ ہی کی بارگاہ جائے پناہ وجائے نجات ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جس پر سلف وخلف (ہمیشہ) رہے اور تمام ادوار وازمان میں حضور کی حیات ظاہری سے لے کر اب تک مسلمانوں نے یہ عقیدہ ورثے میں پایا ہے بعد وفات ظاہری بھی آپ کی حرمت باقی، آپ کی مدد و نصرت جاری اور آپ کی حکومت ولایت دائم وقائم اور جاری وساری ہے! تو ہم حضور کے عہد وحکومت اور رعایت میں ہی ہیں اور جو اس عقیدے سے منہ پھیرے تو جان لو اس نے ایمان کی حلاوت وچاشنی نہ چکھی۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے داعی یعنی ہمیں اسلام کی دعوت دینے والے ہمارے رسول کو لقب اکرم الرسل سے موسوم فرمایا تو اللہ نے حضور کے صدقے میں ہم پر بھی ہمیں قبول فرما کر توجہ فرمائی کہ اس نے ہمیں اکرم الامم بنا دیا، اسی کو شاعر ذی فہم یوں کہتے ہیں:

بشریٰ لنا معشر الاسلام ان لنا — من العناية ركنا غير منهدم

لما دعا الله داعينا لطاعته — باكرم الرسل كنا اكرم الامم

لفظی تشریح: (بشر) " بشرته بكذا" مصدر ہے " البشارة" سے بمعنیٰ خوش خبری اور اس سے مراد وہ خوش خبری ہے جو چہرے کو پر رونق کر دے اور کبھی اس سے مراد وہ خوشی اور مسرت ہوتی ہے جو اس سے حاصل ہو۔ (بشریٰ لنا) یا تو مبتدا ہے اور اس کی یعنی بیان مذکور کا حاصل خوشخبری ہے اور " لنا" صفت ہوگی، یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی " بشرى لنا قد ثبتت" ہمارے لئے خوش خبری ثابت

ہے، یا پھر " بشریٰ "مبتدا ہے اور" لنا "اس کی خبر۔ (معشر) بمعنیٰ جماعت (ان لنا) استئناف ہے،" ان "
استئناف بیانی کی بنیاد پر بکسر ہمزہ ہوگا اور بر تقدیر تعلیل بفتح ہمزہ ہوگا اور (العناية) جس کا ذکر شاعر ذی فہم نے
گزشتہ شعر میں کیا سے مراد امت کے مصالح کی مزید پروا کرنا اور ان کو اکرام دینا ہے اور یہی ازلی عنایات ہیں جو
کہ سعادت ابدیہ ہیں اور یہ وہ خصائص ہیں جو سابقہ تمام امتوں میں موجود نہیں۔

امت محمدیه کے بعض خصائص

(۱) اس امت کے لئے غنائم حلال کئے گئے جو کہ اس سے پہلی امتوں کو حلال نہ تھے، (۲) اس امت کے لئے تمام روئے زمین کو جائے سجود بنایا گیا، (۳) اس امت کو وضو دیا گیا، کہ امم ماضیہ میں سوا انبیا کے یہ وضو کسی کے لئے نہ تھا (۴) کل نماز پنجگانہ اسی امت کا خاصہ ہیں اس کے سوا کسی امت کو نماز پنج گانہ کا شرف نہ ملا (۵) اسی طرح اذان و اقامت (۶) بسملہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) اس لئے کہ یہ اور کسی امت پر نہ اتری (۷) امام کے پیچھے آمین کہنا (۸) نماز میں ملائکہ کی طرح صفبندی کرنا (۹) جمعہ (۱۰) جمعہ کے دن ساعت اجابت و وقت قبول دعا (۱۱) اور ماہ رمضان المبارک کی جب پہلی رات آتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس امت کی طرف نظر رحمت فرماتا ہے اور جس کی جانب اللہ نظر رحمت فرما دے پھر اس کو وہ کبھی عذاب نہیں دیتا (۱۲) جنت کو امت محمدیہ کے لئے ماہ رمضان میں مزین کرنا اور ملائکہ کا ان کے لئے ماہ رمضان کی ہر رات استغفار کرنا اور اس ماہ کی رات کے آخری پہر میں ان کے تمام گناہوں کا مغفور ہو جانا (۱۳) سحری اور تعجیل افطار بھی اس امت کا خاصہ ہے (۱۴) شب قدر کا عطا ہونا (۱۵) اس امت کو وقت مصیبت کے لئے کلمۂ استرجاع (انا لله و انا اليه راجعون) عطا ہوا (۱۶) اللہ تعالیٰ نے اس امت پر سے بوجھ اور کی سختی کو رفع فرما دیا (۱۷) اللہ تعالیٰ نے ان پر دین میں حرج اور تنگی نہیں رکھی (۱۸) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے خطا ونسیان پر مواخذہ اٹھا دیا (۱۹) اسلام ایک ایسا وصف ہے اس امت کا جو اس امت کے ساتھ ہی خاص ہے اس وصف خاص میں کوئی دوسرا سوائے انبیاء کے ان کا شریک نہیں، اللہ فرماتا ہے (هو سمٰكم المسلمين من قبل وفى هذا) (الجمع: ۷۸) (هو سمٰكم) یعنی اللہ تعالیٰ نے (اے امت محمدیہ) تمہارا نام مسلمان رکھا ہے (من قبل) پہلے سے یعنی نزول قرآن سے پہلے اگلی کتابوں میں (وفى هذا) یعنی اور کتاب میں یہ اکثر مفسرین کرام کا قول ہے لیکن حضرت ابن زیاد فرماتے ہیں کہ آیت میں (هو) کی ضمیر راجع ہے حضرت ابراہیم کی جانب معنیٰ ہوگا کہ ابراہیم نے تمہارا نام اپنے زمانے میں اس زمانے سے پہلے اور اس وقت میں مسلمان رکھا اور وہ ان کا یہ فرمان ہے (ربنا واجعلنا مسلمين لك و من ذريتنآ امة

مسلمة لك) اسی طرح امام بغوی کی 'معالم التنزیل' میں ہے (۲۰) اس امت کی شریعت اکمل الشرائع ہے (۲۱) اس امت کا اجتماع ضلالت و گمراہی پر نہیں ہوسکتا (۲۲) ان کا اجماع حجت ہے اور ان کا اختلاف رحمت ہے (۲۳) یہ امت عمل کے اعتبار سے سب امتوں سے قلیل ہے مگر اجر و ثواب کے اعتبار سے سب سے کثیر (۲۴) مرض طاعون ان کے لئے شہادت و رحمت ہے حالاں کہ وہ باقی ساری امتوں پر مثل عذاب تھا۔ (یعنی اگر خدا نہ خواستہ اس امت پر طاعون آئے بھی تو اس کے سبب انتقال کرنے والا شہادت پاتا ہے اور اللہ کی رحمت کا سزاوار ہوتا ہے) (۲۵) اس امت کا خاصہ ہے کہ اس امت کے دو شخص اگر کسی کے بھلا ہونے کی گواہی دے دیں تو اس پر جنت واجب ہوجاتی ہے (۲۶) اس امت کی خاص خصوصیت و فضیلت یہ ہے کہ اس کو سندیں عطا کی گئیں (۲۷) اس امت میں تصنیف و تالیف کتب کا سلسلہ جاری رہے گا (۲۸) اس امت میں اقطاب و اوتاد اور نجبا و ابدال ہوں گے (۲۹) اس امت کا گنہگار قبر میں اپنے گناہوں کو لے کر داخل ہوگا اور بغیر گناہوں کے قبروں سے نکلے گا اس لئے کہ مؤمنین کے ان کے لئے استغفار کرنے سے ان کے گناہوں کو بخش دیا جائے گا (۳۰) ان کی آخرت میں یہ خصوصیت بھی ہے کہ حشر کے دن زمین سب سے پہلے ان پر سے ہی شق ہوگی تمام امتوں میں سے (۳۱) قیامت کے دن یہ امت آثار وضو کی برکت سے روشن پیشانی اور دست و پا نورانی لے کر آئے گی (۳۲) وہ میدان محشر میں (سرکار دو عالم ﷺ کے صدقے و طفیل سے) بلند مقام پر ہوں گے (۳۳) ان کو ان کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دئے جائیں گے (۳۴) اس امت کے ستر ہزار لوگ ایسے ہوں گے جو جنت میں بغیر حساب و کتاب کے جائیں گے اور ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے (۳۵) اور ان خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ یہ امت سب امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔

لفظی تشریح: (رکنا) وہ جس پر آرام و اعتماد کیا جائے اور اس سے مراد ہمارے نبی اکرم ﷺ ہیں جو ہمارے پاس ایسی شریعت لائے جو منسوخ ہونے والی نہیں۔ (غیر منهدم) میں "غیر" بالنصب "رکنا" کی صفت ہے اور "منهدم" کا معنیٰ متغیر اور زائل ہونے والا ہے یعنی یہ شریعت بدلنے اور زائل ہونے والی نہیں اس لئے کہ اس شریعت محمدیہ کو نسخ لاحق نہیں ہوسکتا بلکہ وہ تا قیام قیامت باقی ہے۔

شرح بیت ثانی: (لما) وجود کے لئے حرف وجود ہے سیبویہ کے نزدیک اور ظرف بمعنیٰ "حین" ہے ابن فارس کے نزدیک، اس سے متصل فعل ماضی ہوتا ہے لفظاً یا معناً (دعا) بمعنیٰ "سمّیٰ" ہے (یعنی نام رکھنا) (اللہ) کلمۂ جلالت فاعل ہے "دعا" کا (داعینا) سے مراد ہمارے نبی کریم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ "دعا" کا مفعول اول ہے اور اس کا آخری حرف ضرورت شعری کی وجہ سا کن کر دیا گیا ہے یا پھر اس کا سکون ایک لغت ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے "اعط القوس باریها" (یعنی کمان تراشنے والے کو کمان دو، مطلب یہ

ہے کہ کام کو اس شخص کے سپرد کرو جو اس کی اہلیت رکھتا ہو)
اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کو " داعی " کہنا اس فرمان باری تعالیٰ سے ماخوذ ہے:﴿ وداعیا الی الله باذنه و سراجا منیرا﴾
(لطاعته) متعلق ہے " دعا " سے اور اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی ہے۔(باکرم الرسل) یہ مفعول ثانی ہے " دعا " کا، اس مفعول ثانی تک فعل کو 'با' کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے۔(کنا) یعنی اس وجہ سے کہ ہمارے نبی کو اللہ نے اکرم الرسل فرمایا، ہم (اکرم الامم) ہو گئے یعنی تمام امم ماضیہ سے افضل و اکرم ہو گئے اس لئے کہ تابع کا فضل و شرف متبوع کے فضل و شرف کی وجہ سے ہوتا ہے تو جب آپ ﷺ (یعنی متبوع) تمام رسولوں سے افضل ہیں اسی طرح آپ کی امت (یعنی تابع) تمام امتوں سے افضل ہے۔

فضیلت امت محمدیہ ﷺ

اس امت کی افضلیت پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس کو ابو نعیم نے " الحلیة " میں ذکر فرمایا ہے: حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی حضرت موسیٰ کی طرف یہ وحی کی (ان من لقینی وهو جاحد باحمد ادخلته النار) کہ جو مجھ سے احمد کا منکر ہو کر ملاقات کرے گا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا، حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے میرے رب احمد کون ہیں؟ رب تعالیٰ نے فرمایا (ما خلقت خلقا اکرم علی منه کتبت اسمه مع اسمی فی العرش قبل ان اخلق السماوات و الارض و ان الجنة محرمة علی جمیع خلقی حتی یدخلها هو ا ومته) یعنی وہ وہ ہیں کہ میں نے اپنے نزدیک اس سے زیادہ بزرگ تر کسی کو بھی پیدا نہ فرمایا، میں نے زمین و آسمانوں کو پیدا کرنے سے پہلے اس کا نام اپنے نام کے ساتھ عرش پر لکھا اور میری تمام مخلوق پر جنت اس وقت تک حرام ہے جب تک وہ اور اس کی امت اس میں داخل نہ ہو جائے،" تو حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ اے رب ان کی امت کون ہے؟ فرمایا رب تعالیٰ نے:
" الحمادون یحمدون صعودا و هبوطا وعلی کل حال یشدون ازرهم او ساطهم و یظهرون اطرافهم، صائمون بالنهار و رهبان باللیل، اقبل منهم الیسیر و ادخلهم الجنة بشهادة ان " لا اله الا الله " یعنی وہ حمادون ہیں جو ہر حال میں اٹھتے بیٹھتے میری حمد بجالاتے ہیں اور اپنی کمروں پر تہہ بند باندھتے ہیں اور اپنے اطراف کو ظاہر کرتے ہیں، دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات میں میری عبادت میں مشغول رہتے ہیں میں ان سے آسان اور ہلکی بات کو بھی قبول فرماؤں گا اور کلمۂ شہادت 'لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' کی گواہی سے میں انہیں جنت میں داخل فرمادوں گا" حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے رب تو مجھے تو اس امت کا نبی بنادے فرمایا رب تعالیٰ نے ان کا نبی انہی میں سے ہوگا، تو انہوں نے پھر کہا (اے اللہ) تو تو

مجھے اس نبی کا امتی بنادے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ میں نے تمہیں مقدم کیا ہے اور انہیں مؤخر لیکن عنقریب میں دار الجلال میں تمہاری اور ان کی ملاقات کرادوں گا۔ (الخرفوتی ص ۱۸۴۔۱۸۵۔۱۸۶)
دونوں شعر کا حاصل معنیٰ یہ ہے: اے مسلمانوں ہمارے لئے عظیم خوشخبری ہے اس لئے کہ ہمارے لئے کبھی نہ منسوخ ہونے والی شریعت ہے اور جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم ﷺ کا نام اکرم الرسل رکھا ہے اور رب تعالیٰ نے جب ان کو تمام رسولوں سے بزرگ تر سب سے معظم ومکرم فرمادیا تو ہم بھی اسلام آنے سے پہلے کی تمام گزشتہ امتوں سے افضل ہیں اور اکرم الامم ہیں، باری تعالیٰ کا یہ فرمان عالی شان اس کا مصدر ہے (کنتم خیر امة اخرجت للناس) یعنی تم سب سے بہترین امت ہو اور حضور کی امت کا سب سے بہترین اور افضل امت ہونا اس لئے ہے کہ خود حضور علیہ السلام سب سے بہترین اور سب سے افضل رسول ہیں۔

الحمد لله علی نعمة الاسلام و انه سبحانه قد اکرمنا الله بحبیبنا
و سیدنا محمد علیه الصلوٰة والسلام

☆☆☆☆☆

نوٹ

(آج مؤرخہ ۲۳ رشوال المکرّم ۱۴۳۸ھ بروز منگل مطابق ۱۸ جولائی ۲۰۱۷ء کو بارہ بجے دن میں بحمد اللہ تعالیٰ قصیدہ بردہ شریف کی ساتویں فصل تک شرح مکمل ہوتی ہے اور اسی پر ''الوردۃ فی شرح الفردۃ'' کی پہلی جلد تیار ہوجاتی ہے (بقیہ تین فصلوں کی شرح وترجمہ جلد ثانی میں ملاحظہ ہو) اور آج سے تین مہینے بعد ۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۳۹ھ کو براؤں شریف میرے مادر علمی میں میری دستار بندی کے موقعہ پر چھپ کر شائع ہوگی اور انشاء اللہ تعالیٰ بعدہٗ ۲۵ رصفر المظفر عرس اعلیٰ حضرت میں علماء ومشائخ اور اساتذۂ کرام کے ہاتھوں سے اس کا رسم اجراعمل میں آئے گا۔
اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس کے لکھنے میں میری نیت اور خلوص میں کسی طرح کی کوئی کمی رہ گئی ہو تو معاف فرمائے اور اسے میرے لئے اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور اپنے حبیب کے ثناخوانوں میں میرا نام بھی قصیدہ بردہ شریف کے شارح ومترجم کی حیثیت سے درج فرمائے نیز شارح قصیدہ بردہ حضور تاج الشریعہ کو صحت و توانی عطا فرمائے، ان کے سائے کو ہمارے سروں پر دراز فرمائے آمین۔ اور اسے میرے اور میرے والدین اعزا اقارب استاذ ماں باپ بھائی بہن کے حسن خاتمہ کا ذریعہ بنائے۔ (فقیر محمد ارسلان رضا قادری غفرلہٗ)